رجوع الی القرآن

اہمیت اور تقاضے

مقالات سیمینار



اشہد رفیق ندوی

ادارہ علوم القرآن شبلی باغ علی گڑھ

رجوع إلى القرآن - اہمیت اور تقاضے

مقالات سیمینار

ترتیب

اشہد رفیق ندوی

ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

سلسلہ مطبوعات ادارہ علوم القرآن ۱۳

نام کتاب	:	رجوع إلی القرآن - اہمیت اور تقاضے
نام مرتب	:	اشہد رفیق ندوی
اشاعت	:	۲۰۱۳ء
صفحات	:	۵۲۸
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۳۰۰/-
کمپوزنگ و ڈیزائن	:	حارث احسن
طباعت	:	ایورپروز اکیڈمی، علی گڑھ

Ruju' Ila al Qur 'an - Ahmiyyat Aur Taqaze
Compiled by Ashhad Rafiq Nadwi
Idarah Ulum Al- Quran
P.O. No. 99, Shibli Bagh
Aligarh U.P. Pin: 202002
www.alquran.in
alquran85@gmail.com, 0571- 2720311
Price: 300/-

ISBN:978-81-927666-2-1

ملنے کے پتے

۱- البلاغ پبلیکیشنز، ۱۰/ اعظمی اپارٹمنٹس، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

۲- البدر بک سینٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی۔

محتویات

شرکاء کا تعارف

۱- مولانا محمد یوسف اصلاحی	ناظم جامعۃ الصالحات، رام پور و مدیر ماہنامہ ذکریٰ، رام پور
۲- پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی	فیصل ایوارڈ یافتہ اسلامی اسکالر و معروف ماہر معاشیات
۳- پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، و مدیر ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ
۴- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی	ایسوسیٹ پروفیسر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، و مدیر ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ
۵- مولانا اشہد رفیق ندوی	استاد سینئر سکنڈری اسکول، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و معاون سکریٹری ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ
۶- پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۷- پروفیسر سید مسعود احمد	سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنس، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۸ مولانا سلطان احمد اصلاحی	معروف اسکالر و مدیر سہ ماہی علم و ادب، علی گڑھ
۹ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	ایسوسیٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
۱۰- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی	ایسوسیٹ پروفیسر اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، و سکریٹری ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ
۱۱- ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی	عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ، شانتا پورم، کیرالہ
۱۲- ڈاکٹر محمد مبین سلیم	اسسٹنٹ پروفیسر، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۳- مولانا عبدالبر اثری فلاحی	ناظم اعلی فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی
۱۴- مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی	سینئر استاد قرآن و حدیث، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ
۱۵- مولانا نسیم ظہیر اصلاحی	سینئر استاد حدیث، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ
۱۶- ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی	اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۷- پروفیسر عبدالرحیم قدوائی	پروفیسر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈائریکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۸- مولانا نعیم الدین اصلاحی	سینئر استاد قرآن، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ
۱۹- ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	پروفیسر اسلامک اکنامکس ریسرچ سینٹر، جامعۃ الملک عبدالعزیز، جدہ۔ وسکریٹری ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ
۲۰- ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی	اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدر آباد
۲۱- ڈاکٹر محی الدین غازی	دار الشریعہ برائے مالیاتی اور قانونی رہنمائی، دبئی، ممبر مجمع فقہاء الشریعہ، امریکہ
۲۲- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی
۲۳- ڈاکٹر حافظ سعید احمد بن عبداللہ عمری	عمید الکلیہ، جامعہ دار السلام عمر آباد، تمل ناڈو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

رجوع الی القرآن-اہمیت اور تقاضے کے مرکزی موضوع پر منعقد ہونے والے سمینار کا مجموعہ مقالات پیش کرتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

یہ سمینار ۲۱،۲۲/اکتوبر ۲۰۱۲ کو ادارہ کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا، اس میں ملک کے مختلف اہم علمی اور دینی اداروں سے تعلق رکھنے والے علماء اور اسکالرز نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے، ان پر مفید اور مثبت مذاکرہ اور مباحثہ ہوا۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ اس نے اپنی کتاب عزیز کی نسبت سے یہ علمی مجلس منعقد کرنے اور ارباب علم وفکر کو جمع کرنے کی توفیق بخشی۔ سمینار کے دوران فکر ونظر اور بحث ومباحثہ کے دوران توجہ اسی نکتہ پر مرکوز رہی کہ ہماری زندگی اور معاشرے میں کتاب الٰہی کا حقیقی مقام ومرتبہ بحال کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں کیونکہ امت کی صلاح وفلاح کا یہی ایک راستہ ہے اور دنیا میں بھی عزت وسربلندی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ بھی ہے۔

تلاوت قرآن پاک سے اس بابرکت مجلس کا آغاز ہوا، سورۂ قیامۃ کی چند آیتوں کی تلاوت سے ماحول پر ایک خاص تاثر قائم ہوا۔ اس کے بعد صدر ادارہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کتاب الٰہی کے تئیں ان کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا اور سمینار کے مقصد ومنہج پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قرآن مجید انسانیت پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اسی قرآن کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ نے عرب کے وحشی معاشرے کو جنت نشاں بنا دیا تھا اور آپ نے تاکید فرمائی تھی کہ جب تک امت اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہے گی کبھی گمراہ نہ ہوگی۔ افسوس کہ بعد کے ادوار میں رسی کا سرا امت کے ہاتھ سے جاتا رہا اور امت ذلت وادبار کی کھائی میں گر گئی، ہزاروں دعاؤں نیک تمناؤں اور کوششوں کے باوجود یہ سرا ہاتھ نہیں آ رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ امت اس خسارے کا ادراک کرے، اپنے رب کی کتاب کی طرف پلٹے، اسی کو زندگی کا مرکز ومحور بنائے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اسی بات کو آگے

بڑھاتے ہوئے سکریٹری ادارہ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی رجوع اِلی القرآن کے مختلف مراحل اور درجات پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا سب سے پہلا مرحلہ ہدایت طلبی کا ہے، ہر مسلمان اس بات کا مکلّف ہے کہ قرآن سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرے، پھر اپنے اختصاص کے لحاظ سے ہر شخص کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ مہمان خصوصی مولانا محمد یوسف اصلاحی نے اپنے کلیدی خطاب میں بڑے مؤثر انداز میں اس طرح موضوع کی تفہیم کی کہ رجوع اِلی القرآن کی ضرورت اور اہمیت اور مسلم معاشرے کے لئے اس کی ناگزیز ضرورت پوری طرح آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ آپ نے فرمایا قرآن مجید کی دعوت دینا بظاہر آسان کام ہے مگر قرآن کو زندگی میں اتارنا مشکل کام ہے، قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس سے ہدایت پانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ہر ایک آیت کو اپنے متعلق سمجھیں، ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو بنائیں اور یہ تصور کریں کہ اللہ نے یہ آیت میرے لیے ہی نازل کی ہے اور دوسروں پر منطبق کر کے سکون محسوس کرنے کی عادت چھوڑ دیں، اس کو اپنی ذات پر منطبق کرنے کی عادت ڈالیں۔

اس افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے فرمائی، ماسبق گفتگو کو سمیٹتے ہوئے آپ نے جدید حالات اور تقاضوں کے تناظر میں رجوع اِلی القرآن کے مقصد و منہاج کی نشاندہی فرمائی۔ آپ نے نہایت بلیغ اسلوب میں ان اسباب و محرکات کا تجزیہ کیا جن کی وجہ سے امت قرآن مجید سے دور ہوتی چلی گئی، چند بڑے معاصر مسائل کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ ان مسائل کا حل دیگر مآخذ میں ڈھونڈھا جارہا ہے جبکہ ان کا حل قرآن مجید میں موجود ہے، امت کو ان تنگنائیوں سے نکل کر قرآن مجید کی وسعتوں میں اس کا حل تلاش کرنا چاہیئے، اس طرح افتتاحی اجلاس کے ان خطابات نے سمینار کا رخ، مقصد اور منہاج اچھی طرح متعین کر دیا۔

مقالات کے پانچ اجلاسوں میں پچیس مقالات پیش کیے گئے، ہر مقالہ مرکزی موضوع سے منسلک تھا، زیادہ تر مقالات براہ راست رجوع اِلی القرآن کی دعوت پر مشتمل تھے، چند مقالے رجوع کی مشکلات کو آسان بنانے اور منزل کی جانب رہنمائی کرنے والے تھے، ان مقالات کو مضمون کی مناسبت سے چند ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

پہلا باب افتتاحی اجلاس کے کلیدی مباحث پر مشتمل ہے جس میں مرکزی موضوع کا تعارف اور سیمینار کے مقاصد، منہج اور ترجیحات کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرا باب تعارف قرآن پر مشتمل ہے، جس کتاب کی کی جانب رجوع کی دعوت دی جارہی ہے اس کا حق ہے کہ پہلے اس کا اچھی طرح تعارف کرادیا جائے۔ اس باب میں نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن کا تعارف خود قرآن مجید کی روشنی میں کرایا گیا ہے، ساتھ ہی اس کی دائمی حیثیت انقلابی تعلیمات اور اس کے محفوظ و محکم ہونے کے شواہد فراہم کیے گئے ہیں۔ تیسرا باب رجوع إلی القرآن کی مختلف جہات، معانی، طریقہ، منہج، لوازم اور تقاضوں کے تعارف و تجزیہ پر مشتمل ہے، اس میں دروس قران، مطالعۂ قرآن، تراجم و تفاسیر سے استفادہ کی انفرادی و اجتماعی کوششوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، اس باب کا ہر مقالہ قرآن کی طرف رجوع کی یاددہانی، مشکلات کے حل کی رہنمائی اور اس راہ میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ رجوع کی جانب ترغیب وتشویق کے بعد موضوع کا فطری تقاضا تھا کہ قرآن کے فہم کو تدبر کے وسائل و ذرائع زیر بحث لائے جائیں تاکہ جن لوگوں نے اس جانب قدم بڑھا دیا ہے وہ مأمون طریقے سے منزل تک پہنچ سکیں، تیسرے باب میں ایسے تمام علوم کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے جن کی اس راہ کے راہی کو ضرورت پیش آسکتی تھی۔ 'نظم قرآن' ایک ایسا موضوع ہے جس پر عام طور سے زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے اور فہم قرآن کے باب میں اس کی اہمیت کا ادراک کم ہی کیا گیا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی شاہ کلید ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع کو خاص طور سے نہایت شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس میں موضوع کی اہمیت، افادیت مآخذ، اصول، اقسام اور تاریخ سب کا مفصل تذکرہ آگیا ہے۔ جو لوگ براہ راست قرآن مجید سے رجوع کرنے کے بجائے تراجم و تفاسیر سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، ان کے لئے مروجہ انگریزی و اردو تراجم و تفاسیر کا تعارف، استفادہ کے طریقے اور اس سلسلہ میں ضروری احتیاطوں کے بیان پر مشتمل مضامین بھی اسی باب میں شامل ہیں۔

تعلیم و تعلم کے باب میں فاضل مقالہ نگاران نے کتاب الٰہی کے تدریسی نظام مناہج، طریقے اور نصابوں کا جائزہ لیا ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر منتہی درجات تک اور

ہندوستان سے لے کر سعودی عرب، مصر اور ملیشیا تک تدریس قرآن کے جو نصابہائے تعلیم یا طریقہائے تعلیم رائج ہیں، ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تا کہ ان کی روشنی میں مروج تدریسی نظام و نصاب کو بہتر بنایا جا سکے۔ ایک مقالہ میں خاص طور سے دنیا بھر میں مروج نظام تعلیم میں قرآن مجید کی مرکزیت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، فاضل مقالہ نگار نے دینی درس گاہوں میں پڑھائے جانے والے علوم و مشتملات کا جائزہ لے کر اس حقیقت کو اچھی طرح آشکار کیا ہے کہ پورا نظام محور سے ہٹا ہوا ہے، قرآن مجید کو تمام علوم کا سرچشمہ سب تسلیم کرتے ہیں مگر نصاب تعلیم میں اس کا انعکاس نہیں پایا جاتا۔ ضرورت ہے کہ امت کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے۔ اللہ کی کتاب تمام علوم کا خزینہ ہے۔ لہٰذا اغیار کی نقالی کے بجائے ہر میدان میں اسی سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

رجوع إلی القرآن کی دعوت کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ زندگی کو قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل کو قرآن مجید کی روشنی میں حل کیا جائے، قرآن مجید بلاشبہ زندہ جاوید کتاب ہے اور ہر زمانے کے مسائل کے سلسلے میں بنیادی رہنمائی فراہم کرتا ہے، اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے چھٹے باب میں معاصر مسائل کو موضوع بحث بنا کر ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصر حاضر کا ایک بڑا مسئلہ تقسیم دولت کا نظام ہے، اس نظام کی ناہمواری ظاہر ہے۔ ایک ماہر معاشیات نے اپنے مقالہ میں قرآن مجید کے تقسیم دولت کے معتدل و متوازن نظام کا بھرپور تعارف کرایا ہے اور زور دیا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ نظام تقسیم دولت کو علم و عمل دونوں میدانوں میں عام کر کے اچھا نمونہ پیش کیا جائے۔ ایک دوسرے مقالہ نگار نے یہ اصولی سوال حاضرین کے سامنے اٹھایا کہ انسانوں کے وہ بنیادی حقوق جن پہ ساری دنیا کے ساتھ مسلمان بھی عملاً متفق ہیں، ان کے سلسلہ میں قرآن کا موقف کیا ہے۔ یہ معلوم کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ایک سرسری جائزہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بنیادی حقوق کے سلسلہ میں مروجہ اسلامی لٹریچر میں کئی ایسے تصورات پائے جاتے ہیں جو قرآنی تعلیمات سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے اور قرآن میں ان حقوق کو جس طرح تسلیم کیا گیا ہے ان کو بالکل اسی طرح تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اب رجوع إلی القرآن کی دعوت کو ان ابعاد میں داخل ہونا چاہئے، اسی باب میں وہ مقالات بھی شامل ہیں جن میں قرآن مجید پر کے بارے میں غیر مسلمین کی غلط فہمیوں اور اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالات کے مذکورہ مباحث سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ رجوع إلی القرآن کی دعوت کونتیجہ خیز بنانے کے لئے شعوری جدوجہد کی گئی ہے اس کے نتیجہ میں کئی اہم پہلو زیر بحث آگئے تو کئی پہلو ابھی توجہ طلب ہیں، سمینار کے آغاز میں صدر ادارہ نے یہ وضاحت کی تھی کہ ہر آدمی کی اپنی ایک شخصیت، انفرادیت اور ذہنی ساخت ہوتی ہے، ہر صاحب فکر انسان مختلف مسائل کے بارے میں اپنا ایک مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتا ہے، اس لیے دانشوروں کی اس محفل میں اختلاف رائے ایک ناگزیر امر ہے یہ قطعی ممکن نہیں کہ سب لوگ ایک ہی انداز سے سوچیں اور ایک ہی طرح کے نتائج تک پہنچیں، اس عالم رنگ بو کی زیبائی ورعنائی کا راز یک رنگی میں نہیں بلکہ رنگوں کی کثرت اور فراوانی میں مضمر ہے، اس لئے فکرونظر کے اختلاف سے گھبرانے اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ مناسب حدود میں رہتے ہوئے یہ مفید اور قابل قدر عمل ہے، چنانچہ علم کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے غوروفکر اور نقطۂ نظر کے نتائج کو پوری آزادی سے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے، کشادہ دلی اور کشادہ جبینی سے دوسروں کو سننا اور اپنی سنانا ہی ان مجالس کی جان ہوتی ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر نقطۂ نظر خالص علمی انداز میں پیش کیا جائے، تنقید مثبت، صحت مندانہ، متوازن اور متین ہو، تحقیق وتفتیش کو دلائل و براہین کی پختہ اساس پر قائم کیا جائے اور اس سلسلہ میں کسی تعصب اور تنگ نظری کو راہ نہ دی جائے۔ امید ہے کہ ہمارے اس سمینار میں اس کا پورا خیال رکھا جائے گا۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اس بات کا خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا۔ ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا پورا موقع دیا گیا۔ کئی منفرد خیالات سامنے آئے، ان پر بحث و مباحثہ ہوا۔ حاضرین نے علمی انداز میں تائید یا تنقید کی اور بحث فطری انداز میں اپنے انجام کو پہنچی، اس مجموعہ کی ترتیب میں بھی یہی فکر کارفرما رہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا پورا حق دیا جائے، چنانچہ مقالہ نگاران نے جو کچھ لکھا، بعنیہ اسی فکر کو شائع کیا جارہا ہے، نفس مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، البتہ ترتیب کے درمیان جہاں کہیں آیات یا عربی عبارت کے ترجموں اور حوالوں کی کمی، پروف کی غلطیاں یا اس نوعیت کی دوسری فروگذاشتیں پائی گئیں، انہیں درست کرنے کی ممکن حد تک کوشش کی گئی ہے۔

مجموعۂ مقالات پیش کرتے ہوئے دل تشکر و امتنان کے کے جذبات سے لبریز ہے، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بارگاہ رب العزت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کا حق ہے جس نے اسی اہتمام کے ساتھ سمینار کے انعقاد کی توفیق بخشی جیسا کہ خادمان ادارہ آرزومند تھے، خادمان ادارہ کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ سمینار معیاری ہو اور اس کے سخت تقاضوں کو پورا کرنے کا ممکن حد تک اہتمام کیا جائے، ارکان و کارکنان ادارہ کتاب عزیز کی خدمت کو سعادت تصور کر کے انہماک کے ساتھ پورے سال لگے رہتے ہیں، بالخصوص صدر ادارہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب جس شفقت، محبت اور توجہ سے قدم قدم پر رہنمائی فرماتے ہیں اور ہر مشکل کو آسان بنا دیتے، یہ انہی کا حصہ ہے۔ محترم سکریٹری ادارہ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی صاحب ہزاروں میل دور رہنے کے باوجود برابر خبر گیری کرتے اور رہنمائی فرماتے رہتے نائب صدر ادارہ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب سے جب جو تعاون مانگا گیا، خدمت کتاب الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہر لحہ وہ تیار پائے گئے۔ ادارے کے سابق رفیق جناب زبیر عالم اصلاحی کے کاندھوں پر ہی اس کا اصل بوجھ تھا اور انہوں نے نہایت خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ہر کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ادارے کے موجودہ اور سابق اسکالرس سب ہمیشہ دست و بازو کی طرح ساتھ لگے رہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی کتاب کی خدمت کا بہترین اجر عطا فرمائے کہ صحیح معنوں میں اس کا اجر وہی دے سکتا ہے، عزیزم حارث احسن اس مجموعۂ کی ترتیب و تزئین میں جن انہماک سے لگے رہے اور دن رات ایک کر کے اس خوبصورت شکل میں پیش کیا، ان کا حوصلہ وانہماک دیکھتے ہی بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نیک بندے کو خصوصی اجر عطا فرمائے۔ سمینار کے انعقاد میں ادارے کے ارکان و کارکنان دل و دماغ اور دست بازو کی توانائیاں صرف کرتے ہیں اور الحمد للہ خوب کرتے ہیں۔ ادارے کے ایک دیرینہ کرم فرما جناب منیر احمد خاں صاحب نے انہیں فراہمی اسباب کی فکرمندی سے آزاد کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قرآن کی طرف پلٹنے کا ذریعہ بنائے اور جن حضرات نے بھی دامے، درمے، قدمے، سخنے اس میں تعاون کیا ہے۔ انہیں بہترین اجر عطا فرمائے۔ **اللھم اجعل القرآن ربیع قلوبنا و نور عیوننا و ذھاب ھمنا و غمنا. آمین**

۲/اکتوبر ۲۰۱۳ء

اشہد رفیق ندوی
کنوینر سیمینار

افتتاحی کلمات

عبدالعظیم اصلاحی

قرآن کی طرف رجوع کے مرکزی موضوع کے تحت منعقد ہونے والے اس دوروزہ سیمینار کے آغاز میں اس ہیچمداں کو کچھ عرض کرنے کا حکم ہوا ہے، جس کی تعمیل میں چند باتیں پیش ہیں۔ اس امر میں شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اپنی ہدایت کے لئے، فلاح دارین کے لئے، علم وعمل کی راہ میں روشنی کے لئے اور اپنے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے بلکہ مسلمان کی حیثیت جینے کے لئے قرآن کی طرف رجوع ضروری ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

رجوع إلی القرآن کا مطلب ہے کہ ہم قرآن مجید کو غور سے پڑھیں، اس کی تعلیمات کو سمجھیں، ان پر عمل پیرا ہوں اور انہیں اپنی زندگی کے ہر سفر میں مشعل راہ بنائیں۔

اس وقت قرآن کی تعلیمات اور قرآن کے نام لیواؤں کے عمل میں عام طور پر سخت تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً: قرآن کریم کا آغاز ہی إقرأ (پڑھ) اور "عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" (العلق: ۵) "اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا" کے اہم الفاظ سے ہوتا ہے مگر بحیثیت مجموعی ہم میں ناخواندگی اور جہل دیگر قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ توحید وعبودیت اب بھی قرآن کی بنیادی تعلیم ہے، لیکن اچھا خاصہ طبقہ شرک و بدعات میں مبتلا ہے۔ قرآن میں پاکی وصفائی پر کس قدر زور ہے، احادیث نے نظافت کو دین کا حصہ قرار دیا ہے، لیکن اس وقت گندگی ہمارے محلوں کی علامت بن گئی ہے۔ قرآن مجید میں کس قدر اخلاقی تعلیمات ہیں کسی سے شاید ہی مخفی ہوں، رسول اللہ ﷺ کا مشن ہی مکارم اخلاق کی تکمیل تھا، مگر ان کے ماننے والوں کی اکثریت کا اغیار سے موازنہ کر کے دیکھیں تو فرق

معلوم ہوگا۔قرآن میں تفکر وتدبر کی کتنی تاکید آئی ہے۔قرآن پرغوروفکر أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد:۲۴)،''کیا یہ لوگ قرآن پرغورنہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں''۔خودانسان کی اپنی ساخت پرغور وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات:۲۱)''اورخودتمہارے اندربھی،کیاتم دیکھتے نہیں؟''اور کائنات کے اندر پھیلے ہوئے نظام پرغوروفکرلیکن اس طرف ہماری توجہ شاید ہی ہوتی ہو۔اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ رجوع إلی القرآن کے عنوان کے تحت اہل علم وفکر جمع ہوں،اس کی اہمیت اور تقاضوں پرروشنی ڈالیں اوراس کے مناسب طریقوں پراظہارخیال کریں،اس کوخوداپنے اندرجاگزیں کریں اوراس دعوت کوعام کرنے کاعزم لےکرلوٹیں۔وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (الذاریات:۵۵)''اوریاددہانی کرتے رہوکیوں کہ یاددہانی ایمان والوں کونفع پہنچاتی ہے''۔

قرآن کی طرف رجوع اوراس سے استفادہ کے کئی درجات ہیں جن میں سے بعض کاذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے:سب سے پہلا درجہ توہدایت طلبی کا ہے،ہرمسلمان اس بات کا مکلّف ہے کہ قرآن سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرے کیونکہ قرآن کتابِ ہدایت ہی ہے۔آغازہی میں فرمادیا هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ: ۲) ''ہدایت ہے خداسے ڈرنے والوں کے لیے''۔ارشادہے:إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (سورۃ الاسراء:۹)۔''بے شک یہ قرآن اس(راستے) کی رہنمائی کرتا ہے جوبالکل سیدھا ہے''۔

ہدایت کے مفہوم میں ایمان وعمل کے سارے پہلوشامل ہیں یعنی عقائد کی درستگی،حلال وحرام،صحیح وغلط،کیااخلاق ہے اورکیابداخلاقی،اطاعت کاطریقہ کونسا ہے؟اور بغاوت کا راستہ کیاہے؟تقوی کاعمل کیاہے اورفسادکیاچیز ہے۔آخرت کی فکرکیاہےاوردنیاداری کس کو کہتے ہیں اورفلاح فی الدارین کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟اللہ تعالیٰ کاارشادہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً ۔(الدہر:۳)''ہم نے اس کوراہ سمجھادی۔چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفرکرنے والا۔

دوسری جگہ فرمایا: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۔(البلد:۱۰) اور اس کو دونوں راہیں نہیں سمجھا دیں۔

مذکورہ بالا مطالب کے لئے قرآن کی طرف رجوع کی دعوت سارے انسانوں کے لئے ہے کیونکہ قرآن کا پیغام عالمی ہے اور سارے بنی نوع انسان اس کے مخاطب ہیں۔لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں، ان کے لئے رجوع اِلی القرآن بدرجہ اولی ضروری ہے۔خاص طور پر اس وقت ملکی و عالمی سطح پر مسلمان جس سنگین صورتحال سے دوچار ہیں، ان کی رہنمائی کے لئے اور ان کے مقابلے کے لئے قرآن کی طرف رجوع ازبس ضروری ہے۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بہت آسان کر دیا ہے۔وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۔(القمر:۱۷)''اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے،تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟''

اسی طرح گذشتہ قوموں کے واقعات سے عبرت پذیری کے لئے قرآن کی طرف رجوع ضروری ہے۔قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے لیکن اس نے بہت سی قوموں کی سرگزشت بیان کی ہے جنہوں نے اپنے نبیوں کا انکار کیا، احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی اور اللہ کے نیک و فرمانبردار بندوں کو مبتلاء عذاب رکھا اور بالآخر تباہ کر دی گئیں۔ سورۃ الشعراء میں اس طرح کی تقریباً آٹھ قوموں کا ذکر ہے اور ہر ایک کے بعد فرمادیا: إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۔(۱۰۲) یعنی''بے شک اس واقعہ میں نشانی ہے۔(غور کرنے والوں کے لئے) اور ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی''۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے انسانوں کے مخصوص گروپ اور ان کے رجوع اِلی القرآن کے خاص پہلو کا۔اس میں اپنے تخصص کے لحاظ سے ہر شخص کو قرآن کی طرف رجوع کرنا ہے۔اگر وہ اہل سیاست میں سے ہے تو وہ قرآن سے معلوم کرے کہ وہ کیا اصول جہانبانی دیتا ہے۔اگر وہ ماہر معاشیات ہے تو وہ دیکھے کہ پیداوار اور تقسیم دولت کے سلسلہ میں قرآن کیا رہنمائی کرتا ہے۔اگر وہ تاریخ کا طالب علم ہے تو اسے جاننا چاہیئے کہ قرآن کا نظریۂ تاریخ کیا ہے۔اگر وہ علم نفسیات سے تعلق رکھتا ہے تو دیکھے کہ قرآن کس طرح عبرت و موعظت

کے قصوں میں نفسیاتی پہلو کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح قانون، فلسفہ، طب، جغرافیہ، فلکیات، موسمیات، علوم طبعیات غرضیکہ سبھی علوم کے ماہرین قرآن کی طرف رجوع کر کے اس سے بصیرت و بصارت اور ان حقائق تک پہنچ سکتے ہیں جن کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (البقرہ:۲) ''یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس (کے کتاب الٰہی ہونے میں) کوئی شک نہیں۔

یہ بات شاید ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن مذکورہ بالا علوم کی کتاب نہیں ہے، قرآن کا موضوع ہے انسان، اس لحاظ سے کہ وہ اس کرہ ارضی پر کس طرح ہدایات ربانی کی پیروی کر کے خالق کائنات کا صحیح فرمانبردار بندہ بن سکتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیمات کا محور یہی ہے، اس کے اندر کچھ عملی احکام ہیں اور کچھ علمی حقائق بیان ہوئے ہیں، قرآن رہتی دنیا تک کے لئے ایک معجزہ ہے۔ جو علوم اس وقت پائے جاتے ہیں یا جو آئندہ پائے جائیں گے ان کی اساس کا قرآن میں انکشاف انسان کے دل و دماغ میں قرآن کی صداقت و حقانیت اور اس کے من جانب اللہ ہونے کا یقین پختہ کر دے گا۔ اس نیت کے ساتھ ہر شخص کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ہر شخص کو بقدر ہمت اس سے فیضیابی حاصل ہوگی اور وہ اس کی روشنی میں اپنے علم و عمل کو صحیح سمت میں رکھ سکے گا۔

آج کے اس سیمینار میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی اور ان پر تفصیلی گفتگو ہوگی، ان شاء اللہ۔ اس میں کچھ مقالات تو براہ راست اس موضوع ہی سے بحث کریں گے۔ اور کچھ مقالات بالواسطہ موضوع سے متعلق ہوں گے اس لئے میرے لئے مناسب نہیں ہے کہ میں آپ کا اور وقت لوں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

کلیدی خطاب

محمد یوسف اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے، اس میں غور کیا جائے اور اس سے نصیحت حاصل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ (ص:۲۹)

''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں''۔

بعض لوگ جو عربی زبان اور اس کی ادبی لطافتوں سے واقف ہیں وہ تو براہِ راست اس میں غور کرتے ہیں اور بعض جو عربی زبان نہیں جانتے وہ ترجموں اور تفسیروں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بجا طور پر اپنے اس حسن عمل پر مسرور و شاداں ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کی کتاب کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ بعض اوقات زبردست غلطی کرتے ہیں، شعوری طور پر کرتے ہیں یا غیر شعوری طور پر، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر اس غلطی کی وجہ سے وہ قرآن کے فیض سے محروم رہتے ہیں اور ہدایت کی کتاب پڑھنے کے باوجود ہدایت سے تہی رہتے ہیں۔

دراصل قرآن سمجھ کر پڑھنے والے یہ معلومات ضرور رکھتے ہیں یا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن پاک جس وقت نازل ہو رہا تھا، اس وقت قرآن کے بہت سے مخاطب گروہ تھے۔ مشرکین تھے، منافقین تھے۔ یہود و نصاریٰ تھے، اہل ایمان تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو اطاعت گزار تو بن گئے تھے لیکن ایمان سے خالی تھے۔ یہ معلومات بعض اوقات فائدہ بخش ہونے کے بجائے نقصان رساں ہو جاتی ہیں اور حق و ہدایت سے فیضیاب ہونے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ''اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی'' یہ معلومات رکھنے والا ان

معلومات ہی کی وجہ سے ان ہدایات سے خود کو محروم کر لیتا ہے جن کو قرآن میں پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اپنی ذات کو ان ہدایات سے اوٹ میں کر لیتا ہے کہ یہ آیت تو فلاں گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ آیت تو فلاں گروہ کی شان میں ہے، اس آیت میں تو مشرکین کا تذکرہ ہے، اس آیت میں تو منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے، اس آیت میں تو فلاں گروہ کو تنبیہ کی گئی ہے، اس آیت میں فلاں گروہ کا انجام بیان کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ قرآن کے بہت بڑے حصے کو اپنی ذات سے غیر متعلق کر کے اپنے لیے بے فیض بنا لینے کا زبردست جرم کرتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ یہ جرم اور غلطی برابر کرتا رہتا ہے۔ مگر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے۔ مختلف ترجموں اور تفسیروں کی روشنی میں غور و تدبر بھی کر رہا ہے اور بہر حال قرآن میں غور و تدبر مسلمان کے لیے زبردست سعادت ہے مگر یہ خوش فہمی اور زعم اس کے حق میں قرآن کریم سے فیضیابی کی راہ میں حجاب اکبر ثابت ہوتا ہے اور وہ پڑھنے سمجھنے کے باوجود ہدایت یابی سے محروم رہتا ہے۔

بلا شبہ ہم مومن ہیں، مسلم ہیں۔ کفر، شرک، نفاق وعصیان سے ہمیں نفرت ہے مگر جب قرآن میں کافرین اور مشرکین کے مشرکانہ اور کافرانہ اعمال کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب منافقین کی عہد شکنی اور منافقانہ اعمال کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب کسی گروہ کی نافرمانی، عصیان اور سرکشی کا بیان ہو رہا ہو، جب منافقین کے انجام بد کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب جہنم میں لے جانے والے معاصی کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب ایسے گروہوں کو تنبیہ کی جا رہی ہو جو حق کو پا لینے کے بعد حق سے محروم ہو رہے ہوں، یا حق کا دعویٰ کرنے کے باوجود آگے بڑھ کر حق کو قبول کرنے کے بجائے حق کی مخالفت کر رہے ہوں، تو ان آیات کو مختلف گروہوں پر چسپاں کر کے آگے بڑھ جانے اور ذہن کو جھٹکا دے کر سوچنے اور جائزہ لینے کے بوجھ سے ہلکا کر لینے کی تباہ کن غلطی کرنے کے بجائے رک کر سنجیدگی سے ان برے اعمال اور برے کرداروں کے خد و خال پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس آئینے میں بے لاگ انداز میں اپنے سراپا کا جائزہ لے کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنے عیوب سے واقف ہونے اور

اپنے کردار کو پاک وصاف کرنے کا موقع ملا۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک مومن اور مسلم اپنی غفلت، لاپروائی یا جذبات کے دباؤ اور نفس کی ہوا پرستی کے نتیجے میں ان اعمال کا ارتکاب کر بیٹھے جو کافرانہ، مشرکانہ، منافقانہ اعمال ہیں اور جن کا کوئی جوڑ ایمان واسلام سے نہیں ہے۔ اس طرح سوچنے کی اگر ہم عادت ڈالیں اور قرآن پر سوچنے کا یہ انداز اختیار کریں تو قرآن پاک کا کوئی حصہ اور کوئی آیت ہم سے غیر متعلق نہ ہوگی، ہر حصہ ہمارے لیے ہوگا اور ہر آیت کو ہم اپنا مخاطب سمجھیں گے اور پورے قرآن کا خطاب ہی ہم سے ہوگا۔

یہ زبردست نادانی، افلاسِ فکر اور بے بصیرتی اپنے نفس پر بدترین ظلم ہے کہ ہم قرآن کے بڑے حصے کو دوسروں پر منطبق کر کے خود کو اس کے فیضِ ہدایت سے محروم کرلیں اور جب پڑھنے اور سمجھنے بیٹھیں تو یہ کہتے چلے جائیں کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے، یہ مشرکین کے بارے میں ہے، یہ منافقوں کا بیان ہے، یہ یہود سے متعلق ہے اور یہ نصاریٰ سے، یہ مدینے کے ان بدوؤں سے خطاب ہے...... جن کے دلوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ جب دوسروں کے لیے ہے تو ہمارا تذکرہ کہاں ہے، کن آیات کا تخاطب ہم سے ہے اور وہ کون سی آیات ہیں جو ہمارے لیے ہیں، کیا وہ آیات جہاں یہ ذکر ہے کہ اللہ کو ان مجاہدین پر پیار آتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں، یا وہ آیات ہماری شان میں ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ راہِ حق میں شہید ہونے والے خدا کے حضور خدا کے انعام وفضل پر خوش وخرم ہیں اور وہاں رزق پارہے ہیں، یا ان آیات میں ہمارا ذکر ہے جو راہِ حق میں جان ومال قربان کرنے کے بعد خدا کی رضا کا پروانہ پاکر جنت کے سدا بہار باغوں میں مسندوں پر جلوہ افروز ہیں، آخر خدا کی اس کتاب میں کہاں ہمارا تذکرہ ہے۔ یا ہمارا تذکرہ ان آیتوں میں ہے جہاں ہمارے رب نے ہمیں پکار کر کچھ احکام دیے ہیں، کیا ہمارا رب وہ ہے جو صرف قانون اور احکام دینے والا ایک حکمراں ہے اور اس سے ہمارے تعلق کی بس یہی نوعیت ہے۔

اگر ہمارا خیال یہ ہے کہ جن آیات میں خدا نے تقویٰ کا حق ادا کرنے والوں، اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ جہاد کرنے والوں اور جان ومال سب

کچھ قربان کرنے والوں کی فداکاری کا اعتراف اور تعریف کی ہے، وہ ہمارا ہی تذکرہ ہے اور کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کو ہم بس دوسروں پر منطبق کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا۔ خدا کا ارشاد ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ o (سورۃ الانبیاء:۲۱،۱۰)

''لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایک ایک ایسی کتاب بھیجی ہے، جس میں تمہارا ہی ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو''۔

یعنی اس میں تمہارا ہی حال بیان کیا گیا ہے تمہارے ہی معاملاتِ حیات، تمہاری ہی فطرت، مزاج، ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے، انسانی نفسیات، سیرت و کردار اور اخلاق کے اچھے اور برے پہلو بیان کیے گئے ہیں اور ہر جگہ تمہیں مخاطب کر کے اچھے کردار اپنانے اور برے کردار اور بدانجامی سے بچنے کی تاکید و وصیت کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

دراصل ایمان و اسلام کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک بار آدمی زبان سے کہہ دے کہ میں مومن اور مسلم ہوں اور بس پھر جو چاہے کرے وہ مومن و مسلم ہے، مومن اور مسلم دو نام نہیں ہیں کہ رکھ لیے جائیں بلکہ یہ کرنے کے کام ہیں، ایمان لانا پڑتا ہے، اسلام لانا ہوتا ہے اور بار بار ہر لحہ یہ تقاضا سامنے آتا ہے کہ اسلام لاؤ۔ اسلام لانے والے کو قدم قدم پر فیصلہ کرنا ہوگا کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ کیا کروں کہ میں اسلام لانے والے مسلموں میں شمار کیا جاؤں اور کیا کروں کہ میرا اسلام محفوظ رہے، ہر لحہ یہ فکر، یہ اضطراب، یہ فیصلہ، یہ انتخاب، یہ اقدام، یہ اجتناب اور یہ ترک و اختیار نا گریز ہے۔ اسلام پر باقی رہنے اور غیر اسلام سے بچنے کے لیے اور ہر آنے والی گھڑی میں یا آپ اسلام کے رخ پر بڑھ رہے ہیں، یا کفر و نفاق کے رخ پر، اس لیے کہ زندگی نام ہے مسلسل حرکت کا یا اجتناب کا، ترک و اختیار کا، رد یا قبول کا اور یہی عملی فیصلے طے کرتے ہیں کہ آپ اسلام لا رہے ہیں یا غیر اسلام کی طرف جا رہے ہیں۔

اور سوچیں کہ نفاق کا یہ روگ آپ کے ایمان و اسلام کے خلاف خاموش یلغار تو نہیں کررہا ہے۔ آپ کے فکر وعمل میں کوئی ایسی برائی تو پیدا نہیں ہوگئی ہے اور پھر کوشش میں لگ جائیں کہ آپ کا ایمان نفاق کے روگ سے محفوظ رہے۔ نفاق ایمان کا بدترین دشمن ہے، دبے پاؤں آتا ہے اور نہایت عیاری سے وار کرتا ہے۔ آدمی کو احساس نہیں ہوتا مگر وہ اس ظالم کا شکار ہوچکا ہوتا ہے۔ فکر وعمل کے بہت سے پہلوؤں میں اسی کی نمائندگی کررہا ہوتا ہے۔ لیکن زبان سے نفاق کی برائی کرتے نہیں تھکتا۔ اس چھپے دشمن کے حملوں کے اثرات کا بصیرت کی خوردبین سے جائزہ لینا چاہیے اور اپنے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے اپنی ذات اور اپنے خاندان ومعاشرے پر فکر وتشویش کی نگاہ ڈالنی چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ بہت سی منافقانہ خصلتوں کو لاپرواہی سے برداشت کررہے ہوں، بہت سی برائیوں سے سمجھوتا کررکھا ہو اور بہت سی برائیوں کو تاویلوں اور بہانوں سے ناخوب کی فہرست سے خارج کرکے بتدریج خوب بنالیا ہو، قول وعمل کا تضاد، نفاق کی ایک ابھری ہوئی بیماری ہے۔ برائیوں پر اکسانا، برائیوں کو رواج دینا اور بھلائیوں کی راہ مارنا منافقین کا محبوب مشغلہ ہے، ان کے معاشرے میں ایک دوسرے سے دل پھٹے ہوتے ہیں۔ یہ بغض وکدورت اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت وتحقیر کے جذبات کے روگی ہوتے ہیں۔ بڑھ بڑھ کر دعوے کرتے ہیں مگر وقت آنے پر دین کی راہ میں کوئی حبہ خرچ کرتے ہوئے ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے اور کوئی پھانس برداشت کرنے کی ہمت وحوصلہ نہیں ہوتا، یہ خدا اور رسول کا نام تو لیتے ہیں لیکن تعلقات اور مالی معاملات میں خاص طور پر یہ اپنے نفس اور خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، یہ دین کا نام تو لیتے ہیں لیکن دنیوی امور میں بدترین دنیاداروں سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ بطور مثال یہ چند موٹی موٹی خرابیاں قرآن کی روشنی میں یہاں سامنے لائی گئی ہیں، بے لاگ جائزہ لیجئے اپنا بھی، اپنے خاندان کا بھی اور اپنے مسلمان معاشرے کا بھی، آپ کس مقام پر کھڑے ہیں اور پھر سوچئے کہ منافقین کے اعمال واخلاق پر تبصرہ کرنے والی آیات آپ سے خطاب کررہی ہیں یا نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ قرآن کے ہر ہر حصے کا خود کو مخاطب بنائے بغیر آپ قرآن پڑھیں گے تو نہ قرآن کے ساتھ انصاف

کر سکیں گے اور نہ اپنے ساتھ اور قرآن میں غور وتدبر کا یہ انداز آپ کو قرآن سے دور تو کر سکتا ہے، قریب نہیں کر سکتا اور ہرگز اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ آپ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ آپ قرآن فہمی کی چاشنی ہرگز نہیں پا سکتے۔

قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس سے ہدایت پانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ہر ایک آیت کو اپنے سے متعلق سمجھیں، ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو بنائیں اور یہ تصور کریں کہ اللہ نے یہ آیت میرے لیے ہی نازل کی ہے اور دوسروں پر منطبق کر کے سکون محسوس کرنے کی عادت چھوڑ کر اس کو اپنی ذات پر منطبق کرنے کی عادت ڈالیں، تو آپ دیکھیں گے کہ کہیں مؤمنین کا سراپا بیان کیا جا رہا ہے، اپنا جائزہ لیں اور قرآن کے دیے ہوئے سانچے میں خود کو ڈھالنے کے لیے ذوق وشوق اور ولولے کے ساتھ لگ جائیں۔ کہیں رذائل اخلاق اور اہل جہنم کے کرتوت بیان کیے جا رہے ہوں گے۔ اللہ سے توبہ کریں، اس کی پناہ ڈھونڈیں، باریک بینی سے اپنا بے لاگ جائزہ لیں اور اس قسم کا کوئی بھی داغ دھبہ اپنے دامنِ ایمان واسلام میں پائیں تو اس کو صاف کرنے میں لگ جائیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی عادت ڈالیں۔ دنیا والوں کو تو آدمی حیلوں اور رتاویلوں سے بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ کہیں اہل کفر وشرک کے انجامِ بد اور ان کے عذاب کا لرزہ خیز نقشہ کھینچا جا رہا ہوگا، ایسے موقع پر آپ کا دل لرزنے لگے، آنکھیں اشک بار ہو جائیں، چہرے پر خدا کی ہیبت وجلال کے آثار نمایاں ہوں اور آپ اپنے رب کے حضور گڑگڑائیں کہ پروردگار تو اس انجام بد سے مجھے محفوظ رکھ، کہیں مومنین صادقین کے نیک انجام اور آخرت کی ابدی اور بے مثال نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر ہوگا۔ آپ رک کر خدا سے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگیں کہ پروردگار مجھے بھی ان میں شامل فرما۔ کہیں **یا ایھا الذین آمنوا** کہہ کر پکارا جا رہا ہوگا، آپ یوں ہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ رک کر سوچیں کہ کون پکار رہا ہے، میرا رب، شہنشاہ کائنات، مالکِ کل پکار رہا ہے، مجھے پکار رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے اور مجھے ایمان والا کہہ کر پکار رہا ہے، خوشی سے جھوم اٹھیں اور دل کی زبان سے رب کو جواب دیں پروردگار تو مجھے ایمان والا کہہ کر پکار رہا ہے، تجھے میرے ایمان کا اعتراف ہے، تو اگر مجھے ایمان والا

مان لے تو یہی تو میری معراج ہے، یہی تو میری منتہائے تمنا ہے، مجھے تو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ تو نے مجھے ایمان والا تسلیم کیا ہے تو اب میں دل وجان سے ایمان کا ہر تقاضا پورا کروں گا اور میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہ ہوں گا جو بڑھ چڑھ کر دعوے تو کرتے ہیں لیکن عمل میں بودے ثابت ہوتے ہیں، کہیں منافقین کا کردار، ان کے رذائلِ اخلاق کا بیان ہوگا، آپ سنجیدگی سے اپنے اخلاق ومعاملات اور شب وروز کا جائزہ لیں اور ایک ایک روگ کو دشمن کی طرح پکڑ کر تہ تیغ کرنے کی کوشش کریں۔ منافقین کا لفظ پڑھ کر بے پروائی سے آگے نہ بڑھیں، بلکہ ایک ایک برائی کو رک رک کر پڑھیں۔ قرآن میں بار بار مختلف انداز اور مختلف پیکروں میں، حق وباطل، نیکی اور بدی، کفر واسلام، اخلاص ونفاق، توحید وشرک، اتباع وسرکشی، خود شناسی اور خود فراموشی، احسان مندی اور ناشکری، خدا شناسی اور خدا بیزاری، آخرت پسندی اور آخرت فراموشی، رذائلِ اخلاق اور فضائل اخلاق، حسنِ معاملہ اور بدمعاملگی، حسنِ کردار اور بدکرداری، پاکیزگی اور گندگی، عالی ظرفی اور رذالت اور دیانت وخیانت ان ہی اعمال اور اقدار کا باہمی ٹکراؤ، کشاکش اور آویزش نظر آئے گی اور جب تک آپ کے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں، آنکھوں میں دم ہے، دماغ میں سوچنے سمجھنے کی توانائی ہے اور جسم میں ترک واختیار کی قوت وقدرت ہے، ہر ہر قدم اور ہر ہر موڑ پر آپ کے ایمان واسلام کی آزمائش ہے اور اس ازلی جنگ میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گی۔ آپ برابر امتحان گاہ میں ہیں اور آپ کو شعور ہو یا نہ ہو، آپ اپنا رول ادا کر رہے ہیں اور عالم الغیب والشہادۃ برابر آپ کے بارے میں صادر فرما رہے ہیں اور آپ کی تگ ودو کو نگاہ میں رکھ کر مختارِ کل آپ کے دل کو اپنی چٹکی سے اپنے علم وحکمت کے تحت برابر ادھر پھیر رہا ہے اور قلب کے یہ انقلابات آپ کی زندگی اور آپ کی روح اور دماغ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک

''اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جمادے''۔

تو ہم لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ ہم آپ پر ایمان لائے اور جو دین آپ لے کر آئے اس پر ایمان لائے کیا آپ کو ہمارے بارے میں بھی خوف ہے (کہ ہم پھر جائیں گے) ارشاد فرمایا:

نعلم ان القلوب بين اصبعين من اصابع الرحمن يقلبها كيف يشاء

''جی ہاں! بلاشبہ انسانی قلوب رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے ان کو پھیرتا رہتا ہے''۔

یعنی ہر انسان اور ایمان واسلام کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص اس نازک موڑ پر کھڑا ہے کہ اس کے افکار وجذبات، اعمال وحرکات اور شب وروز کی تگ ودو کے پیش نظر خدا تعالیٰ اس کے بارے میں اپنے فیصلے صادر فرماتا رہتا ہے اور یہ فیصلہ اس کے فکر وعمل کے لحاظ سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نازک ترین مقام پر ہونے کا احساس وشعور رکھنے والا کیا آسانی کے ساتھ مطالعہ قرآن کے دوران یہ کہتے ہوئے بیباکانہ آگے بڑھ سکتا ہے کہ فلاں آیت فلاں گروہ کے بارے میں ہے اور فلاں آیت فلاں گروہ کے بارے میں اور فلاں آیت فلاں گروہ کی شان میں ہے اور فلاں آیت میں فلاں گروہ کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ فلاں آیت میں یہود ونصاریٰ کی بدعنوانیاں بیان کی گئی ہیں اور فلاں آیت میں نصاریٰ کی گمراہیاں،......... یا اسے سب سے زیادہ اپنی فکر دامن گیر ہوگی۔

دراصل قرآن میں جس جس کردار کا بھی ذکر ہے اور کردار کی جس جس خامی اور برائی یا اچھائی اور بھلائی کا تذکرہ ہے یہ کردار بھی اور کردار کی یہ برائی اور اچھائی بھی ہر دور میں پائی گئی ہے اور پائی جاتی رہے گی، کوئی کردار یا کردار کی کوئی برائی کسی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہر کردار ہر دور میں پایا جاتا ہے اور کردار کی ہر برائی ہر دور میں پائی جاتی ہے، اسی طرح کردار کی ہر بھلائی ہر دور میں پائی جاتی ہے اور آدمی تادم واپسیں برابر امتحان گاہ میں ہے۔ اس تصور اور یقین کے ساتھ قرآن کا مطالعہ اور قرآن میں غور وفکر ہی کے ذریعے انسان قرآن سے فیض ہدایت پاسکتا ہے اور ایسے مطالعہ ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آدمی قرآن سے وہ نورِ حق پاسکے گا جس کے لیے قرآن کا نزول ہوا ہے۔

خطبۂ صدارت

محمد نجات اللہ صدیقی

رجوع الی القرآن کی دعوت پرانی ہے، پھر اِس کی بار بار تکرار کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ اتنی کھلی بات کہ جو بھی اللہ رسول پر ایمان لاے اس کو اللہ کی بھیجی کتاب، قرآن سے رشتہ جوڑنا لازم ہے تاکہ وہ جان سکے کہ اُس کے رب نے اسے کیا کرنے کو کہا ہے، اور انسان کے ذہن میں اپنے اور اپنی دنیا کے بارے میں جو سوالات اُبھریں اُن کے کیا جواب خالقِ کائنات نے دیئے ہیں۔ یہ بات بار بار کیوں یاد دلانی پڑتی ہے؟

ہمیں اُن رکاوٹوں کو ہمدردانہ طور پر سمجھنا ہوگا جو عام آدمی کو رجوع الی القرآن کی دعوت قبول کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے سے روک سکتی ہیں۔ پہلی رکاوٹ زبان کی ہے۔ قرآن عربی میں ہے اور دنیا کی آبادی کے صرف پانچ فی صد لوگوں کی مادری زبان عربی ہے۔ خود مسلمانوں میں اسّی فی صد لوگ عربی نہیں جانتے۔ ترغیب دلانے، ہمّت بندھانے اور بڑے جتن کرنے پر کچھ غیر عرب عربی زبان سیکھ بھی لیں تو بھی عام انسانوں، عام مسلمانوں کی نسبت سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ خود ہمارے ملک، ہندوستان میں ایک بڑی تعداد اَن پڑھ ہے، اپنی مادری زبان کو بھی کان سے سن کر سمجھتی ہے، آنکھ سے دیکھ کر نہیں سمجھ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔

تاریخی طور پر اِس مشکل کو دو طرح حل کیا گیا ہے۔ پہلا طریقہ مقامی زبانوں میں قرآن شریف کے ترجمے کا ہے جسے پڑھ کر یا سن کر عام آدمی قرآن کی باتیں جان سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ درس اور وعظ کا ہے جسے علماء سے سن کر عام لوگ قرآن کی باتیں جان سکتے ہیں۔ تقریباً تین سو سال پہلے جب شاہ ولی اللہ دہلوی نے عام فہم فارسی میں قرآن کریم کا ایک نیا ترجمہ فتح الرحمان فی ترجمۃ القرآن کے نام سے پیش کیا تو اُس کے مقدمے

میں لکھا: 'یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہیئے تا کہ سب سے پہلے اُن کے ذہن میں جو چیز آئے وہ اللہ کی کتاب اور اُس کے مطالب ہوں'۔

گزشتہ صدی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں لکھا ہے: 'سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں اور اُس کی صفات اور احکام کو معلوم کریں اور تحقیق کریں کہ حق تعالیٰ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کون سی باتوں سے غصہ ہوتا ہے۔ اور اُس کی خوشی کے کاموں کو کرنا اور اُس کی ناخوشی کے کاموں سے بچنا، اِسی کا نام بندگی ہے۔ اور جو بندگی نہ کرے وہ بندہ نہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو سب چیزوں سے ناواقف محض انجان ہوتا ہے۔ پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے اور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہے۔ لیکن جیسا حق تعالیٰ نے ان باتوں کو قرآن شریف میں خود بتلایا ہے ویسا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اور جو اثر اور برکت اور ہدایت خدا کے کلام میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں ہے۔ اِس لیے عام و خاص جملہ اہلِ اسلام کو لازم ہے کہ اپنے اپنے درجے کے موافق کلام اللہ کے سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں'۔

بعض لوگ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ عام آدمی قرآن کا ترجمہ پڑھے گا یا سُنے گا تو بہت سی باتیں اُس کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ عام مسلمان علماء کے وعظ و نصیحت سنیں اور اُن ہی سے پوچھیں کہ کرنا کیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے، دو وجوں سے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ سمجھنے میں مشکل صرف بعض اُن آیات میں پیش آ سکتی ہے جن کا تعلّق طلاق، وراثت وغیرہ امور یا غیب کی باتوں یا تاریخی حکایات سے ہے۔ ترجمے کے ساتھ وضاحتی نوٹ کے اضافے سے اس مشکل کو دور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری وجہ اس خیال کو رد کرنے کی یہ ہے کہ کوئی بات جب خدا کے حکم کے طور پر سامنے آتی ہے تو اُس کا اثر کسی انسان کے وعظ و نصیحت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

اپنی بات کی وضاحت کے لیئے چند متفرّق آیات کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔

'پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوے ایک خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم

سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔' (سورہءِ علق: آیات ا۔۵)

'زمانہ گواہ ہے، انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔' (سورہ والعصر)

'لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو۔ حقیقت یہ کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اُسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچّے سے غافل ہو جاےءگی، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔' (حج:۱-۲)

'تعریف اللہ کے لیئے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازِل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے عذاب سے خبردار کردے اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے والوں کو خوش خبری دے دے کہ اُن کے لیئے اچّھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔' (کہف:۱۔۳)

'اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکّھا ہو۔ ہر چراغ ایک فانوس میں ہو، ہر فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کا چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ جس کا تیل آپ کی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے۔ اِس طرح روشنی پر روشنی (پڑنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (نور:۳۵)

'تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو اُنھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام

کے ساتھ بات کرو۔اور نرمی اور رحم دلی کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو: 'پروردگاران پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔' (بنی اسرائیل:۲۳۔۲۴)

'اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔' (حجرات:۱۰۔۱۱)

خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی ہے اور ظاہری ٹیپ ٹاپ، اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک بارش ہو گئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہو گئے، پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی، پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اُس کی خوشنودی ہے۔دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔دوڑو، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین جیسی ہے، جو مہیّا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیئے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوں۔یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔'(الحدید:۲۰۔۲۱)

'نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔آسمان کو اسی نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔اس کا تقاضا ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔'(الرحمٰن:۱۔۹)

عام مسلمانوں کو ترجموں کے ذریعے قرآن کی طرف رجوع سے روکنا نادرست

ہی نہیں نا جائز بھی ہے۔ایسا کرنا اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔

خواص کا مسئلہ

یہ باتیں سن کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ رجوع الی القرآن کی دعوت کے اصل مخاطب تو خواص ہیں۔آج صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان دانشوروں اور علماء نے پیش آمدہ مسائل میں اپنا رہنما فقہِ اسلامی کو بنا رکھا ہے۔مسئلہ سیاست کا ہو یا معاشرت کا، یا معاشی نظام اور زر اور مالیات کے مسائل ہوں، قرآن میں مشکلات کے حل تلاش کرنے کی جگہ فقہی سرمایہ پر انحصار ہے۔دورِ جدید میں اِس کی سب سے بڑی مثال اسلامک فنانس کی ہے۔مسلمانوں کو صریح سود سے بچانے کے لیئے، مگر ساتھ ہی اُن کو کاروبار میں آگے بڑھانے کے لیئے بازار میں مروّجہ سارے ہی طریقوں کے اسلامی بدل جزئیاتِ فقہ پر قیاس اور تلفیق کے ذریعہ نکال لیئے گئے ہیں۔چالیس برس کی کوششوں کے نتیجے میں اسلامِک فنانس سارے مسلمان ملکوں میں، بلکہ ان علاقوں میں بھی رواج پا چکا ہے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔مگر ابھی تک اسلامِک فنانس مال کو اُن مقاصد کا خادم بنانے مین کوئی پیش رفت نہیں کرسکا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے۔مسلمان آبادیوں کا ایک معتد بہ حصّہ بھوک، مرض اور سر چھپانے کی جگہ سے محرومی کا شکار ہے مگر اِسلامی مالیاتی ادارے ان کے لئے کسی کام کے نہیں۔قرضوں کا بار اور قرض پر مبنی تمسّکات کا حجم جس طرح دنیا کے دوسرے مما لک میں بڑھ رہا ہے، اسی طرح مسلمان ملکوں میں بھی بڑھ رہا ہے۔مسلمان ملکوں میں زر کی سپلائی اور کنٹرول کا نظام بھی دوسرے ملکوں کی طرح قرضے دینے اور لیئے پر مبنی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بھاری تعداد کی چھٹی حس مرابحہ اور تورّق پر مبنی مروّجہ اسلامِک فنانس کو پوری طرح اسلامی ماننے سے گریز کرتی ہے۔اسلامک فنانس کو مقاصدِ شریعت کا خادم بنانے کے لیئے قرآن وسنّت کی طرف رجوع ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا ہوتا کیوں نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارے علماء اور دانشور نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے بھی رجوع اِلی القرآن سے جھجھکتے ہیں؟ بالکل نئے امور

جن کے بارے میں قرآن وسنّت میں کوئی نصِّ صریح ملنا کُجا کوئی ایسا حکم مِلنا بھی دشوار ہے جس پر قیاس کیا جا سکے، ایسے امور میں بھی غالب رجحان یہی ہے کہ کسی ادنیٰ مناسبت رکھنے والے فقہی جزئیے کے سہارے آگے بڑھنا براہِ راست رجوع الی القرآن سے بہتر ہے۔ زر اور کریڈٹ کی سپلائی کا مسئلہ ہو یا کاروبار میں درپیش خطر سے عہدہ برآ ہونے کا۔ شہروں میں پانی اور بجلی کی سپلائی نیز دیگر رہائشی، تجارتی، اور تفریحی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ نقل وحمل اور مواصلات کی پلاننگ؛ قدرتی وسائل سے استفادہ میں آنے والی نسلوں کے مفاد کا لحاظ اور عالمی درجۂ حرارت میں اضافہ سے پیدا ہونے والے مسائل نئے مسائل ہیں جن سے ساتویں صدی کا انسان ناواقف تھا۔ کرّۂ ارضی پر آج سات ہزار ملین انسان آباد ہیں جب کہ ساتویں صدی میں یہ تعداد چند سو ملین تک محدود تھی۔ پیداواری طریقے ایسے تھے کہ ماحولیاتی تلوّث کا مسئلہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ بظاہر مذکورہ بالا امور کا تعلّق 'امورِ دنیا' سے معلوم ہوتا ہے جن کے بارے میں صحیح حدیث میں آیا ہے کہ 'انتم اعلم بامورِ دنیاکم' لیکن سب کو معلوم ہے کہ مذکورہ بالا امور سے وہ مصالح بھی وابستہ ہیں جو ظلم وفساد کے ازالہ اور عدل وقسط کے قیام سے جڑے ہوے ہیں، جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ پھر اِن امور کی بابت غور و بحث کے دوران ہم قرآن کی طرف رجوع سے کیوں کتراتے ہیں؟

جواب آسان نہیں۔ تفصیلی جواب جس گہرے اور ہشت پہلو تجزیئے کا طالب ہے اُس کا یہ موقع نہیں۔ لیکن بحث کا آغاز کرنے کے لئے ہمیں اُن رکاوٹوں کو سمجھنا ہوگا جو، عربی زبان نہ جاننے کے علاوہ، رجوع اِلی القرآن میں سامنے آتی ہیں۔ قرآن ساتویں صدی میں ملکِ عرب کے ایک علاقے میں ایک مرد پر نازل ہوا تھا، جب کہ رجوع اِلی القرآن کی دعوت ہم اکیسویں صدی میں ساری دنیا کے مردوں اور عورتوں کو دے رہے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ٹکنالوجی بدلی، جگہ کے ساتھ آب وہوا بدلی، نقل وحمل آسان ہوا، اِتّصالات کی دنیا میں انقلاب آیا، معلومات بڑھیں، دنیا کے ہر حصّے میں، بالخصوص بڑے شہروں میں ملی جلی آبادیاں بسنے لگیں۔ اِن تبدیلیوں کے نتیجے میں لوگوں کے مزاج، نفسیات اور زندگی سے اُن

کی توقّعات میں بھی تبدیلی آئی۔ نئے مسائل کے حل کے لیئے قرآن کی طرف رجوع کے لیئے ان تمام باتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔قرآن کی شرح کے طور پر احادیث کے ذخیرے کو کھنگالنا ہوگا۔تاریخ کا مطالعہ یہ جاننے کے لیئے کرنا ہوگا کہ ہم سے پہلے لوگوں نے بدلتے حالات میں احکامِ خداوندی کی تعمیل کس طرح کی۔ اگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب رہے تو ان کی کامیابی کا راز کیا تھا، اگر ناکام رہے تو ناکامی کے اسباب کیا تھے۔مثال کے طور پر تجارتی لین دین میں عدل وقسط پر قائم رہنے اور رکھنے کے مسئلہ کو لیا جاسکتا ہے۔اور یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ زندگی کے اِس دائرے میں مقاصدِ شریعت کے حاصل کرنے کی تفصیلی تدابیر، حرمت، رباوقمار کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ کس حدتک کارگر رہیں۔اور مال کو قرآن کریم کے الفاظ میں قیامِ حیات کا ذریعہ کامیابی کے ساتھ بنایا جاسکا یا نہیں۔

جب آپ رجوع الی القرآن کے ان پہلوؤں پر سوچیں گے تو تحقیق کے دو ایسے طریقوں کی اہمیّت ابھر کر سامنے آےگی جن کی طرف آپ کم توجّہ کرتے ہیں۔میدانی تحقیق اور تاریخی تحقیق۔زبان ولغت اور سیاق وبلاغت کی اہمیّت مسلّم، مگر انسانی فرد وسماج کا حال آج کیا ہے، کل کیا تھا اور آنے والے کل کے اِمکانات کیا ہوسکتے ہیں، ان پہلوؤں کی اہمیت پہچاننا اور اُن کے تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہے۔آپ کے ادارے نے گزشتہ برسوں میں قرآنِ مجید کو مرکزِ توجّہ بنا کر بڑی خدمت انجام دی ہے۔سالانہ کانفرنسوں میں مروّجہ اہم عنوانات: اسلام کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام وغیرہ کو موضوعِ بحث بنایا جاچکا ہے۔اب عمومیات سے آگے بڑھنے کا وقت آگیا ہے۔آپ کو چاہیئے کہ رجوع الی القرآن کے جدید تقاضے پورا کرنے میں مسلمان علماء اور دانشوروں کی مدد کریں۔محدود اور متعیّن موضوعات چنے جائیں اور قرآنی اِفادات کی روشنی میں، مسلمانوں کی تاریخ اور اُن کی موجودہ حالت کے مطالعہ کی بنیاد پر بتایا جائے کہ کرنا کیا ہے۔عرصہ ہوا نئے علوم، اِختراع اور اِنکشافات ہماری جانب سے دنیا کو ملنا بند ہوگئے اور اب تو ہم دوسروں سے سیکھنے میں بھی پچھڑے شمار ہوتے ہیں۔جب ہم آگے تھے تو قرآن کی وجہ سے آگے آئے تھے، آج بھی ایسی ہی توقّع رکھنی چاہیئے، بشرطیکہ ہم نئے تقاضوں کو پہچانیں۔کتابوں پر انحصار نہ کرکے

مشاہدۂ احوال کا چلن عام کیجئے۔ معلوم اور صراحت شدہ احکام کے پہلو بہ پہلو تجرباتی طریقوں کی گنجائش نکالیئے۔ نئی بات کہنے والوں کی ہمت افزائی کیجئے اگرچہ وہ غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ نئے سماجی اور معاشی مسائل کے حل کو صرف مسلمانوں تک محدود نہ رکھئے بلکہ مشترکہ انسانی مسائل کے حل میں دل وجان سے دوسروں کو بھی شریک کار گردانئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری ہمتیں بلند کرے، ہمیں اپنی راہ پر قائم رکھے اور ہماری لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

قرآن کریم کا تعارف قرآن کی روشنی میں

ظفر الاسلام اصلاحی

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے جس سے نبی آخر الزماں ﷺ کے توسط سے انسان کو مشرف کیا گیا۔ اس کتاب عزیز کے تعارف کا سلسلہ اس کے زمانۂ نزول سے جاری ہے۔ اس کے لیے مختلف انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک معروف ومفید طریقہ یہ ہے کہ خود اس کتاب کی روشنی میں اس کا تعارف پیش کیا جائے یعنی خود قرآن اپنے اوصاف کیا بیان کرتا ہے اس کی تشریح وتوضیح کی جائے۔ اس کتاب مبین نے اپنے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان میں سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے، سارے انسانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں ہدایت کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ یہ کتاب عزیز اسی مقصد سے نازل کی گئی کہ انسان اس کی روشنی میں سیدھا راستہ دیکھ لے اور اس پر چل کر کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ۔ (البقرہ/۱۸۵)

(رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے، اس میں ہدایت کی نشانیاں ہیں اور یہ حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی [کتاب] ہے۔)

ایک دوسری آیت میں قرآن کا یہ وصف مزید واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب وہ راستہ دکھانے والی ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں صراط مستقیم کہا جاتا ہے اور اس پر چلنا کامیابی کی ضمانت دیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔ (بنی اسرائیل/۹)

(بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے)

ایک دوسری آیت میں قرآن کے اس وصف کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

قَدْ جَآءَ كُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ. يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنِ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔(المائدہ/۱۵-۱۶)

(تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ کتاب وہ روشنی عطا کرتی ہے جو گمرہی کا پردہ چاک کر دیتی اور ہدایت کی راہ نمایاں کر کے دکھاتی ہے۔ایک دوسری آیت میں آپ ﷺ کو مخاطب کر کے اس کتاب کے نزول کا یہ مقصد بیان کیا گیا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک پہنچایا جائے۔

الٓرا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔(ابراہیم/۱)

(ا.ل.را۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ ان کے رب کی توفیق سے خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف۔)

اس سے یہ واضح ہوا کہ قرآن کریم کسی خاص قوم یا کسی مخصوص علاقہ کے لوگوں کے لیے رہنما نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے یہ وسیلۂ ہدایت ہے۔ایک جگہ قرآن کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے:

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ۔(الجاثیہ/۲۰)

(یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے)

دوسرے قرآن کی ہدایت کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہ زندگی کے کسی خاص شعبہ تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کے لیے جملہ شعبہ ہائے حیات میں بہترین رہنما ہے۔اوپر یہ ذکر کیا گیا کہ قرآن راہ مستقیم دکھاتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ راہ مستقیم کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ایک جانب یہ کتاب عقائد کی اصلاح کرتی ہے اور عبادات کی بجا آوری کا صحیح طریقہ سکھاتی ہے تو دوسری جانب یہ حسن اخلاق کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتی ہے، سماجی تعلقات کی بہتری وخوش گواری کے اصول وضوابط وضع کرتی ہے اور لین دین کے معاملات میں اصولی ہدایات دیتی ہے۔خلاصہ یہ کہ ہدایت دینا، رہنمائی فراہم کرنا اور اللہ رب العزت کا مقررہ و پسندیدہ طرز زندگی واضح کرنا قرآن کریم کا بنیادی وصف ہے۔انسان کی سعادت وفلاح اسی میں ہے کہ وہ اس سے رہنمائی حاصل کرے اور صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ارشاد ربانی ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً ۔(الدھر/۳)

(ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے خواہ وہ شکر گزار بندہ بنے یا کفر کرنے والا)

اسی سیدھی راہ کو دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور اپنے ہدایت نامے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اس کی آخری و مکمل شکل قرآن مجید ہے۔بلاشبہ وصفِ ہدایت اس کتاب میں پوری طرح جلوہ گر ہے اب یہ انسان کی طلب وپہنچ پر ہے کہ وہ اس سے کس قدر فائدہ اٹھاتا ہے۔

قرآن کریم نے اپنا دوسرا اہم وصف یہ بیان کیا ہے کہ یہ فرقان ہے یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ہے۔اس کتاب کی ہدایات کی روشنی میں یہ اچھی طرح جانچا و پرکھا جاسکتا ہے کہ صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے، کون حق کے راستہ پر ہے اور کون باطل کی راہ اپنائے ہوئے ہے، گویا کہ یہ کتاب حق و باطل کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے۔قرآن کا یہ وصف سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت (نمبر ۱۸۵) میں بیان کیا گیا ہے۔اس کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ''الفرقان'' کے نام سے ایک مستقل سورہ ہے اس میں اس وصف کو

اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے اس کی پہلی آیت ملاحظہ ہو:

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ (الفرقان/۱)

(بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا والوں کو خبر دار کر دینے والا ہو۔)

قرآن کا یہ وصف (الفرقان) درحقیقت اس کے بنیادی وصف (ھدی للناس) کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ ہدایت میں یہ بات شامل ہے کہ صحیح و غلط کی نشان دہی کی جائے، حق و باطل میں تفریق قائم کی جائے اور لوگوں کے سامنے یہ واضح کیا جائے کہ کون لوگ حق کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں اور کون باطل پر چل رہے ہیں، مذکورہ بالا آیت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اسی لیے نازل فرمایا تا کہ حق و باطل میں فرق واضح ہو جائے۔ قرآن میں جگہ جگہ گذشتہ قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، ان کے عقائد کی نشان دہی کی گئی ہے، ان کے طرز عمل کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر یہ حقیقت بے نقاب کی گئی ہے کہ ان میں کون لوگ اللہ کے رسول کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے والے ہیں یعنی راہ حق اپنائے ہوئے ہیں اور کون اس کو چھوڑ کر باطل کی راہ اپنائے ہوئے ہیں۔ قرآن اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ انجام کے اعتبار سے بھی دونوں میں خطِ تفریق کھینچتا ہے اور ان کے انجام سے انھیں باخبر کرتا ہے۔ قرآن کا یہ اندازِ بیان یعنی حق و باطل میں امتیاز قائم کرنے کا رویہ پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے اور پھر اس طرح کی ہر وضاحت کے بعد یہ اعلان بھی ملتا ہے کہ اس میں عبرت ہے، سبق ہے عقل والوں کے لیے یا صحیح نہج پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے۔ سورہ یوسف کے آخر میں گذشتہ انبیاء کے زمانہ کے دونوں قسم کے لوگوں کی روش وانجام کے ذکر کے بعد یہ ارشاد ہوا:

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (یوسف/۱۱۱)

(اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے)

انسان فطری طور پر حق کا طالب ہوتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے غلط و صحیح میں

فرق معلوم ہو جائے یا حق واضح ہو کر اس کے سامنے آ جائے۔ بلاشبہ اللہ کی کتاب سے بڑھ کر اس بات کو واضح کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی ہر دور میں رجوع الی القرآن مطلوب ہے۔

قرآن کریم کے تعارف کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ نصیحت سے بھری کتاب ہے، اس نصیحت کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے اور وہ یہ کہ یہ نصیحت اللہ رب العزت کی جانب سے اس کے بندوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے بارے میں فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس/۵۷)

(اے لوگو تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ دلوں کے امراض کے لیے شفا ہے اور مومنین کے لیے رہنمائی و رحمت ہے)

نصیحت کا مطلب ہوتا ہے خیر خواہی و بھلائی کی بات۔ اس کا سننا، اس پر توجہ دینا، اسے یاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا ہر چیز منفعت بخش ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو مختلف ذرائع سے نصیحت ملتی ہے لیکن اس سے بڑھ کر قیمتی اور مفید نصیحت اور کون ہو سکتی ہے جو انسان کو خود پروردگارِ عالم کی جانب سے نصیب ہو جو نہ صرف ان کا خالق ہے بلکہ ان کی ضروریات زندگی اور ان کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہے۔ ان سے بے انتہا محبت کرنے والا اور ان کے ساتھ بے حد رحم کا معاملہ فرمانے والا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اللہ رب العالمین کی جانب سے قرآن کی صورت میں انسان کو جو نصیحت نامہ ملا ہے وہ اتنا جامع ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے وہ اس قدر واضح و مدلل ہے کہ اس میں ذرا بھی پیچ و خم نہیں، وہ اس قدر دل نشیں ہے کہ ذہنوں کو اپیل کرتا ہے اور دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ قرآن میں دی گئی نصیحت کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں سے پڑھیے، جس صفحہ کی آیات پر غور کیجیے کچھ نہ کچھ نصیحت یا تذکیر کی بات ضرور ملتی ہے، کہیں عبادتِ الٰہی، مقررہ فرائض کی بجا آوری، اللہ کا پسندیدہ طرز زندگی

اختیار کرنے کی ہدایات ملتی ہے،تو کہیں والدین، اقرباء، پڑوسی، غرباء و مساکین کے ساتھ حسن سلوک اور انسانی حقوق ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے، کسی مقام پر انفاق فی سبیل اللہ اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کی تاکید ہے تو کسی جگہ مالی معاملات میں دیانت داری سے کام لینے اور اپنے وغیر، دوست و دشمن، امیر و غریب کی تفریق کے بغیر سب کے ساتھ انصاف برتنے پر زور دیا گیا ہے۔ گویا قرآن کی نصیحت انسان کے ہر طبقہ اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس نصیحت پر عمل کرنے والوں کو دونوں جہاں میں فوز و فلاح کی ضمانت ملتی ہے۔ درحقیقت انسان کے لیے سب سے بڑی بھلائی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جائے، خالق و مالک اور رب العالمین سے اس کا رشتہ جڑ جائے اور مضبوط ہو جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر اللہ کی بندگی میں لگ جائے۔ اسی میں اس کی عافیت و نجات ہے اور اخروی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کا سکون اسی پر منحصر ہے۔ قرآن کریم کے پیغام کا ماحصل یہی ہے اور سچ یہ کہ اس کتاب کی نصیحت کا سب سے قیمتی جز یہی ہے۔

قرآن کے نصیحت ہونے کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ وہ اپنی نصیحت اور بھلائی کی باتوں کو بار بار انسان کے سامنے پیش کرتا ہے اور ان کی طرف انسانی ذہن کو مسلسل متوجہ کرتا رہتا ہے، وہ بار بار انسان کو اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق یاد دلاتا ہے اور ان پر عمل کے فیوض و برکات بھی واضح کرتا ہے۔ قرآن کا ناصحانہ انداز اس سے مزید واضح ہوتا ہے کہ اپنی ہدایات دینے اور ان پر عمل کی تلقین کرنے کے بعد مختلف مقامات پر آخر میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسی میں انسان کے لیے بھلائی و خیر ہے۔ کسی کی جانب سے زیادتی کی صورت میں انتقام سے گریز اور صبر کی تلقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِينَ۔(النحل/۱۲۶)

(اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے)

ناپ تول ٹھیک کرنے یعنی دیانت داری سے کام لینے کی ہدایت کے ضمن میں یہ واضح کیا گیا کہ خبردار انجام کی بہتری اسی میں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً۔(بنی اسرائیل/۳۵)

(اور پیمانہ سے دو تو پورا بھر کر دو اور تو لو تو ٹھیک ترازو سے تولو یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے)

نماز جمعہ کے وقت خرید و فروخت کی ممانعت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔(الجمعہ/۹)

(اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم لوگ اس کو جان لو)

اسی طرح فساد و بدامنی پھیلانے سے دور رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے ارشاد ہوا کہ اسی میں بھلائی ہے:

وَلاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔(الاعراف/۸۵)

(اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اسی میں تمھارے لیے بھلائی ہے اگر واقعی تم مومن ہو)

کسی بات میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں معاملہ اللہ و رسول کے حوالہ کر دینا یا قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنا یہ بھی قرآن کی ایک اہم نصیحت ہے اس سلسلہ میں بھی یہ واضح کیا گیا کہ خیر اسی میں ہے۔فرمانِ خداوندی ہے:

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً۔(النساء/۵۹)

(پس اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت اچھا ہے)

یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن کو ذکر للعٰلمین اور ذکری للعٰلمین بھی کہا گیا ہے۔ایک جگہ اس کتاب کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے۔والقرآن ذی الذکر

(ص/۱)۔ ذکر و ذکریٰ کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو موعظت یا نصیحت کا ہے۔ اس کے مفہوم میں نصیحت کرنا یا اچھی بات بتانا، یاد دلانا یا یاد دہانی کراتے رہنا سب کچھ شامل ہے۔ قرآن کی بہت ساری آیات میں اس کتاب کے لیے ''ذکر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے ان میں وہ مشہور آیت بھی شامل ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے (الحجر/۹)۔ اسی طرح اس آیت میں بھی القرآن کے بجائے الذکر استعمال ہوا ہے جس میں اس کتاب کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری نبی کریم ﷺ کے سپرد کی گئی ہے (النحل/۴۴)۔ یہاں ان آیات کے حوالہ سے خاص طور سے اس جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ قرآن سراپا یاد دہانی ہے ہدایاتِ ربانی کی اور احکام الٰہی کی۔ اس لحاظ سے قرآن کتابِ ذکر بھی ہے۔ یہ کتاب انسان کو بار بار یاد دلاتی ہے کہ اللہ کے بندہ ہونے کا تقاضا کیا ہے۔ اس کے فرائض کیا ہیں، اس پر دوسروں کے کون کون سے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو باخبر کرتی رہتی ہے کہ عقیدہ کیسے درست کیا جائے، عبادت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے، اخلاقی زندگی کی تعمیر کیسے ہو، لوگوں کے ساتھ تعلقات و معاملات میں کیا طرز عمل اپنایا جائے۔ قرآن کی یہ نصیحت و یاد دہانی بالکل عام ہے وہ سب کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی طرف پلٹ کر آنے کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ کبھی وہ اپنا تعارف اس انداز میں کراتا ہے کہ یہ تو بس تمام دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے۔ کبھی اس طور پر متوجہ کرتا ہے کہ اس میں سب کے لیے عبرت و نصیحت ہے پس جو چاہے اس سے فائدہ اٹھا کر راہ حق کو پالے یا اسے اللہ سے قربت کا ذریعہ بنالے۔ کہیں وہ انسان سے یہ سوال کرتا ہے کہ اس کتاب میں تمھارے لیے نصیحت و خیر خواہی کی باتیں ہیں آخر تم اس سے منہ موڑ کر کہاں جا رہے ہو، کسی مقام پر وہ اس سے حیرت سے پوچھتا ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے بڑی بابرکت ہے یہ تمھیں اچھی اچھی باتیں یاد دلاتی ہے کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔ قرآن کی ان آیات سے یہی حقائق سامنے آتے ہیں:

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ۔ (ص/۸۷)

(یہ تو بس تمام دنیا کے لیے یاد دہانی ہے)

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔(القلم/۵۲)

(یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے)

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ. لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ۔(التکویر/۲۶-۲۷)

(یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو)

إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَى رَبِّهِ سَبِيْلاً۔(المزمل/۱۹)

(بے شک یہ ایک نصیحت ہے اب جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے)

فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ. إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔(التکویر/۲۶-۲۷)

(پس تم کہاں بھاگے جارہے ہو، یہ (قرآن) تو ساری دنیا کے لوگوں کے لیے نصیحت و یاددہانی ہے)

وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ۔(الانبیاء/۵۰)

(اور یہ بابرکت ذکر ہم نے اسے [تمھارے لیے] نازل کیا ہے پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو)

ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی نصیحت و یاددہانی بالکل عام ہے۔ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اس کے مخاطب معاشرہ کے مختلف طبقہ کے لوگ ہیں خواہ وہ مومن ہوں یا غیر مومن، قرآن کو ماننے والے ہوں یا اس کے منکر، عوام ہوں یا خواص، اس کی نصیحت میں سب کے لیے بھلائی ہے، اس کی یاددہانی میں ہر ایک کے لیے خیر کا پہلو ہے۔ اس لیے سب کو اس کی طرف بلایا جارہا ہے اور ہر ایک سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس سے فیض حاصل کرے۔ اس نعمت کی ناقدری پر باز پرس بھی ہوگی۔ رسول اکرم ﷺ کے توسط سے سب کو یہ پیغام دیا جارہا ہے:

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ۔(الزخرف/۴۴)

(اور یہ تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے یاددہانی ہے اور عنقریب تم سب

سے پرسش ہوگی)

قرآن کریم ایک اور اعتبار سے کتاب ذکر ہے گرچہ اس پہلو پر کم توجہ دی جاتی ہے لیکن یہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور وہ یہ کہ اس میں ہر ایک شخص کا ذکر موجود ہے۔ اس میں ہر ایک کے حالات کا بیان ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (الانبیاء/۱۰)

(لوگو ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمھارا ہی ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو)

اس آیت میں لوگوں کو مخاطب کر کے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر شخص اپنا تذکرہ پڑھ سکتا ہے اس کے ذریعہ اپنے احوال واوصاف معلوم کر سکتا ہے۔ اپنے محاسن ومعایب کا پتہ لگا سکتا ہے، اس کے آئینہ میں وہ اپنے عمل وکردار کی تصویر کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ عقاید وعبادات سے متعلق وہ قرآنی ہدایات کو کہاں تک پوری کر رہا ہے اسے جان سکتا ہے، اخلاق کے اعتبار سے وہ کس مقام پر ہے وہ اسے قرآن سے دریافت کر سکتا ہے، معاملات میں صفائی ودیانت داری کے لحاظ سے وہ کس پوزیشن میں ہے اس کا بخوبی پتہ لگا سکتا ہے، حقوق انسانی کی ادائیگی میں اس کی کیا تصویر بنتی ہے اسے وہ دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اس کا اپنا کیا مقام ہے، اللہ کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہے اسے بھی وہ اس کتاب کے ذریعہ سمجھ سکتا ہے، غرض یہ کہ قرآن کریم ایک زندہ کتاب ہے اور ایسا صاف و شفاف آئینہ ہے کہ اس میں افراد بھی اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی تصویر ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ قرآن میں صحیح عقائد کی وضاحت کی گئی ہے، عبادات کی بجا آوری کا صحیح طریقہ بیان کیا گیا ہے، اللہ واس کے بندوں سے تعلق قائم رکھنے کے اصول و ضوابط واضح کیے گئے ہیں، حسن اخلاق کے اعلیٰ نمونے پیش کیے گئے ہیں، مالی معاملات میں صفائی ودیانت داری کی ہدایات دی گئی ہیں، سیاست وحکومت کے رہنما اصول وضع کیے گئے ہیں، اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ وناپسندیدہ اعمال کی نشان دہی کی گئی ہے، صاحب ایمان، فرماں بردار، صالح، متقی وباکردار لوگوں کو ملنے والے اجر وثواب اور انعام واکرام کی خوشخبری

دی گئی ہے۔ نافرمان، سرکش و بدکردار قوموں کے انجامِ بد سے خبردار کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہمارا تذکرہ کہاں کہاں ہے اور کس انداز میں ملتا ہے اسے مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ میں اہل اسلام کے ۱۸ وصاف بیان کیے گئے ہیں اور وہ ہیں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری، سچائی، صبر کرنا، فروتنی وانکساری اختیار کرنا، صدقہ و خیرات کرنا، روزہ رکھنا، شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، اللہ کا کثرت سے ذکر کرنا۔ اس آیت کو سمجھ کر پڑھنے پر ہر شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس پوری آیت میں اس کا ذکر ہے یا کچھ میں ہے یا صرف ایک دو میں ہے۔ اسی طرح سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۶ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، والدین، رشتہ داروں، یتامیٰ، مساکین، قرابت دار یا اجنبی پڑوسی، ہم نشیں و عام مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ بے شک اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ جب اس آیت کا مفہوم کسی کے سامنے آئے گا تو اسے اپنی عملی زندگی کی روشنی میں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کے کس حصہ میں اس کا ذکر ہے یعنی وہ اس کے مطالبات کو کہاں تک پورا کر رہا ہے۔

اسی طرح سورہ حجرات آیات نمبر ۱۱-۱۲ میں اللہ کی یہ ہدایات ملتی ہیں: کسی کا مذاق نہ اڑاؤ، کسی پر عیب نہ لگاؤ، کسی کو برے لقب سے نہ یاد کرو، بہت زیادہ قیاس آرائیوں سے پرہیز کرو، کسی کی ٹوہ میں نہ لگے رہو اور کسی کی غیبت نہ کرو۔ جب یہ ہدایات کسی کی نظر سے گذریں گی تو اسے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے جن اخلاقی خرابیوں و برائیوں سے منع فرمایا ہے ان میں سے کن سے وہ پاک ہے اور کن سے وہ بچ نہیں سکا ہے۔ اسی طریقہ سے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مال و زر کے حصول، ان کے استعمال و خرچ اور لین دین کے معاملات سے متعلق یہ احکام ملتے ہیں: ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ (بقرہ/۱۸۸)، حلال و پاک چیزیں کھاؤ (بقرہ/۱۶۸)، مال و دولت کے حصول میں ناجائز ذرائع سے اجتناب کرو (البقرہ/۲۷۵، المائدہ/۹۰)، مال و دولت ملنے پر نہ اتراؤ (الحدید/۲۳)، اپنے مال و دولت میں سے اقرباء، یتامیٰ، مساکین، مسافر و محرومین کے حقوق ادا کرو (بنی اسرائیل/۲۶، الذاریات/۱۹)، سائل کو نہ جھڑکو یعنی

اس کی عزت نفس کا خیال رکھو (الضحیٰ/۱۰)، تنگ دست مقروض کو قرض کی ادائیگی کے لیے مہلت دو (البقرہ/۲۸۰)، نیک کام کے لیے مال خرچ کرنے میں مسابقت کرو، اس میں تاخیر سے کام نہ لو (البقرہ/۱۹۵، المنافقون/۱۰، التغابن/۱۶)، صدقہ و خیرات کر کے احسان نہ جتاؤ اور نہ ستاؤ (البقرہ/۲۶۳-۲۶۴)، مال خرچ کرنے میں ریا ونمود سے پرہیز کرو (البقرہ/۲۶۴، النساء/۳۸)، بخل وفضول خرچی سے اپنے کو دور رکھو (الاعراف/۳۱، بنی اسرائیل/۲۶-۲۷، ۲۹)، امانتیں اہل امانت کے حوالہ کر دو (النساء/۵۸، الانفال/۲۷)، ٹھیک ٹھیک اور انصاف کے ساتھ ناپو تولو (الانعام/۱۵۲، بنی اسرائیل/۳۵، الرحمٰن/۹)، لین دین یا مالی معاملات میں جو وعدہ یا قول و قرار کرو اسے پورا کرو (المائدہ/۱، بنی اسرائیل/۳۴)۔ جب بھی یہ احکامِ الٰہی کسی کے سامنے آئیں گے تو اسے اپنے بارے میں بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ مالی معاملات میں اس کا ریکارڈ کتنا صاف ہے اور یہ کہ ان میں سے کس کس حکم پر عمل کا حق وہ ادا کر رہا ہے۔

قرآن نے مختلف مقامات پر مومنین صادقین یا عاملین بالقرآن کے کردار و اخلاق کی تصویر کشی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ ایمان ویقین پر جمے رہتے ہیں، اللہ کی عبادت میں مخلص و سنجیدہ ہوتے ہیں اور انسانی حقوق کی پاسبانی اور بھلائی کے کاموں میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ سورہ الفرقان کے آخر میں اللہ کے ان محبوب بندوں کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ متعلقہ آیات کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل یا بدتہذیب ان کے منہ کو آئیں تو کہہ دیتے ہیں تم کو سلام اور جو اپنے رب کے حضور سجدے و قیام یعنی اس کی عبادت میں راتیں گذارتے ہیں اور جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب سے ہم کو بچا لے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے۔ وہ بڑا ہی برا ٹھکانا اور مقام ہے، اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے اور جو اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں پکارتے۔

اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا......اور (رحمان کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور جب کسی لغو چیز پر ان کا گذر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گذر جاتے ہیں، جنھیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو اس پر وہ اندھے بہرے بن کر نہیں رہ جاتے (بلکہ ان کا اثر قبول کرتے ہیں) اور وہ دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ 'اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام (یعنی نیکیوں کا پیشوا) بنا'' (الفرقان/۶۳-۶۸، ۷۲-۷۴)۔

جب بھی کوئی شخص ان آیات کو سمجھ کر پڑھے گا تو اسے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان آیات میں کہاں کہاں اس کا ذکر ہے یعنی ان میں بیان کیے گئے کن کن اوصاف پر وہ پورا اتر رہا ہے اور کن آیات میں اس کا ذکر نہیں ملتا یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے کن اوصاف سے اس کی ذات عاری ہے قرآن میں اپنا ذکر تلاش کرنا یا اس طرح کا جائزہ لینا ہر شخص کو اپنے بارے میں احتساب کا موقع فراہم کرے گا جو لازمی طور پر اس کے کردار و اخلاق کو سنوارنے میں مدد دے گا۔ سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیت (نمبر۱۰) کے حوالہ سے قرآن کریم کی کتاب ذکر ہونے کی حیثیت سے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بجا فرمایا ہے:

''ہمارے اسلاف اپنے اخلاق و اوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے، ہر چیز ان کے سامنے روشن و عیاں ہوتی تھی، وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ایسی عجیب و غریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق و اطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں پا جاتے تھے اور پہچان لیتے تھے۔ اگر ذکرِ خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے

تھے"۔ (سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، قرآنی افادات [جمع و ترتیب: ر- حقانی ندوی] محمد الحسنی ٹرسٹ، رائے بریلی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۶۲)

قرآن کریم سے خود تذکیر حاصل کرنا اور دوسروں کو اس کی نصیحت، ہدایات و تعلیمات یاد دلانا ہر حال میں نفع بخش ہے جیسا کہ خود قرآن میں اس کی تاکید ملتی ہے:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ۔ (الذاریات/۵۵)

(اور یاددہانی کرتے رہو بے شک یاددہانی کرنا مومنین کو نفع بخشتا ہے)

قرآن کریم کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ سراپا کتابِ رحمت ہے۔ متعدد قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نزول قرآن کے ضمن میں اس کی صفات رحمٰن و رحیم استعمال کی گئی ہیں، اس سے یہ ذہن نشیں کرانا مقصود ہے کہ اس کتاب کا نازل کیا جانا اللہ رب العزت کی ان دونوں صفات کا مظہر ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ ہوں:

تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ۔ (حم السجدہ/۱-۲)

(یہ خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ [کتاب] ہے)

يٰسٓ. وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ. إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ. عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ۔ (یٰس/۱-۴)

(یٰس۔ شاہد ہے یہ پُر حکمت کتاب کہ تم رسولوں میں سے ہو، ایک نہایت سیدھی راہ پر جس کو نہایت اہتمام سے نازل فرمایا ہے خدائے عزیز و رحیم نے)

تَنزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاوَاتِ الْعُلَى. الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ۔ (طٰہٰ/۴-۵)

(نازل کردہ اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین اور بلند آسمانوں کو جو رحمٰن ہے [کائنات کے] تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہے)

سورہ رحمٰن اللہ رب العزت کے انعامات و احسانات کی دل نشیں تشریح و ترجمانی کے لیے مشہور ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نعمتیں بار بار یاد دلائی ہیں۔ ان میں وہ نعمتیں شامل ہیں جو انسان کو دنیا میں ملی ہوئی ہیں اور جن سے وہ رات دن فائدہ اٹھاتا

رہتا ہے اور وہ بھی جو اسے آخرت میں نصیب ہونے والی ہیں۔ یہ تمام نعمتیں جیسا کہ اس سورہ کے نام سے واضح ہے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کے مظاہر ہیں۔ خاص قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ کے بالکل شروع میں اس صفت کے اولین مظہر کے طور پر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو قرآن کا علم عطا کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

الرَّحْمٰنُ. عَلَّمَ الْقُرْآنَ۔(الرحمٰن/۱-۲)

(خدائے رحمان نے قرآن کا علم عطا کیا)

علم قرآن عطا کیے جانے کے ضمن میں اللہ کی صفت ''رحمٰن'' کے ذکر سے اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا ہے کہ اس کی رحمت بے پایاں اس بات کی مقتضی ہوئی کہ سراپا کتاب رحمت یعنی قرآن نازل کیا جائے اور انسان کو اس کا علم مرحمت کیا جائے تا کہ وہ اس سے فیض یاب ہو کر اللہ کی خصوصی رحمت کا مستحق بن جائے۔

ان سب کے علاوہ قرآن کی متعدد آیات میں واضح طور پر اس کتاب کو موجب رحمت قرار دیا گیا ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو اس کے پیغام کو قبول کرنے والے ہیں اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ قرآن نے ان خوش نصیب بندوں کے لیے مومنین، مسلمین و محسنین کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔(العنکبوت/۵۱)

(کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ۔(النحل/۸۹)

(اور ہم نے یہ کتاب جو تم پر نازل کی ہے ہر چیز کی وضاحت کے لیے اور وہ ہدایت و رحمت اور بشارت ہے اہل اسلام کے لیے)

الـم. تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ. هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ۔ (لقمان/۱-۳)

(الم-یہ پر حکمت کتاب کی آیات ہیں، ہدایت ورحمت ہیں نیکوکاروں کے لیے)

ان آیات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ قرآن پر ایمان لانا، اس کی حقائیت و صداقت کو دل میں جاگزیں کرنا اوراس کی ہدایت کے مطابق نیک کام انجام دینا خیرو برکت اور رحمت کا باعث بنتا ہے۔

قرآن مجید اس اعتبار سے بھی باعثِ رحمت ہے کہ یہ کتاب انسان کو صراط مستقیم یا سیدھی راہ دکھانے والی ہے جو نجات کی راہ ہے کامیابی کی راہ ہے۔یہی راہ دکھانے کے لیے گذشتہ انبیاء کرامؑ اور آخری نبی حضور اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی اوراسی کی وضاحت کے لیے قرآن کریم کا نزول ہوا۔اہل ایمان روزانہ متعدد بار جس صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہیں پورا قرآن اسی کی تشریح و ترجمانی سے عبارت ہے، عقائد، عبادات، اخلاقیات و معاملات کون سا ایسا پہلو ہے جسے قرآن میں واضح نہ کیا گیا ہو، مذہبی، سماجی، معاشی وسیاسی زندگی میں اہلِ ایمان سے کیا مطلوب ہے، اس بابت بھرپور رہنمائی قرآن کریم سے ملتی ہے۔انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خیر و رحمت کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ سیدھی راہ پالے اور اسے اس پر چلنا نصیب ہو جائے۔اوپر سورہ بنی اسرائیل کی ایک آیت (نمبر۹) کے حوالہ سے یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ اس کتاب عزیز کا امتیازی وصف سیدھی راہ دکھانا ہے۔ایک دوسری آیت سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اسی کتاب کے ذریعہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے تھے۔ارشاد الٰہی ہے:

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الأُمُورُ (الشوریٰ/ ۵۲-۵۳)

(تمھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اس کو ہم نے

ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں یقیناً تم [اس کتاب کے ذریعہ] سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو اس خدا کے راستہ کی طرف جو زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو سارے معاملات اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جاتے ہیں)

ظاہر ہے اُس کتاب کے کتابِ رحمت ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے جس کے توسط سے صراط مستقیم پر چلنا آسان ہو جائے۔

قرآن کا باعث رحمت ہونا اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ اس میں دلوں کے امراض کے لیے شفا ہے، سورہ یونس کی ایک آیت (نمبر ۵۷) اوپر ذکر کی جا چکی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصیحت ہے اس میں دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور یہ مومنین کے لیے باعث رحمت ہے۔ اسی مضمون کی آیت سورہ بنی اسرائیل میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاء وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔ (بنی اسرائیل/۸۲)

(اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ شفاء و رحمت ہے ایمان والوں کے لیے)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ان دونوں آیتوں میں شفاء کے ساتھ ساتھ رحمت کا لفظ بھی آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں (شفاء و رحمت) میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ چاہے ظاہری بیماری ہو یا باطنی مرض اس سے نجات سکون و آرام اور راحت کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ ظاہری امراض کے مقابلہ میں باطنی امراض زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں اس لیے کہ یہ اس زندگی کے لیے تباہ کن بنتے ہیں جو ہمیشہ ہمیش کی زندگی ہے اور مزید یہ کہ یہ اعمال صالحہ کے لیے سم قاتل ثابت ہوتے ہیں جب کہ انہی اعمال پر ابدی سکون و آرام کا انحصار ہے۔ ان باطنی امراض میں نفاق، کبر و غرور، حب مال و جاہ، خودستائی و بیجا خوش فہمی، بدگمانی و غیبت، بغض و حسد اور مکاری و دغابازی کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم ان بیماریوں کا بہترین علاج فراہم کرتا

ہے اور ان سے حفاظت کے لیے احتیاطی تدابیر بتاتا ہے۔قرآن کی مختلف سورتوں بالخصوص سورہ لقمان وحجرات میں ان اخلاقی خرابیوں اور اندرونی بیماریوں کے خطرات واضح کر کے ان سے دور رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔مثال کے طور پر سورہ حجرات کی آیات ۱۱-۱۲ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔دوسری جانب قرآن تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے ذریعہ انسان کے اندر ایسی صفات پیدا کرتا ہے جو اخلاقی برائیوں اور اندرونی بیماریوں کے لیے سدباب بن جاتی ہیں اور دلوں کو منفی رجحانات و باطنی آلائشوں سے پاک کر کے انھیں صحت مند خیالات اور پاکیزہ جذبات کی آماجگاہ بنادیتا ہے۔اس ضمن میں صدق واخلاص، احسان وایثار، تواضع وانکسار، اخوت و ہمدردی، نرم روی و بردباری، عفو ودرگذر اور عدل وانصاف سے متعلق قرآنی تعلیمات وہدایت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔تیسرے قرآن نے تقویٰ کی صفت پیدا کرنے پر بہت زور دیا ہے اور اس وصف کے برکات واثرات بار بار واضح کیے ہیں۔اس وصف کے نشوونما کے بعد دل خود بخود بہت سی اندرونی آلائشوں اور باطنی امراض سے پاک ہوجاتا ہے اور ایسی اعلیٰ صفات کا مسکن بن جاتا ہے جو خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی راحت ورحمت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

قرآن کریم کے اس وصف (کتابِ رحمت ہونے) کی قدر وقیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک جگہ اس کے نزول کی خبر دینے کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اس میں اللہ کا فضل وکرم اور اس کی بڑی رحمت ہے۔یہ اتنی قیمتی نعمت ہے کہ اس کے نصیب ہونے پر لوگوں کو خوب خوش ہوجانا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ اُس دولت سے بدرجہا بہتر ہے جسے وہ انتہائی محنت ومشقت سے جمع کرتے ہیں۔قرآن کے نصیحت کے طور پر نزول کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (یونس۵۸)

(کہہ دیجیے کہ تو چاہئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت [نصیب ہونے] پر وہ خوش ہوجائیں یہ قرآن کی دولت اس سے بہتر ہے جو [دنیا کے ساز وسامان] لوگ جمع

کررہے ہیں)

قرآن کریم کے بارے میں یہ اوپر واضح کیا گیا کہ یہ کتاب ہدایت ہے، یہ حق و باطل میں امتیاز کے لیے ایک کسوٹی ہے، اس میں نصیحت و یاددہانی ہے یہ لوگوں کے لیے موجبِ رحمت ہے۔ ان سب کے علاوہ اس کا ایک بہت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب عمل ہے، یعنی اس کا مقام و مرتبہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ اس کتاب مبارک کا فیض صحیح معنوں میں اس وقت حاصل ہوگا جب اس کے معنی و مفہوم کو سمجھا جائے اور اس کی ہدایات کو روزمرہ زندگی میں اختیار کیا جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے امتیازات و خصائص واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیروی کا حکم دیا ہے اور اس کے احکام بجالانے کی تاکید کی ہے بعض آیات میں یہ حکم رسول اکرم ﷺ کے توسط سے پوری امت کو دیا گیا ہے اور بہت سی آیات میں عام انداز میں قرآن کی اتباع کی ہدایت دی گئی ہے۔ کچھ متعلقہ آیات ملاحظہ ہوں:

اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔ (الانعام/۱۰۶)

([اے نبیؐ] اس وحی کی پیروی کیجئے جو تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے)

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَى إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً۔ (الاحزاب/۲)

(اور پیروی کرو اس چیز کی جو تمھاری طرف وحی کی جارہی ہے اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو)

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْ أُوحِيَ إِلَيْكَ۔ (الزخرف/۴۳)

(پس اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو تمھاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے)

اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء ۔ (الاعراف/۳)

(لوگو جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو)

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم۔(الزمر/۵۵)

(اور پیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے)

قرآن میں متعدد مقامات پر (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) اس کتاب کو کتابِ رحمت کہا گیا ہے۔لیکن قرآن ہی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس کی رحمتِ خاصہ کے مستحق اصلاً وہی لوگ ہوں گے جو اس پر عمل کو اپنا شیوہ بنانے والے ہیں اور اس کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں داخل کرنے والے ہیں۔درا صل نزول قرآن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس کے سانچہ میں زندگی کو ڈھالا جائے۔ارشاد ربانی ہے:

وَهَـٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ (الانعام/۱۵۵)

(اور یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے سراپا خیر و برکت ہے تو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے)

قرآن مجید کا کتاب عمل ہونا اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس میں بار بار نیک عمل و نیکی کمانے کی ترغیب دی گئی ہے اور اہل ایمان کو اس پر ابھارا گیا ہے کہ وہ نیکی کی راہ میں سرگرداں رہیں، اسی کو اپنی دوڑ بھاگ کا اصل میدان بنائیں اور اسی میں مسابقت یا ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے لیے کوشش کریں۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔(البقرہ/۱۴۸)

(ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو)

اسے اہل ایمان کے امتیازی اوصاف میں شمار کیا گیا ہے کہ وہ نیکیاں کمانے میں سرگرم رہتے ہیں۔ارشاد خداوندی ہے:

أُولَـٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ۔(المومنون/۶۱)

(یہی لوگ نیکیوں کی طرف دوڑنے والے اور اسے پالینے والے ہیں)

قرآن کی نگاہ میں اللہ کی بندگی بجالانا اور نیکی کمانا کامیابی کی ضمانت دیتا ہے جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے:

وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔(الحج/۷۷)

(اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور نیکی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ)

قرآن میں اس شخص کے قول کو بہترین قول قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط رکھی ہے کہ وہ خود نیک عمل کرے۔اس سے معلوم ہوا کہ قول کی عمدگی و بہتری اور دعوتِ دین کی تاثیر اس پر موقوف ہے کہ اس کے پیچھے حسنِ عمل کی قوت ہو۔اس آیت سے یہی نکتہ سامنے آتا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔(حم السجدہ/۳۳)

(اور اس شخص کی بات سے اچھی کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں)

اس آیت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں عمل کی کتنی اہمیت ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی ادراک کیا جاسکتا ہے کہ قول وعمل میں مطابقت اللہ کی نگاہ میں کس قدر پسندیدہ طرزِ عمل ہے اور ہر مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس صفت سے متصف ہوجائے، دوسری جانب قول وعمل میں عدم مطابقت کس قدر ناپسندیدہ اور اللہ کو ناراض کرنے والی روش ہے وہ اس آیت سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔

كَبُرَ مَقْتاً عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ۔(الصّف/۳)

(اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں)

قرآن کریم نے اس نقطۂ نظر سے بھی انسان کو عمل کی دعوت دی ہے اور اس میں نیک عمل کی تحریک پیدا کی ہے کہ بزم جہاں کو آراستہ کرنے اور انسان کو پیدا کیے جانے کا خاص مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا امتحان لیا جائے کہ ان میں عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اس امتحان کے نتیجہ پر اس کی اصل کامیابی و ناکامی منحصر ہے اس لیے اس کے لیے خیر اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو نیک عمل کا خوگر بنائے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً۔ (الملک/۲)

(وہی ہے جس نے موت و زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے)

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَیُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً۔ (الکہف/۷)

(روئے زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے زمین کے لیے زینت بنایا تا کہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے)

وَالْعَصْرِ. إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ. إِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر/۱-۳)

(زمانہ شاہد ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے)

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں نیک عمل کی تاکید و ترغیب سے متعلق سینکڑوں آیات ملتی ہیں، ان میں خاص طور سے یہ نکات واضح کیے گئے ہیں:

۱- نیک عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور برے اعمال سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

۲- اللہ رب العزت کا پکا وعدہ ہے کہ وہ نیک عمل کرنے والے اہل ایمان کو مغفرت، اجر عظیم، کامیابی و جنت نصیب کرے گا۔

۳- وہ مومنین جو نیک عمل کرتے ہیں انھیں یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ وہ دونوں جہاں میں خوشگوار زندگی، حسن انجام، ابدی سکون و آرام اور جنت میں طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔

۴- وہ لوگ جو برے عمل کرتے ہیں وہ اس کے وبال سے دوچار ہوں گے یا وہ لوگ جن کی ساری تگ ودو اس دنیوی زندگی کی تعمیر و ترقی تک محدود رہتی ہے اور وہ

اخروی زندگی کی فکر سے خالی رہتے ہیں وہ خسارے میں ہوں گے۔

۵- انسان جو کچھ عمل کرتا ہے وہ اللہ کے سامنے ہے اور وہ اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

۶- انسان کو دوبارہ زندہ کیے جانے، قیامت برپا کرنے اور حساب وکتاب کا نظام قائم کرنے کی اصل غرض وغایت یہ ہے کہ اسے ان اعمال کی خبر دی جائے جنہیں وہ دنیا میں کرتا رہا ہے اور اس کے عمل کے مطابق اسے اچھا یا برا بدلہ دیا جائے۔

۷- اللہ رب العزت کسی نیک عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ان مضامین سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح وترجمانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب میں مختلف انداز میں نیک عمل انجام دینے کی ترغیب دی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن پر عمل زندگی کے ہر شعبہ میں مطلوب ہے۔ یہ کتاب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی ہدایات وتعلیمات پر جزوی نہیں بلکہ کلی طور پر عمل کیا جائے۔ بالفاظ دیگر زندگی کے بعض معاملات میں قرآنی ہدایات پر عمل کیا جائے اور دوسرے امور میں انھیں نظر انداز کر دیا جائے یہ نہ تو مومنانہ طرز عمل ہے اور نہ قرآن کا مطلوبہ رویہ ہے۔ قرآن تو یہ چاہتا ہے کہ مومن فکری وعملی دونوں طور پر پوری طرح قرآن کے سانچہ میں ڈھل جائے۔ یہ آیت اس حقیقت کی ترجمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً۔ (البقرہ/۲۰۸)

(اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)

اس آیت کے حوالہ سے قرآن کے مطلوبہ رویہ کی بہترین ترجمانی ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری کے اس تبصرہ میں ملتی ہے:

''انسانی زندگی کے بارے میں قرآن کریم کا یہ رویہ ہے کہ وہ ایک ناقابل تقسیم مکمل وحدت ہے، چنانچہ عملی زندگی ہو یا فکری اسے مکمل طور پر خدا کے حوالہ کرنا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مثلاً انسان کی انفرادی وذاتی زندگی میں تو رب العالمین کی فرماں روائی ہو اور اجتماعی وسیاسی، معاشی زندگی سے رب العالمین کو بے دخل

کر کے کچھ دوسرے فلسفوں، نظریوں اور افکار کے حوالہ کر دیا جائے"۔(کتاب الٰہی کے پانچ مطالبات، حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۶۰)

خلاصہ یہ کہ قرآن کی رو سے روزمرہ زندگی میں اپنی من چاہی یا Pick and choose کی بات نہیں چل سکتی بلکہ فرمانِ خداوندی کے سامنے مکمل سپردگی مطلوب ہے۔ یہ کتاب ہدایت عملی زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کے تقاضے پورا کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور اسی کو دین حق کی بہترین تعبیر اور ملت ابراہیمی کی کامل پیروی کا نام دیتی ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ دِيناً مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لله وَهُوَ مُحْسِنٌ واتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَاتَّخَذَ اللّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً۔(النساء/۱۲۵)

(اور اس شخص سے بہتر اور کس کا دین ہوسکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کی اس ابراہیم کے طریقہ کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا)

آخر میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے قرآنی تعلیمات و ہدایات پر پوری طرح عمل کر کے امت کو یہ دکھا دیا کہ قرآن کتابِ عمل ہے اس پر عمل کے بغیر اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی پوری زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔اپنے قول وعمل سے قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح فرمانا آپ ﷺ کے پیغمبرانہ مشن کا ایک اہم حصہ تھا۔ بلاشبہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ قرآنی ہدایات وتعلیمات کا پرتو تھی۔یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اسے لوگوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا اور اخروی کامیابی کے لیے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول کی اطاعت کو بھی لازمی بتایا۔ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔(الاحزاب/۲۱)

(یقیناً تم سب کے لیے رسول اللہ [کی زندگی] میں بہترین نمونہ ہے)

وَأَطِيعُوا اللّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔(آل عمران/۱۳۲)

(اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيماً۔(الاحزاب/۷۱)

(اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی)

نبی کریم ﷺ کے عمل بالقرآن کی مزید شہادت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس مشہور قول سے ملتی ہے: کان خلقه القرآن ۔یعنی آپ ﷺ کے اخلاق قرآن کا مجسم نمونہ تھے۔ آپ ﷺ کے زیر تربیت صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی پروان چڑھی تو انھوں نے بھی عمل بالقرآن کی شاندار مثالیں پیش کیں۔ ان کا یہ معمول تھا کہ جب بھی قرآنی آیات نازل ہوتیں اور ان میں کسی نئے حکم یا ہدایت کا ذکر ہوتا تو وہ نبی کریم ﷺ سے اس کا مطلب ومنشا معلوم کرتے اور پھر اس پر عمل میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ عمل بالقرآن میں ان کے وفورِ شوق وانہماک کی مثالوں سے ان کی زندگی کے واقعات بھرے پڑے ہیں یہاں صرف ایک دو واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

سورہ آل عمران کی یہ آیت جب نازل ہوئی:

لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ۔(آل عمران/۹۲)

(تم لوگ اس وقت تک نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی محبوب ترین چیز کو [اللہ کی راہ میں] خرچ نہ کرو)

تو بہت سے صحابہ کرامؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول فلاں مال مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہی میں حضرت ابوطلحہ انصاریؓ بھی تھے جنھوں نے بیرحا کا باغ اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کردو۔ چنانچہ انھوں نے اسی کے مطابق اپنے چچیرے بھائیوں اور دیگر اعزہ میں تقسیم کردیا (صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الاقارب)۔ اسی طرح جب یہ آیت نازل ہوئی:

مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافاً كَثِيرَةً ۔ (البقرہ/۲۴۵)

(کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے)

تو حضرت ابو دحداح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب کررہا ہے (یعنی اپنی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دے رہا ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ اے رسول اللہ دستِ مبارک بڑھایئے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا ہے۔ یہ بہت بڑا باغ تھا جس میں کھجور کے تقریباً چھ سو درخت تھے اور اسی میں ان کے اہل وعیال بھی رہتے تھے۔ اس کے فوراً بعد باغ کے کنارہ پر کھڑے ہوکر حضرت ابو دحداح نے اپنی بیوی کو آواز دیا کہ ام دحداح باہر نکل آؤ میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے (الطبرانی، المعجم الکبیر، ۲۲/۳۰۱، حدیث نمبر ۷۶۴)۔

علم کو عمل سے جو تازگی وقوت نصیب ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، علمِ قرآن پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ اس کی ایک دل نشیں وضاحت ایک حدیث سے ملتی ہے۔ حضرت زیادؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے ایک (خوفناک) چیز کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ایسا اس حالت میں ہوگا کہ علم دین مٹ جائے گا، اس پر حضرت زیادؓ نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا علم دین کیوں کر مٹ جائے گا جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور پھر ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی (یعنی یہ سلسلہ چلتا رہے گا)۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے زیاد میں تمھیں مدینہ والوں میں سب سے زیادہ سوجھ بوجھ والا سمجھتا تھا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہود ونصاریٰ تورات وانجیل کی کتنی تلاوت کرتے ہیں لیکن ان کی تعلیمات پر کچھ بھی عمل نہیں کرتے (سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب ذھاب القرآن)۔ اس حدیث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علم قرآن کا بقاو تحفظ اصلاً اس پر عمل کرنے پر موقوف ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن سے نصیحت حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا آسان بنادیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی نصیحت سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا جب اس پر عمل کیا جائے گا۔ سورہ قمر کی یہ آیت (جو بار بار دہرائی گئی ہے) تذکیر وعمل دونوں کی دعوت دے رہی ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔ (القمر/۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

(اور ہم نے قرآن کو نصیحت [حاصل کرنے] کے لیے آسان بنا دیا ہے کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا)

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ عقائد وعبادات، خانگی زندگی، سماجی تعلقات و مالی معاملات سے متعلق قرآن کی جو اصولی ہدایات ہیں ان میں ذرا بھی پیچیدگی وابہام نہیں۔ انھیں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے اور شکر خدا کہ اس کے لیے مختلف ذرائع مہیا ہیں، دوسرے یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی چیز کی طلب صادق ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہیں ہموار کر دیتا ہے۔

اوپر آیات کے حوالہ سے قرآن کریم کے تعارف کی نسبت سے جو مباحث سامنے آئے یہ اس کے چند اہم پہلو تھے۔ حقیقت یہ کہ مقام ومرتبہ کے اعتبار سے یہ کتاب اتنی ارفع و اعلیٰ ہے، مضامین کے لحاظ سے اتنی جامع ہے اور اس کے امتیازات وخصائص اتنے کثیر ومتنوع ہیں کہ ایک مضمون میں کیا کتابوں کے انبار لگ جائیں تب بھی اس کے تعارف کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ بس مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ کتابِ ہدایت ہے جو انسان کو صراط مستقیم پر گامزن کرتی ہے، یہ حق وباطل میں تفریق کرنے والی کتاب ہے، اس میں لوگوں کے لیے بڑی قیمتی نصیحتیں اور بھلائی کی باتیں ہیں، یہ انسان کو بار بار اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق یاد دلانے والی ہے۔ یہ ایک صاف وشفاف آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے کردار واعمال کی تصویر دیکھ سکتا ہے۔ یہ کتاب سب کے لیے بالخصوص اس کے پیغام کو قبول کرنے والوں کے لیے موجبِ رحمت ہے، اس کے علم کی اشاعت وجہِ سعادت ہے اور اس کی ہدایات وتعلیمات پر عمل کرنا ذریعہ نجات وفلاح ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے قرآن کریم بلاشبہ اللہ رب العزت کی سب سے بڑی نعمت ہے جو رحمۃ للعالمین وختم المرسلین حضور اکرم ﷺ کے توسط سے انسان کو مرحمت ہوئی، اس کی قدر دانی کا تقاضا یہی ہے کہ زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کو رہنما بنایا جائے، ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور اسی میں درپیش مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ اللہ کرے ہمیں اس کی توفیق نصیب ہو اور ہم سب اس کتاب عزیز کے سچے عاشق اور مخلص خادم بن جائیں۔ اللھم وفقنا بما تحبّ و ترضیٰ

قرآن کریم۔ کتاب ہدایت

ابوسفیان اصلاحی

قرآن کریم آخری کتابِ ہدایت ہے۔ یہ آسمانی کتاب حکمت وبصیرت اور غیر منتہا عجائب کا مجموعہ ہے، علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت ورفعت کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ مستشرقین اور مخالفین اسلام کو بھی اس کی حقانیت کا اعتراف ہے۔ عالمی محققین اور ماہرین علوم کے نزدیک اپنے لب ولہجہ، مباحث ومضامین اور اندازِ بیان کے اعتبار سے یہ کتاب خداوندی ہے۔ یہی وہ نوشتہ ہے جس نے ان عربوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے جو اپنے علاوہ دنیا کے تمام لوگوں کو گونگا تصور کرتے تھے۔ اونٹ چرانے والے عرب اس کی وجہ سے دنیا کے امام بن گئے اور یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس نے بڑے بڑے بہادروں کو اسلام کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ عربوں کو عزت، شہرت اور قدرومنزلت سے صرف اس لیے نوازا گیا کہ انھوں نے قرآن کریم کو اپنا معیار ومحور بنالیا تھا۔ اس میزان حیات کے بغیر اپنی زندگی کو لایعنی تصور کرتے اور اس کے اجالے کے بغیر خود کو تاریکیوں میں محصور سمجھتے۔ قرآن کریم درحقیقت ایک پیغام ہے، اور اس پیغام کے توسط سے بنی نوع انسان کو باخبر کیا گیا کہ یہ دنیا کہاں تک اس کے لیے مفید اور کہاں تک اس کے لیے مضر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

هَـٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُواْ بِهِ وَلِيَعْلَمُواْ أَنَّمَا هُوَ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُوْلُواْ الْأَلْبَابِ (ابراہیم: ۵۲/۱۴)

(یہ تمام انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے، تاکہ اس کے توسط سے انھیں باخبر کیا جائے، اور وہ جان لیں کہ خدا ایک ہی ہے اور عقل رکھنے والے ہوشیار ہو جائیں۔)

مذکورہ آیت سے واضح ہے کہ یہ کتاب انسانوں کو برائیوں اور خطرات سے

بچانے کے لیے نازل کی گئی ہے اور یہ بات صاف کرنے کے لیے آئی ہے کہ اس کائنات کا واحد کارساز اور تنہا مدبر اللہ رب العالمین ہے اور یہ صرف ان لوگوں کے لیے جادۂ تذکیر ہے جنھوں نے غور و فکر کے ساتھ اس کتاب کی تلاوت کی، اور صدق دل سے اسے حرزِ جاں بنایا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے اندر تعمیر و ترقی کے سارے راز پوشیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ دوٹوک انداز میں کہتا ہے کہ اس آخری پیغام سے اعراض کرنے والوں کے لیے سراسر ہلاکت و ناکامی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

بَلاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (الاحقاف:٤٦/٣٥)

(یہ ایک پیغام ہے۔ اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا۔)

قرآن کریم وہ واحد منشور ہے، جس کی اتباع دین و دنیا دونوں میں سرخروئی کی ضمانت ہے۔ اللہ کے رسول مقبول ﷺ نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں تمہارے لیے قرآن حکیم چھوڑے جاتا ہوں، اگر تم لوگوں نے اس کتاب سے تعلق کو برقرار رکھا تو دنیا میں ایک باوقار زندگی بسر کرو گے، کیوں کہ یہ کتاب تمام مسائل و مصائب کا حل ہے، اور ایسا عظیم سرمایہ ہے، جو مومنین کو تمام سرمایوں اور مال و منال سے بے نیاز کر دیتا ہے، یہ الجھنوں میں قرار جاں اور مشکلات میں راہنما ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلاَ يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إَلَّا خَسَارًا (بنی اسرائیل:١٧/٨٢)

(ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔)

یہ کتاب ان لوگوں کے لیے درد کا درماں اور ہر اضطراب میں ابر رحمت ہے جو اسے تعصّبات سے بالاتر ہو کر تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن کریم چوں کہ ایک 'گائڈ بک' ہے اس لیے اللہ رب العزت نے اسے دل کی آنکھوں سے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار ایک ایک آیت پر ڈیرہ ڈالنے اور فکری مراقبہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جوں جوں قرآن پر غور کیا جائے گا، اسی قدر اس کی اہمیت و افادیت منکشف ہوتی جائے گی۔ یہ دین

ودنیا کے تمام علوم کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔آج علمی دنیا کی طرف سے یہ بات کھل کر کہی جارہی ہے کہ یورپین اور امریکن سائنس دانوں اور محققین کی بہت سی تحقیقات اور اکتشافات کی بنیاد قرآن کریم ہے جس کی طرف قرآن میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (ہود:١١/٦)

ترجمہ:اور وہ جانتا ہے اس کے مستقر اور مدفن کو ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے۔

جب تک ہم نے اس کتاب عزیز کو اپنے سینے میں بسائے رکھا،اس وقت تک جہاں ایک طرف حکمرانی اور فرمانروائی کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں تھی،وہیں دوسری طرف علوم وفنون کے تمام میدانوں میں مسلم مفکرین کی نمایاں نمائندگی تھی۔حکمت،طب، سائنس،ریاضیات،سماجیات،ادبیات اور انجینئرنگ میں امت مسلمہ دنیا کی آنکھیں خیرہ کررہی تھی۔اندلس کی تاریخ سے کون واقف نہیں،یورپ کی علمی بیداری کا سہرا ان مسیحی علماء وفضلاء کے سر جاتا ہے جو دراصل اندلس کے مسلم درس گاہوں کے پروردہ تھے،جن کے اساتذہ مسلم تھے،لیکن آگے چل کر یہی یورپ شاگردی کے بجائے استاذی کا دعویدار بن گیا اور مسلمانوں کا ورثہ کلیسا کی میراث بن گیا۔شاعر نے امت مسلمہ کے ماضی اور حال کا کیا خوبصورت موازنہ کیا ہے۔

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی ساری ترقی اور تمام تر سربراہی کا راز صرف یہ تھا کہ انھوں نے قرآن کریم کو اپنی فکری جولان گاہ بنا رکھا تھا،اس کتاب کے ایک ایک حکم کو ضابطۂ حیات کے طور پر اختیار کرتے تھے۔اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ باعث حزن وملال تھی وہ یہ کہ قوم اس صاحب مرتبت کتاب سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے، اجالوں سے ان کی حد درجہ بے اعتنائی۔اللہ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ کے جذبات واحساسات کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً (الفرقان:

۲۵/۳۰)

(اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا۔)

خلفائے راشدین اور اصحاب نبی کریم ﷺ اپنی مختلف مجالس اور مختلف خطبوں میں قرآن کریم کی گرفت پر زور دیتے رہے۔ اپنے معاملات وعبادات میں اسی کو اپنا حکم بتایا کیوں کہ اس میں عدالت اور سیادت وقیادت کے تمام خطوط موجود ہیں۔ خلفائے راشدین اپنے گورنرز کو تمسک بالکتاب کا بار بار حکم دیتے رہے، کیوں کہ یہ ایک ایسا مستند سہارا ہے جو انسان کو تمام سہاروں سے بے نیاز کردے۔ ایک ایسا آستانہ ہے جو تمام آستانوں سے لاتعلق کردے۔ اسی کو اس انداز میں پیش کیا گیا:

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرہ:۲/۲۵۶)

(اور جو کوئی طاغوت کا انکار کرے گا، اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔)

آج کی دنیا میں ملت اسلامیہ تعداد، مال ودولت اور جاہ ومنصب کے اعتبار سے ایک بڑی حیثیت کی مالک ہے، لیکن دنیا کے منظر نامے میں اس کی کوئی حیثیت اور کوئی وقعت نہیں، اہل ملت مساکین کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ہر شعبۂ حیات میں افلاس زدہ نظر آرہے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ملت اسلامیہ کے اس حالت زار کی طرف بہت پہلے اشارہ کردیا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تمہاری تعداد بہت بڑی ہوگی، لیکن تمہاری حیثیت خس وخاشاک سے زیادہ نہ ہوگی۔ کلامِ نبوت کا انداز بے مثال ملاحظہ ہو:

"ولکنکم غثاء کغثاء السیل"۔ یعنی اے امت تم سیلاب کے اس جھاگ کے مانند ہو، جسے پانی ادھر ادھر لیے پھرتا رہتا ہے، اس کا پانی پر کوئی اختیار واقتدار نہیں، بلکہ وہ خود اس کے تصرف میں ہے۔ اس کی اپنی کوئی ترجیح وتوجیہ نہیں۔ کیا آج ہماری قوم اوروں کی رائے کا پابند نہیں ہے؟ غیروں کے احکام کا غلام اور بیگانوں کے رحم وکرم کی متمنی ہے۔

علامہ اقبال کو اپنی قوم کی بدقسمتی اور زبوں حالی پر گریہ وزاری کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مذکورہ سطور میں مسلمانوں کے زوال وانحطاط کا اصل سبب یہ بتایا گیا کہ قرآن کریم سے ان کا تعلق کم زور ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو بار بار ''کتاب مبین'' اور ''بلاغ مبین'' سے موسوم کیا ہے، یعنی یہ ایک ایسی کتاب اور ایک ایسا پیغام ہے جو تمام عیوب ونقائص اور اوہام وخرافات سے مبرا ہے، ہر بات اور ہر حکم صاف وشفاف، اس کی آیات بینات حق وباطل کے مابین خط امتیاز کی مانند، انسانی ذہن کے لیے سکینت وطمانیت کا ذریعہ اور ذہنی خلجان اور گندے وسوسوں کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ:۲/۱۸۵)

(رمضان ہی کا ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، یہ لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے اور ایسی واضح ہدایات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق وباطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔)

یقیناً یہ ایک ایسا روشن پیغام ہے جو انسانیت کی استقامت اور رشد وہدایت کے لیے مثالی ہے۔ یہاں قرآن کریم کے تین اہم اور اساسی پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا جائے گا۔ ایک اتحاد بین المسلمین، دوسرے تقوی اور تیسرے شکر خداوندی۔ یہ وہ تین خصوصیات ہیں جو ہر مومن کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کسی کے اندر یہ صفات موجود نہیں ہیں تو اس کی اخروی زندگی قرآن کی زبان میں ''خسران مبین'' یعنی ناکامیوں اور نامرادیوں سے عبارت ہوگی۔

عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کا جائزہ لیا جائے تو محلے، گاؤں، شہر اور ملکی پیمانے پر ان کے اندر پورے طور سے اتحاد واتفاق کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے ملکی اور عالمی سطح پر یہ قوم قیادت وسیادت سے محروم ہے۔ آج ملت اسلامیہ کا ہر فرد اور مسلم فرمانروا محکومی اور

محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے باہمی اختلافات وانتشارات کی وجہ سے دوسروں کی زیر قیادت جینے پر مجبور ہیں۔ سیاسی سطح پر ان کا اپنا پلیٹ فارم نہیں ہے، ان کے مفادات وترجیحات جداگانہ ہیں۔ ان کے افکار وخیالات میں ہم آہنگی نہیں۔ ان کی جہتیں الگ الگ اور ہر فرد اپنی اپنی ڈفلی بجانے کا تمنائی، تعصّبات کی انتہاؤں سے مربوط ہے۔ ایک ہی محلّہ اور ایک ہی شہر میں مختلف برادریوں کی کئی کئی فلاحی تنظیمیں قائم، جب کہ یہ تمام سلسلے قرآن کریم کی رو سے غلط ہیں، کیوں کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد تمام گروہی اختیارات مٹ جاتے ہیں۔ یہ قبائلی نظام تو محض تعارف کے لیے ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (الحجرات:۴۹/۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تمہیں بے شک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبائل میں صرف باہمی تعارف کے لیے تقسیم کیا۔)

اور ہم آہنگی کی تصویر کشی قرآن کریم نے "كأنهم بنيان مرصوص" (الصّف: ۶۱/۴) کہہ کر کی ہے، جسے بادوباراں نہ تو گرا سکتی ہے اور نہ ہی گردش روزگار اسے مٹا سکتی ہے، یعنی مومن کے ساتھ ایسی تائید الٰہی ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ تو زبوں کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے شکست دے سکتی ہے، لیکن افسوس کہ آج ہر مومن، ہر امام، ہر لیڈر اور ہمارا ہر حکمراں اپنے مخصوص اہداف واغراض سے وابستہ ہے، حصول مقصد کے لیے ایک مومن دوسرے کو تہہ تیغ کرنے میں کوئی دریغ نہیں محسوس حتیٰ کہ اپنی جاہ ومنصب کے لیے ملت اسلامیہ کو قربان کرنے میں اسے کوئی تأمل نہیں، آج ہم اہل ایمان ہی تو اپنے ادارۂ سرسید کو کھنڈر بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور عرب بیت المقدس کے حال زار پر دادِعیش دینے میں مصروف ہیں۔ ایک مسلم حکمراں اپنی خواہشات کے لیے دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر ایک دوسرے مسلم حکمراں کی تذلیل وتحقیر میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی مومن کی عزت وناموس اور مال ودولت کسی دوسرے مومن کی زبان سے محفوظ نہ ہو تو وہ مومن ہی نہیں ہے۔ مومن کی شان ہے کہ وہ اپنے بھائیوں میں بادِ نسیم اور نکہتِ گل

بن کر رہے۔اللہ کا ارشاد ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ (الفتح:۴۸/۲۹)

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔)

مذکورہ آیت کی روشنی میں اہل ایمان سے اس فعل کا تصور ہی نہیں کہ وہ دوسرے اہل ایمان کو تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنائے اور اس کے وجود کو ختم کرنے کے لیے جدو جہد کرے، بلکہ قرآن کریم کی رو سے ایک مومن دوسرے مومن کی عزت و ناموس کا ضامن ہے۔ چوں کہ امت مسلمہ نے قرآنی تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے، اسی لیے آج دنیا کے گوشے گوشے میں ردائے عزوشرف تار تار ہو رہی ہے۔قرآن کریم نے یہ فلسفہ واضح کر دیا کہ اے مومنو! اگر تم باہمی عداوتوں کا شکار ہوئے تو دنیا کی قومیں تمہیں لقمہ تر کی مانند نگل جائیں گی۔ قرآن کریم میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُواْ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (الانفال:۸/۴۶)

(اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں عداوت نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

قرآن کریم کے نزدیک ایمان کا مفہوم اتحاد و یگانگت ہے، ایمان تالیف قلب اور تائید وتوثیق کا نام ہے۔قرآن کریم نے بانگ دہل اعلان کیا ہے کہ "و اخفض جناحک للمؤمنین" یعنی اے اہل ایمان! تم اپنے بھائیوں کے لیے آغوش محبت وا کر دو۔اسی کا مفہوم علامہ اقبال نے یوں پیش کیا:

زرم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

اب تک اتحاد بین المسلمین پر گفتگو ہورہی تھی کہ اتحاد علامت ایمان اور اختلاف علامت کفر ہے، اب اختصار کے ساتھ تقویٰ پر گفتگو کی جائے گی۔

تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا نام ہے۔تقویٰ کے بغیر مومن کا تمام عمل، تمام عبادات کا رعبث کی مانند ہیں اور جس اتحاد کی بات کی گئی ہے وہ تقویٰ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ایک متقی اپنے دین، اپنے معاملات اور اپنی عبادات میں مخلص ہوتا ہے۔اس کی آرزوئیں اللہ کی مرضیات کی پابند اور دنیا اور آخرت کی تمام سرخروئیاں اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے لکھ دی گئی ہیں۔ارشاد ربانی ہے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ .الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (المؤمنون:۲۳/۱-۲)

(یقیناً وہ مومنین کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔)

قرآن کریم نے متقی اور پرہیز گار بندوں کی کامیابی کا ذکر مختلف انداز میں کیا ہے۔روز آخرت اللہ انھیں اپنے انعامات واعزازات سے نوازے گا،قرآن نے اسے کہیں "و العاقبة للتقوى" اور کہیں "والعاقبة للمتقين" کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔تقویٰ معرفت خداوندی کا مصدر ہے، بندے کے اندر حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ایک متقی اللہ کے علاوہ کسی سے ڈرتا نہیں، کیوں کہ اللہ اس کا ولی اور ایسا دوست ہے جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، ہر مقام اور ہر مرحلے پر اللہ اس کا راہنما ونگہبان ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (البقرہ:۲/۱۹۴)

(اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ متقی بندوں کے ساتھ ہے۔)

نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے، حج کرنے اور روزہ رکھنے سے انسان متقی نہیں بن جاتا، بلکہ متقی وہ ہے جو اپنی عبادات اور اپنے معاملات میں متقی ہو۔اپنے دفتر اور اپنی تدریس میں متقی ہو، اپنے والدین اور اپنے اہل وعیال میں متقی ہو، اپنے اعزاء اور احباب میں متقی ہو، اپنے بھائیوں اور اپنے غیر مسلم بھائیوں میں متقی ہو، ارض وسماء میں متقی ہو، مختصر یہ ہے کہ قرآن کریم زندگی کے ہر میدان میں تقویٰ اور زہد وورع کے تسلط کے دیکھنے کا خواہش مند

ہے اور اہل ایمان کا ہر نفس تقویٰ سے عبارت ہو، کیوں کہ تقویٰ کے بغیر کارزار حیات بے معنی ہے۔ تقویٰ انسان کے لیے دنیاوی مشکلات سے نجات دہندہ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَن يَّتَّقِ اللّٰه يَجْعَلْ لَه مَخْرَجاً (الطلاق:۶۵/۲)

(جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا، اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔)

تقویٰ ہی کو قرآن کریم میں "صبغة اللہ" یعنی اللہ کا رنگ کہا گیا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے؟ اور اسی طریقے سے "لباس التقویٰ ذلک خیر" یعنی تقویٰ کا لباس تمام لباسوں سے کہیں قیمتی ہے۔ قرآن کریم اسی رنگ میں رنگنے اور اسی لباس کو زیب تن کرنے کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کو اپنا سنگ میل بنا لے وہ اللہ کی نظر میں سب سے جلیل القدر اور محبوب ترین بندہ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات:۴۹/۱۳)

(درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔)

اللہ اپنے محبوب بندوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں آسائشوں سے نوازے گا، ارشاد باری ہے:

هَـٰذَا ذِكْرٌ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ جَنَّاتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ. مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ. وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ. هَـٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ (ص:۳۸/۴۹-۵۳)

(یہ یاددہانی ہے اور بے شک متقی بندوں کے لیے بہترین ٹھکانہ ہے، ہمیشہ کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ان میں وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور بہت سے میوے اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی، ہم سن حوریں ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں جنھیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔)

اب تک اتحاد اور تقویٰ پر روشنی ڈالی جا رہی تھی اور بتایا گیا کہ تقویٰ کے بغیر اتحاد

کامل ممکن ہی نہیں۔اب قرآن کریم کے ایک اور اہم ترین پیغام کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، وہ ہے شکر خداوندی۔تقویٰ کا ایک مظہر شکر رب العالمین ہے، ایک متقی کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا بندوں پر اپنی ہزار ہا نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح مختلف طریقوں سے اپنے عجائبات وتفردات کو پیش کیا ہے تا کہ بندے کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔ "**کذلک نصرف الآیات لقوم یشکرون**" (الاعراف:۷/ ۵۸) اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں کو گھما گھما کر پیش کرتا ہے تا کہ بندے شکر گزار بن جائیں۔اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ تمہارا میرا شاکر بندہ بننا فرض ہے۔"**فاذکرونی أذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون**" (البقرۃ:۲/۱۵۲)

(تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا میری شکر گزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر تم اعراض وانحراف کے برعکس تم میری تعریف وتوصیف کروگے تو میں تمہاری ہر پکار پر لبیک کہوں گا۔ایمان وتقویٰ انسان کو اللہ کی سرتابی سے دور رکھتے ہیں، اس کے اندر ایثار وانفاق کا جذبہ نمو پاتا ہے۔متقی بندے کی منزل مقصود شکر وامتنان ہے، کیوں کہ شکر کی شان وعظمت سے وہ بخوبی واقف ہے۔شکر ادا کرکے انسان اللہ پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ یہ چیز خود اس کی ذات کے لیے مفید ومعاون ہے۔جیسا کہ سورہ نمل میں ارشاد ہے:

وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ
(النمل:۲۷/۴۰)

(جو کوئی شکر ادا کرتا ہے، اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے۔ ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور صاحب شان ہے۔)

شکر گزاری کے علی الرغم جن لوگوں نے بغاوت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا، انھیں قیامت کے روز بدترین عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا اور آخروی نعمتوں سے انھیں محروم رکھا جائے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَاباً شَدِيداً فِي الدُّنيَا وَالآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (آل عمران:۳/۵۶)

(جن لوگوں نے کفر وانکار کی روش اختیار کی ہے، انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے۔)

اللہ سے دعا ہے کہ ملت اسلامیہ کی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کردے۔ انھیں تقویٰ کا علمبردار بنادے اور ان کے دلوں کو جذبۂ شکر سے معمور کردے۔ یہ بات سچ ہے کہ مذکورہ تین چیزیں اہل ایمان کی بنیادی علامتیں ہیں۔ ان صفات سے غیر متصف مومن کا پورا وجود قرآن کریم کی رو سے مشکوک ہے۔ اے رب کائنات! قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے رنگ میں رنگنے کی توفیق عطا فرما۔ آخر میں مندرجہ آیت نقل کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ (النحل:۱۶/۸۹)

(ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کردی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت ورحمت اور بشارت ہے ان کے لیے جنھوں نے سر تسلیم خم کردیا ہے۔)

حوالہ

(۱) ملاحظہ ہو-سنن ابی داؤد لأبی داؤد السجستانی، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الأمم علی الإسلام۔ (۲/۴۲۹۸)۔

حفاظت قرآن کا الٰہی وعدہ اور اس کے ایفاء کی عملی تدابیر

اشہد رفیق ندوی

حفاظت کا وعدہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت واضح لفظوں میں یہ وعدہ کیا ہے کہ قرآن مجید وہی نازل کر رہا ہے اور رہتی دنیا تک وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (الحجر: ۹) رہا یہ ذکر تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں نیز یہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ قرآن مجید کو اجزا کی شکل میں نازل فرما رہا ہے، اور ان اجزاء کی شیرازہ بندی اور قلوب پر ثبت کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ "ان علینا جمعه وقرآنه" (القیامه: ۱۷) اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے "کذلک لنثبت به فوادک ورتلناه ترتیلا" (الفرقان: ۳۲)

یہ دونوں وعدے اس نے صرف قرآن مجید کے لیے کیے ہیں، اس سے پہلے کی جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں وہ متعین مدت کے لیے تھیں، اس لیے ان کی حفاظت کی نہ کوئی یقین دہانی کرائی گئی اور نہ کوئی مستحکم انتظام کیا گیا۔ سیکڑوں برس بعد ان کی جمع وتدوین عمل میں آئی، اس درمیان ان میں لفظی ومعنوی تحریفات ہوتی رہیں، قدرتی نظام اس میں مخل نہیں ہوا اور وہ بکثرت تحریفات کی وجہ سے بے اعتبار ہو گئیں۔ ان کتابوں کے بارے میں قرآن مجید کا یہ واضح اعلان ہے۔ "یحرفون الکلم عن مواضعه ونسوا حظامما ذکروا به" ۔(المائدہ: ۱۳) (اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں۔)

محفوظ ہونے کا مطلب:

محفوظیت کا مطلب اور تقاضا کیا ہے، سب سے پہلے اس کی وضاحت ہونی

چاہیے تاکہ اسی کو معیار بنا کر اس دعویٰ پر غور و فکر کیا جا سکے۔کسی آسمانی کتاب کے محفوظ ہونے کا مطلب ہے کہ جیسی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی بعینہٖ اسی طرح محفوظ ہو۔ اس دعویٰ کو پرکھنے کا یہ معیار ہو سکتا ہے:

☆ اس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہوں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائے گئے ہیں۔

☆ ان الفاظ میں باہمی ربط و ترتیب نیز ان سے بنے ہوئے جملوں اور فقروں کا سلسلہ بھی ٹھیک وہی رہے جیسے اس کتاب کے لانے والے پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا ہے۔

☆ اس میں کوئی ایک کلمہ خداوندی بھی ضائع نہ ہوا ہو، نہ اس طرح کہ وہ بالکل غائب ہو گیا ہو، نہ اس طرح کہ اس کو ہٹا کر کوئی اور لفظ رکھ دیا گیا ہو یا اس کا کسی اور زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہو۔

☆ اس میں کوئی لفظ بڑھایا نہ گیا ہو، حتی کہ اس کے لانے والے پیغمبر کا اپنا بھی کوئی لفظ اس کے اندر داخل نہ ہوا ہو۔(۱)

دنیا میں آسمانی کتابوں کے نام سے متعدد کتابیں مروج ہیں، مگر ان میں سے کسی کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس صورت میں نازل ہوئیں بعینہٖ اسی صورت میں محفوظ ہیں۔نزول قرآن سے قریب تر جو کتابیں نازل ہوئیں وہ توریت اور انجیل ہیں، مگر ان کے حاملین بھی اس کے الفاظ، مضامین اور تعلیمات کو سو فیصد الہامی نہیں مانتے اور اگر ڈاکٹر موریس بوکائے کی تحقیقات پر اعتبار کیا جائے تو ان کے نزدیک ان کتابوں کا کوئی ایک صفحہ یا ایک پیراگراف بھی تحریف سے مبرا نہیں ہے۔(۲) یہ اعزاز و امتیاز صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ جوں کا توں محفوظ ہے۔ حاملین قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے اور ان کے پاس نہایت مضبوط و مستحکم دلائل و ثبوت ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اس کی حفاظت کا ذمہ لیا، باقی تمام کتابیں خاص حالات اور خاص مدت کے لیے تھیں، ان کی دائمی تحفظ کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے وہ محفوظ نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے لیے کیا کیا انتظامات کیے، مآخذ

میں ان کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔اس کو درج ذیل چھ ذیلی عناوین میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

☆ قرآن کو دلوں پر ثبت کرنا۔یعنی حفظ قرآن کا نظام

☆ ضبط تحریر میں لانا

☆ لہجوں اور قراتوں کی حفاظت کا نظم

☆ قانونی حیثیت دینا

☆ ہر دم زبان پر جاری رکھنا

☆ حفاظت کی راہ میں آنے والی چیزوں کا سد باب

حفظ قرآن کا اہتمام:

دلوں پر ثبت کرنے کا انتظام کیا گیا، ایسا محکم اور لازوال انتظام کہ کوئی سازش، کوئی کوشش اس کے خلاف کارگر نہ ہو۔سب سے پہلے خود آنحضور کو یقین دہانی کرائی گئی کہ ان کے قلب پر اس طرح ثبت کردیا جائے گا کہ وہ کسی حال میں بھول ہی نہ سکیں۔''سنقرئک فلاتنسی''(الاعلی: ٦) (ہم تمہیں پڑھوادیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے) اور یہ بھی تسلی دی کہ آپ کو جلدی کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا پڑھنا، پڑھانا اور محفوظ رکھنا ہمارے ذمہ ہے۔(القیامہ:١٧) نیز یہ بشارت بھی سنائی گئی کہ اس کا یاد کرنا آسان ہے زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ **ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر** (القمر:١٧) اور ہم نے قرآن کو یادداشت اور سبق آموزی کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے۔تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا۔

آنحضور ﷺ نے خود حفظ کرنے کے ساتھ صحابہ کرامؓ اور پوری انسانیت کو اس کی ترغیب دی، کبھی تعلیم قرآن میں مشغول انسان کو سب سے معزز انسان قرار دیا(٣)۔کبھی سینوں میں محفوظ رکھنے والے کو جنت کا سفارشی بتایا ہے(٤)۔کبھی اسے عبادات اور دیگر معاملات میں روزمرہ کی ضرورت قرار دیا۔آپ عملی طور پر اس شخص کو فوقیت دیتے جسے قرآن مجید زیادہ یاد ہوتا(٥)۔

عرب کے لوگ قدرتی طور پر بہت ذہین ہوتے تھے۔ان ترغیبات کی وجہ سے حفظ قرآن ہر شخص کا اولین شوق بن گیا۔جیسے ہی خبر ملتی کہ نئی آیات کا نزول ہوا ہے، صحابہ کرامؓ اسے حاصل کرتے اور حفظ کرنے میں مسابقت کرتے۔تمام جلیل القدر صحابہؓ کے سینے حفظ قرآن سے منور تھے۔یہاں تک نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جنگ موتہ جیسے معمولی معرکہ میں جولوگ شہید ہوئے اُن میں ۷۰ سے زیادہ حفاظ کرام تھے۔آپ کی ترغیبات کا یہ اثر رہا ہے کہ کیا عہد صحابہ وتابعین اور کیا اس کے بعد کے ادوار کسی زمانہ میں حفظ قرآن کا شوق کم نہیں ہوا۔بلکہ روز بروز بڑھتا ہی رہا۔ماضی میں مسلمان حکمرانوں نے خاص طور پر توجہ دی اور حفظ قرآن کے لیے خصوصی مواقع بہم پہونچائے اور ترغیبات کا اعلان کیا۔اس کی وجہ سے بیشتر ممالک میں اس کا رجحان کافی بڑھ رہا ہے۔فی زمانہ دنیا بھر کے حفاظ کو شمار کرنا تو دور کی بات ہے،ایک شہر کے حفاظ کو شمار میں لانا مشکل ہے۔دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس طرح ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک کے حرف کے ساتھ کروڑوں سینوں میں محفوظ ہو۔یہ حفاظت قرآن کا الٰہی بندوبست ہے۔اب کوئی معاند قرآن اپنے دل کی آگ بجھانے کے لیے قرآن کے چند صفحات یا چند کا پیاں تو نذر آتش کرسکتا ہے مگر کروڑوں سینوں سے کھرچ کرنکالنا کسی کے بس کی بات نہیں۔**ذلک فضل الله یو تیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم** (الحدید:۲۱) یہ اللہ کا فضل ہے۔جسے چاہتا ہے وہ بخش دیتا ہے۔یقیناً اللہ بڑا فضل والا ہے۔

کتابت قرآن:

حفاظت کا دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ اسے تحریری شکل میں محفوظ کردیا جائے اگرچہ اس زمانہ میں لکھنے لکھانے کے وسائل کمیاب تھے،مگر قرآن مجید کا نزول قلم کے تذکرہ سے ہوا اور آنحضور ﷺ نے شروع ہی سے اس بات کا اہتمام فرمایا کہ جوں ہی قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوتی، کتابت وحی پر مامور صحابہ کرامؓ کو طلب فرما کر تازہ وحی قلم بند کروادیتے،اس میں بھی اس حد تک احتیاط کرتے کہ لکھانے کے بعد پڑھوا کر سنتے اور اس

اولین تحریر میں کسی طرح کی فروگذاشت راہ پا جاتی تو اس کی اسی وقت اصلاح فرما دیتے، (۶) تب عام اجازت ہوتی کہ جو لوگ اسے لکھنا یا یاد کرنا چاہیں، اس کی نقل کر لیں۔ صحیح احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرامؓ کو حضور رسالت مآب میں کتابت قرآن کا شرف حاصل تھا، صحابہ نے کتابت قرآن ہی کے شوق میں کتابت سیکھی، آپ ﷺ نے بھی تحریر و کتابت کے فروغ کے مختلف وسائل و ذرائع استعمال کیے یہاں تک کہ جنگی قیدیوں کا فدیہ کتابت سکھانا قرار دیا اور متعدد جلیل القدر صحابہ نے اسی طرح کتابت سیکھی۔ چنانچہ متعدد صحیح روایات سے واضح طور پر یہ ثابت ہے کہ آپ نے وفات پائی تو پورا قرآن مجید تحریری طور پر مدون و مرتب شکل میں موجود تھا (۷)۔ صحابہ کرام اس نے نقلیں تیار کرتے تھے، عہد خلافت راشدہ میں صحابہ کرامؓ کے پاس اس کی متعدد نقلیں موجود تھیں۔ اسے مزید استناد بخشنے کے لیے عہد صدیقی و عہد عثمانی میں از سر نو چھان پھٹک کر کے ایک مستند سرکاری نسخہ تیار کرایا گیا، باقی ذاتی و انفرادی نسخوں کو تلف کرنے کی ہدایت جاری کی گئی کہ دنیا بھر میں صرف ایک ہی مستند مصحف رائج ہو اور اللہ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ ہر دور میں سچا ثابت ہو۔

تمام آسمانی کتابوں میں یہ اعزاز صرف قرآن مجید ہی کو حاصل ہے کہ آغاز وحی ہی سے اسے لفظ بلفظ لکھ کر محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا، اموی و عباسی زمانہ میں تحریر و کتابت کے وسائل بڑھے تو سب سے زیادہ دلچسپی قرآن مجید کی کتابت میں دیکھی گئی، کئی خلفاء و امراء نے بذات خود کتابت قرآن کی سعادت حاصل کی اور مختلف خطوں میں مختلف طریقوں سے اسے لکھنے اور محفوظ کرنے کا اہتمام ہوتا رہا۔ ایسے متعدد باوقار نسخے دنیا بھر کے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

پریس کی ایجاد کے بعد قرآن مجید بھی پریس تک پہونچا، سب سے پہلے مستشرقین نے طبع آزمائی کی اور کچھ دسیسہ کاریاں بھی کیں، مگر اس کی حفاظت کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھی ہے۔ ان کے ارادے اور مقاصد واضح ہو گئے اور ان کے طبع کرائے ہوئے نسخے ضائع ہو گئے، سب سے پہلے اس مطبوعہ نسخے کو پذیرائی حاصل ہوئی جو

شیخ الازہر کی سرپرستی میں نہایت احتیاط کے ساتھ شائع کرایا گیا، پھر دنیا بھر میں ہر جگہ سے اس کی اشاعت عام ہوگئی (۸)۔

اشاعت قرآن کے باب میں ایک خوشگوار انقلاب ۱۴۰۵ ہجری میں رونما ہوا، جب شہر رسول مدینہ منورہ میں ملک فہد قرآن کمپلکس وجود میں آیا، اس ادارہ نے اشاعت قرآن کی ایک نئی تاریخ رقم کردی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں قرآن مجید کے بالکل صحیح نسخے عام کرنا اس کا بنیادی مقصد قرار پایا۔ اس نے سب سے پہلے دنیا بھر سے قرآن، علوم قرآن اور قرأت قرآن کے ماہرین کو جمع کرکے مروجہ نسخوں کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا اور غایت درجہ احتیاط کے ساتھ خط عثمانی پر ایک معیاری نسخہ تیار کرایا۔ پھر مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت کا نظم کیا، تمام اشاعتی اداروں میں اس کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے تین سطح پر نگرانی کا نہایت مستحکم نظام بنایا ہے۔ سب سے پہلے نص قرآن کی کتابت اور پروف ریڈنگ کی ایک ٹیم نگرانی کرتی ہے۔ اور ایک ایک نکتہ، اعراب اور علامات کو چک کرتی ہے، طباعت کے مرحلہ میں ہر سطح پر ایک مستعد ٹیم کھڑی رہتی ہے کہ اس کی کوالیٹی اور معیار پر کسی طرح کا حرف نہ آئے۔ پھر آخری مرحلہ میں تقسیم سے پہلے ایک ایک نسخہ کی نہایت باریک بینی سے جانچ ہوتی ہے کہ طباعت، جلد سازی یا کسی مرحلے میں کوئی کمی نہ رہ گئی۔ قرآن کمپلکس کا یہ دعویٰ ہے کہ نگرانی کا ایسا مستحکم نظام دنیا میں کسی اشاعتی ادارہ کے پاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پرنٹنگ ٹکنالوجی نے جتنی ترقی کی ہے اور جو جدید ترین آلات تیار کیے ہیں، پہلی فرصت میں یہاں حاصل کیے جاتے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

یہ ادارہ سالانہ ایک کروڑ نسخے تیار کرکے دنیا بھر میں تقسیم کراتا ہے، اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تحریری طور بھی قرآن میں کوئی تحریف یا اس کا اتلاف ممکن نہیں ہے۔ (۹)

لہجے اور قرأت کی حفاظت:

عہد خلافت راشدہ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ دور دراز علاقوں میں اسلام

کے پھیل جانے کی وجہ سے قراتوں اور لہجوں میں اختلافات رونما ہورہے ہیں، ان کے تدارک کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لغت قریش پر مشتمل معیاری نسخہ تیار کرا کے عام کرایا اور اسی کے مطابق قرأت کا اہتمام کرنے کے لیے ہر نسخے کے ساتھ قاری روانہ کیے کہ انہیں صحیح لہجہ پر قرأت سکھائیں۔ ساتھ ہی مختلف فیہ نسخوں کو تلف کرنے کا حکم جاری فرمایا تاکہ یہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کسی بڑے اختلاف کا پیش خیمہ نہ بنیں، اس زمانے سے اسی نسخہ کی پیروی ہوتی رہی، بیسویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے لہجوں اور قرأتوں کے تحفظ اور ترسیل کا مزید پختہ نظم کردیا، اب حرمین شریفین کے ائمہ کرام اور دنیا بھر کے مشہور قراء کی آواز میں ہزاروں کی تعداد میں آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگ موجود ہیں جو انگلی کی ایک جنبش پر ہر وقت دستیاب ہیں اور گھر، دفتر، سفر اور تفریح گاہ ہر جگہ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، اس جدید ٹکنالوجی نے ایک طرف قرآن مجید کے حصول واستفادہ کو آسان بنادیا تو دوسری طرف متن قرآن مجید کے ساتھ اس کے لہجوں اور قراتوں کی دائمی حفاظت کا بندوبست بھی کردیا، اب دنیا کے گوشے گوشے میں، ان خوبصورت آوازوں کی نقل ہورہی ہے۔ مہبط وحی سے نکلے ہوئے صوتی آہنگ سے آہنگ ملا کر دنیا ایک لہجہ اور ایک آواز پر مجتمع ہوتی جارہی ہے۔ اسے حفاظت قرآن کا قدرتی نظام نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید - دائمی دستور:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو صرف حفظ وتلاوت کی کتاب نہیں بنایا بلکہ اسے دستور حیات کی حیثیت عطا کی۔ اسے رہتی دنیا تک عالم انسانیت کا مرجع بنایا ہے اور اسے تمام عالموں کا نذیر بنا کر نازل کیا۔ (فرقان:۱) اس میں عالم انسانیت کے لیے فکر وعمل کا نظام اور اعتقادی، عملی، ظاہری، باطنی اور انفرادی واجتماعی گویا ہر شعبہ زندگی کے لیے واضح ہدایات رکھیں، تاکہ شفاف الٰہی ہدایات سے کوئی زمانہ خالی نہ رہے۔ آسمانی کتابوں میں یہ دائمی حیثیت کسی کتاب کو حاصل نہ تھی۔ اس کی اس دستوری حیثیت نے بھی اسے دائمیت عطا کی، آسمانی کتابوں میں یہ امتیاز صرف قرآن مجید کو حاصل ہے، اس لیے قرآن مجید کا

ہمیشہ ہمیش باقی رہنا اور دیگر کتابوں کے اعتبار کا ختم ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ یہ بھی حفاظت قرآن کا ایک قدرتی نظام ہے۔

دائمی ذکر:

قرآن مجید کی ایک حیثیت ''ذکر'' کی بھی ہے، قرآن مجید ہر دو معنی میں ذکر ہے۔ اس سے یاد دہانی اور سبق آموزی بھی ہوتی ہے اور اس کا ہر دم زبان و دل پر رواں رہنا بھی مطلوب ہے۔ قرآن و حدیث میں دونوں حیثیتوں کا بار بار ذکر آیا اور اس سے لگے رہنے میں اجر عظیم رکھا گیا ہے، اس سے مقصود بھی قرآن مجید کو ہر خاص و عام کے درمیان زندہ و تابندہ بنا کر رکھنا ہے تاکہ یہ پاکیزہ کلام ہر لحہ عوام میں گردش کرتا رہے اور دیگر آسمانی کتابوں کی طرح مذہبی پروہتوں کی جاگیر بن کر نہ رہ جائے چنانچہ نمازوں، دعاؤں، خطبات اور ہر عبارت میں آیات قرآنی کا ورد بھی اسے دائمیت بخشتا رہے۔

حفاظت کی راہ میں حائل ہونے والے اسباب کا سدّ باب:

ایسے مثبت اقدامات کے ساتھ ان اسباب کا بھی سدّ باب کر دیا گیا جن کی وجہ سے قرآن مجید کی حفاظت پر حرف آ سکتا تھا، بہت مشہور حدیث ہے کہ قرآن میں جو شخص اپنی طرف سے کچھ ملاتا یا کہتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے(۹)۔ اتنی سخت وعید کے بعد کس کی جرأت ہوگی کہ وہ قرآن میں حک و اضافہ کرے، آپ نے نزول وحی کے دوران احادیث مبارکہ کی نقل کی بھی ممانعت فرمادی کہ مبادئ قرآن مجید کے ساتھ اختلاط نہ ہو جائے، اسی طرح بھاری بھرکم چیزوں پر لکھے ہوئے اجزا قرآن کو سفر میں لے کر چلنے کی حوصلہ شکنی کی(۱۰)۔

اس پوری بحث سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ قرآن کی حفاظت روز اول سے پورے اہتمام سے ہوئی۔ اسے کافی وسیع پیمانے پر اپنی اصل شکل میں لفظ بہ لفظ یاد کیا گیا، نہایت احتیاط کے ساتھ لکھا گیا، اس کے الفاظ اور آیات زبانوں پر جاری رہے۔ اس کے احکام و مضامین ہر دم چرچے میں رہے اور اس کی حفاظت کو جن اسباب کی وجہ سے

خطرہ لاحق ہوسکتا تھا اس کا پیشگی سدباب کر دیا گیا۔اس طرح اللہ کی یہ کتاب پورے تواتر کے ساتھ نقل ہوتی ہوئی ہم تک ٹھیک اس حالت میں پہونچی ہے جس میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول کو مرحمت فرمائی گئی تھی۔واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت کے لیے ابتدا سے آج تک ایسے قابل اطمینان اہتمامات میسر آئے ہوں۔اسی لیے حاملین قرآن اس کے ۱۰۰ فیصد محفوظ رہنے کا دعوی کرتے ہیں۔اور تمام غیر جانبدار مورخین و محققین اس دعویٰ کو سچ تسلیم کرتے ہیں۔

حفاظت قرآن شکوک کے گرداب میں:

حفاظت قرآن مجید کے انتظامات کی جو تاریخ اوپر بیان کی گئی ہے، حدیث، تاریخ اور بالخصوص تاریخ قرآن کی کتابوں میں اسی طرح بیان ہوئی ہے اور یہی جمع وتدوین قرآن کی متفقہ تاریخ بھی ہے۔استشراقی مساعی نے جب سے زور پکڑا ہے، انہوں نے سیرت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کو خاص نشانہ بنا رکھا ہے، منجملہ دیگر اعتراضات کے مستشرقین نے حفاظت قرآن کی متفقہ تاریخ کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ان کا الزام ہے کہ:

۱- قرآن مجید جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا، پورا کا پورا محفوظ نہیں ہے۔کچھ آیات مصحف صدیقی وعثمانی میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔

۲- قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں کوئی منطقی ترتیب نہیں ہے، ترتیب کا عمل عہد نبوی میں پایہ تکمیل کو نہیں پہونچ سکا تھا۔یہ عہد صحابہ میں پایہ تکمیل کو پہونچا، جو ان کے ظن وگمان پر مبنی ہے۔

یہ دونوں باتیں بظاہر نہایت سادہ ہیں اور تحقیق کے پرفریب جامہ میں نہایت معصومانہ طور پر پیش کی گئی ہیں۔لیکن اگر ان پر یقین کرلیا جائے تو حفاظت قرآن کی پوری تاریخ شکوک کے گرداب میں آجاتی ہے۔تشکیک کی یہ کوشش اسی مذموم مقصد کے لیے انجام دی گئی ہے کہ اگر حفاظت قرآن کا دعویٰ مشکوک ہوجائے تو پوری شریعت اسلامی کا

اعتماد واستناد نا قابل اعتبار ہو جائے گا۔ان الزامات میں مستشرقین کی بدنیتی اپنی جگہ پر مگران کو مواد ہمارے بسیار نویس مصنفین ومورخین نے فراہم کیا ہے۔ان کتابوں میں چند ایسی روایات بھی راہ پا گئی ہیں جو اس متفقہ تاریخ سے متصادم اور جرح وتعدیل کے معیار پر کمزور، مرجوح یا نا قابل اعتبار ٹھہرتی ہیں۔اس موقع پر ان کا تذکرہ وتجزیہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جن بیانات وروایات کی وجہ سے شبہات پیدا ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی، اس وقت تک قرآن مجید کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا'' (۱۱)۔

۲- کتاب المصاحف میں ابن ابی داؤد نے ابن شہاب زہری کی سند سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سا قرآن نازل ہوا تھا۔لیکن جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ جنہیں پورا قرآن یاد تھا شہید ہو گئے، اس بنا پر قرآن کا خاصا حصہ ضائع ہو گیا اور اسے ضبط تحریر میں نہیں لایا جا سکا (۱۳)۔

۳- کتاب المصاحف ہی میں ابن ابی داؤد نے حضرت زید بن ثابت کے حوالہ سے ایک ہی مضمون کی سات روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد صدیقی یا عہد عثمانی میں تدوین کے وقت انہیں سورہ توبہ کی آخری دو آیات یا سورہ احزاب کی آیت ۲۳ نہیں مل رہی تھیں جو تلاش بسیار کے بعد خزیمہ ابن ثابت انصاری/ ابوخزیمہ / حارث بن خزیمہ / ابن خزیمہ کے پاس ملیں جنہیں تصدیق کے بعد شامل کر لیا گیا (۱۲)۔

مستشرقین نے اس پر اپنے قیاسات کا اضافہ کر کے اسے مزید دو آتشہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے چوں کہ قرآن مجید میں بار بار تذکرہ آیا ہے کہ قیامت جلد آنے والی ہے۔نبی ﷺ اپنی آنکھوں سے کافروں کا انجام دیکھ لیں گے،اس لیے یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ قیامت سے قبل نبی کی موت نہیں ہوگی، اس بنا پر نبی (ﷺ) کی زندگی میں وحی کو مدون کرنے کا کوئی محرک نہ تھا۔وفات نبوی تک حافظہ پر ہی زیادہ بھروسہ رہا۔تحریر وتدوین پر

زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ بالآخر عہد صدیقی وعثمانی میں تدوین قرآن پر توجہ دی گئی۔اس وقت تک کچھ حصہ معدوم ہو چکا تھا(۱۴)۔

اس نقطہ نظر کا سیدھا مقصد نص قرآنی کو مشکوک بنانا تھا، ان کو مواد ہمارے مآخذ سے میسر آ گیا، اس کو لے کر خوب دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ حالاں کہ ان الزامات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔عہد نبوی میں قرآن مجید کی حفاظت کا ہمہ جہت بندوبست تھا، چند آیات اور سورتیں تو دور کی بات ایک لفظ اور لب ولہجہ کی بہت عرق ریزی کے ساتھ محفوظ کر لیا گیا تھا، عہد صدیقی وعثمانی میں اسی سلسلہ کو مزید مستحکم کیا گیا ہے۔ان ادوار میں کوئی نیا واقعہ نہیں پیش آیا، اسی قرآن مجید کو جو عہد نبوی مروج تھا، اسے مزید چھان پھٹک کر دینا کے سامنے پیش کیا گیا، اللہ نے یہ سعادت ان جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے حصہ میں لکھی تھی کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی امانت کی حفاظت پر ان کے جانشین کتنے مستعد تھے۔محدثین ومحققین نے تحقیق وتنقید کے بعد انہیں مرجوح اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔جن شاذ روایات سے مستشرقین نے شکوک پھیلائے ہیں، یہ روایات ہمیشہ محدثین وناقدین کے درمیان زیر بحث رہی ہیں، ان میں بعض روایات کا مفہوم غلط لیا گیا ہے، بعض سند کے اعتبار سے کمزور ہیں اور یہ روایات ان صحیح اور معتبر روایات سے ٹکراتی ہے جو حفاظت قرآن وتدوین قرآن کی شفاف اور متفقہ تاریخ بیان کرتی ہیں(۱۵)۔

جہاں تک آیات اور سورتوں کی ترتیب کا سوال ہے، اس سلسلے میں نہایت واضح اور صریح روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نزول وحی کے وقت ان کا مقام متعین فرمادیتے تھے اور کاتبین وحی کو کہتے کہ تازہ نازل ہونے والی وحی کو فلاں فلاں مقام پر رکھا جائے،صرف ایک روایت ایسی موجود ہے جس میں حضرت عثمان غنیؓ سے منقول ہے کہ انہیں سورہ توبہ کا مقام معلوم نہ تھا، مضمون کی مناسبت کی وجہ سے اسے سورہ انفال کے ساتھ رکھ دیا، آیات کی ترتیب کے سلسلے میں تو کوئی اختلاف کبھی رونما ہی نہیں ہوا، البتہ کچھ لوگوں نے اسی روایت کی بنیاد پر سورتوں کے اجتہادی ہونے کی بات کہی ہے، حالاں کہ یہ روایت بجائے خود اپنے آپ میں توقیفی ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ تمام سورتوں کا مقام ومحل معلوم تھا،

صرف سورہ توبہ کا معلوم نہ تھا، محدثین نے طویل روایت میں اس ٹکڑے کی توجیہہ کی ہے، بقیہ پوری روایت سے سورتوں کے اجتہادی کے بجائے توقیفی ہونے پر استدلال کیا ہے۔ سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں متقدمین کے درمیان کچھ اختلافات رہے ہیں، مگر وہ بھی تکنیکی امور تک، جہاں مصحف عثمانی کی ترتیب اور اس ترتیب کی بہرطور پاسداری کا سوال ہے، اس پر عہد صحابہ سے اجماع چلا آرہا ہے اور اس کے خلاف ورزی کسی کے یہاں بھی درست نہیں۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک علیحدہ مقالہ میں تفصیلی بحث کی ہے تفصیلات کے طالب اس سے رجوع کر سکتے ہیں (۱۶)۔

الغرض حفاظت قرآن کا الٰہی وعدہ تاریخ کے ہر دور میں نہایت اہتمام کے ساتھ وفا ہوتا رہا۔ بلکہ زمانے کی ترقی کے ساتھ اس کی حفاظت کے اسباب وذرائع میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا ہے، الحمدللہ آج کے دور میں صورت حال یہ ہے کہ اسے معاندین قرآن کسی طرح بھی مشکوک ومعدوم کرنا چاہیں، اس میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس لیے اس کی حفاظت پر اللہ کا پہرہ ہے۔ اور یہی انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون کی عملی وحقیق تفسیر ہے۔

حواشی

۱- یہ پیمانہ مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نے بنایا ہے۔ دیکھئے قرآن مجید کا تعارف، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۴ء

۲- ڈاکٹر موریس بوکائے، بائبل قرآن اور سائنس کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۳- ان افضلکم من تعلم القرآن وعلمه / خیر کم من تعلم القرآن وعلمه، بخاری، کتاب فضائل القرآن باب خیر کم من تعلم القرآن ۵۰۲۷/۲۸

۴- قاضی القضاۃ ایسے لوگ بنائے جاتے جن کو قرآن مجید زیادہ یاد ہوتا، آنحضور مدینہ سے باہر جاتے وقت اپنا قائم مقام حضرت ابن ام مکتوم کو بناتے، اس لیے

کہ انہیں قرآن زیادہ یاد تھا، یہاں تک کہ غزوہ احد کے شہدا کی تدفین کے وقت بھی ان حفاظ کرام کو مقدم رکھا گیا جنہیں قرآن زیادہ یاد تھا، دیکھئے مفتی عبد اللطیف رحمانی، تاریخ القرآن، حضرت شاہ ابوالخیر اکیڈمی، ۱۹۸۳ ص ۴۲

۵- مجمع الزوائد، ج ۱ ص ۶۰ بحوالہ تاریخ القرآن، ص ٦٦

۶- ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان، من قضایا القرآن ص ٦٦

۷- ڈاکٹر صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن دار العلم للملابین، بیروت ۱۹۸۵ء، ص ۷۰،۷۱

۸- صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، ۹۹، ۱۰۰

۹- بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب استذکار القرآن ولقاہدہ۔

۱۰- من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعده من النار ، ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیه.

۱۱-

۱۲- بخاری، کتاب فضائل القرآن اس روایت محل اور تعبیر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان، تاریخ تدوین وجمع قرآن، مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۲۰۱۱ء ص ۱۱ نیز تاریخ القرآن ص ۷۰

۱۳- ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص ۲۳

۱۴- تاریخ تدوین وجمع قرآن ص ۱۸-۲۰

۱۵- ڈاکٹر محمد عارف عمری، اسلام اور مستشرقین، دار المصنفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۶، جلد ۷ ص ۱۰

۱۶- مفتی عبداللطیف رحمانی، تاریخ القرآن، اسماعیل احمد الطحان، تاریخ تدوین وجمع قرآن

۱۷- اشہد رفیق ندوی، تحقیقات اسلامی، قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب جلد ۷ شمارہ ۳، ص ۳۸-۵٦

رجوع اِلی القرآن کی دعوت - جہات ومعانی

محمد یٰسین مظہر صدیقی

یہ کوئی نئی دعوت ہے اور نہ کوئی نیا نعرہ۔ سلف سے خلف تک ہر دور میں قرآن کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا جاتا رہا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی دعوتِ اسلامی کا آغاز اسی سے کیا اور قرآن مجید کو دعوت کا محور بنایا۔[1] خلفاء راشدین نے ہمیشہ کتابِ الٰہی کی طرف بلایا اور خاص حالات اور ہنگامی معاملات میں اسی کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔[2] اموی خلفاء و امراء سے عباسی دور تک اور بعد کے تمام ادوار میں تمام اہلِ دین وسیاست اور علماء وفقہاء کی دعوت یہی ہوتی تھی۔ خیرالقرون سے دوری بڑھی تو فکر ونظر کی بیماریاں در آئیں، ان کو دور کرنے کے لیے تمام اہلِ حق نے کتاب اللہ کو تھام لینے کا مشورہ دیا۔[3]

خیرالقرون میں بالعموم اسے اعتصام بالکتاب والسنۃ یا تمسک بالقرآن والحدیث سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس میں سنت وحدیث کا اضافہ کسی غیرِ قرآن یا غیر مقصود کا اضافہ نہیں ہے جسے دخل در معقولات قسم کی چیز سمجھا جائے۔ کتاب وسنت یا قرآن وحدیث کا تعلق لازم وملزوم کا باہمی ارتباط ہے، دونوں وحیِ الٰہی کی مشکوٰۃ سے ہی برآمد ہوئے ہیں۔ اسی لیے رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مرضیِ الٰہی کی تشریح وتعبیر اپنی حدیث سے فرماتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی تفہیم وتشریح، دین اسلام کی پیروی اور شریعت کی اتباع ان دونوں پر ہی منحصر ہے۔[4]

حدیث وسنت کو قرآن مجید کے ساتھ لازمی ارتباط دینے پر خالص اہلِ قرآن کی جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دینے والوں میں

سے متعدد افراد و طبقات کو بھی اس تلازمِ باہمی سے ناگواری خاطر ہوتی ہے۔ مگر اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی فہم اسی جامعیت کی داعی ہے۔ سلف و خلف کے تمام محدثین وفقہاء، مجتہدین وعلماء، مصلحین وزعماء اور دوسرے سب اہلِ فکر ونظر ان دونوں کی طرف ہی دعوت دیتے ہیں۔ عظیم ترین خلفاءِ اسلام اور سرخیل امت صحابہ کرام بسا اوقات ''کتاب اللہ'' سے مراد مجموعۂ قرآن وحدیث لیتے ہیں۔[۵]

بلاشبہ قرآن مجید بنیادی متنِ کلامِ الٰہی ہے اور اس کی بہت سی آیاتِ بینات صرف اسی کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ ارشاد و ہدایت اور تبلیغ و ترسیل اور تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر اور تمام معاملاتِ بشری کی اصلاح میں ان ہی کا جلوہ ملتا ہے۔ قرآنی آیاتِ کریمہ کا ہی بنیادی مقام و مرتبہ آتا ہے، ان ہی کی انسانیت نوازی اور آدم گری کی صداقتیں بیان کی جاتی ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے ان ہی کی طرف اول اول دعوت دی تھی اور تمام دوسرے علماء و اہل نظر نے بھی ان کی طرف بلایا تھا۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت کی طرف پلٹنے بلکہ اسے اختیار کرنے کی دعوت بھی دی تھی، یہ قرآن مجید ہی کا تقاضا ہے۔[۶]

خالص قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے، اس سے تمسک کرنے اور اس کی پیروی کرنے کی دعوت دینے کے اسباب ہیں۔ سلفِ صالحین کے بعد کے ادوار میں اہلِ فکر ونظر کا مرجع و مصدر اور مقصد و مطمح قرآن مجید کے علاوہ متعدد دوسرے علوم بن گئے۔[۷] تمام ادوارِ اسلامی میں صالح افراد و طبقاتِ امت کے لیے سرمایۂ ہدایت و بصیرت اور نورِ علم و عرفان صرف قرآن مجید ہی رہا۔ مادی خواہشات، فکری میلانات، علمی انحرافات، مسلکی تعصبات اور متعدد دوسری چیزوں نے قرآن مجید کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل اور فکروں سے دور کر دیا۔ صلحائے امت نے اسی لیے تمام افراد و طبقات کو قرآن مجید کی طرف پلٹنے کی دعوتِ جدید دی۔

رجوع الی القرآن کی دعوت بڑی مبارک ہے اور اتنی ہی لازمی، نہ صرف اہل

اسلام بلکہ تمام عالم انسانیت کو اس کی طرف بلانا، اس سے جوڑنا اور اس پر چلانا ہے کہ اسی میں ان سب کی دنیاوی واخروی فلاح و بہبود ہے، اسی میں امن عالم کی ضمانت موجود ہے۔ قرآن مجید کی طرف دعوت دینے اور اسے قبول کرنے کے مختلف معانی و جہات ہیں۔ قرآن مجید، حدیث وسنت نبوی، طریقہ وتعاملِ صحابہ، مسلکِ سلف و خلف اور طریق علماء و مفسرین و محدثین سب ہی ان مختلف معانی اور جہات اور ان کے مراحل کو بیان کرتے ہیں۔ اس مقالے میں چند عناوین کے تحت ان مراحل و جہاتِ دعوتِ قرآن کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کی طرف رجوع کی دعوتِ عام

بہت سی آیات قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید سب انسانوں کے لیے ہے، صرف مسلموں کے لیے نہیں، اس سے عوام وخواص، تعلیم یافتہ و ناخواندہ، عرب و عجم، مرد و عورت اور ہر فرد بشر استفادہ کر سکتا ہے اور ہدایت پا سکتا ہے۔ اس لیے تمام انسانوں کو خاص کر ایمان والوں کو قرآن مجید کی طرف بلانا اور اس سے جوڑنا چاہیے۔[۸] رجوع الی القرآن کی دعوت دینے والوں میں یہ احساس وشعور سب سے غالب ہے اور بلاشبہ وہ مبارک بھی ہے اور لازمی بھی۔ ان کی حساسیت کی یہ وجہ بھی بہت قابلِ رشک وافتخار ہے کہ عوام تو عوام، خواص امتِ اسلامی بھی قرآن مجید سے کٹ گئے ہیں۔

امتِ اسلامی کی عالمی تاریخ وتہذیب کی یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ غیر اسلامی افکار ونظریات نے عوام وخواص کو قرآن مجید سے دور کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا۔ علمی شغف اور فنی وابستگی نے بھی اصل مصدر سے دور کیا۔ طرح طرح کے نظریات و رجحانات نے ان کو غیر قرآنی مشاغل میں الجھا لیا اور قرآن مجید کی بجائے اپنا اسیر وقیدی بنا لیا۔ فلسفہ وعلم کلام، تصوف وطریقت، علوم جدیدہ اور نت نئے ابھرنے والے رجحانات نے قرآن مجید کی مرتبت پر چھاپہ مارا حتی کہ صحیح اسلامی علوم اور ضروری فنون میں حد سے زیادہ انہماک نے اہل حدیث وصاحبانِ فقہ کو بھی اصل متنِ اسلام سے دور کر دیا۔[۹]

طاقِ نسیاں اور مشکوٰۃِ تبرک میں قرآن مجید کو سجا دینے کا جرم عظیم دراصل عوام

سے زیادہ خواص کا ہے۔عوام تو اپنے زمانے کے خواص کے پیرو ہوتے ہیں، وہ اتنی سوجھ بوجھ، زبان و معانی کی فہم اور حکمت و تدبر نہیں رکھتے جو ضروری ہے۔ یہ دراصل خواصِ امت کا فریضہ ہے اور ہر زمانے میں رہا ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو کتاب سے جوڑیں اور عوام کو بھی اس سے جوڑیں۔خواصِ امت کے بیشتر طبقات کا جرم دوگنا ہے کہ وہ خود تو خرافات میں کھو گئے اور عوام کو بھی منجدھار میں لے ڈوبے۔انھوں نے ایک طرح سے قرآن مجید کو عوام سے دور کر دیا اور ان پر کتابِ الٰہی کی تلاوت، فہم و تفہیم اور ہدایت کے دوازے ہی بند کر دیے۔۱۰

تلاوت و تفہیم کا ارتباط

عربی زبان مادری اور علمی زبان ہونے کی وجہ سے رسولِ اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور سلفِ صالحین کو تلاوتِ قرآن یا سماعتِ قرآن سے ہی اس کی تفہیم حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ سہولت تو منکرین و مشرکین عرب خاص کر اکابرِ قریش کو حاصل تھی۔کانوں کے ذریعہ ان کے دلوں میں بات اتر جاتی تھی مگر دماغوں کی کجی اور ذہنوں کی پراگندگی ان کو قبولِ حق پر آمادہ ہی نہ ہونے دیتی تھی۔اہلِ ایمان، صحابہ کرام اور دوسرے متلاشیانِ حق کو سماعت و قراءتِ قرآن سے الفاظ و متن کی خوبصورتی اور معانی کی ہمہ گیری کا ادراک ہو جاتا تھا۔تلاوت و قراءت اور سماعت و حسنِ استماع کے باوجود ان پر معانی و مفاہیم کی گرہیں نہ کھلتیں تو صاحبِ وحی ﷺ سے رجوع کرتے تھے۔۱۱

تلاوتِ قرآن مجید ایک علیحدہ حکم، مستقل فریضہ اور سنتِ موکدہ اختلافِ احوال و ظروف میں بتایا گیا ہے۔رسولِ اکرم ﷺ کو متعدد آیاتِ قرآنی میں صرف تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ انفرادی بھی تھا اور بطور فرض منصبی بھی۔ وہ نماز کے باہر کا بھی ہے۔ تلاوتِ قرآن مجید اسی بنا پر تمام اہل ایمان کے لیے ایک سنت و فریضہ بھی ہے اور اس پر تمام سلف و خلف کا پیہم تعامل رہا ہے، وہ رجوع الی القرآن کی دعوت کا سرنامہ ہے۔عربی زبان جاننے والوں، عربوں اور ماہرین کے لیے بھی اور عجمیوں اور عامیوں کے لیے بھی۔ وہ محض

ایک تعبدی سنت اور اجر وثواب کی عبادت ہی نہیں بلکہ کلام الٰہی سے ہر عام وخواص کو جوڑنے اور اس سے ربط رکھنے کی سبیل بھی ہے[۱۲]۔ وقتاً فوقتاً یہ نعرہ خاص مصلحین اور داعیوں کی طرف سے لگتا رہا ہے کہ محض تلاوت وسماعتِ بلا تفہیم سے کیا حاصل؟[۱۳] وہ تلاوتِ قرآن کو محض ایک رسمی چیز قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے ہیں یا رجوع الی القرآن کی دعوت میں اسے نہیں شمار کرتے۔ وہ ان کی انتہا پسندی ہی نہیں، سنتِ نبوی وصحابہ کرام کی خلاف ورزی اور حکمتِ الٰہی اور تاثیرِ قرآنی سے ان کی خالص بے خبری بھی ہے۔ الفاظ وکلمات یا دوسرے الفاظ میں صرف عربی متنِ قرآن کریم کی زبان سے تلاوت اور کان سے سماعت باعثِ انقلاب وسعادت ہے۔ کتنے واقعاتِ سیرت وتاریخ ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ قراءتِ قرآن سن کر اور خود اس کی قراءت کر کے بہت سے لوگ دلوں کے انقلاب وطہارت سے گذرے۔ صرف اہل زبان اور عرب ہی نہیں، زبانِ قرآن سے ناواقف افراد وطبقات اس کے جمال وجلال سے تھرا اٹھے اور ان کی روحیں متاثر ہوئیں۔[۱۴]

خواص وعوام کے لیے قرآن مجید-تلاوت

عام وخاص، ادنیٰ اور اعلیٰ، ناخواندہ وتعلیم یافتہ، پست وبالا، جاہل وعالم کا فرق فطری ہے اور اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ دینی معاملات تک میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے اور اسلام ودین اور شریعت کا یہ ایک مسلمہ اصول اور حکمتِ نبوی کی ایک اہم شق ہے۔ قرآن مجید اور حدیث وسنت اور تاریخ وسیرت سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین میں عوام کا نصاب ہلکا پھلکا اور آسان بنایا گیا ہے۔ عوام سے اوپر اہل علم وتعلیم یافتہ کے افراد وطبقات کا نصاب اس سے بلند تر ہوتا ہے اور محسنین ومقربین کا سب سے اعلیٰ اور مشکل ترین بھی۔ ارکانِ نماز وروزہ وصدقہ وغیرہ ہوں یا دوسرے معاملاتِ دینی، سب میں یہ قریب قریب تین سطحی نصاب ملے گا، قرآن کی تلاوت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ سورہ مزمل کی آخری آیات کریمہ میں تلاوت قرآن کی تیسیر کا اصول ہے کہ مجاہدین ومسافرین، تجار واہل بازار وغیرہ کی مشغولیات ہوں گی، ان میں مریضوں اور دوسرے معذوروں کا بھی لحاظ ملتا ہے اور اسی بنا پر

ان کے لیے صرف اتنی تلاوت و نماز کا نصاب مقرر کیا گیا ہے جو ان کے لیے آسان ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سہمیؓ کی مشہور حدیث ہے کہ قرآن مجید کی قراءت و تلاوت کرنے کا نصاب رسولِ اکرم ﷺ سے پوچھا۔ آپ ﷺ نے ان کو ایک ماہ میں پورا قرآن پڑھنے کا حکم دیا مگر جوانی اور طاقت کی بنا پر زیادہ کی طلب تھی لہٰذا آپ ﷺ نے اضافہ فرما دیا اور مزید اضافہ ان کے جوش و خروش پر کیا مگر اس کی حد بندی بھی کر دی کہ ایک حد کے بعد تکمیلِ قرآنی نہ کریں۔ ان کو اپنے تقاضے پر بعد میں خاصی ندامت ہوئی کہ رخصت نہ قبول کی اور شدت نصاب نے ان کے بڑھاپے میں ان کے کس بل نکال دیے۔[۱۴]

سلفِ صالحین نے اس سہ گانہ نصاب کا حکم ہی نہیں سنا بلکہ اس کی حکمت و افادیت بھی پوری طرح جان لی، اسی لیے قرون خیر کے دورِ دوم یا دورِ سوم میں قرآن مجید کے عام نصاب کے اجزا تیس مقرر کیے کہ ایک ماہ میں تلاوت قرآن کامل ہو جائے۔ حفاظ و قراء اور علماء و اکابر کے لیے منازلِ سبعہ کا تعین کیا جو سنت و حدیث کی حکمت اور مزاج و فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔[۱۵] اس سے کم کی حد تک اترنا ان دونوں کے خلاف تھا لہٰذا اس کی حد بندی نہ کی، فرد بشر کی حرص دینی پر اسے چھوڑ دیا مگر پسند نہ کیا۔ اسلام نے اپنے دینی معاملات، تعبدی امور اور تشریعی مسائل سب میں اعتدال و توازن کا حکم و نصاب لازمی و ناگزیر بنا دیا۔ اس کے لیے چند شرائط بھی عائد کر دیں تا کہ جوش و خروش ایمانی حد سے متجاوز نہ ہو۔ قراءتِ قرآن میں ترتیل کا حکم اور تحسین آواز کی شرط اور آیاتِ کریمہ کے اختتام کی رعایت وغیرہ اسی اعتدال و توازن کی خاطر ہے اور اس کے بغیر تلاوت محض خانہ پری رہ جاتی ہے۔[۱۶]

حفظِ قرآن کا نصابِ سہ گانہ

دعوتِ رجوع الی القرآن کا اگلا مرحلہ حفظِ قرآنِ کریم کا ہے۔ وہ نماز کے لیے تو شرط و فرض ہے ہی، عام ایمانی زندگی کی طہارت و پاکیزگی کے لیے بھی لازمی ہے۔ حفظِ قرآن مجید سے شعوری اور غیر شعوری طور سے ذہن و قلب پر اثر پڑتا ہے۔ حکیمانِ اسلام

نے ماہرینِ نفسیات سے بہت پہلے یہ حقیقت بیان کر دی تھی کہ ''یاد'' کا خانۂ دماغ سوتے میں بھی بیداری کی طرح کام کرتا ہے۔ حفظِ قرآن سے کلامِ الٰہی زبان ہی پر نہیں چڑھتا وہ دماغ کے اندرون میں اور قلب کے نہاں خانے میں سما جاتا ہے اور تحریک پیدا کرتا ہے۔ بلاشبہ اس کا نصاب بھی سہ گانہ ہے۔ وہ سیرتِ نبوی اور اسوۂ نبوی سے بھی ثابت ہوتا ہے اور صحابہ و سلف کے طریقوں سے بھی۔ [۱۷]

عام نصابِ حفظ و تحفیظ عہد نبوی میں یہ رہا ہے کہ آپ ﷺ عام صحابہ کرام کو صرف چند سورتیں یاد کراتے تھے۔ اس کا بہت ذکر ان صحابہ کرام کے نصابِ تعلیم میں آتا ہے جو مختلف بدوی قبائل سے اور اطرافِ عرب سے مکہ مکرمہ خدمتِ نبوی میں آتے تھے۔ [۱۸] دس پندرہ دنوں تک یا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک ان کی تعلیم و تربیت کا بنیادی نصاب چلتا تھا جس میں حفظ قرآن بھی شامل ہوتا۔ تجارتی شاہراہوں اور حج و زیارت کعبہ کے راستوں کے قریب بسے ہوئے قبائل کے افراد اور بعض طبقات بھی اپنی بساط بھر قرآن یاد کر لیتے۔ ان میں حضرت عمرو بن ابی سلمہؓ کا واقعہ بخاری اور ابوداؤد میں ہے۔ مؤخر الذکر کے مطابق ان کا بیان ہے: وکنت غلاما حافظا فحفظت من ذلک قرآنا کثیراً۔ [۱۹] تجارت و زیارت کے قافلوں اور ان کے میر کاروانوں کا کردار بڑا مؤثر و کارگزار رہا کہ وہ زبان رسالت مآب ﷺ سے جو سنتے یاد کر کے روایت و ترسیل کرتے اور ان کے تسلسل آمد و رفت سے قرآن مجید کی تازہ منزّل آیات اور سورتیں دوسروں تک اسی حفظ کے ذریعہ پہونچتی تھیں اور بسا اوقات ان میں ''حفاظ قرآن'' اور ''مبلغینِ کلام الٰہی'' میں ایسے افراد کی اکثریت ہوتی جو ایمان و اسلام کی علم بردار نہیں ہوتی تھی۔ [۲۰]

حفظِ قرآن کریم کے اعلیٰ مراحل میں بیش تر یا کافی قرآن کریم یاد کرنے کا دوسرا درجہ تھا کہ وہ حفاظِ کل نہ ہوتے تھے۔ حفاظ و علماء قرآن مجید کا سب سے اعلیٰ طبقہ ''قراء'' کہلاتا تھا اور سرخیلِ علماء ہوتا تھا۔ ان کی تعداد پہلے دو طبقات کے مقابلے میں کم ہوتی تھی۔ [۲۱] حفظِ قرآن کی تحریک کی خاطر اجر و ثواب کا وعدہ الٰہی بھی ہے اور سنت و حکمتِ نبوی بھی۔ عام دینی زندگی میں ہی نہیں، موت کے بعد زیادہ۔ حافظ قرآن کو ترجیح دینی سنتِ نبوی تھی اور

اکابر صحابہ جیسے حضرات شیخین کی موجودگی میں غلامانِ نبوی اور موالی اور فروتر قراء کرام امامت کرتے تھے۔۲۲

تفہیمِ قرآن کے منازل

افہام وتفہیمِ قرآن مجید کے مختلف مرحلے ہیں: وہ اپنے متن وشرح کے اعتبار سے بھی ہیں اور فہم حاصل کرنے والوں کے معیارِ علم اور قدرِ ضرورت کے لحاظ سے بھی۔ حدیث وہدایتِ نبوی کہ لوگوں کی عقلوں اور ذہنی معیاروں کے مطابق سلوک کرنا چاہیے، یہاں بھی اصولِ رہنما ہے۔ وہ فطری صلاحیتوں اور اکتسابی لیاقتوں دونوں کے مختلف بلکہ گونا گوں منزلوں کی نشاندہی کرتی اور احوال مختلف میں رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیاتِ کریمہ میں فہم وعقل، اخذ وقبول اور تفہیم وتعلیم کے متعدد انسانی مراتب واحوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں عامی وخاص، خواندہ وناخواندہ، صاحبِ علم اور معمولی جاننے والے اور بلند درجاتِ فہم وذکا پر فائز افراد وطبقات کا فرق ملتا ہے۔۲۳

تعلیم وتدریسِ نبوی اور نصابِ صحابہ واکابر کا تجزیہ بتاتا ہے کہ عام افراد وطبقات کو صرف چند سورتوں اور ضروری آیات کریمہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ عہد نبوی وعہد صحابہ میں بلاشبہ اہل زبان تھے اور عربی مبین جاننے کے سبب قرآن مجید خوب سمجھتے تھے مگر ان کی فہمِ قرآن کی حدود بھی تھیں اور ان کے ذہنی معیار اور علمی اعتبار سے صرف ان کی ضرورت کے مطابق اجزاء قرآن کی تفہیم کی جاتی تھی حتی کہ ان کو سبعۃ احرف میں سے کسی پر قرآن کریم کی تلاوت کا اختیار دیا جاتا تھا جو ان کی مادری زبان کے لہجوں اور مخارج سے مطابقت رکھتا تھا۔ بلاشبہ قرآن مجید کا نزول لسانِ قریش پر ہوا تھا کہ وہ فصیح وبلیغ ترین زبان ہی نہیں تمام عرب میں اپنی قراءات ولہجات کے لیے مقبول تھی۔ اس کے باوجود جب بلند سطح کے حرفِ قرآنی کا تقاضا ہوا تو قریش ہی کے دو اکابر حضرات عمر بن خطاب عدوی اور ہشام بن حکیم اسدی رضی اللہ عنہما کو سورہ فرقان کی قراءاتِ مختلفہ یا تنزیل قرآن مجید کے دو حروف پر تعلیم خود رسولِ اکرم ﷺ نے دی تھی اور ان دونوں کی فہم ان سے متاثر ہوئی تھی۔ احادیث

نبوی میں رسولِ اکرم ﷺ کی ایک حدیث خاص ملتی ہے کہ چار اصحاب سے قرآن کی تعلیم حاصل کی جائے اور وہ تھے: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ۔ ایسی دوسری احادیث بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے عظیم ترین قاریوں اور معلمین کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام عظیم معلمین قرآن کا خاص ذکر ان کی خاص فہم قرآن اور ضبط کتاب کی بنا پر ہی تھا۔ ۲۴

متنِ قرآن مجید کی تفہیم بنیادی اور اہم ترین مقصود ہے۔ اس کی خاطر آیات قرآنی پر تدبر و تفکر کی دعوت ہر عام و خاص کو دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن مجید نے محکمات و متشابہات کا فرق بیان کر کے واضح کیا ہے کہ محکمات تمام مخاطبین واہلِ ایمان کے لیے ہیں اور متشابہات پر غور وخوض اور ان کے معانی و مفاہیم میں غواصی کرنا صرف راسخین فی العلم (علم میں رسوخ رکھنے والوں) کا ہی کام ہے۔ آیاتِ احکام اور مقاماتِ دقیق کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے کہ وہ صرف ان کے لیے ہیں جو استنباط و تفہیم کی بلند پروازی کے مالک ہیں۔ عوام اور فہم وذکا اور عقل رسا سے کم حصہ پانے والوں کو ہدایت ہے کہ وہ ان کو رسولِ اکرم ﷺ اور اہل علم کے حوالے کر دیا کریں اور خود نہ غور کریں کیونکہ ان کا علم وفہم دونوں ان آیات واحکام کا احاطہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔ وہ صرف اولوا الالباب، اولوا العلم اور صاحبان فکر واستنباط کا کام ہے۔ وہ علم وفکر سے بھی مالا مال ہیں اور ان کی وجہ سے آیاتِ الٰہی سے معانی واحکام کا استنباط بھی کر سکتے ہیں۔ ۲۵

مکی عہدِ نبوی میں تنزیل قرآن مجید کی ایک اہم حکمتِ الٰہی یہ بھی رہی تھی کہ کفار و مشرکین کے معیارِ فکر وعمل کے موافق رہے۔ مکی سورتوں میں قریشی فصاحت و بلاغت کے افتخار وتکبر کا جیسا لحاظ رکھا گیا ہے وہ مدنی سورتوں میں نہیں ہے کہ وہاں وہ غرور وتکبر نہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مکی دور میں اپنی تبلیغ ودعوت کا بنیادی محور قرآن مجید کو بنایا تھا، صرف بطور مقدمہ کلمۂ ایمان وشہادت پیش فرماتے تھے۔ عام افراد وطبقات، اہل علم اور صاحبانِ فہم اشخاص اور اکابر قریش وقبائل کو دعوت دینے میں آپ ﷺ نے مناسبِ حال آیات کریمہ اور بسا اوقات سورتوں کا انتخاب فرمایا تھا۔ یہ محض وقت پر سوجھ جانے یا زبان پر آیاتِ قرآنی

کا بلالحاظِ مواقع آ جانے کا معاملہ نہیں تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اور اشخاص و سامعین اور مخاطبین کے فکر و فہم اور علم و عقل کے مطابق آپ ﷺ آیات کریمہ پیش فرماتے تھے۔ مثلاً اکابر قریش میں عتبہ بن ربیعہ، عاص بن وائل وغیرہ اور سرداران قبائل میں سوید بن صامت، اعشیٰ، طفیل بن عمرو وغیرہ کو مناسبِ احوال آیات سنائی تھیں۔ صحابہ کرام بھی موقع و محل کی نزاکت کا لحاظ کرتے تھے۔ اس کی مثال دربارِ نجاشی میں حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی تلاوتِ سورہ مریم ہے ۲۶۔ اسی طرح وفدِ حبشی اور وفدِ نجرانی سے کلام و تبلیغ میں خاص حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام سے متعلق آیات کا انتخاب حکمتِ تبلیغ بتاتا ہے۔ اکابر قریش نے احبار یہود مدینہ سے جو علمی سوالات برائے مناظرہ پوچھے تھے ان کا ذکر سورۂ کہف کی آیات میں ملتا ہے جو علم غیب الٰہی کا اظہار کرتا ہے۔

متنِ قرآن کا نصابِ ولی اللّٰہی :

بقولِ شبلی گرامی اسلام کے دمِ پسیں میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جیسی عبقری شخصیت اپنے معارفِ اسلامی کے لیے فخرِ ملتِ اسلامی ہے جس کے سامنے غزالی، رازی اور ابن رشد جیسے امامانِ وقت اور صاحبانِ علم و فضل کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔ ۲۷ ان کے معارفِ اسلامی میں اولین مقام قرآن مجید کی تفہیم و تعلیم کو حاصل ہے اور اسی کے ذریعہ وہ تمام افراد و طبقاتِ ملت کو دعوت رجوع دیتے ہیں۔ ان کے دلنشیں اور موثر و کرب آمیز اسلوب میں تمام طبقاتِ امت کو قرآن کی طرف پلٹنے اور اسی سے ہدایت طلب کرنے کی ندا ملتی ہے۔ ان کا خاص دعوت نامہ اہلِ تصوف کے نام ہے جو کتبِ تصوف اور رسائلِ مشائخ تو پڑھتے ہیں مگر کتابِ الٰہی نہیں پڑھتے۔ حضرت شاہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ قرآن فتح الرحمٰن کے مقدمے میں ان اصحاب طریقت کو اور دوسروں کو مخاطب کیا ہے۔

اس نصابِ ولی اللّٰہی کا خاص نکتہ یہ ہے کہ اصحابِ طریقت صرف ترجمۂ قرآن کریم ہی پڑھا کریں اگر وہ کتابِ الٰہی کی زبان عربی سے ناواقف ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ اپنی تالیف فتح الرحمٰن کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ روزانہ کسی وقت ایک دو رکوع

کا ترجمہ اور حواشی فتح الرحمٰن پڑھ لیا کریں تو ان کو صحیح تذکیر مل جائے گی اور رفتہ رفتہ وہ تکمیلِ قرآن کر کے اس کے تمام بنیادی مطالب ومعانی سے بھی آگاہ ہو جائیں گے۔ یہ عوام کے تمام طبقات کو قرآن سے جوڑنے کی تحریک ہے۔ اس کا طریقہ بھی بتایا ہے کہ انفرادی قراءت کے علاوہ اگر وہ ترجمۂ قرآن کو اپنے حلقوں میں پڑھا کریں تو اور بھی مفید ہوگا۔ ایک شخص قراءتِ متن وترجمہ کرے اور دوسرے اسے غور سے سنیں اور باری باری سے اس حلقہ کے لوگ قراءت کیا کریں۔ کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں کی مجلس میں ظاہر ہے کہ صرف صاحبِ علم ہی قراءت کریں گے اور باقی سن کر استفادہ کریں گے۔[۲۸] ایسے حلقے اور مجالسِ قرآنی ہر محلے اور ہر آبادی میں ہونے چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک کلام الٰہی پہونچے۔ بہت سے علماء، اصحابِ شریعت وطریقت، معلمین ومذکرین نے حضرت شاہؒ کے اس نصاب وطریق قرآنی کو جاری کیا اور بیش تر نے ان کو مساجد میں خاص کر نماز جمعہ کے بعد صبح یا شام کے اوقات میں جب لوگ فارغ ہوں ایک رکوع کا معنی ومطلب بتایا۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اس قسم کی تذکیر قرآنی سے لوگوں میں خاصی دلچسپی پیدا ہوئی اور خواص کے علاوہ عوام میں بھی بہت سے خواندہ لوگوں نے قرآن مجید کے متن اور ترجمہ سے استفادہ کیا تھا اور کلام الٰہی سے واقف ہوئے۔[۲۹]

تشریحِ متنِ قرآن کریم:

فتح الرحمٰن کے نصاب وطریق متنِ قرآن سے تشریح کی ضرورت کا ذکر آچکا کہ بسا اوقات ترجمہ کے ساتھ مختصر تشریح وتعبیر کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اسی کے لیے حضرت شاہؒ نے اپنے حواشی کی قراءت بھی بتائی۔ ترجمہ قرآن کریم کے ساتھ تشریح وتعبیر کی ایک لازمی حد بھی ہے تاکہ وہ ترجمہ ومطلب قرآن کریم سے پرے نہ ہو جائے۔ صرف آیاتِ کریمہ کے الفاظ وکلمات اور عبارات کی سادہ وضاحت کی جائے اور مطلب ومعنی تک ہی اسے محدود رکھا جائے، اسے تفسیر وتاویل کی حدود میں اور مفسرین واہلِ تاویل کے اقوال کے جنگل میں نہ ڈھکیلا جائے کہ وہ اگلی منزلِ دعوت ہے۔[۳۰]

فارسی ترجمہ قرآن مجید کے منہاج پر پچاس سال بعد ہی شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اردو ترجمہ وتشریح تیار کی اور اسے موضح القرآن کے نام سے موسوم کیا۔ وہ حضرت شاہؒ کی تقلید میں ایک اور مفید کام اور دعوت قرآن کا طریق ہے۔[۳۱] عوام کے سننے اور پڑھنے کی خاطر بعد کے متعدد مترجمین اور مفسرین نے صرف سادہ ترجمہ پر مبنی قرآن مجید کے مطالب تیار کیے، ان میں مولانا فتح محمد جالندھری کا روشن چراغ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا۔ ایسے دوسرے تراجم اردو انگریزی وغیرہ میں بھی ہیں۔[۳۲] مختصر حواشی کے ساتھ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا ترجمہ اور متعدد مترجمین ومفسرین کے ضخیم کارناموں کے مختصرات بھی اسی مقصد سے کیے گئے۔[۳۳] ان میں سے کسی کا انتخاب اپنے ذوق وپسند سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں بہرحال تفسیری دقائق اور مسلکی خیالات نہیں ہیں۔ اور وہ قرآن مجید کے متن کی طرف رجوع کرنے اور اس سے تذکیر حاصل کرنے اور اپنی زندگیوں کو منور کرنے کا سامان رکھتے ہیں۔

متنِ قرآن مجید اور اس کی سادہ، صاف اور سہل تشریح قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی دعوت کا اصل سرنامہ ہے، وہ عوام وخواص دونوں کے تمام افراد وطبقات کو خالص قرآن مجید اور کلامِ الٰہی کی طرف بلاتا اور اس کے معانی و جہات سے واقف کراتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل متن قرآن کے عربی میں ہونے کے خاص اثرات ہیں اور حکمتیں بھی۔ وہ کلام الٰہی ہونے کے سبب تاثیر بے مثال رکھتا ہے۔ لیکن وہ صرف عربی داں عوام وخواص تک محدود تھے۔ ان کے لیے بہرحال وہی اصل محور دعوت رجوع ہے اور اسی کو بنانا چاہیے۔ عربی نہ جاننے والوں کے لیے ان کی اپنی مادری اور بول چال کی زبان میں متن قرآن کے ترجمہ اور سادہ تشریح سے کام لیا جانا چاہیے۔[۳۴]

تفسیرِ قرآن مجید کی دعوتِ رجوع

تفسیر وتاویل کے ذریعہ قرآن مجید کی طرف دعوت دینے اور اس کی طرف پلٹ آنے کا مرحلہ بعد کا ہے۔ وہ بہرحال عوام سے زیادہ خواص کے طبقات وافراد کے لیے ہے اور ان میں سے بھی تعلیم یافتہ اور نکتہ شناس لوگوں کے لیے۔ تفسیر وتاویل میں سب سے محفوظ

ومبارک رجوع الی القرآن کی دعوت کا نصاب وطریق تفاسیر ماثورہ میں ہی دستیاب ہے۔ اوران میں بھی خاص تفسیر ابن کثیر میں اسے محدود کیا جاسکتا ہےاوراس کے خاص مختصر تفسیر القرآن العظیم کے نسخہ میں مقید کیا جانا چاہیے۔اس مفصل اور مختصر تفسیر ابن کثیر کی خاصیت و افادیت یہ ہے کہ وہ قارئین وسامعین کو متنِ قرآن کریم کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔تفسیرِ ماثور کا حصہ اسی متن کی تشریح وتعبیر خالص کا ہے جو زبانِ رسالت مآب ﷺ یا صحابہ کرام یا سلف کی تشریحات پر مبنی ہے۔اس میں اقوال کا تضاد ضرور ملتا ہےمگر وہ بقول ابن تیمیہ تنوع کا اختلاف ہے،تضاد وتصادم یا تنافر کا ہرگز نہیں ہے۔[۳۵]

دوسری تفاسیرِ ماثورہ میں سے بیش تر بلکہ قریب قریب تمام ضعیف ومنکر روایات پر مشتمل ہیں اوران سے فائدہ کی بجائے نقصان کا احتمال زیادہ ہےاورسب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ متنِ قرآن کریم سے دور کردیتی ہیں اور لاطائل مباحث میں پھنسا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سب کی سب ماہرین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہیں جن کا مقصد دقائق کی تلاش ہوتا ہے۔اسی طرح تفسیر بالرای پر مبنی تمام تفاسیر،خواہ اردو میں ہوں یا عربی میں یا کسی اور زبان میں، وہ علماء وفقہاء وغیرہ کے لیے ہیں۔ان سے خالص متنِ قرآن کا مطلب ومقصود نکالا تو جاسکتا ہےاورنکالا بھی گیا ہےمگر وہ صرف راسخین فی العلم اور خالصین کا کام ہے۔اسی بنا پر متعدد محققین نے تفاسیر کے مؤلفین کے علمی رجحانات،فکری میلانات اور مسلکی خیالات سے بحث کر کے ان پر نقد بھی کیا ہے۔[۳٦]

مدارس عربیہ میں تعلیمِ قرآن کریم:

عربی مدارس، جو قدیم زمانے سے دارالعلوم کہلاتے چلے آرہے ہیں، اوراب جامع وجامعات بن گئے ہیں،تعلیم وتدریسِ قرآن مجید کے عظیم ترین مراکز ہیں اورملتِ اسلامیہ قرآنیہ کی ریڑھ کی ہڈی، کہ ان سے ہی روحِ قرآن جاری ہوتی ہے۔ان کے مختلف نصاباتِ قرآن سے سرِ دست بحث نہیں ہے۔''رجوع الی القرآن'' کی دعوت کے لحاظ سے ان کی ضرورت کے مطابق نصابِ متنِ قرآن اور نصابِ تشریح اور نصابِ تفسیر وتاویل کی

ایک مختصر و مفید کوشش کرنی یہاں مطلوب ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ بھی قرآن مجید کی طرف پلٹنے کا ہے اور عوام وخواصِ ملت کو بھی اسی سے باندھنے کا منصب بھی ان ہی کا ہے۔ لیکن ان میں سے بیش تر کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص فکر قرآنی یا رجحان مسلکی کے تناظر میں ہی متن قرآن کریم کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ ۳۷

تمام مدارس و جامعاتِ عربیہ کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان میں پورا متنِ قرآن کریم بلا تفسیر طلبہ کو پڑھایا جائے۔ وہ مختلف درجاتِ عالمیت میں تکمیل کو پہونچایا جائے جیسا کہ متعدد مدارس میں نظامِ قرآنی ہے اور منتخب سورتوں کے متن پر اکتفا نہ کیا جائے جیسا کہ اب سہولت پسندوں نے شروع کر دیا ہے۔ پورے متن قرآن کی تعلیم و تدریس کے لیے موجودہ مصحف کی ترتیب لازمی نہیں ہے۔ سہولت وافادیت اور طلبہ و طالبات کی ذہنی صلاحیت اور علمی لیاقت کے مطابق ان کی ترتیب مقرر کی جاسکتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے تجربے سے یہ نسخہ بالکل صحیح تجویز کیا ہے کہ جب طلبہ عربی زبان سمجھنے لگیں تو سب سے پہلے ان کے ”جوف“ واندرون میں متنِ قرآنی اتارنا چاہیے کیونکہ اگر کلام الٰہی ان کے اندرون میں جاگزیں ہو جائے گا تو مقصودِ حقیقی مل جائے گا۔ دوسرے علوم وفنون اور ان کے اثرات اور افکار و تاویلات ان کے قلب و دماغ پر ہجوم کر کے ان کو اپنی اصل سے نہ ہٹا سکیں گے۔ ۳۸

تفسیر و تاویل کا مرحلہ صرف متنِ قرآن کی تکمیل کے بعد آنا چاہیے اور اس میں دو طرح کا انتخاب لازمی ہے۔ ایک، تمام تفاسیر کا مطالعہ و تجزیہ ایک عرصہ دراز بلکہ ایک پوری زندگی کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا ان میں سے چند نمائندہ کلاسیکی تفاسیر منتخب کی جائیں اور ان تفاسیر منتخبہ میں بھی ان کے مختلف اجزاء کی چیدگی ضروری ہے۔ یہ دو طرح کی ہو سکتی ہے: ایک یکساں سورتیں مختلف تفاسیر سے لے کر ان کا تقابلی مطالعہ و تدریس کی جائے۔ دوسرے منتخب تفاسیر میں سے ہر ایک کی چند سورتیں پڑھائی جائیں اور ایک مختصر عرصے میں پورے قرآن کی تفسیر و تاویل کا چکر مختلف تفاسیر کی مدد سے پورا کر لیا جائے۔ اس کے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ۳۹

تنقیدی بحث و تجزیہ

رجوع الی القرآن کی دعوت بلاشبہ بڑی مبارک اور اس سے زیادہ امتِ اسلامی کے لیے لازمی ہے۔ غالباً اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب و تمدن کے کسی دور میں بھی مخلصوں اور دردمندوں کی اس دعوت کا فقدان نہیں رہا۔ عہدِ نبوی سے سلفِ صالحین کے دورِ بابرکات تک قرآن مجید ہی امتِ اسلامی کے خواص و عوام دونوں کا محورِ قلب و نظر رہا۔ وہ تلاوت و حفظ، ترجمہ و تفہیم متن اور تشریح و تفسیر کے مختلف ذرائع سے قرآن مجید سے بنیادی طور سے مربوط رہے۔ تفسیر و تاویل بھی ان کے لیے متنِ قرآن اور اس کے مطالبِ عالیہ تک پہونچنے کے ذرائع تھے، افکار و اقوال کی بھول بھلیاں نہ تھیں۔

مختلف اقوام کے میل ملاپ، غیر اسلامی افکار و خیالات کی ریل پیل اور علوم و فنون کے ہجوم و تسلط نے ان کو بہت کچھ دیا مگر قرآن مجید اور کلامِ الٰہیؐ سے دور کر دیا۔ وہ علومِ اسلامی میں غرق ہوئے تو ہوئے، غیر اسلامی علوم کے بھی شیدائی بن گئے۔ اس بیجا فریفتگی نے رفتہ رفتہ قرآن مجید کے اصل متن اور اس کے اصل مقصد سے ان کو دور کیا تو ان کا سررشتۂ حیات ہی کٹ گیا۔ کتاب الٰہی فلاسفہ کے ہاتھ لگی تو کتابِ فلسفہ بن گئی، متکلمین اور ان کے فرقوں نے اسے کتابِ علم کلام بنا کر رکھ دیا۔ اہل طریقت و تصوف نے غالباً سب سے بڑا غضب ڈھایا کہ کتابِ الٰہی کو کتابِ تصوف بنا کر اصل مقصد ہی پر پانی پھیر دیا۔ فقہاءِ کرام نے بلاشبہ قرآنی متن سے قوانینِ شریعت اخذ کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا مگر وہ مسالک فقہی کا اسیر بن گیا۔ قدیم سے جدید دور تک مختلف فرقوں نے قرآن مجید کو اپنے اپنے افکار و خیالاتِ فاسدہ کا مصدر و مرجع بنا کر حقیقت مسخ کر دی۔ ہمارے معاصر دور میں مسلکی اور گروہی تعصّبات اور خاص فکری و علمی تحقیقات کا زور ہے اور قرآن مجید کی تفسیر و تاویل ان کے تابع ہے۔ اس میں سب سے خطرناک رجحان صرف اپنے فکر و خیال اور اس پر مبنی تفسیر و ترجمۂ قرآن کو حق سمجھنے کا ہے، وہ بھی کسی قدر غنیمت ہے۔ اس سے زیادہ مضر یہ رجحان و فکر بلکہ پرچار ہے کہ ان کی خاص مسلکی و فکری تفسیر و تشریحِ قرآنی کے سوا سب غلط و ناقص ہے۔

بلکہ دوسروں کا سارا سرمایہ دریا برد کرنے کے لائق اور ان سے استفادہ کرنے والے گردن زدنی ہیں۔اب تو طبقات ومسالک اور اداروں ومدرسوں کے علاوہ بہت سے افرادِ یگانہ بھی میدان میں اتر آئے ہیں اور وہ اپنے سواسب کو باطل بتاتے ہیں۔

قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے، اس سے تمسک کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا صرف ایک راستہ ہے۔اور وہ ہے قرآن مجید کے متن کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ۔اس کے معانی ومطالب سمجھنے کا طریقہ اور اس کے احکام وتعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ، ان سے نصیحت وعبرت حاصل کرنے کی فکر، اپنے افکار وخیالات کی تطہیر کا ذوق، اپنے جسم وروح کی تہذیب وتزکیہ کا مقصد، اس کے بیکراں علوم ومعانی سے، روز افزوں عجائبات سے آراستہ کرنے کا خیال، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری اور اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وپیروی کا مخلصانہ مقصود اور اسی کی طلب۔ دعوت رجوع الی القرآن کا محرک وسبب اور مقصد ومطمح صرف خدا شناسی اور رسول شناسی ہے اور اسلامِ-خالص اسلام-پر چلنے کا عزم مصمم۔اس کو بنیادی طور سے اتباعِ دین وشریعت کہا جاتا ہے اور اسی کی طرف قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔اس مقصد ومطلب کے حصول میں بلاشبہ تفسیروں اور تشریحوں سے بھی مدد لی جاسکتی اور لی جانی چاہیے کہ وہ قرآن مجید کے اعلیٰ مطالب ومفاہیم کی راہیں کھولتی ہیں اور اسی غرض سے ان کی تدریس وتعلیم کی جانی چاہیے۔ ہمارے تمام مخلص مفسرین ومترجمین اور شارحین نے اسی غرضِ اصلی سے اپنی تفسیریں لکھیں، ترجمے کیے اور شرحیں لکھیں۔ان کی تفسیر وتشریح میں بہرحال اور ان سے زیادہ خاص نقطۂ نظر، فکر ومسلک اور خیال ورائے کی تائید وترویج کی خاطر تصنیف کی گئیں تفاسیر وتراجم سے احتراز ضروری ہے۔بطور مثال کشافِ زمخشری سے استفادہ لازمی ہے مگر اس کے زہرِ اعتزال سے حفاظت ناگزیر تر۔اسی اصول کی سان پر عہد جدید کی اردو عربی اور انگریزی وغیرہ تفسیروں کو پرکھنا چاہیے۔

تعلیقات وحواشی

۱ دعوتِ نبوی کا اولین نکتہ کلمۂ شہادت پر مبنی تھا اور اس کے بعد آپ ﷺ قرآن مجید کی آیات کریمہ موقع ومحل کی مناسبت سے تلاوت فرماتے تھے۔ مکی دورِ دعوت میں دعوتِ قرآن کی صدہا مثالیں ہیں جن میں سے بہت سی کتب سیرت و حدیث وتفسیر میں محفوظ ہیں:

ابن اسحاق/ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرتبہ حمدی بن محمد نور الدین النوفل، مکتبۃ المورد، القاہرۃ ۲۰۰۶ء، (آئندہ ابن ہشام)، ۱/ ۱۸۵: شیخِ قریش عتبہ بن ربیعہ عبشمی سے گفتگو میں سورہ فصلت کی ابتدائی آیات سنائیں، ۱/ ۱۸۶ و مابعد: علماء یہود سے اکابر قریش کے مناظرانہ سوالات کے جواب میں سورۂ کہف کی بیش تر آیات کریمہ تلاوت کیں۔

حضرات صحابہ کرام بھی قرآن مجید کی طرف دعوت دیتے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قرآن مجید کی سورۂ رحمٰن اکابر قریش کو سنائی تھی، ابن ہشام، ۱/ ۱۹۹۔

۲ خلفاء اسلامی کے خطبات ومباحث کی بنیاد صرف قرآن وسنت ہوتی تھی، یہاں تک کہ ان کے مشاجرات میں بھی اسی کی طرف لوٹنے کی دعوت ہوتی جب کہ تلوار کی کاٹ بھی مسئلہ کا حل تلاش نہ کر پاتی۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے جنگِ جمل میں پہلی بار قرآن مجید کے مصاحف نیزوں پر بلند کر کے تلوار کی بجائے قرآن کی طرف پلٹ آنے کی دعوت دی تھی اور اسی طریق خلیفہ چہارم کو حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی نے جنگِ صفین میں اختیار کیا تھا۔

طبری، تاریخ الرسل والملوک (تاریخ الطبری)، مرتبہ محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۱ء۔

حدیث بخاری: ۷۲۶۹: میں حضرت ابوبکرؓ کا اولین خطبۂ خلافت کا ایک جملہ ہے: ... وھذا الکتاب الذی ھدی اللہ بہ رسولکم فخذوا بہ تھتدوا، ولما ھدی اللہ بہ رسولہ ...'' حدیث بخاری: ۷۲۷۲: کے مطابق حضرت ابن عمرؓ نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی بیعت کرتے ہوئے لکھا تھا: و أقر لک بالسمع والطاعة علیٰ سنة اللہ وسنة رسولہ فیما استطعت''۔

۳۔ کتب حدیث خاص کر بخاری ومسلم کے کتاب الاعتصام بالقرآن والسنة کے ابواب ملاحظہ ہوں۔ مثلاً بخاری کی شرح فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی، مکتبہ دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۷ء، ۱۳/۳۰۳-۴۲۳ کے مختلف ابواب میں کتاب وسنت سے تمسک کا ذکر ہے۔

۴۔ حدیث کے وحی الٰہی ہونے پر اجماعِ امت ہے اور ان دونوں کے لازم وملزوم ہونے پر بھی کہ دین وشریعت کے بہت سے ابواب واحکام کی تفہیم اور ان پر عمل ان دونوں کے بغیر ممکن نہیں۔ حدیث شارح قرآن بھی ہے۔ بحث کے لیے کتاب خاکسار، ''وحی حدیث'' اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۰۶ء کے مختلف ابواب خاص کر باب اول۔

قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ میں اطاعت رسول کو اطاعت اللہ سے پیوست کیا گیا ہے کہ وہی اطاعت الٰہی کا راستہ اور طریقہ بتاتی ہے۔ آل عمران: ۳۲، ۱۳۲؛ نساء: ۵۹؛ مائدہ: ۹۲ وغیرہ۔ ان کے علاوہ متعدد انبیاء کرام نے صرف اپنی اطاعت کی دعوت دی جو اطاعت الٰہی کو مستلزم تھی: آل عمران: ۵۰؛ الشعراء: ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۷۹ وغیرہ۔

۵۔ حدیث بخاری: ۷۲۷۶: ان الامانة نزلت من السماء فی جذر قلوب الرجال، ونزل القرآن فقرؤوا القرآن وعلموا من السنة''۔ بحث کے لیے فتح الباری، ۱۳/۳۰۶ ومابعد

حدیث بخاری: ۷۲۸۴-۷۲۸۵: کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے حدیث نبوی

کے مطابق ہی مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی اور اسے حکم قرآن قرار دیا تھا۔ فتح الباری، ۱۳/ ۳۰۷ ومابعد

رجم کی بحث میں خاص طور سے قرآن وحدیث دونوں کو ''کتاب اللہ'' سے تعبیر کرنے کا ذکر خلفاء وصحابہ کے مباحث میں ملتا ہے۔ بخاری، کتاب الحدود، باب رجم المحصن؛ فتح الباری، ۱۲/ ۱۴۲-۱۴۷ وغیرہ خاص کر باب رجم الحبلیٰ من الزنا''۔ وغیرہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے ایک خطبہ کا ایک خاص جملہ ہے: **ان اللہ بعث محمدا بالحق وانزل علیه القرآن فکان مما انزل آیة الرجم''، فقرأناها وعقلناها ووعیناها، رجم رسول اللہ ﷺ ورجمنا بعده...'' والرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة ...''** حدیث بخاری: ۶۸۳۰ میں حد رجم کے کتاب اللہ میں ہونے کا ذکر ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے شارحین نے اس پر بحث کر کے سنت کو کتاب اللہ میں شامل کیا ہے۔ موطا امام مالک میں حضرت عمر بن خطابؓ سے حضرت سعید بن المسیب کی روایت میں ہے: **ایاکم أن تهلکوا عن آیة الرجم ان یقول قائل لا اجد حدین فی کتاب اللہ فقد رجم''**۔

عام طور پر جس آیت رجم کو نقل کیا جاتا ہے اس کو محققین علماء نے غیر ثابت قرار دیا ہے اور اس کی وجوہ بتائی ہیں۔ بحث کے لیے مولانا محمد مجیب اللہ ندوی کی کتاب ''ثبوت رجم''، ندوۃ التالیف والترجمۃ، اعظم گڑھ۔

٦۔ رسولِ اکرم ﷺ کی بہت سی حدیثوں میں یہ اصرار ملتا ہے کہ جو کچھ میں کہوں اور کروں اس کو اختیار کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ یہ اصلاً قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ کریمہ کی توسیع وتشریح ہے جیسے: سورہ حشر: ۷: ''**وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ**''۔

٧۔ عہد نبوی کے سوڈیڑھ سو سال کے بعد ہی غیر قوموں کے اختلاط اور ان کے افکار

وعلوم کی ترویج و مداخلت کی وجہ سے متعدد علوم وفنون کا ارتقاء بلاشبہ ہوا۔ ان میں خاص غیر اسلامی فنون فلسفہ وکلام تھے اور ان کے ساتھ دوسرے علوم وفنون بھی تھے۔ تیسری/نویں صدی سے تصوف نے بھی اپنا رنگ جمایا اور سائنسی علوم نے بھی۔ ان میں عام اہل علم کی مشغولیت بڑھ گئی اور ان کے علاوہ مسلکی اور مذہبی عصبیتوں نے بھی جنم لیا اور ان سب نے مل کر قرآن مجید اور اس کے علوم سے لوگوں کو دور کرنا شروع کیا حتی کہ مفسرینِ قرآن نے بھی غیر قرآنی افکار خاص کر فلسفیانہ ومتصوفیانہ خیالات اور اسرائیلیات کو اپنی تفسیروں میں بھر دیا۔ یہ سب تفاسیر متن قرآن کی شارح کم تھیں اور اپنے علوم محبوبہ کی نمائندہ زیادہ تھیں۔

۸۔ ہدایت دینا، تذکر اور اصلاح قلب وغیرہ کرنا قرآن مجید کی بہت سی آیات کریمہ کا موضوع ہے۔ چند حوالے یہ ہیں: سورہ بقرہ: ۱۸۵: **شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدی للناس**؛ سورہ اسراء: ۹: **ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم**۔ نیز سورہ اسراء: ۱۲؛ سورہ ص: ۱: **صٓ والقرآن ذی الذکر**...؛ ق: ۴۵؛ قمر: ۱۷ وغیرہ۔

معاصر کفار مکہ وعرب نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا تھا جس کا شکوہ زبان رسالت مآب ﷺ سے سورہ فرقان: ۳۰ میں کیا گیا ہے: **وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا**۔

۹۔ دوسرے ضروری اور لازمی علوم وفنون اسلامی جیسے تفسیر و حدیث و فقہ میں ضرورت سے زیادہ شغف اور فنی بحث ومباحثہ نے قرآن مجید کو کتاب ہدایت کی بجائے کتاب تفسیر وحدیث وفقہ بنا دیا۔ حالانکہ محققین مفسرین ومحدثین اور فقہاء نے متن قرآن مجید کی منزلت واولیت برقرار رکھی تھی جیسے امام بخاری کی کتاب الجامع الصحیح کے بیشتر کتب وابواب کا سرنامہ آیات قرآنی ہی ہوتی ہیں۔

۱۰۔ متن قرآن مجید سے خواص امت کی دوری ان کے اپنے پسندیدہ علوم وفنون میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شیفتگی تھی۔ اس کی مثالیں آگے آتی ہیں۔

۱۱ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسے ''قرآن منطوق'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق قرآن سمجھ لیتا تھا۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو: شاہ ولی اللہ دہلوی، الفوز الکبیر، مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۱ء، بحث بر قرآن منطوقؒ: نیز کتابچہ خاکسار راقم: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، علی گڑھ ۲۰۰۱ء، ۲۴-۲۵؛ صحابہ کرام کی تفاسیر نبوی دراصل اسی رجوع کی مثالیں ہیں۔ ان کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری، کتاب التفسیر اور فتح الباری جلد ہشتم۔

۱۲ تلاوتِ قرآن کرنے کا حکم الٰہی سورۂ نمل: ۹۱-۹۲ میں ہے: ''... وأمرت ان اکون من المسلمین. وان اتلوا القرآن'' تلاوتِ قرآن برائے تذکیر و تبلیغ کے مقصد بتانے والی آیات کریمہ قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور اسی طرح نماز میں تلاوت قرآن کے فرض ہونے کا ذکر بھی بہت سی آیات میں ہے۔

کتب احادیث میں اور کتب تفسیر اور ان کی روایات میں بھی تلاوت کے حکم نبوی کا ذکر ہے خواہ اسے مندوب یا سنت سمجھا جائے۔ مثلاً بخاری، کتاب الفضائل: فضائل القرآن، فتح الباری، ۹/ ۱۳۰۰۵ میں متعدد احادیث تلاوت کے باب میں ہیں۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، کے اواخر میں باب فضائل القرآن ہے۔ بخاری کی احادیث جیسے ۵۰۲۶، ۷۲۳۲، ۷۵۲۸ وغیرہ میں صرف تلاوت کا ذکر خیر ہے اور اسی کو خیر کثیر کا باعث بتایا گیا ہے۔

۱۳ تلاوتِ قرآن کی جاذبیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قریش مکہ کے اکابر جو رسولِ اکرم ﷺ کے مخالفین اور اسلام کے دشمنوں میں ممتاز تھے قراءت نبوی چھپ چھپ کر سنا کرتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ خود ان کو سناتے تو حیرت زدہ اور گنگ رہ جاتے تھے۔ عورتیں بچے اور عام آدمی تلاوت صدیقی سننے کے لیے ان کی گھریلو مسجد کے قریب جمع ہو جاتے اور سن سن کر متاثر ہوتے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے صرف قراءت نبوی سن کر دل میں اسلام کی طرف میلان محسوس کیا تھا۔ سیرت نبوی کے ایسے بہت سے واقعات ہیں۔ نجاشی حبشہ جیسے عیسائی حکمراں

صرف تلاوت سورہ مریم سن کر روئے تھے اور ان کے مذہبی علماء اور اہل دربار بھی۔
ابن ہشام، ۱/۲۰۰ ومابعد؛۱/۲۱۴؛۱/۲۲۰-۲۲۱ وغیرہ۔
موجودہ دور میں متعدد افراد نے صرف قراءت قرآن سن کر ہی اسلام قبول کیا اور جنھوں نے اسلام نہیں قبول کیا وہ بھی تاثیر قرآن کے معترف ہیں۔

۱۴۔ سورہ مزمل:۲۰:فاقرؤا ما تیسر من القرآن
بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فی کم یقرأ القرآن؟ حدیث: ۵۰۵۲:
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سہمیؓ ہر روز رات میں قرآن ختم کر لیتے تھے۔
آپ ﷺ نے ان کو ہدایت کی:... واقرأ القرآن فی کل شھر ...بعد میں ان کے اصرار پر فرمایا:واقرأ فی کل سبع لیال مرۃ فلیتنی قبلت رخصۃ ﷺ وذاک انی کبرت وضعفت ... الخ" حدیث:۵۰۵۴:
میں ہے:فاقرأہ فی سبع ولاتزد علی ذلک"۔
حافظ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ۹/۱۲۱ میں قراءت وتلاوت سے متعلق دوسرے احکام کا بھی ذکر کیا ہے جیسے کم ازکم تین دنوں میں کامل تلاوت کی جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ میں۔دوسری مدتیں ہیں: بیس دنوں میں دس دنوں میں، سات دنوں میں، پانچ دنوں میں۔ابوداؤد،نسائی اور ترمذی میں ہے کہ چالیس دنوں میں ایک بار، ایک ماہ میں ایک بار پورا قرآن ضرور پڑھا جائے۔اسی لیے علماء کا خیال ہے کہ چالیس دنوں تک جو شخص قرآن کی تلاوت نہ کرے وہ گناہگار ہوگا۔

۱۵۔ تیس پاروں میں قرآن مجید کی تقسیم تلاوت کی خاطر کی گئی ہے اور اسی طرح طبقات عالیہ کی سات منزلیں قرار دی گئی ہیں۔بحث کے لیے ملاحظہ ہو: جلال الدین سیوطی، الاتقان۔

۱۶۔ بخاری/فتح الباری،فضائل القرآن کے ابواب حسن ترتیل وغیرہ پر جیسے:باب من لم یتغن بالقرآن، القراءۃ من ظھر القلب، الترتیل فی القراءۃ، مد القراءۃ ، حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن، البکاء عند قراءۃ القرآن وغیرہ۔

۱۷۔ قرآن مجید کو حفظ کرنے کی متعدد آیاتِ کریمہ ہیں اور ان میں سے کچھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں اور کچھ عام حفظ کے لیے ہیں۔ جیسے سورہ حجر: ۹، الٰہی حفاظت کو بیان کرتی ہیں؛ سورہ بروج: ۲۲ قرآن مجید لوح محفوظ میں محفوظ ہے؛ طٰہٰ: ۱۱۴؛ قیامہ: ۱۶؛ اعلیٰ: ۶؛ وغیرہ۔ احادیث نبوی میں حفظ قرآن کی فضیلت اور حفاظِ قرآن کی منزلت کا ذکر ملتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی محفوظیت کی ایک انسانی تدبیر بھی ہے۔ بخاری/ فتح الباری، فضائل القرآن کے مختلف ابواب خاص کر باب استذکار القرآن وتعاہدہ۔

۱۸۔ قبیلہ عبدالقیس کے حضرت الاشجؓ اور ان کے بھتیجے نے مکہ مکرمہ آکر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ فاتحہ اور بعض سورتیں سیکھی اور یاد کی تھیں۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، ۵/۵۶۴؛ ابن قتیبہ دینوری، کتاب المعارف، ۳۳۸؛ بخاری، کتاب الاذان، باب اذا استووا فی القراءۃ الخ؛ فتح الباری، ۲/۲۲۱ ومابعد: حضرت مالک بن حویرث کا وفد بیس دن ٹھہرا تھا۔

صحابہ کرام میں سے حضرت خباب بن ارت تمیمیؓ کے قرآن کے صحیفہ کی تعلیم دینے کا واقعہ اسلام حضرت عمرؓ کے ضمن میں آتا ہے کہ وہ ان کی بہن اور بہنوئی حضرت فاطمہ اور حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہما کو ان کے گھر پڑھاتے تھے۔

حضرت ابن ام مکتومؓ نابینا تھے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے تھے، وہ ان کو حفظ ہوتا تھا اور اپنے حفظ سے ہی وہ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ہجرت نبوی سے قبل حضرت براء بن عازبؓ نے ان سے سورہ الاعلیٰ اور دوسری مفصل سورتیں سیکھی اور یاد کی تھیں۔

بخاری، باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی المدینۃ؛ فتح الباری، ۷/۲۸۱-۳۰۰ ومابعد۔

کتاب خاکسار مفصل بحث کے لیے عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، القاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۵ء، باب ششم (آئندہ تنظیم ریاست وحکومت)

۱۹۔ سیرت نبوی کا یہ باب ابھی مفصل ومدلل تحقیق کا طالب ہے خاص کر قرآن مجید کی

ترسیل وتعلیم کے اعتبار سے، چند مثالوں میں سے ایک یہ ہے: حضرت عمرو بن سلمہ اور ان کے والد ماجد حضرت سلمہ اور ان کا خاندان لوگوں اور قافلوں کی گذرگاہ پر بستا تھا اور ہم رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں رکبان (اہل قافلہ) سے پوچھا کرتے تھے۔ وہ لوگ بتاتے کہ ان کا خیال ہے کہ اللہ نے ان کو رسول بنایا ہے اور ان کے پاس وحی بھیجتا ہے اور وہ وحی سناتے تھے میں وہ کلام یاد کر لیتا اور وہ میرے سینے میں جم جاتا۔۔۔قرآن سب سے زیادہ ان کو یاد ہو گیا حالانکہ وہ چھ سات سال کے لڑکے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ کی ہدایت کے مطابق مجھے امام بنایا گیا کیونکہ مجھ سے زیادہ قرآن جاننے والے اور کوئی نہ تھا کیونکہ میں قافلوں سے برابر سیکھا کرتا تھا۔"... فلم یکن احد اکثر قرآنا منی لما کنت اتلقی الرکبان..." حدیث بخاری: ۴۳۰۲؛ فتح الباری، ۸/ ۲۸-۳۰۔

۲۰۔ حضرت سلمہ اور ان کے فرزند قاری حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہما سے ملنے والے اکثر وبیشتر قافلے غیر مسلموں کے ہوتے تھے جیسا کہ حدیث مذکورہ سے دروبست سے واضح ہوتا ہے کیونکہ مسلم قافلے یہ کبھی نہیں کہہ سکتے: یزعم ان اللہ ارسلہ، اوحیٰ الیہ ..." اس وقت حضرت عمرو بھی غیر مسلم تھے۔

۲۱۔ بخاری، کتاب الاذان، باب امامۃ العبد والمولیٰ؛ فتح الباری، ۲/ ۲۳۹: مہاجرین وانصار کی امامت حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کرتے تھے کیونکہ وہ زیادہ بڑے قاری تھے۔ اسی طرح حضرت کلثوم بن الہدمؓ بڑے بڑے صحابہ کرام کی امامت کرتے تھے۔
قراء عہد نبوی پر ملاحظہ ہو: بخاری، فضائل القرآن؛ باب القراء من اصحاب النبی ﷺ، فتح الباری، ۹/ ۵۸-۶۸ ومابعد؛ "تنظیم ریاست وحکومت" مذکورہ بالا؛ نیز ابن سعد، ۲/ ۱۳۷ وغیرہ۔

۲۲۔ بخاری، کتاب الاذان کا باب امامۃ العبد والمولیٰ وغیرہ۔

۲۳۔ سورہ توبہ: ۱۲۲: فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین الخ اس کی نمائندہ آیت کریمہ ہے اور ایسی بہت سی ہیں۔ مثلاً سورہ نحل: ۴۳:

فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون ۔ نیز سورہ انبیاء:۷ میں یہی ہے؛ اولوا الالباب اور اولوا العلم کی آیات کریمہ۔ سابقہ حواشی میں احادیث بخاری بھی ان کے مختلف طبقات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

دوسری آیات کریمہ ہیں: سورہ نساء:۸۳: ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم۔ سورہ آل عمران:۷ اور سورہ النساء:۱۶۲ میں ''الراسخون فی العلم'' کی خاص تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

۲۴ بخاری، فضائل القرآن، باب انزل القرآن علیٰ سبعة احرف؛ فتح الباری، ۹/ ۳۰-۴۸ ومابعد؛ باب القراء من اصحاب النبی ﷺ میں ان قراء کرام کا ذکر ہے۔ خاص کر انصار قراء کرام کا۔ مفصل بحث کے لیے تنظیم ریاست وحکومت کا باب ششم۔

۲۵ حاشیہ ۲۳ کی آیات کریمہ کے علاوہ تدبر و تفکر اور محکمات و متشابہات پر غور و خوض کرنے کے لیے آیات کریمہ ہیں: سورہ آل عمران:۷: هو الذى انزل عليك الكتٰب منه ايٰت محكمٰت هن ام الكتٰب واخر متشٰبهٰت ...؛ سورہ ص:۲۹:... ليدبروا ايٰته وليتذكر اولوا الالباب؛ نیز سورہ النساء:۸۲؛ مومنون:۶۸۔

۲۶ ابن ہشام، ۱/ ۲/۱۷۱، ۱۸۵: مکی سردار عتبہ بن ربیعہ عبشمی کو سورہ فصلت کی اولین آیات سنائی تھیں۔ ان میں یہ نکتہ حکمت بہت اہم ہے کہ قریش یا اکثر کفار اس قرآن عربی سے اعراض کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کو ششدر کر دیتا ہے جیسا کہ مکی سردار ہوتے تھے۔

۱/ ۱۹۰: دوسرے اہم سردار و مخالف اسلام نضر بن حارث بن کلدہ کو، جو خود آیات بنا لینے کا مدعی تھا، سورہ قلم کی آیات سنا کر مبہوت کر دیا تھا۔ اسی طرح دوسرے اکابر قریش و یثرب کو مختلف آیات کریمہ آپ ﷺ نے سنائی تھیں اور ان کو متاثر کیا تھا۔ ۲/ ۲۰-۲۱؛ ۲/ ۴۷: مشہور حکیم یثرب سوید بن صامت کو غالباً سورہ لقمان کی آیات سنائی تھیں۔ یہاں قرآن سنانے کا ذکر ہے تفصیل نہیں ہے۔

۲۷ شبلی، علم الکلام، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۱۳۴۱ھ، ۱۰۹

۲۸ شاہ ولی اللہ دہلوی، فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن، کراچی، تاج کمپنی، حمائل غیر مورخہ میں مقدمہ موجود ہے جو سعودی طباعتوں میں نہیں ہے۔ بحث کے لیے خاکسار کی کا مضمون "فتح الرحمٰن کا تجزیاتی مطالعہ، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء، ۲۹-۶۰

۲۹ ہمارے استاذ قرآن مولانا غلام محمد قاسمیؒ تا زندگی بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں اور بعد مغرب محلّہ کی مسجد میں ایک رکوع کی قراءت کرتے اور اس کا ترجمہ سناتے تھے۔ ان کے سامنے ہمیشہ شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے ترجمہ وتفسیر پر مبنی حمائل شریف رہتی تھی۔

آج کل اس کے مختلف مظاہر سامنے آتے ہیں اور متعدد حضرات واہل علم مختلف ترجموں اور تفسیروں کے ذریعہ رجوع قرآنی کا کام کر رہے ہیں۔

۳۰ غالبًا اسی ضرورت عام کی خاطر حکومت سعودیہ نے صرف سادہ معانی وتشریحات پر مبنی کئی تفاسیر چھاپی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے: "التفسیر المیسر" جسے نخبۃ من العلماء نے تیار کیا ہے اور وزارت مذہبی امور نے چھاپا ہے۔ وہ صرف معانی و تشریح پیش کرتی ہے۔

۳۱ شاہ عبد القادر دہلوی، موضح القرآن، تاج کمپنی لاہور وکراچی غیر مورخہ۔ اس کے مختلف ایڈیشن ہیں جو اردو دنیا میں شائع ہوئے ہیں۔

۳۲ فتح محمد جالندھری کا ترجمہ قرآن مجید متن کے ساتھ خاصا ضخیم ہے اور بار بار چھپ کر مقبول ہوتا رہا ہے۔ خالص اردو ترجمہ بلا متن روشن چراغ کے نام سے تاج کمپنی لاہور وکراچی نے شائع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا اور آج تک عام گھروں میں پایا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں احمد ابو سعید نے ذلک الکتاب کے عنوان سے رکوع بہ رکوع تیار کیا ہے۔ آغاز میں ہر رکوع کا آغاز واختتام عربی متن کے ساتھ دیتے ہیں اور

ترجمہ کے درمیان بعض آیات کے ٹکڑے بھی نقل کرتے ہیں جو خاص سرخ وسبز رنگوں میں عربی خط میں ہوتے ہیں۔اس کے پانچویں ایڈیشن ۲۰۰۸ء میں حسن طباعت وکتابت کا اہتمام ہے۔ان کا دعویٰ ہے کہ تمام اہم ترین مشاہیر ملت اسلامیہ ہندیہ کے تراجم وتفاسیر سے مدد لی گئی ہے جن کی تعداد بیس ہے۔

۳۳۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ قرآن کی مقبولیت بہت رہی ہے اور وہ شروع میں بہت مقبول ہوا اور متعدد طباعتیں نکلیں۔ بعد میں وہ نظر انداز کر دیا گیا کچھ تو ان کے محاورہ دہلوی کی سخت پابندی کی وجہ سے اور کچھ ترجمہ دہلویہ پر مولانا تھانوی کی تنقید کی وجہ سے۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو: مضمون خاکسار ''شمس العلماء نذیر احمد اور علوم اسلامیہ'' فکرونظر علی گڑھ، ڈپٹی نذیر نمبر، جون ۱۹۹۴ء

۳۴۔ متن قرآن مجید اور اس کے سادہ ترجمہ وتشریح پر اصرار اس لیے ہے کہ وہ کسی غیر کے کلام سے مخلوط نہیں ہوتا۔ اگرچہ ترجمہ قرآن خواہ کسی زبان میں ہو کلام اللہ نہیں ہے۔کلام اللہ تو صرف عربی زبان میں موجود و محفوظ قرآن مجید وقرآن مبین ہے۔ترجمہ میں اصل کلام کی ترسیل نہیں ہوتی، انسانی کلام کی نہیں ہوسکتی تو کلام الٰہی کی کیا ہوگی۔البتہ اس سے کلام اللہ کے معانی ومطالب سمجھ میں آجاتے ہیں اور ان سے رجوع اور اس کی تاثیر کا کام چل جاتا ہے۔

۳۵۔ محققین نے تفسیر وتاویل میں فرق کیا ہے۔قرآن مجید میں بہرحال دونوں آئے ہیں جیسے تاویل سورہ آل عمران: ۷ اور اعراف: ۵۳، یونس: ۳۹ میں آیا ہے اور تفسیر سورہ فرقان: ۳۳ میں ہے۔ بحث کے لیے مقالہ خاکسار ''متن قرآن کریم- تشریح وتفسیر'' مشمولہ ''علم شرح، تعبیر اور تدریس متن''، مرتبہ پروفیسر محمد نعیم، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۵ء، ۱۸۸-۲۱۷۔

تفسیر ماثور کی بحث خاصی مفصل ہے۔اس کو مختصر یوں کیا جا سکتا ہے صحیح تفسیر ماثور پر اکتفا کیا جائے اور اختصار کے لیے تفسیر ابن کثیر خاص کر اس کا مختصر بہت مفید ہے۔اس کی چند وجوہ ہیں:

۱- اول حافظ ابن کثیر آیت یا آیات کریمہ کا مجموعہ نقل کر کے ان کی سادہ و صاف عربی میں تشریح کرتے ہیں۔
۲- وہ صرف صحیح روایات و احادیث تفسیر ماثور میں لاتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ان کی بعض روایات مشتبہ بھی ہیں۔
۳- ان میں سے بھی وہ اختصار ملحوظ رکھتے ہیں اور زیادہ اقوال سے بوجھل نہیں کرتے۔

امام ابن تیمیہ، المقدمہ فی اصول التفسیر، دمشق ۱۹۳۶ء، ۶-۹

۳۶ تفاسیر قدیم وجدید کی فکری و علمی جہات کے لیے ملاحظہ ہو:
محمد حسین ذہبی، التفسیر والمفسرون، قاہرہ ۱۹۶۱ء، تین جلدوں میں ہے اور مختلف قسموں میں تفاسیر کو تقسیم کر کے بحث کرتی ہے مثلاً امام رازی کی تفسیر مفاتح الغیب پر یہ نقد ہے کہ وہ معتزلہ کے اشکالات تو زور و شور سے پیش کرتے ہیں، مگر ان کے رد میں جمہور علماء کے دلائل و مباحث پھسپھسے ہیں۔ زمخشری کی تفسیر الکشاف بہر حال معتزلی نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ سیوطی کی تفسیر الدر المنثور میں رطب ویابس ہیں غلط روایات بہت ہیں۔ تفسیر بالرائی الجائز کے علاوہ ایک خانہ تفسیر بالرای المذموم کا ہے۔

۳۷ مسلکی رجحان میں حنفی، شافعی اور اہل حدیث کے خاص افکار کی چھاپ ان کی تشریح و تفسیر قرآن پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اداری اور جامعاتی میلان میں خاص اداروں اور مدرسوں کا نقطۂ نظر رہتا ہے کہ وہ متن قرآن کریم کو اپنے اکابر مفسرین و شارحین کے خاص نظریات و افکار کے تابع بنا دیتے ہیں۔ مثالیں ''خوف فساد خلق'' کی وجہ سے نہیں دی جارہی ہیں۔

۳۸ مقدمہ فتح الرحمٰن مذکورہ بالا، نیز تعارف شخصیت شاہ پر کتابچہ خاکسار۔

۳۹ مختلف عربی مدارس میں ایسے طریقے اختیار کیے گئے ہیں جیسا کہ ان کے نصابات اور شخصی تجربات بتاتے ہیں۔

رجوع الی القرآن کی مختصر تاریخ مع لوازمِ درس ومطالعۂ قرآن

سید مسعود احمد

تمام مخلوقاتِ عالم بشمول حضرتِ انسان ہر لمحہ خدائی ہدایت کے محتاج ہیں اور رب کریم ہمہ آن ان کی طلب و حاجت کے بقدر ہدایت سے نوازتا بھی رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے کہ ''اَلَّذِیْ أَعْطَی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی'' اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس کی رہنمائی کی۔ (طٰہٰ:۵۰) اور ''اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی. وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ''جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے اور جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی (الاعلیٰ: ۲-۳)۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ پروردگار عالم اپنی ربوبیت کے اس فیضان کو وحی الٰہی کے ذریعہ بروئے کار لاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رب العالمین اپنی پروردگاری کا سب سے بڑا مظاہرہ اُن لطیف اشاروں کے ذریعہ جملہ مخلوقات عالم پر ہر لمحہ جبلی یا شعوری ہدایت کی نوازش کی شکل میں کرتا رہتا ہے۔ اور اس حقیقت کے انکار کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ انسان بحیثیت ایک اعلیٰ مخلوق، شعوری اور جبلی دونوں سطحوں پر ہر لمحہ خصوصی ہدایت کا محتاج ہے۔ اس عالمِ ہست و بود میں وحی الٰہی ہی عقل و وجدان، فطرت و جبلت اور علم وحکمت کا منبع رہی ہے۔ وحی الٰہی سے ہماری مراد وہ لطیف خدائی اشارے (Divine Signals) ہیں جو ہادی برحق شہد کی مکھی کو اس کی احتیاج کے مطابق بتمام خوبی وکمال اور بروقت و برمحل پہنچاتا رہتا ہے نیز تاریخ کے ایک اہم واقعہ کے ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خصوصی آگہی کے بطور یہ وحی کی جاتی ہے کہ ان کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دیں۔ اور ہر انسان کو اچھے اور برے کی تمیز کا الہام کیا جاتا ہے، جب کہ وحی الٰہی کی اعلیٰ ترین شکل یہ ہے کہ پیغامِ الٰہی کی مستقل ترسیل کے لیے رب العالمین کے منتخب کردہ مخصوص بندوں کے قلوب کو اخذ وحی کا بے خطا (fool-proof) ملکہ عنایت کیا

جاتا ہے تاکہ وہ جملہ زمانی و مکانی مسائلِ حیات میں مرضیاتِ خداوندی سے اپنی امتِ دعوت واجابت کو آگاہ کر سکیں۔

رجوع الی القرآن ایک مہتم بالشان تحریک

قرآنِ کریم تمام کائنات کے لئے پروردگار حقیقی کے رحمت و کرم کا بہترین مظہر ہے اور بالخصوص حضرتِ انسان اس مہتم بالشان ذریعۂ ہدایت کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل جب دنیائے انسانیت شعور کی اس منزل کو پہنچ چکی تھی کہ ایک جامع وکامل اور آفاقی ہدایت الٰہی کی حامل بن سکے۔ اور ترسیلِ ہدایت کے مادی ذرائع اتنے ترقی یافتہ اور مستحکم ہو چکے تھے کہ معلوم دنیا تک پیغام الٰہی پہنچایا جا سکے اور دوسری طرف اسی دنیائے انسانیت کے حالات اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ ظلم و بربریت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹکتی اور سسکتی انسانیت کے بے شمار مسائل کے پائدار حل کا حصول ہر قلبِ سلیم کی متفقہ آواز بن گئی تھی۔ طوائف الملو کی عام تھی۔ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی دو طاقتیں یعنی روم و فارس آپس میں دست و گریباں تھیں، ٹھیک اسی وقت جب کہ جزیرۃ العرب کے اسی شہر مکہ مکرمہ میں جہاں توحید خداوندی کی عظیم الشان علامتِ حق معروف بنامِ بیت اللہ ابرہہ کے حملہ کے خلاف باطل کی شکست فاش اور حق کی فتح کاملہ کا مژدہ سنا رہی تھی اور ملتِ ابراہیمؑ کی ابتدائی تشکیل و قیام کے تین ہزار سال گزر چکے تھے کہ اسی شہر کی اُمّی مگر صادق وامین ذاتِ محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر ہدایت الٰہی کا جامع، تفصیلی اور مکمل متن نازل ہوا۔ اُسی ہمہ گیر ظلم کی طویل رات میں بھٹکتی انسانیت کو اُس عظیم مینارۂ نور ''القرآن الحکیم'' کے ذریعہ شاہ راہِ مستقیم اور منزل مقصود دکھائی گئی۔ یہ بھی ایک قسم کی رجوع قرآن ہی کی تحریک تھی۔ کیونکہ قبلِ بعثتِ محمدی ﷺ صحفِ ابراہیم کی تلاوت اور تعلیمِ توحید تو در کنار وقت کے دبیز پردوں نے شرک و بت پرستی اور آباء پرستی ہی کو خدائی مذہب سے موسوم کر دیا تھا۔ صحفِ موسیٰ وعیسیٰ و داؤد علیہم السلام تک کو ان کے نام لیوا بالکل بھول چکے تھے جب کہ ان مصاحف کی تلاوت اور تعلیم ان پر لازم کی گئی تھی۔ البتہ لسانِ نبوتِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رو

سے اصل تورات وزبور بھی دراصل امم سابقہ کے قرآن کریم تھے اوران کا پیغام بھی بنیادی طور پر القرآن الحکیم ہی کا پیغام تھا۔[1] اگر وہ صفاتی طور پر'قرآن' کہے جانے کی مستحق تھیں تو قلبِ محمد ﷺ پر نازل ہونے والا کلام ذاتی وصفاتی دونوں پہلوؤں سے عین ''القرآن'' تھا۔ اور یہ تحریکِ دعوتِ توحید جو نبی خاتم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ برپا ہوئی کوئی نئی تحریکِ دعوتِ دین نہیں تھی بلکہ ایک لحاظ سے رجوع الی کتاب اللہ اور ''رجوع قرآن'' کی خصوصی تحریک تھی۔ جس میں نبی آخرالزماں پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی کو''القرآن'' کہا گیا یعنی قرآن پر الف لام کی علامت معرفہ داخل کر کے اس کو معرفہ بنا دیا گیا۔ اور دنیائے انسانیت کو کتبِ ہدایت الٰہی کے آخری ایڈیشن'القرآن الحکیم' کی حبل اللہ المتین کے ذریعہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کی دعوت وتحریک برپا کی گئی۔

سلسلۂ انبیاء کی دعوت الی القرآن کے آخری روح رواں اور سب سے پہلے اور حقیقی حامل'القرآن' محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری اور کامل شریعت میں'القرآن الحکیم' کو اولیت دے کر رجوع الی القرآن کی طرف ہر موقع پر جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی، اس کے لیے صرف ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ وہ یہ کہ جب نبی خاتم ﷺ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا گورنر بنایا تو وہاں بھیجنے سے پہلے اُن سے یہ پوچھا کہ اے معاذؓ! تمہارے پاس کوئی مقدمہ لے کر آئے تو تم فیصلہ کس بنیاد پر کرو گے؟ جواب میں حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ قرآن حکیم کے مطابق۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر قرآن میں تمھیں اس کا جواب نہ ملا تو فیصلہ کی بنیاد کیا ہوگی؟ حضرت معاذؓ نے کہا کہ سنت رسول اللہ ﷺ میں اس کی نظیر تلاش کروں گا۔ تب نبی آخرالزماں ﷺ نے پوچھا کہ اگر سنت رسول میں بھی کچھ نہ ملا تو، اس پر حضرت معاذ کا جواب تھا کہ پھر میں اجتہاد کرونگا۔[2] حضرت معاذؓ کی رائے کو آپ ﷺ نے بعینہٖ پسند فرمایا۔ عرض یہ کرنا ہے کہ ہر معاملہ میں سب سے پہلے کلام اللہ کی طرف رجوع کرنا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عادت ثانیہ بن گئی تھی اور اس کے لیے بعض صحابۂ کرام خصوصی کوشش بھی فرماتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ دروس قرآن کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے۔[3] لہٰذا یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے

کہ اسی انبیائی مشن کو نبی آخر الزماں کے بعد ان کے براہ راست تربیت یافتہ گروہِ صحابۂ رسول نے جاری فرمایا اور پھر تابعین صحابہ، تبع تابعین اور ان کے بعد امت مسلمہ کے صلحاء متقدمین و متاخرین نے آج تک رجوع الی القرآن کی اس تحریک کو یکے بعد دیگرے اسی طرح زندہ رکھا جس طرح قرآن وسنت میں اس کی اہمیت بتائی گئی ہے کہ ”کِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ“ یہ نہایت مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور صاحب حق اس سے یاددہانی حاصل کریں (ص/۲۹) اور ”وَهَـٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ“ اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، سراپا خیر و برکت تو اسی کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (الانعام/۱۵۵) اور فرمان رسولِ خاتم ہے کہ ”خیرکم من تعلم القرآن وعلمه“ (بخاری، عن عثمان بن عفانؓ)۔ لہٰذا مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ اسلام کے ہر دور میں رجوع الی القرآن کی تحریک عالم اسلام میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود رہی۔ جہاں کہیں بھی قرآن مجید کی دعوت وتعلیم سے امت مسلمہ ذرا بھی غافل ہوئی تو کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ رجوع الی القرآن کی تحریک کو ایک نئے جوش و خروش سے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وطن عزیز میں تحریک رجوع الی القرآن کے سرخیل شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی:

برصغیر ہند و پاک کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ، جس میں یہاں صرف گزشتہ چار صدیوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی گئی ہے، یہ بتاتا ہے کہ رجوع الی القرآن والسنہ کے سرخیل اٹھارہویں صدی عیسوی یا بارہویں صدی ہجری کے مجدد وعبقری حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیںؒ۔ ان کی برپا کردہ تحریک کو ان کے صاحب زادگان نے مہمیز فراہم کی۔ رجوع الی القرآن کی اسی تحریک کا تسلسل اور بڑھتا دائرہ کار افغانستان سے بنگلہ دیش اور سری لنکا تک اور ہندوستان سے انگلستان و امریکہ تک اور فارسی سے اردو، بنگلہ، پشتو، سنگھالی انگریزی وغیرہ بولنے والوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم چودھویں صدی کے

نصف اول میں حمید الدین فراہیؒ اور نصف آخر میں سے ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریک رجوع الی القرآن کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو بجا طور پر تحریکِ ولی اللّٰہی ہی کا تسلسل مانی جاسکتی ہے۔ مزید برآں تحریک ولی اللّٰہی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح وغیرہ قائم کیے گئے، جن کے فارغ التحصیل علماء نے رجوع الی القرآن کی شمع فروزاں رکھی۔

ہندوستان کی وسعتوں میں جب ہم اس عظیم تحریک کی شاندار کامیابی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو مجبوری یہ ہے کہ اس مضمون کے محدود صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں لہٰذا صرف علی گڑھ میں تحریک رجوع الی القرآن پر چند باتیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔ سرسید علیہ الرحمہ جنھوں نے قرآن حکیم سے اکتساب فیض کے لیے خانوادۂ ولی اللّٰہی سے خوشہ چینی کی اور بجاطور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کے قرآن حکیم پر غیر متزلزل یقین کا کریڈٹ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اور ان کی تحریکِ دعوتِ قرآن کو جاتا ہے۔[۵] ورنہ سرسید کی تعقل پسندی اور حریت فکر ان کو کہیں کا نہ چھوڑتی۔ سرسید علیہ الرحمہ نے نہ صرف خود علی گڑھ میں درس قرآن کا حلقہ قائم کیا، اپنے کالج میں قرآن کی تعلیم وتدریس پر زور دیا، بلکہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ پر یہ اضافی ذمہ داری ڈالی کہ وہ اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں درس قرآن بھی دیا کریں گے۔[۶] چنانچہ یکم فروری ۱۸۸۲ء کو مولانا شبلی نعمانی کی علی گڑھ میں تدریس کا پہلا دن تھا، جیسا کہ عرض کیا گیا سرسید نے ان کو قرآن کا باقاعدہ ایک پیریڈ دیا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے علی گڑھ کے زمانۂ درس قرآن کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنادیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے، سید سجاد حیدر صاحب کہتے تھے کہ مولانا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصول و بلاغت اور صنائع بدائع کو بتاتے تھے اور ان صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے''۔[۷] گویا علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ میں

درس قرآن کی تحریک کا آغاز آج سے سوا سو سال قبل ہوا۔علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) کے بعد درس قرآن کی یہ ذمہ داری پہلے ناظم دینیات علی گڑھ کالج مولانا عبداللہ انصاری (م ۱۹۲۵ء) خویش مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی گئی۔مولانا یہ درس روزانہ اسٹریچی ہال میں مدرسہ کے اوقات سے قبل دیتے تھے جس میں اسکول و کالج کے تمام طلبہ پیشتر سے جمع رہتے تھے اور ان میں دونوں فرقوں (سنی وشیعہ) کے طالب علم ہوتے تھے۔مولانا عبداللہ انصاری کے بعد درس قرآن کی ذمہ داری مولانا سلیمان اشرف پھلواری (م ۱۹۳۹ء) نے سنبھالی۔ان کا درس قرآن بعد نماز عصر ہوتا تھا۔[8] علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ مولانا عصر بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔یہ درس قرآن اس نصابی تعلیم سے الگ تھا جس کی پابندی طلباء پر لازم تھی''۔[9] بحمد اللہ درس قرآن کے متعدد حلقے یونیورسٹی کے مختلف اقامتی ہالوں میں آج بھی چل رہے ہیں اور مطالعۂ قرآن کے بعض حلقے بھی وجود میں آ گئے ہیں جن میں تفسیروں کی روشنی میں مذاکرات اور بحث و مباحث ہوتے ہیں۔

علی گڑھ میں رجوع الی القرآن کی تحریک کی آبیاری سے متعلق سب سے بڑا کام ادارۂ علوم القرآن کا قیام تھا جس میں منظّم طور پر لیکن خاموشی سے اس تحریک کے دوام واستحکام کے لیے علمی اور تحقیقی سرگرمیاں بحمد اللہ ۱۹۸۵ء سے جاری ہیں۔اس سلسلہ میں ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ کے دو اہم فیصلے خاص طور سے قابل ستائش ہیں۔اولاً: رجوع الی القرآن کی تحریک کو مستقبل میں افراد فراہم کرنے کے لیے یہ ادارہ اپنے سند یافتہ اور تربیت یافتہ داعیانِ قرآن کی تیاری کا جامع منصوبہ رکھتا ہے۔ثانیاً: عوام وخواص میں قرآن کریم سے تعلق پیدا کرنے کے لیے اور رجوع الی القرآن کی تحریک کو ایک فعال مکالماتی پلیٹ فارم فراہم کرنے کے لیے یہ ادارہ ۲۰۰۸ء سے سالانہ اِسی موضوع سے متعلق مناسب عنوانات پر سمیناروں کا انعقاد کرتا ہے۔

رجوع الی القرآن کی تحریک میں انگریزی داں طبقہ کی شمولیت بھی ضروری تھی

اور علی گڑھ یونیورسٹی کو یہ کام بطور خاص انجام دینا تھا۔اس سلسلہ میں ایک اہم پیش رفت نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز کے نام پر ہوئی ہے۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد قرآنی تعلیمات کی عصر جدید میں معنویت، اس کا پیغام امن وسلامتی اور ہندوستان میں تفاسیر قرآن کا ذخیرہ وغیرہ موضوعات پر تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیاں قرار پائی ہیں۔

ان منظم سرگرمیوں کے علاوہ انفرادی طور پر تقریری و تصنیفی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے قوی امید ہے کہ قطرہ قطرہ سے دریا اور ایک چراغ سے مزید چراغ روشن ہوں گے۔

تحریکِ رجوع الی القرآن کی امتیازی صفات:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے ذریعہ احیا شدہ تحریکِ قرآن جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے اور جس میں برصغیر ہندو پاک سے ولایت اور نئی دنیا تک قدم جمانے والی مختلف تحریکات شامل ہوگئی ہیں ان میں جو مشترک قدریں پائی جاتی ہیں ان کا ذکر بھی کردیا جائے۔ان تمام تحریکات میں پہلی قدر مشترک یہ ہے کہ ان کے علم برداروں نے قرآن حکیم سے براہ راست تدبر اور غور وخوض پر زور دیا ہے۔گویا شاعر مشرق علامہ اقبال کی نصیحت ؎

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

پر عمل کیا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان تحریکات میں قرآن حکیم کے آفاقی اور اعجازی پہلوؤں کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے نیز قرآن مجید کو محض ایک کتابِ شریعت کے بجائے اس سے اعلیٰ وارفع مقام دے کر اس کو کتاب ہدایت اور انسانوں کی فوز وفلاح کی گائڈ بک کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔اس طرح اس کو رب العالمین کی طرف سے مسائل کا بہترین حل اور امراضِ انسانیت کے نسخۂ کیمیا کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ تیسرا اہم اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفہیم وتشریح میں عصر حاضر کے علوم سے خاطر خواہ مدد لی گئی اور جدید سائنس جو مذہب دشمن اور منکرین خدا کا سب سے بڑا ہتھیار بن کر ابھر رہی تھی اس

کا قرآنی آیات کی زمانی تفہیم وتشریح کے ذریعہ زور توڑا گیا۔ ہاں اس سلسلہ میں بعض زیادتیاں بھی ہوئیں اور کچھ لوگ غلط فہمی اور مرعوبیت کے شکار بھی ہوئے جن کا ازالہ بھی کیا جاتا رہا ہے اور آج بھی ان غلطیوں کو دور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس قرآنی تحریک نے نہ صرف عوام بلکہ مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی قرآنِ کریم سے مطلوبہ تعلق قائم کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔

رجوع الی القرآن کی تحریک کے تعارف، توازن اور تیز گامی کی ضرورت:

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اس تحریک کی اعلیٰ خوبیوں کے باوجود اس کے کارکنان سے شعوری یالاشعوری طور پر بعض اجتہادی غلطیوں کا صدور ایک بشری تقاضا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان غلطیوں پر لگاتار اغماض برتنا کسی طرح بھی درست قرار دیا جاسکتا ہو، لہٰذا یہاں ہم بعض اشارے کرتے ہوئے اور اصلاحی اقدامات کی ضرورت کے پیشِ نظر، قابل توجہ امور کی یاددہانی کرائیں گے۔ مثلاً اس تحریک میں آج کی سب سے بڑی ضرورت مختلف امور میں متوازن رویوں کو اجاگر کرنے کی ہے۔ جس کے لیے ہمیں ایک طرف اسلاف کے ذخیرۂ علم خصوصاً ذخیرہ تفسیر، علوم القرآن سے متعلق قدیم و جدید علمی سرمایہ، صحیح احادیث کی تحقیق اور ان کا قرآن کریم سے انطباق، نیز تفسیری احادیث کے بارے میں متوازن رویہ پیش کرنا ہے تو دوسری طرف جدید وقدیم دونوں علوم کی اہمیت بتاتے ہوئے قرآن فہمی کے تعلق سے تعقل بنام سائنس اور ایمان بنام اندھی عقیدت (Blind faith) دونوں غیر متوازن رویوں کی تصحیح کرنا ہے۔ ذی وقار اسلافِ امت، علماء کرام اور گروہی، مسلکی اور مذہبی بزرگوں سے عقیدت میں توازن اور شخصی و جماعتی عقیدت و نفرت میں توازن پیدا کرنا اور امتِ مسلمہ کو قرآن وسنت کی صحیح شاہراہ مستقیم یاد دلانا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دین ودنیا کی غیر اسلامی تقسیم اور علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم پر بھی محتاط ومتوازن رائے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے وحیِ الٰہی پر مبنی اقوالِ رسول اور غیر وحی الٰہی پر مبنی انسانی آرا یعنی الٰہیاتی (Divine) اور غیر الٰہیاتی (Non-Divine)

امور و اقوال میں عدم توازن کا رویہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔اسی طرح خالص دنیوی اور دینی امور، نظریات و حقائق، زمانی و مکانی علوم اور آفاقی حقائق وغیرہ میں فکر کی درستگی ضروری ہے۔علاوہ ازیں علوم دین و دنیا کی مستقل تقسیم، کلامی بحثیں، فلسفیانہ مسائل، فقہی مناقشے، مسلکی و مذہبی آرا سے کنارہ کشی ہی اس تحریک کی زندگی کی علامت ہے۔ان تمام امور کے تئیں کارکنان میں احتساب کی اور امت مسلمہ میں اصلاح کی ضرورت ہے اوران تمام اصلاحات کو بروئے کار لانے کے لیے تمام مساجد میں حلقہائے درس قائم کر کے قرآن کریم سے زندہ و متحرک رشتہ قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے اور جہاں گروہی، مسلکی اور جماعتی تعصّبات ہیں وہاں محبت اور سوز و حکمت نیز خدمتِ خلق کی راہ سے دعوتِ الی القرآن کو ہر مسلم کے دل کی آواز بنا دینا ہے۔اصلاحِ امت کا ایک دائرہ شرک و بدعات کی گندگیوں سے دنیائے اسلام کو نجات دلانا ہے نیز جماعتی، مسلکی اور جملہ لسانی، مکانی، سماجی اور باطل تعصّبات کو مٹا کر اُس حبل اللہ المتین سے بندگان خدا کا رشتہ استوار کرانا ہے جو ان کے دنیوی مسائل کے حل کی شاہِ کلید اوراخروی نجات کی ضمانت دیتی ہے۔رجوع الی القرآن کی تحریک کے ذریعہ اُن بندگان خدا تک بھی رب العالمین کا پیغام ہدایت پہنچانا ہے جو اس سے بالکل ناآشنا ہیں۔

مندرجہ بالا عمومی امور کے علاوہ کچھ معروضات خصوصی نوعیت کی ہیں۔اولاً قرآن حکیم کی آفاقیت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ کلام الٰہی رہتی دنیا تک اور تمام انسانوں کے لیے جملہ مسائلِ حیات کا حل پیش کرتا ہے لیکن ایسا کہنے اور غیروں کے سامنے ثابت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔بدقسمتی سے نہ ہم نے تمام انسانوں کے مسائل یعنی آفاقی مسائل کے بارے میں سوچا اور نہ قرآن مجید میں اس تعلق سے غور و خوض کی منظّم کوشش کی۔آج دنیائے انسانیت کو قرآن کریم کی آفاقی تفسیر کی ضرورت ہے جو خاص طور سے غیر مسلموں کو ذہن میں رکھ کر تصنیف کی جائے۔اسی طرح قرآن مجید کو کسی زمانی و مکانی فریم میں رکھ کر لسانِ وحی و رسالت کے علاوہ کسی تعبیر کو حرف آخر سمجھنا بھی قرآن حکیم کی آفاقیت کو مجروح کرنا ہے۔دراصل قرآن حکیم کی زمانی و مکانی تعبیروں کو ان کے صحیح پس

منظر اور سیاق کی روشنی میں بدلتے زمان و مکان کی نئی اصطلاحات اور اسالیب نیز زمانی و مکانی علوم سے مملو قرآنی تعبیروں کی ضرورت ہے۔ رجوع الی القرآن کے علم برداروں کو قرآن وسنت پر مبنی شریعت کے آفاقی تصور سے عالمِ انسانیت کو روشناس کرانے کے لیے اس کے بنیادی اقدار اور بنیادی تعلیمات و احکامات کے غیر مبدل ہونے کی حکمت اور فروعات و احکامات میں یک گونہ لچک کو یاد دلانا ہے بلکہ ہدایتِ الٰہی کے متحرک (Dynamic) اور لچک دار (Flexible) پہلوؤں کو خصوصاً پیش کرنا ہے البتہ یہ بھی بتانا ہے کہ اصولی طور سے قرآنی تعلیمات، اس کی حکمتیں اور اس کا نظامِ اقدار زمان و مکان سے مبرا ہونے کی وجہ سے غیر مبدل ہیں نیز قرآنی تفسیر و تعبیر کے جوہر اور اصل الاصول میں کسی طرح کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔[10] مزید براں آیات قرآنی کی اصطلاحی تاویلات و معانی اور مراد خداوندی زمان و مکان کی محدودیتوں سے وراء الورا ہیں، ہمیں اس پر یقین رکھنا ہے اور اس پر نظر بھی رکھنا ہے کہ کوئی جانے یا انجانے ان بنیادوں میں تغیر و تبدیلی کی وکالت تو نہیں کر رہا ہے۔

علوم شرعیہ اور غیر شرعیہ کی غیر قرآنی تقسیم سے جو تفہیم قرآن اور فہم قرآن میں مشکلات پیدا ہوئی ہیں اس خلاء کو پُر کرنے کی بھی ضرورت ہے لہٰذا ان دونوں علوم کے ماہرین جب تک ایک پلیٹ فارم پر آکر مطلوبہ تدبر نہیں کریں گے اس وقت تک قرآنی معرفت و ہدایت کی عصری تعبیر و تشریح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔[11]

رجوع الی القرآن کی افادیت عصر حاضر میں اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ عالم انسانیت فی الوقت خطرناک معاشی، سماجی، سیاسی اور روحانی بحرانوں سے گزر رہا ہے اور دور جدید کے سارے ملحدانہ نظام ہائے زندگی فیل ہو چکے ہیں اور الہامی و روحانی مذاہب میں عیسائیت، یہودیت، ہندوازم، بدھ ازم، جین ازم، پارسیت وغیرہ موجودہ معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کا وزنی متبادل حل پیش نہیں کر سکتے۔ صرف اسلام ہی ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے بھٹکتی انسانیت کو اپیل کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ جس کے لیے قرآن مجید کے آفاقی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت بدرجہا بڑھ گئی ہے اور امت مسلمہ کو ایک امتِ دعوہ

اور خیر امت کی حیثیت سے اپنے فقہی، مسلکی، گروہی، لسانی و سماجی اور جملہ غیر قرآنی تعصّبات وتحفظات سے اوپر اٹھ کر خدائے واحد کے آفاقی پیغامِ ہدایت کی عصری تشریح و توجیہ پیش کرنے کے لیے اس کو من حیث الجماعت دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رجوع الی القرآن کی تحریک کا عوام میں تعارف، خواص میں اس کے ذریعہ اصلاح وتوازن کا قیام اور کارکنانِ تحریک میں اخلاص وتڑپ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

رجوع الی اللہ کی دعوت وتحریک کا بہترین طریقہ جو روزِ اول سے امتِ مسلمہ نے اختیار کیا ہے اور جس کی افادیت ہر زمانہ میں مسلم رہی ہے وہ درس قرآن کا پابندی سے انعقاد کرنا ہے لہٰذا مندرجہ ذیل سطور میں اس موثر آلہ تحریک کو مزید موثر اور جاندار بنانے کے ذرائع اور شرائط پر اظہار خیال کیا جائے گا۔

مقاصدِ درس قرآن (Objectives)

جیسا کہ اب تک کی بحث سے واضح ہے کہ یہاں ہم درس قرآن کو بحیثیت ایک موثر آلہ تحریک رجوع الی القرآن لینا چاہتے ہیں مگر اس بنیادی مقصد کے علاوہ ہمارے ذہن میں کچھ ذیلی Objectives بھی ہوں تو اس سے مزید فائدے ہوں گے ہم ان کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف ان کی طرف اشارے کر رہے ہیں:

(۱) درس قرآن کا پہلا مقصد اپنی ذات کی اصلاح وتربیت کے ذریعہ رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

(۲) درس قرآن کا مقصد لوگوں کی ہدایتِ عامہ کا جذبہ ہو اور اس کے لیے خصوصی تڑپ پیدا کرنا مقصود ہو۔

(۳) درس قرآن کا مقصد لوگوں کو ان کے رب اور کلام اللہ سے قریب کر دینا ہوتا کہ وہ اپنے رب اور اس حبل اللہ المتین سے محبت کا رشتہ قایم کر سکیں۔

(۴) درس قرآن سے مخاطبین کی اصلاح وتربیت پیش نظر ہو جس سے وہ جہنم سے بچ جائیں اور جنت کے مستحق بن سکیں۔

(۵) درس قرآن کا ایک مقصد امتِ مسلمہ میں خصوصاً اور تمام انسانوں کے درمیان عموماً اتفاق واتحاد اور امن وسلامتی کا ماحول پیدا کرنا ہو۔

(۶) درس قرآن کے ذریعہ عصری مسائل کے قرآنی حل کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو تا کہ لوگوں کے درمیان قرآنی حل ایک بہترین انتخاب (Viable option) بن کر ابھرنے لگے۔

(۷) درس قرآن میں مسلکی، گروہی، جماعتی بلکہ تمام غیر اسلامی تعصّبات سے اوپر اٹھ کر صرف اور صرف منبع وحیِ الٰہی، حاملِ وحی ونبوت اور اصلِ کلامِ وحی سے رشتہ استوار کرنا مقصود ہو۔ ہم تو یہ پسند کرتے ہیں کہ اگر کوئی مسلکی، گروہی اور جماعتی بلکہ منفرد شخصیات پر مبنی ترجیحات اور پسند و ناپسند کا معاملہ بھی آجائے تو ان کا نام لیے بغیر درس قرآن میں مجرد رائے ہی کا اظہار کیا جائے اور اقرب الی القرآن وابستہ رائے پیش کردی جائے تا کہ کسی خاص گروہ، جماعت یا فرد کو جانے یا انجانے حمایت نہ مل جائے۔ جس کے نتائج باعث نفرت ہوں۔

درس قرآن کی موثر ترسیل (Delivery) کے ذرائع

درس قرآن کے مندرجہ بالا لوازم و مقاصد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے البتہ درس میں مزید قوت اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع بطور یاددہانی پیش کیے جارہے ہیں۔

(۱) درس قرآن، بول چال کی عام فہم، دلنشیں اور با ادب شریفانہ زبان میں دیا جائے۔ نیز دوران درس کوئی لفظ یا جملہ قرآن کریم کی عظمت واحترام کے منافی نہ ہو۔ جہاں تک ممکن ہو درس میں سادگی اور بیساختگی نمایاں ہو۔ جملوں میں ادبی، فلسفیانہ اور عالمانہ الجھاؤ نہ ہو۔ درس قرآن نہ اتنا آہستہ آواز میں دیا جائے کہ لوگوں تک بات پہنچنے میں دشواری پیدا ہوجائے اور نہ اتنی بلند آواز میں دیا جائے کہ مدرس کی آواز قریب بیٹھے لوگوں پر گراں گزرنے لگے۔

(۲) درس قرآن میں کلام اللہ کی عظمت اور اس کے معجزہ ہونے کا استحضار نمایاں ہو اور اس پر گہرا ایمان ہونے کا اشارہ ملے۔ اگر مدرسِ قرآن خود ابہام کا شکار ہوگا اور وہ کسی آیت کے بارے میں اس طرح اظہار کرے گا کہ سامعین بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائیں تو اس سے زیادہ خسارہ کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ایسے امور میں اپنی علمی کوتاہی بلکہ عالم انسانیت کی محدودیتِ علمی کو یاد رکھے اور سامعین کو یہ حقیقت بار بار یاد دلاتا رہے کہ یہ اس علام الغیوب اللہ کا کلام ہے کہ جو اپنے علم کے پردے رفتہ رفتہ اٹھا رہا ہے تو بھی آج کا دورِ علمی دھما کہ (Knowledge explosion) کا دور کہلایا جا رہا ہے اور جیسے جیسے یہ پردے اٹھ رہے ہیں وہ ماضی کے علوم کو بے معنیٰ بنا دیتے ہیں تو تصور کریں کہ مستقبل میں انسانی معلومات وعلوم کی کیا وسعتیں ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی علمی گہرائیاں اور تنوع جہات ومعلومات کا تصور بھی ناممکن ہے اور ان سب وسعتوں کے باوجود انسان کا علم محدود اور خلاق عالم کا علم محیط اور ناپیدا کنار ہے، لہٰذا اس کے کلام کی گہرائیاں اور گیرائیاں اور اس کی حقیقی کنہ کی معرفت انسانی عقل وذہن میں نہ آئے تو بعید از قیاس نہیں۔

(۳) درس قرآن میں سوز وگداز اور نصیحت وموعظت کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ قرآنی دلائل بلا جھجک اور بالکل فطری انداز میں پیش کیے جائیں، جہاں دوزخیوں پر غیض وغضب کا ذکر ہے اور اس کی تفصیل ہے وہاں اس کی مناسب تاویل کی جائے نیز عربی زبان اور اسالیب قرآن سے سامعین کو روشناس کرایا جائے اور جہاں جنت کی نعمتوں اور حور وغلمان کا ذکر ہے وہاں بھی دل لگتی اور اطمینان بخش تاویل کی جائے۔

(۴) مخاطبین وسامعین کے علم، صلاحیت، مزاج اور ذہنی سوالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے درس کی باقاعدہ تیاری کی جائے اور ان نکات کو سامعینِ درس کے سامنے رکھا جائے جو ان کو سمجھ میں آسانی سے آ جائیں اور جن امور کو وہ جاننا بھی چاہتے

ہوں۔ سامعین جن اصطلاحات سے واقف ہوں اور جو زمانی و مکانی محاورے عام ہوگئے ہوں ان کا استعمال کیا جائے۔ اپنی علمی برتری کا اظہار اور سامعین کی کم علمی پر حقارت بھری نظر وہ سمِ قاتل ہے جو نہ خدا کو پسند ہے اور نہ اس کے بندوں کو، لہٰذا ایسی حماقت سے مکمل پرہیز کیا جائے جس سے ہماری دنیا اور آخرت دونوں بگڑتی ہیں بالخصوص سچی محبت اور اخلاص پر مبنی عزت و احترام مخلوقات عالم کے قلب سے اٹھالیا جاتا ہے۔

(۵) درس قرآن میں نہ صرف جملہ سامعین کو مخاطب بنایا جائے بلکہ ہر شخص کو یکساں طور پر متوجہ رکھا جائے اور دورانِ درس پیچیدہ امور میں باقاعدہ یہ پوچھا جائے کہ یہ مشکل بات سمجھ میں آگئی اور اگر سامعین کرام اپنی زبان حال (Body language) سے نہ سمجھ پانے کا اشارہ دیں تو نئے اور آسان تر اسلوب و زبان میں وہی بات دوبارہ پیش کی جائے۔ مزید برآں درس قرآن کے بعد سوالات کا موقع بھی ضرور دیا جائے کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بعد درس سوالات سے مدرس اپنی ترسیل درس کا صحیح احتساب کرسکتا ہے اور اپنی خوش فہمی اور دوسروں کی غلط فہمی صحیح معنی میں رفع کرسکتا ہے۔ درس قرآن میں جدید ذرائع ابلاغ مثلاً پاور پائنٹ کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے البتہ قرآن مجید کا ادب و احترام بہرحال ضروری ہے۔ انٹرنیٹ، ویڈیو گرافی وغیرہ بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں جن کا استعمال فی زمانہ بڑھتا جارہا ہے اور ہمیں جملہ آلاتِ ترسیل وترغیب کو رجوع الی القرآن کی تحریک میں لگانا ہے۔

صاحب درس کے بنیادی اوصاف:

قرآن کریم کا درس دینے والا جب تک خود اپنی زندگی میں مطلوبہ صفات پیدا نہیں کرتا اس کا درس خاطر خواہ اثرات پیدا نہ کرسکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی دعوت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کرکے ان کی گزشتہ زندگی کو بطور ثبوت پیش کیا کہ ’’فَقَدْ

لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّن قَبْلِهِ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ ''(یونس/۱۶) نیز آپ ﷺ عرب کی فصیح ترین زبان بولتے تھے۔ آپ ﷺ حاملِ نبوت ہونے کی وجہ سے ایمان وعلم اور حکمت کے خزینوں سے بھی مالا مال تھے، آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ وتابعین وغیرہ نے جونشانات راہ قایم کیے ان کی روشنی میں صاحبان درس قرآن میں مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا لازمی قرار پاتا ہے۔

اولاً: قرآن مجید کا درس دینے والا سب سے پہلے خود قرآن کریم پر غیر متزلزل یقین رکھنے والا ہو۔

ثانیاً: وہ خود ایمان دار، نمازی، سنت رسول ؐ کا پابند، بااخلاق، کبائر سے مجتنب اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا ہو۔

ثالثاً: قرآن مجید کا درس دینے والا کم ازکم قرآن مجید کی صحیح تلاوت کرنے والا اور بہتر یہ ہے کہ قراءت وتجوید کے فن کے مطابق پڑھنے والا ہو۔

رابعاً: وہ قرآن وسنت کا لازمی علم رکھتا ہو اور اس پر عمل کرنے میں کسی کوتاہی کا شکار نہ ہو۔

خامساً: وہ قرآن حکیم سے خصوصی شغف رکھتا ہو یعنی رات دن قرآن ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہو اور درس قرآن کی تیاری میں کسی کوتاہی کا ملزم نہ ہو۔

سادساً: جو کچھ کہتا ہو اس پر خود پہلے سے عمل پیرا ہو، فخر ومباہات سے دور اور منکسر المزاج ہو، محبت اور عفو ودرگزر اس کا عام شیوہ ہو اور سلام میں پہل کرنے والا ہو۔

سابعاً: لوگوں کی ہدایت اور جہنم سے خلاصی کے لیے رات دن بے چین رہتا ہو۔ راتوں کو لوگوں کی ہدایت کی خاطر روتا اور دعائیں کرتا ہو۔

ثامناً: قرآن کے متعلقات مثلاً علوم القرآن، احکاماتِ قرآن، عجائب القرآن، اعجاز القرآن وغیرہ سے اس کو خصوصی دلچسپی ہو۔ مفسرین اور عام تفسیروں کے بارے میں مثبت رویہ رکھتا ہو۔

تاسعاً: صاحب درس قرآن میں یہ بنیادی خوبی ہو کہ وہ مخاطبین میں قرآن مجید سے محبت وشغف پیدا کردے۔

عاشراً: صاحب درس قرآن مخاطبین میں قرآن فہمی کو آسان بنادے اور قرآن کریم پر عمل کرنا ان کے لیے آسان ہو جائے۔

درسِ قرآن کے دوران یادرکھنے والی اور توجہ دلانے والی باتیں:

مدرس قرآن دوران درس یاددلاتا رہے کہ یہ اللہ رب العالمین کا پاکیزہ، آفاقی، جامع و کامل کلام اور ہدایت نامہ ہے۔اس کلام کے مخاطب ہم سب ہیں۔ یہ ہماری فلاح و کامیابی اور اللہ تعالیٰ سے صحیح اور بہترین رشتہ قایم کرانے کے لیے ہی نازل ہوا ہے۔اس میں جملہ انسانوں کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔اسی سے وابستگی ہمیں دائمی اور مکمل سکون سے ہم کنار کراسکتی ہے، یہی ہمارے جملہ امراض کا نسخۂ شفا ہے۔یہی کائنات کے جملہ حقوق میں توازن کا ضامن ہے۔یہ نفس کے حقوق، بندوں کے حقوق، موجودات عالم کے حقوق اور خالق کائنات کے حقوق کی بدلتے زمان و مکان اور حالات میں بہترین ترجیحات وتوازن کا حامی ہے۔قاری قرآن کو اس حقیقت کو مستحضر رکھنا چاہیے کہ اسالیب میں تبدیلی، خطاب ومخاطبین میں تبدیلی اور کلام میں تنوع کے ساتھ جامع توازن کا علم بردار ہے، اگر جنت کا ذکر کرتا ہے تو جہنم کا ذکر بھی کرتا ہے۔سزا اور انعام کی بات کرتا ہے تو عدل کے پہلو کو بھی یاددلاتا ہے۔

قرآن مجید بنیادی طور پر کتاب نصیحت وموعظت ہے لہٰذا عبادات کا معاملہ ہو یا احکامات کا، جنگ کا تذکرہ ہو یا امن کا، ان تمام مباحث کے بعد بلکہ ساتھ ساتھ نصیحت و موعظت کے پہلوؤں کو نہیں چھوڑتا، مدرسین کرام کو بھی ان تمام امور کی طرف قارئین قرآن اور سامعین کی توجہ مبذول کراتے رہنا چاہیے۔اسی طرح یہ حقیقت بھی مستحضر رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم اپنے قاری کا عقل وایمان کے پہلو سے ہر آیت میں امتحان لیتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کی ہر آیت میں عقل اور ایمان کا مختلف پہلوؤں سے قاری کا امتحان ہے اس سے قاری قرآن کو نہ تو دل گرفتہ ہونے کا موقع ہے اور نہ کسی آیت پر شک وتردد کی گنجائش واجازت ہے بلکہ رب کریم کا مقصد قرآن کریم کے ذریعہ عقل وایمان میں

جلا، توازن اور استحکام پیدا کرانا ہے۔اس حقیقت کے استحضار سے ہر سامع و قاری، قرآن مجید کی ہر آیت سے نہ صرف صحیح سبق حاصل کرتا ہے بلکہ ان کو اپنے مختلف مسائل سے جوڑ کر ان کا بہترین حل معلوم کرسکتا ہے ضرورت اس یقین کی ہے اور اس کے بعد انطباق کی۔اس معاملہ میں سامعِ قرآن درس قرآن کے بعد اپنے مسائل کو مدرس کے سامنے رکھ کر اس کی مدد سے اپنے مسائل کا قرآنی حل آسانی سے معلوم کرسکتا ہے۔رجوع الی القرآن کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ بندگان خدا کا کلام اللہ سے براہ راست اور حقیقی رشتہ قایم ہو جائے اور یہ مقصد جبھی حاصل ہوگا جب کہ ہم سب اپنے جملہ مسائل کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی شعوری کوشش کریں اور دنیائے انسانیت کے مسائل کے قرآنی حل کی منظّم جدو جہد کریں۔ دراصل یہی مومن کی شان ہے اور اسی طریقۂ کار میں ہماری فوز و فلاح کی ضمانت دی گئی ہے کیونکہ یہی حقیقی دعوتِ الی الخیر ہے۔مزید برآں قرآن کریم کی اسی جامعیت و کاملیت کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ”لو ضاع لی عقالاً لوجدته فی كتاب الله“ [۱۲] (اگر اونٹ باندھنے کی رسی بھی گم ہو جائے تو میں اسے کتاب اللہ میں تلاش کرلوں گا)۔فہم قرآن کا ایک راستہ مسائل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے جس کا ذکر ہم نے یہاں کیا ہے، جب کہ فہم قرآن میں مطلوبہ جلا، اضافہ اور استحکام کی چند شرائط بنیادی نوعیت کی بھی ہیں جن کا ذکر مندرجہ ذیل نکات میں کیا گیا ہے۔

قرآن فہمی کی بنیادی شرائط:

۱- قرآن کریم اور اس کے نازل کرنے والے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار معرفت قرآن کی لازمی شرط ہے۔

۲- قرآن کریم کے اعجاز و انقلابیت پر یقین اور سعی پیہم کے ساتھ مسلسل دعاؤں کے بقدر قرآن حکیم کا فہم حاصل ہوتا ہے۔

۳- قرآن فہمی کے لیے متنِ قرآن (Quranic text) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کے لیے عربی زبان کی ضروری شُدبُد لازمی ہے، نیز متنِ قرآن کی صحیح

سمجھ ایک جیسی آیات کی مختلف جگہوں پر ہونے سے پیدا شدہ معانی کی وسعتوں میں ہے۔

۴- آیات قرآنی کے نزولی پس منظر ان کے سیاق وسباق اور سورہ کے موضوع وعمود کی روشنی ہی میں مراد خداوندی تک رسائی ممکن ہے۔

۵- قرآن وسنت اور علوم القرآن کی روشنی میں غور وخوض کرنا قرآن فہمی کی کنجی ہے۔

۶- قرآن فہمی کی بنیادیں ان عقائد خمسہ میں بھی پیوست ہیں جن کو توحید، رسالت، آخرت، عبادت اور خلافت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

۷- قرآنی تحریک سے عملی تعلق کے بقدر قرآن حکیم کا فہم حاصل ہوتا ہے۔

۸- قرآن کریم کی آیات اور آیات کائنات ایک ہی سکہ کے دورخ کی مانند ہیں اور ان کی دوسری تعبیر Word of God اور Work of God سے کی جاسکتی ہے لہٰذا کتاب اللہ کو کتابِ کائنات کے آئینہ اور حوالہ سے پڑھنا قرآن فہمی کو آسان تر بنادیتا ہے۔ اسی طرح کھلی کتابِ فطرت، جس میں تصنعات اور مصنوعات کے کم سے کم پردے حائل ہوں، اس میں قرآن کریم کا سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے یعنی مظاہر فطرت سے دلچسپی اور ان کا براہ راست (Direct) مشاہدہ جس میں دوربین اور خوردبین کے استعمال کا انکار مقصود نہیں ہے، کیونکہ یہ آلات بذات خود مشاہدۂ فطرت میں ممد ومعاون ہیں۔آلات کی مثال نظر کے چشمہ جیسی ہے جب کہ ہم رنگین اور دھوپ کے چشموں سے پرہیز کی وکالت کررہے ہیں۔

۹- قرآن فہمی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قاری خود کو پوری طرح قرآن کے حوالہ کردے اور اپنے تمام تحفظاتِ ذہنی وقلبی کو بالائے طاق رکھ دے۔

۱۰- قرآن مجید کے اسالیب کی واقفیت بھی قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے۔ دراصل ان اسالیب قرآن کو نہ جاننے یا ان کی طرف توجہ نہ ہونے سے آیات قرآنی کے معانی تک رسائی نہیں ہو پاتی اور بعض اوقات تو اس کی اُلٹی تعبیر وتاویل تک ہوجاتی ہے۔[۱۳۳]

قرآن فہمی کے مندرجہ بالا لوازم میں ہر شرط بنیادی نوعیت کی حامل ہے اور مستقل بالذات ہے لہٰذا ہمارا حقیر خیال ہے کہ ان میں سے کسی بھی شرط کی عدم موجودگی قرآن فہمی کے نقص پر دلالت کرے گی اور ان میں سے کسی ایک کی کمزوری بھی فہم قرآن کو متاثر کرے گی۔ نیز رجوع الی القرآن، تعلق بالقرآن کے بغیر اور تعلق بالقرآن فہم قرآن کے بغیر ممکن نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس سے پیش تر کہ رجوع الی القرآن کی بحث میں مطالعۂ قرآن کی اہمیت اور اس کے لوازم کا ذکر کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا خلاصہ بیان کرنے کی ضرورت واہمیت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ قرآن حکیم کے خلاصہ کو پیش کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عوام میں قرآن کو سمجھنے کا ذوق وشوق بڑھتا ہے۔ جس بستی میں بدقسمتی سے قرآن حکیم کی تعلیمات عوام تک نہیں پہنچی ہیں اور اس سے لوگوں کا متحرک اور زندہ رشتہ قایم نہیں ہوسکا ہے بلکہ بعض اس قسم کے شکوک وشبہات اور سوالات ہیں جن کا جواب ان کو چند ہفتوں میں چاہیے اور ہوسکتا ہے کہ درس قرآن میں شرکت تک کے لیے ان کے ذہن و قلب آمادہ نہ ہوں، ایسی حالت میں ماہ رمضان المبارک اور قرآن مجید کے رشتہ کے حوالہ سے نمازِ تراویح کے بعد سوز وحکمت سے قرآن مجید کے تلاوت کردہ حصہ کا خلاصہ بیان کر دیا جائے اور قرآن مجید کا اعجاز، اس کا حسن، اس کی انقلابیت، اس کی تعلیمات وغیرہ سے مصلیانِ مسجد کو روشناس کرا دیا جائے تو بعد میں درس قرآن میں شرکت بھی ان کے لیے آسان ہو جائے گی اور قرآن کا ذوق بھی پیدا ہو سکے گا۔ بلاشبہ خلاصۂ تراویح قرآن درس قرآن سے مشکل کام ہے۔ اس میں تیاری بھی زیادہ کرنا ہوتی ہے اور سامعین کرام کے مزاج، لیاقت، قرآن کے تئیں سوالات اور ان کے حجابات کے ساتھ ساتھ ان میں قرآن سے تعلق کا جذبہ بیدار کرنا اور ذوق وشوق دلانا بھی شامل ہے۔ ان تمام امور کے علاوہ اس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینہ کی مشقت اور تکان کا بھی حقیقی مسئلہ ہے۔ البتہ قرآن مجید کے پڑھنے سننے کے لیے اضافی جذبہ بھی ان دنوں امت مسلمہ میں بحمداللہ موجود رہتا ہے۔ اس اشارہ پر یہاں اکتفا کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سطور میں مطالعۂ قرآن کے

لوازم پر چند گزارشات پیش کی جائیں گی۔

مطالعۂ قرآن دراصل رجوع الی القرآن کا درس قرآن سے اعلیٰ طریقۂ کار ہے اور جب تک کسی بستی میں درس قرآن کا باقاعدہ سلسلہ موجود نہ ہو مطالعۂ قرآن جاری کرنے سے مطلوبہ مقصد حاصل نہ ہوسکے گا اور نہ خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔مزید برآں مطالعہ قرآن کے لیے جس حوصلہ، شوق، تیاری اور علمی لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ دروس قرآن میں باقاعدہ شرکت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ ضرورت بھی ایک دو پارے کے دروس میں شرکت سے پوری نہیں ہوسکتی بلکہ کم از کم چوتھائی قرآن کے دروس میں مستقل شرکت کے بعد سامع قرآن خود کو اس پوزیشن میں پاتا ہے کہ مطالعۂ قرآن کی شرائط کو پورا کر سکے۔مطالعۂ قرآن میں خاموش تماشائی بن کر بیٹھنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ درس قرآن کی مجلسوں میں شرکت کرے کیونکہ اس سے ایسے شخص کو زیادہ علم وفہم اور اطمینان حاصل ہوگا یہ ہمارا یقین اور تجربہ ہے۔

مطالعۂ قرآن کے لوازم

درسِ قرآن اور مطالعۂ قرآن نیز ان کے طرق ولوازم میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ درس قرآن عوام کے لیے ہوتا ہے اور اس میں مدرس قرآن کے سوا باقی تمام شرکاء خاموش تماشائی کی حیثیت میں رہتے ہیں جب کہ مطالعہ قرآن میں تمام شرکاء بحث ومباحثہ میں برابر کے شریک رہتے ہیں یعنی یہاں رفع ترددواشکال کا فوری موقع ہوتا ہے۔علاوہ ازیں مطالعۂ قرآن کے شرکاء باقاعدہ تیاری کر کے آتے ہیں جب کہ درس قرآن میں تیاری صرف مدرس کرتا ہے اور باقی لوگ مدرس کی تیاری پر اعتماد کرتے ہوئے اور اس کے علم کو مستند سمجھتے ہوئے اپنا ذہن وفکر اور رائے بناتے ہیں۔اس طریقِ ترسیل میں اس نقص وغلطی کا امکان ہے کہ مدرس اپنی اجتہادی رائے کو قرآنی حکم بنا کر پیش کردے جب کہ مطالعۂ قرآن میں اس غلطی کا امکان کم رہتا ہے کیونکہ دوسرے لوگ بھی مطالعہ کر کے آتے ہیں اور وہ بھی اپنی اجتہادی رائے رکھتے ہیں اور ہر ایک شریک مطالعہ کو اپنے دلائل کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے کا موقع ہوتا ہے۔مطالعۂ قرآن کے بعض بڑے فائدے یہ ہیں کہ کسی

مسئلہ میں اجتماعی رائے ابھر کر سامنے آتی ہے، قرآنی آیات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں، ایک نشست میں خاطر خواہ علمی ذخیرہ (Matter) ملتا ہے اور آدابِ اجتماعیت اور تہذیب وتربیت نفس کے مواقع ملتے ہیں خصوصاً انسانی مزاج کی پیچیدگیاں اور عقل وذہن کی خامیاں اور خوبیاں نیز معلومات عامہ اور مطالعہ کی سطحیت و گہرائی اور تحفظاتِ شخصی اور گروہی سبھی کچھ سامنے آتے ہیں۔ ان تمام نزاکتوں کے پیش نظر ضروری ہے کہ مطالعۂ قرآن کو بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے علم میں گیرائی رکھنے والے معزز ومحترم شخصیت کو ناظم پروگرام بنانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ناظمِ قرآن نہ صرف پروگرام میں مطلوبہ نظم قایم رکھتا ہے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ زیر مطالعہ قرآنی آیات کا تعارف، خلاصہ اور اختلاف رائے میں ایک جچی تلی اور صائب رائے پیش کرے جس سے اکثریت مطمئن ہو سکے۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظم مطالعۂ قرآن کی حیثیت اختلافی امور میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنے والے شخص کی نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے حکَم کی ہوتی ہے جو سب کے شیشۂ دل کا محافظ ہوتا ہے جو نہ صرف لوگوں کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے بلکہ اپنی مقناطیسی صفات کو بروئے کار لا کر شرکاءِ مطالعہ کو قرآن کریم سے اور خود سے قریب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ناظم مطالعہ کو حضور نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کو یاد رکھنا چاہیے کہ "یسّروا ولا تعسّروا ، بشروا ولا تنفروا"[۱۴۱] (آسانی فراہم کرو نہ کہ مشکلات، بشارت دو اور متنفر نہ کرو) لہٰذا دوران مطالعہ ہر گھڑی اور خصوصاً اختلافی امور میں نرم روی، محبت، دل سوزی اور مؤثر دلائل سے لوگون کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر شخص اپنی رائے کو برحق سمجھتا ہے اور سبھی طالب علم ہیں۔ لہٰذا مسئلہ حق وباطل کا نہیں بلکہ اپنی رائے پر دوسروں کو مطمئن کرنے کا ہے جو زور وزبردستی سے کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے عقل ودل دونوں کو جیتنا ہے۔ دوسری اہم بات یہ عرض کرنا ہے کہ ناظم مطالعہ اگر تبدیل ہوتا رہے تو اس کے مزید فائدے ہیں، ایک تو یہ فائدہ ہے کہ شرکاءِ مطالعہ مختلف شخصیات کے ذریعہ پروگرام میں تنوع سے شاد کام ہوسکیں گے اور کسی شخص سے ذہنی قربت نہ ہونے کی وجہ سے پروگرام نہ چھوڑ بیٹھیں گے۔ مزید برآں ایک ہی شخص پر

خصوصی تیاری کا مسلسل بوجھ بھی نہ رہے گا۔ تیسرے یہ کہ قرآن کریم کی آفاقی ہدایات اور لامحدود معارف و حِکَم کو یک شخصی رائے سے مسلسل مجروح نہ کیا جا سکے گا۔

مطالعۂ قرآن کے لوازم میں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس طریقہ میں ہر شریک مطالعہ کو نشست کے لیے طے شدہ آیات کی تیاری کرنا ہوتی ہے لہٰذا ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ تفسیر کو پڑھ کر آئے اور اپنا حاصل مطالعہ پیش کرے اور آیات پر الگ سے بھی غور و تدبر کرے اور وہ اس مجلس میں سب کے سامنے اس غرض سے رکھے کہ مطالعہ اور غور و خوض میں اس کی جو خامیاں یا غلطیاں ہوں وہ اس کو معلوم ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بنیادی نوعیت کی اہلیت اور اضافی تیاری دونوں ہی چاہتا ہے۔ ہماری یہ حقیر رائے ہے کہ مطالعہ قرآن میں شرکت کرنے والا ہر فرد کم سے کم عربی گرامر (صرف و نحو) اور اسالیب قرآن کے پرائمری نصاب کو باقاعدہ مکمل کر چکا ہو جس کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آغاز مطالعۂ قرآن سے پہلے ان دو کورسوں کی باقاعدہ تعلیم کا نظم کیا جائے۔ اسی طرح علوم القرآن کی بنیادی واقفیت، قرآن و سنت کا رشتہ، احادیث و آثار کا قرآن فہمی میں مقام، قرآن فہمی میں زمان و مکان کی بحث اور قرآن مجید کی آفاقیت کے پہلوؤں پر باقاعدہ لیکچرس کے ذریعہ امت مسلمہ کے طے شدہ اجماعی افکار شرکاء مطالعہ کو ابتدا ہی سے معلوم ہونے چاہئیں تا کہ مطالعۂ قرآن کے وقت ان بحثوں میں الجھنے کے بجائے ان آیات سے دنیوی زندگی کے مسائل میں مطلوبہ ہدایت حاصل کی جا سکے اور رجوع الی القرآن کے اصل مقاصد یعنی اخروی نجات اور خوشنودی رب بھی حاصل ہو سکیں۔[۱۵]

درس و مطالعۂ قرآن میں تعین وقت کی اہمیت

آج کی تیز گام زندگی میں وقت کی اہمیت ماضی کی بہ نسبت بہت بڑھ گئی ہے اور شاید اسی وجہ سے لوگوں کے ہاتھوں میں گھڑیاں ہیں۔ سبھی لوگ مصروف و مشغول ہیں یا کم از کم اپنے وقت کو استعمال کرنے کے معاملہ میں حساس ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے کاموں کے اوقات کا تعین اور ان کی ترجیحات مقرر کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کم سے کم وقت میں

بڑے سے بڑا کام ہوجائے ، رسل رسائل اور معلومات عامہ کے تعلق سے انٹرنیٹ ، پاور پائنٹ ، آڈیو اور ویڈیو ریکارڈس اور کانفرنسنگ وغیرہ کی موجودگی میں وہ گھر بیٹھے سب کچھ معلومات حاصل کرسکتا ہے۔ لہٰذا درس ومطالعہ قرآن اور خلاصۂ قرآن سبھی میں وقت کا تعین بھی ضروری ہے اور پابندی بھی۔ اسی طرح اس امر کا خیال بھی رکھنا ہے کہ ان کا درمیانی وقفہ کیا ہو اور کس پروگرام کے لیے ہمارے مخاطبین کتنا وقت نکال سکتے ہیں۔ زمانۂ حال ہی میں تعین اوقات کی قدر وقیمت مسلم نہیں ہے بلکہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی گئی کہ وہ درس قرآن روزانہ دینے لگیں تو انھوں نے فرمایا کہ اگر میں درس روزانہ دینے لگوں تو تم لوگ اکتا جاؤ گے لہٰذا میں درس ہفتہ میں ایک بار ہی دینا پسند کرتا ہوں، چنانچہ وہ اپنا درس جمعرات کو دیتے تھے۔ [۱۶] عوام کے درمیان درس قرآن کا مناسب ترین وقفہ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ایک ہفتہ ہی کا ہے۔ البتہ اگر کہیں لوگ روزانہ درسِ قرآن سننا چاہتے ہوں تو اس کے لیے فجر کا وقت موزوں ترین ہے ورنہ عشاء کا وقت بھی قارئین کی پسند سے طے کیا جاسکتا ہے۔ روزانہ درس قرآن کے لیے دس منٹ سے کم وقت ہی مناسب ہے البتہ ہفتہ واری درس آدھا گھنٹہ کا ہونا چاہیے، ہاں اگر لوگ قرآن مجید سے جُڑ چکے ہیں تو اس وقفہ کو ایک گھنٹہ تک بڑھایا جاسکتا ہے جس میں سوال و جواب کا وقفہ بھی شامل رہے گا۔ اس کے برخلاف مطالعۂ قرآن کے لیے وقت زیادہ دیا جانا چاہیے کیونکہ اس میں لوگ پہلے ہی سے تحریکِ رجوع قرآن سے وابستہ ہوچکے ہیں اور قرآن سے براہ راست کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح درس قرآن کی جگہ کے تعلق سے عرض کرنا ہے کہ اس کے لیے مساجد بہترین مقاماتِ درس ہیں۔ خلاصۂ قرآن کے بارے میں پہلی ہی عرض کیا جاچکا کہ وہ مسجد میں عشاء کے بعد اور رمضان کے ماہ میں سب سے زیادہ مناسب ہے ہاں رمضان کے اخیر عشرہ میں صاحبان ذوق اگر تیار ہوں تو ایک دن میں کئی بار بھی مسجد میں دیا جاسکتا ہے اور کئی لوگ بھی باری باری سے دے سکتے ہیں۔ مطالعۂ قرآن کے لیے لائبریری بھی ایک دوسری مناسب جگہ ہوسکتی ہے جس میں قرآنی علوم پر

کتابیں دستیاب ہوں اور اگر طلبہ قرآن بھی شرکت کر سکیں تو اور اچھا ہے۔

خلاصۂ کلام

درس قرآن، مطالعۂ قرآن اور خلاصۂ قرآن فی زمانہ رجوع الی القرآن کے موثر ترین ذرائع ہیں لہٰذا امت مسلمہ کو متحد ہو کر اس تحریک کے آفاقی، انبیائی اور اہم ترین فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دینا چاہیے کیونکہ وابستگی قرآن ہی میں تمام انسانوں کی دنیوی واخروی کامیابی مضمر ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

حواشی ومراجع

(۱) سورہ الجن: ۱؛ الرعد: ۳۱؛ فصلت (المومن): ۴۴؛ صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب: واٰتینا داؤد زبورا

(۲) سنن دارمی، مقدمہ باب ۲۰، حدیث نمبر ۱۶۸؛ ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل

(۳) الصحیح البخاری، کتاب العلم، باب ۱۲، عن ابی وائل

(۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'قرآنی افکار وتعلیمات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت'، مصنفہ ظفر الاسلام اصلاحی میں باب بعنوان ''شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریکِ رجوع الی القرآن والسنہ اور موجودہ دور میں اس کی معنویت'' ص ۱۳ تا ۳۳، شائع کردہ یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۸ء

(۵) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: منہاج تفسیر، مصنفہ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی میں بعنوان ''سرسید کی ذہنی تشکیل اور شاہ ولی اللہ، ناشر فاران اکیڈمی علی گڑھ، ص ۵۴

(۶) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اداریہ، مجلّہ دراسات دینیہ، فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مدیر: ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، ۲۰۰۵ء

(۷) بحوالہ مذکور، (ایضاً)

(۸) ایضاً

(۹) 'ہم قرآن حکیم سے استفادہ کیسے کریں' مؤلفہ راقم حروف میں ''قرآن فہمی کا انیسواں نکتہ، ص ۹۰ تا ۹۵، ناشر انٹر نیشنل پریس، علی گڑھ ۲۰۰۹ء، مزید دیکھیں:

'Understanding the Holy Quran: some reflections' by the Author himself, under point # 8.2 entillled 'Search for the Universal teaching in individual verses of the Quran is the need of the hour' pp. 70-77. Published by Dar Al-kotob Al-ilmiyah, Beirut - Lebanon, 2012.

(۱۰) 'Inspirations from the Quran' by the Author himself: Under the point # 5.5; Pub: amana publications, USA (In press)

(۱۱) اسلام: مسلم ذہن کی تشکیل جدید، مصنفہ راشد شاذ، ملی پبلیکیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۸ تا ۱۳۷

(۱۲) اثرِ ابوبکر صدیق، ماخوذ از مطالعہ تفاسیر قرآن، مؤلفہ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، ناشر فیکلٹی دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۴ء، ص ۵

(۱۳) 'ہم قرآن حکیم سے استفادہ کیسے کریں' مصنفہ راقم الحروف میں اسالیب قرآن پر بحث دیکھیں۔ صفحات: ۴۴ تا ۵۱

(۱۴) الصحیح البخاری، کتاب العلم، باب ۱۱، عن انسؓ بن مالک، حدیث نمبر ۶۹، کتاب الادب، حدیث نمبر ۶۱۲۵

(۱۵) 'Inspirations from the Quran' Pub: amana publications, USA (In press) under points#5

(۱۶) الصحیح البخاری، کتاب العلم، باب ۱۲، عن ابی وائل

غیر مسلمین کے پیش نظر درس قرآن - متعلقات اور تقاضے

سلطان احمد اصلاحی

تحریر کی طرح تقریر کے سلسلے میں بھی یہ بات اسی طرح درست ہے کہ اگر آدمی کا مخاطب متعین ہو اور اس کی ضرورتوں اور اس کے مطالبات سے اس کو آگاہی ہو تو اس کی گفتگو زیادہ مفید، برمحل اور مطابق حال ہوگی اور مجمع پر اپنا واجب اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوگی۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس نکتے پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ امت محمدیہؐ کی فلاح کے ساتھ غیر مسلم انسانیت کی دین و دنیا کی فلاح اس سے وابستہ ہے کہ وہ قرآن کی آغوش میں آجائے اور اسے اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لے۔ اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن اپنی بنیادی دعوت اور اپنے اصل پیغام میں بہت سادہ اور آسان ہے۔ اور ایک مسلمان کی طرح ایک غیر مسلم بھی سادہ مطالعہ سے بہت کچھ اس کے معنیٰ و مفہوم کو اخذ کر سکتا اور اس کے منشاء و مراد کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بہر حال علم کے لیے معلم کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے بے نیازی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لحاظ سے دنیا کی پھیلی ہوئی غیر مسلم انسانیت کی طرح برصغیر ہند کی ہندو، سکھ، عیسائی، جین اور بودھ قوم کو اگر قرآن کے پیغام سے آشنا کرنا ہے اور انھیں اس کے معنیٰ و مفہوم سے آگاہ کرنا ہے تو اس کے لیے ان کے حسب حال تحریری مواد پیش کرنے کے ساتھ ایسا ہی تقریری مواد بھی ان کے سامنے پیش کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اردو اور عربی زبان میں تفسیر کے پھیلے ہوئے ذخیرے اور متعلقات قرآن پر کتابوں کی کثرت اور فراوانی کے پیش نظر بظاہر یہ کام چنداں دشوار نظر نہیں آتا، لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ کام اتنا آسان نہیں اور جب تک اس سے وابستہ مشکلات پر قابو نہ پالیا جائے اس کے تقاضوں سے کامیاب عہدہ براری ممکن نہیں ہو سکتی۔

ذخیرۂ تفسیر کی عدم کفایت:

قرآن کے درس کے لیے آدمی سب سے پہلے اس کی تفسیر سے رجوع کرتا ہے، وہ مدرسہ کا شیخ التفسیر ہو یا عام مسلمانوں کے سامنے قرآن کی تفسیر بیان کرنے والا، ہر ایک اپنی صلاحیت اور ضرورت اور فرصت کے مطابق تفسیر سے مراجعت کرکے اپنے مخاطب کا سامنا کرتا ہے۔ غیر مسلم مخاطب کے سامنے قرآن کا درس پیش کرنے والے کے لیے بھی اس کا یہی راستہ رہتا ہے کہ وہ اپنے حسب حال تفسیر سے تیاری کرکے اپنے سامع کی ذہنی تشفی کا سامان کرے۔ لیکن اس سلسلے میں تفسیروں سے مراجعت کے بعد بھی اس کی مشکل بہت کچھ برقرار رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کا تفسیری ذخیرہ کافی پھیلا ہوا ہے اور طبری سے لے کر تدبر قرآن تک إ عربی اور اردو میں تفسیروں کی اپنی ایک دنیا ہے۔ قرآن کا کوئی شیدا اپنے کو اس ذخیرے سے بے نیاز اور اس کو نظر انداز کرکے قرآن کے رموز واسرار تک پہنچنے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیائے انسانیت تک تحریر وتقریر کے ذریعہ قرآن کے معانی وحقائق کو پہنچانے کے لیے ان تفسیروں پر کلی انحصار بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ فقہ اور کلام کی طرح تفسیر پر بھی اس کے زمانی اثرات ہوتے ہیں۔ اور جس طرح کسی ایک زمانے کی بعینہٖ فقہ سے دوسرے زمانے کے تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے، مخصوص زمانے کی تفسیر سے دوسرے زمانے کی ضرورتوں کو بھی تمام اور کامل صورت میں پورا نہیں کیا جاسکتا۔ امت کے کلامی ذخیرے میں اس زمانی اثر کو زیادہ نمایاں اور ابھری ہوئی صورت میں محسوس کیا جاسکتا اور اس حقیقت کا ادراک کیا جاسکتا ہے کہ ایک زمانے کے کلام کے مغز اور اس کے منہج اور طرز سے تو دوسرے زمانے میں فائدہ اٹھایا جاسکتا، بلکہ لازماً اٹھایا جانا چاہیے، لیکن اگر ایک دور کے کلام کی دوسرے دور میں من وعن جگالی کردی جائے، تو اکثر وبیشتر صورت میں فائدے کے مقابلے اس کا نقصان زیادہ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے کلام اور فقہ کی طرح تفسیر کے سلسلے میں بھی یہ بات اسی طرح درست ہے کہ بجائے اس کے کہ کتابیں اس پر حاوی ہوں بیدار مغز عالم دین کو

کتابوں پر حاوی ہونا چاہیے۔ اسے پتہ ہونا چاہیے کہ اپنے زمانے کے لحاظ سے اسے ماضی کے ذخیرۂ علم سے کس درجہ استفادہ کرنا چاہیے۔ اس سے کیا لینا چاہیے، اور کس سے دامن بچا کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔ اس لیے بے شک کلام اور فقہ کی طرح امت کے تفسیر کا ذخیرہ بیش بہا اور بے مثال ہے، لیکن تحریر و تقریر کے ذریعہ اس سے درست استفادے کے لیے ضروری ہے کہ مفسر کو اپنے مخاطب کے علمی پس منظر اور اس کی ذہنی اور فکری ضرورتوں کا ادراک ہو اور اس کے مطابق وہ اپنے ماضی کے ذخیرۂ تفسیر سے کام کے مواد کو چھانٹ سکے اور اس کو مطابق حال بنا کر اپنے مخاطب کی علمی پیاس کے بجھانے کا سامان کر سکے۔

تفسیر کے مختلف مناہج اور ان کا مختلف رنگ:

اپنے زمانے کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کے مفسر اور مدرس کے لیے اس ذخیرے سے اخذ و ترک کی اس لیے مزید ضرورت ہے کہ ہر دور میں امت کے ذخیرۂ تفسیر کے الگ الگ رنگ اور ان کے مصنفین کی مختلف ترجیحات رہی ہیں۔ زمخشریؒ (م ۵۳۸ھ) کے یہاں اعتزال کی کمزوری ہے تو امام رازیؒ شافعیؒ (م ۶۰۶ھ) اشاعرہ کے ترجمان ہیں۔ طبریؒ (م ۳۱۰ھ) روایات کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ امت کا باقی ذخیرۂ تفسیر انہی تینوں کا انعکاس ہے۔[۲] اب اگر زمانۂ حال کا کوئی مفسر کشاف اور رازی کے مضامین کو من و عن تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنے مخاطب کے سامنے انڈیل دے تو اپنی تاریخ کے ایک دور میں امت کے دو کلامی مکاتب فکر معتزلہ اور اشاعرہ کی نوک جھونک سے تو اسے ضرور واقفیت ہو جائے گی، لیکن اپنے مخاطب کو وہ مغز قرآن سے آشنا کرنے میں کامیاب نہ ہوگا۔ اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ کشاف اور رازی میں صرف علم کلام یا دوسرے لفظوں میں اشعریت اور اعتزال ہی ہے۔ نہیں بلکہ ان دونوں تفسیروں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ بلکہ سب کچھ ہے۔ امام رازیؒ کی تفسیر کبیر تو علوم اسلامیہ کی دائرۃ المعارف ہے۔ جس میں علاوہ دیگر کے فقہ کی بھی ایسی ہی معرکہ آرائی ہوئی ہے۔ احادیث و آثار کا اس کا ذخیرہ بھی ایسا ہی قابل توجہ ہے۔ زمخشری کی کشاف میں بھی درجے کے فرق سے یہ تمام بحثیں اسی

طرح موجود ہیں۔لیکن ان دونوں تفسیروں کا مابہ الامتیاز ان کا کلامی پہلو ہے جس میں ایک اعتزال کی نمائندہ ہے تو دوسری کو اشعریت کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ان بحثوں سے ذہن میں جو تیزی آتی ہے اور الٰہیات اور اسلامیات میں استدلال کی جو قوت پیدا ہوتی ہے، اس کی اہمیت اور افادیت ہر زمانے کے لیے مسلم ہے۔لیکن اگر اپنے زمانے کا نبض شناس مفسر ان کتابوں پر حاوی نہ ہو اور ان کے مباحث کی جوں کی توں اپنے مخاطب کے سامنے جگالی کر دے تو جیسا کہ عرض کیا گیا اکثر و بیشتر صورتوں میں فائدے کے مقابلے میں اس کا نقصان زیادہ ہوسکتا ہے۔تفسیر طبری روایات کی دائرۃ المعارف ہے۔جس میں صحیح ذخیرۂ احادیث سے ساتھ اسرائیلیات کا بھی پھیلا ہوا مواد موجود ہے۔اب اگر آج کے دور کا قرآن کا کوئی مفسر سورۂ انبیاء اور سورۂ ص میں مذکورہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ اور سورۂ یوسفؑ کے مرکزی کردار حضرت یوسفؑ کے سلسلے کی اسرائیلی روایات کو جوں کا توں بیان کر دے تو بہت کم توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر کوئی صحت مند اثر چھوڑ سکے گا۔ رازیؒ اور زمخشریؒ کی طرح یہاں بھی اسے روایات کی چھان پھٹک کا کام کرنا ہوگا اور مخاطب کی ذہنی سطح اور اس کی ذہنی حالت کے مطابق اس کو اس کی خوراک فراہم کرنی ہوگی۔طبری م ۳۱۰ھ سے آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) تک تفسیر کا پھیلا ہوا ذخیرہ ہے۔ہر تفسیر کا الگ رنگ اور اس کی اپنی ترجیح ہے۔آج کے دور کے تحریر اور تقریر کے کامیاب مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے کام کے مواد کو چھانٹ کر اپنے مخاطب کے سامنے پیش کرے۔کسی تفسیر کی ہو بہو جگالی کرنے سے احتراز کرے۔

برصغیر ہند کی حد تک علاوہ دیگر کے یہی بات حال کی تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ان دونوں تفسیروں کے بہت سے کمزور مقامات ہیں۔ بیدار مغز مفسر ان سے اپنے آپ کو بچا کر ہی آج کے دور میں تفسیر قرآن کا حق ادا کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔[۳] یہ جو کچھ ہم نے کہا یہ غالب طور پر تفسیر کے مسلمان مخاطب کے حوالہ سے ہے۔تحریر اور تقریر کے ذریعہ قرآن کی تفسیر بیان کرنے والا اپنے مسلمان مخاطبین کو بھی اسی صورت میں متاثر کرسکتا اور ان کو مغز قرآن سے آشنا کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے

جب کہ امت کے پھیلے ہوئے ذخیرۂ تفسیر سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اوپر کی باریکیوں کا لحاظ رکھ سکے۔ بصورت دیگر اپنے مخاطبین پر وہ اپنی معلومات کا سکہ جمانے کے احساس سے تو اپنے آپ کو خوش کرسکتا ہے۔ ان کی ذہنی تشفی اور تسلی کا اطمینان نہیں کرسکتا۔ جب یہ بات قرآن کے مسلمان مخاطبین کے سلسلے میں ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے تو کتاب اللہ کے غیر مسلم مخاطبین کے لیے بدرجہ اولی تفسیر کی اس نزاکت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ قرآن کی تفسیر کے حوالہ سے ان کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے، اسے مزید چھان پھٹک کے ساتھ پیش کیا جائے۔ غیر ضروری بحثوں اور لا طائل نکتہ آفرینیوں میں ان کو ہرگز نہ الجھایا جائے۔ قرآن کو ان کے سامنے خالص قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اور تشریح اور تفسیر سے اس کو اتنا ہی بوجھل کیا جائے جتنا کہ ناگزیر ہو اور جس کے بغیر قرآن کے منشا و مراد کو سمجھنے میں کامیابی نہ ہو سکے۔[۱]

غیر مسلم مخاطب کی ہمہ جہتی رعایت:

اوپر کی گفتگو کی روشنی میں تفسیروں سے استفادہ کرتے ہوئے غیر مسلم مخاطب کی رعایت سے قرآن کے مدرس/مفسر کو اپنی الگ ترجیحات خود طے کرنی چاہئیں۔ اس کے نتیجے میں 'حروف مقطعات' کی بحث میں لا طائل موشگافیوں سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح نظم قرآن سے شغف کی صورت میں اسے غیر ضروری نکتہ آفرینیوں سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے اس کے مخاطب کو کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔ اور وہ الجھن اور بوریت کا شکار ہو۔ قرآن کی دیگر متشابہات، قرآنی قسموں، اقوام بائدہ کے حالات، انبیاءؑ کے واقعات وغیرہ کے سلسلے میں بھی ذخیرۂ تفسیر کو اچھی طرح چھان پھٹک کر کے اس کے متعلق نکھرا ہوا مواد مخاطب کے سامنے پیش کرے۔ ان کے سلسلے میں نہ وہ خود الجھاؤ کا شکار ہو، نہ اپنے مخاطبین کو الجھن میں ڈالنے کا جوکھم لے۔ احکامی آیات میں قرآن کی ترجیحات کو اولیت دے۔ اور قرآن کا رجحان جس مسلک اور فقہی مکتب فکر کے حق میں جاتا ہو، اپنی گفتگو اور اپنے میلان کو بھی اسی کے مطابق رکھے۔ طلاق کی بحث میں (بقرہ/۲۲۹) چھوٹتے ہی اس رائے

پر اصرار شروع نہ کردے کہ ایک وقت کی تین طلاق ہر حال میں تین طلاق ہو جاتی ہے اور بدنام زمانہ 'حلالہ' کے علاوہ اس سے نکلنے کا دوسرا راستہ نہیں رہتا ہے۔ اس کے بجائے وہ قرآن کے رجحان اور اس کے استدلال کو فوقیت دے اور اپنی گفتگو کو اسی پر مرکوز رکھے۔ اسی طرح صلاۃ خوف کی تفسیر میں (نساء۴/۱۰۲-۱۰۳) وہ متعلق آیت کریمہ سے حنفی استدلال میں اٹک کر نہ رہ جائے کہ اس میں لاحق اور مسبوق کے لحاظ سے قرأت کے وجوب اور عدم وجوب کا فرق ہوگا۔ اس کے بجائے آیت کریمہ کو وہ اس کے عموم پر رکھے۔ اور اس سے استدلال کی جتنی صورتیں بنتی ہوں ان سب کا ذکر کسی عصبیت کے بغیر کرے۔ فقہ حنفی کے استدلال کو اگر وہ اجاگر بھی کرے تو استدلال کو صرف استدلال رکھے اور نامطلوب حنفیت کی آمیزش سے قرآن کے چشمۂ صافی کو عدم شفافیت کا شکار نہ کرے۔ امام مالکؒ کی موطا میں 'صلاۃ خوف' کی بحث میں وسعت ہے۔ اس موقع پر اس سے مراجعت مفسر کو قرآن سے اپنے کو قریب رکھنے میں معاون ہوگی۔[۵]

غیر مسلم مخاطب کے سامنے قرآن کے مدرس کے اندر بحث اور استدلال کی یہ صلاحیت اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جب کہ قرآن کے ساتھ اس کا قابل لحاظ وقت گزرے۔ وہ صرف مطبوعہ تفسیروں کا ناقل نہ بنے، بلکہ ہر آیت کے سلسلے میں تحقیق کی بنیاد پر اس کی اپنی رائے ہو اور وہ کسی مفسر اور کسی فقیہ اور متکلم کا اندھا مقلد نہ ہو۔ تفسیر کی بدعتوں کا اس کو ادراک ہو اور اپنے مخاطب کو وہ اس سے بچانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ کلام اور فقہ کی طرح تفسیر پر بھی اس کی نظر ناقدانہ ہو، نہ کسی مفسر سے اس کی عقیدت میں غلو ہو اور نہ کسی کے خلاف وہ محاذ آرائی کا شکار ہو۔ وہ کسی بڑے نام سے مرعوب ہو، نہ کسی کی شہرت سے متاثر ہو کر اس کی ذہنی غلامی کا شکار ہو۔[۶] وہ تحقیق کا قدرداں ہو اور تفسیر کے معاملے میں پارٹی بندی میں ملوث نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ قرآن کو صرف قرآن کی حیثیت سے دیکھے اور اپنے مخاطب کو براہ راست قرآن سے جوڑنے کی کوشش کرے۔ ہر چند کہ، جیسا کہ گزرا، اس کا لحاظ قرآن کے مسلم/غیر مسلم مخاطب کے لیے یکساں مفید ہے۔ لیکن غیر مسلم مخاطب قرآن کے لیے اس کا مزید اہتمام چاہیے۔ اور اس کی نفسیات اور اس کی ذہنی

اور فکری ضرورت کا اس کو اضافی ادراک ہونا چاہیے۔

متعلق مذاہب کے لٹریچر پر نظر

برصغیر ہند کے پس منظر میں اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ ایسے مدرس قرآن کی متعلق مذاہب کے لٹریچر پر نظر ہو ورنہ کم از کم اس کو ان کی مبادیات سے واقفیت ہو۔ اس سلسلے میں ہندو مخاطبین کی حد تک روایتی طور پر ابھی تک ان کی غالب ترین اکثریت اپنے مذہب کی بنیادی کتابوں سے ناآشنا رہی ہے۔ ہندو مذہب کی بنیادی کتابوں سے اصل واقفیت تو اس کے برہمن طبقے کی ہی رہی ہے۔ اس کی معیت میں لالہ/ کائستھ جو برہمن/ غیر برہمن کی مخلوط نسل ہے، اس کے ساتھ ہی کسی قدر بنیا، چھتری اور بھومیہار کی ان سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ہندو قوم کی جو غالب ترین اکثریت ہے اہیر، چمار، بھر، پاسی، کرمی، کوئری، نونیاں، کھٹک، برئی، گڈریا، کیوٹ، اس کے علاوہ پیشہ و برادریاں لوہار، کونہار، کمہار، تیلی، بڑھئی، نائی، دھوبی وغیرہ وغیرہ۔ ان کی غالب اکثریت نے تو ویدوں، پرانوں، اپنشدوں اور سمرتیوں کا نام بھی نہیں سنا ہوگا، چہ جائیکہ ان کا ان کا مطالعہ ہو اور ان کے مضامین سے ان کی واقفیت ہو۔ اس کے بجائے ہندو قوم کی یہ غالب ترین آبادی اپنی مذہبی کتابوں کے بجائے کچھ روایات پر عمل پیرا ہوتی اور اُسی کے سہارے جیتی ہے۔ اسی کے مطابق وہ اپنی شادی بیاہ اور مرنے جینے کی رسموں کو پورا کرتی ہے اور مخصوص دائرے میں زندگی کے دوسرے معاملات سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جس مذہب کی تعلیم ہی یہ ہو کہ اگر وید کے اشلوک کسی شودر کے کان میں پڑ جائیں تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی لاکھ ڈال دی جائے۔ (گوتم، بحوالہ مولانا مودودی: الجہاد فی الاسلام، بحوالہ سلطان احمد اصلاحی: اسلام کا تصور مساوات، ص ۳۲، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، اشاعت اپریل ۲۰۰۱ء) اگر اس مذہب کے پیروکاروں کی اپنی بنیادی مذہبی مآخذ سے یہ عملی دوری ہو تو یہ قابل فہم ہے اور اس پر چنداں تعجب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ادھر جب سے ملک میں تعلیم میں ترقی ہوئی ہے اور ہندو قوم کے پسماندہ طبقات میں معاشی بہتری آئی ہے، ان

کے فہم وشعور میں اضافہ کے ساتھ اپنے مذہب کی تعلیمات سے ان کی آگاہی میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ مسلمانوں سے مقابلہ آرائی کے جذبہ سے ادھر اس میں مزید ترقی ہوئی ہے اور ہورہی ہے۔ مسلمانوں کی مسجدوں کی طرح اگر چہ وہ پانچ وقت اپنے مندروں کو آباد نہ کرسکیں، لیکن ان کی مسجدوں کے مقابلے میں انھیں ضرورت ہو نہ ہو مندریں بنانے کا بہت شوق ہے۔ جس میں سرکار کی سرپرستی نے اس کی رفتار کو مزید بڑھا دیا ہے۔ ہندو قوم میں چونکہ حلال وحرام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے تحصیل، کچہری، تھانے ہر جگہ حرام آمدنی سے مندروں کی بہتات ہے۔ الکٹرانک آلات ترسیل سے مندروں کو آباد کرنے میں بھی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ گیتا اور رامائن کے ایک حرف سے بھی واقفیت نہ ہو جب بھی بازار میں ان کے آڈیوز کی فراوانی ہے۔ ان کے کیسٹس لگا کر لاؤڈ اسپیکرس کی آواز تیز کر کے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے ساتھ پڑوسی مسلمانوں کو پریشان کرنے کا بھی دوہرا فائدہ اٹھالیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال ہے بہت تشویش ناک اور حکومت کو فوری توجہ دے کر اس پر قابو پانا چاہیے، لیکن اس سے اپنے مذہب کی طرف عمومی سطح پر ہندو قوم کے رجحان کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اور ہندو براہ راست گیتا اور رامائن کا پاٹھ نہ کرے، کیسٹوں کے ذریعہ بھی کچھ نہ کچھ اس کے مذہب کی معلومات اس کے کان سے ٹکراتی ہے اور اس کی واقفیت کے دائرے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس پس منظر میں ہندو قوم کے مخاطب قرآن کا درس پیش کرنے والے عالم دین/مفسر قرآن کے لیے اس مذہب کی معلومات ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اس کی معلومات کا دائرہ جتنا وسیع اور گہرا ہوگا، ہندو مخاطب کے سامنے اس کا درس قرآن بھی اتنا ہی موثر اور جان دار ہوگا۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مذکورہ صدر ہندو مآخذ، وید، پران، اپنشد، سمرتی، گیتا، رامائن وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ براہ راست، جامع اور گہرا ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہو کہ ثانوی مآخذ سے ہی سہی ہندو مذہب کی مبادیات سے اس کی واقفیت ہو اور برسر موقع وہ اپنے قرآن کے درس میں اس کو Appreciate کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس سلسلے کی اختصاصی مدرس قرآن کے لیے ویدوں اور سمرتیوں وغیرہ کا براہ راست مطالعہ بھی کچھ مشکل نہیں، بلکہ ترجیحی طور اس کو اسے اپنے دائرے میں لانا چاہیے۔ لیکن کسی وجہ سے اگر

اس درجے میں یہ ممکن نہ ہو سکے تو ثانوی ماخذ سے ہی سہی، اس کو بقدر ضرورت اس کی معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایسے مدرس قرآن کی نظر اردو زبان میں مولانا سید حامد علی کے سلسلۂ مذاہب اور مولانا محمد فاروق خاں، مولانا کوثر یزدانی اور اس وقت کے ہفتہ وار اور ماہنامہ کانتی (ہندی) کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد احمد کے تیار کردہ لٹریچر پر بھی آدمی کی گہری نظر ہو تو وہ بہت کچھ کام چلا سکتا اور غیر مسلم/ ہندو مخاطب کے سامنے موثر درس قرآن پیش کر سکتا ہے۔ مولانا سید حامد علی کے سلسلۂ مذاہب میں ہندومت کے علاوہ بدھ مت، جین مت اور سکھ مت اور یہودیت اور عیسائیت پر بھی معلومات ہیں۔ خاص زاویہ سے ان جملہ مذاہب پر مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'الجہاد فی الاسلام' اور اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی میں مفید اور وسیع معلومات ہیں۔ خاکسار کی 'اسلام کا تصور مساوات اور مذاہب کا اسلامی تصور' میں بھی مذکورہ مذاہب پر کارآمد معلومات ہیں جن سے قرآن کا مدرس فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر 'وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام' کا باب اول بہت کارآمد ہے۔ جس میں ایک خاص منہج سے جملہ مذاہب کی مبادیات زیر بحث آئی ہیں۔ 'اسلام کا نظریۂ جنس' میں آچاریہ رجنیش کے جنسی خیالات پر منفرد بحث ہے۔ غیر مسلم مخاطبین کا درس قرآن اگر ان کتابوں کی معلومات ہی کو اچھی طرح ہضم کر لے اور ان کو Appreciate کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لے تو یقیناً اس کا درس قرآن دوسرے مدرس قرآن کے مقابلے میں بدرجہا موثر اور پرکشش ہوگا جس کی اس لٹریچر پر نظر نہ ہو یا جس نے اس سے بے نیازی کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہو۔

یہودیت اور عیسائیت سے متعلق عہد نامۂ قدیم و جدید کا مطالعہ آسان ہے، اس لیے کہ یہ اردو میں دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ عربی اور انگریزی جس میں بھی مل سکے تالمود کو بھی اپنی پکڑ میں لانا چاہیے۔ تفسیر ماجدی کا یہودیت اور عیسائیت میں اختصاص ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزادؒ کی تفسیر 'ترجمان القرآن' مولانا مودودیؒ کی 'تفہیم القرآن' اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تدبر قرآن' میں بھی عہد نامہ قدیم و جدید کے حوالہ سے ان مذاہب سے متعلق وسیع معلومات ہیں۔ عہد نامۂ قدیم و جدید کا مولانا آزادؒ کا مطالعہ گہرا اور محققانہ

ہے۔ [۷] اور مولانا مودودیؒ کی نظر عہد نامۂ قدیم و جدید کے علاوہ تالمود اور مذاہب کی انسائیکلوپیڈیا پر بھی ہے۔ اور اس دائرے میں ان کا رتبہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے اوپر ہے۔ بنیادی مآخذ سے بدھ مت، جین مت اور سکھ مت کا مطالعہ مشکل ہے۔ اس کے لیے کام چلاؤ حد تک محولہ صدر اردو مآخذ سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ نکتہ واضح ہوگا۔ قرآن میں چار مقامات: آل عمران: ۱۹۵، نساء: ۱۲۴، نحل: ۹۷ اور غافر: ۴۰، پر ہے کہ مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت ان میں سے جو بھی نیک عمل اور اچھا کام کرے گا، دنیا و آخرت دونوں میں اس کی زندگی خوش گوار ہوگی اور آخرت میں وہ جنت کی ابدی نعمتوں سے شاد کام ہوگا۔ اس موقع پر اگر قرآن کے مدرس کو اس کا علم ہو کہ جین مت کے لحاظ سے عورت عورت رہتے ہوئے کبھی موکچھ پراپت نہیں کر سکتی اور آواگون کے چکر سے آزاد نہیں ہو سکتی، اس کے لیے اس کا مرد کے روپ میں جنم لینا ضروری ہے، [۸] ان آیات کریمہ کے درس میں اگر قرآن کا مفسر جین مت کی اس تعلیم کا حوالہ دے سکے تو اس کا درس موثر اور جاندار ہونے کے ساتھ دعوتی نقطۂ نظر سے مفید اور مخاطب کو اسلام سے قریب کرنے والا ہوگا۔

اسی طرح قرآن میں آخری پیغمبر ﷺ کے ساتھ دیگر انبیاءؑ کے سلسلے میں بھی جا بجا صراحت ہے کہ یہ سب کے سب بشر انسان تھے۔ اور بشری ضروریات سے گھرے ہوئے تھے۔ یہ کھاتے پیتے تھے، بازار سے سوا سلف لاتے تھے اور ان کے بیوی بچے ہوتے تھے۔ [۹] قرآن کی اس صراحت سے ہندو مذہب کے 'اوتار واد' کی نفی ہوتی ہے جس میں انسانوں کو برائی اور تباہی سے بچانے کے لیے خدا خود انسان کی صورت میں زمین پر اتر آتا ہے۔ [۱۰] اسی طرح ہندو مت میں 'آواگون' تناسخ ارواح کا عقیدہ ہے۔ اس کے مطابق اپنے اچھے یا برے عمل کے لحاظ سے انسانی روح کسی انقطاع کے بغیر انسانی اور حیوانی صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی شخص کے اعمال اگر بہت برے ہو جائیں تو وہ پیڑ پودوں کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ اس کے مطابق سماج کی ضرورت سے اگر غلہ کی پیداوار بڑھانی مقصود ہو تو اس کی ایک تدبیر کے طور پر جرائم میں اضافہ کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ قرآن میں ہے کہ قیامت میں ہر شخص کی اللہ کے حضور براہ راست پیشی ہوگی اور اچھے اور

برے لوگ الگ الگ جماعتوں میں جنت اور دوزخ کے اپنے اپنے ٹھکانوں میں پہنچا دیے جائیں گے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ......(الانعام/۹۴)

(اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔)[۱۱]

وَ كُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْداً۔(مریم/۹۵)

(اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا۔)[۱۲]

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔(یٰس/۵۹)

(اور اے قصور وارو! آج کے دن تم ایک کنارے لگ جاؤ۔)

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلٰى جَهَنَّمَ زُمَراً ......(زمر/۷۱)

(اور کفر کی راہ اپنانے والوں کو جہنم کی طرف ایک ٹولی کی صورت میں لے جایا جائے گا۔)

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَراً......(زمر/۷۳)

(اور اپنے رب سے ڈرنے والوں کو جنت کی طرف ایک ٹولی کی صورت میں لے جایا جائے گا۔)

وغیرہ وغیرہ۔اب اگر ان آیات کریمہ کے درس میں آدمی تناسخ کا رد کر سکے اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لا سکے تو یقیناً اس کے درس میں جان آ جائے گی۔اور وہ اپنے مخاطب کی بہتر ذہنی تشفی کا سامان کر سکے گا۔اسی طرح انسانی مساوات کی اسلامی تعلیم سے متعلق حجرات کی آیت کریمہ:۱۳ کے درس میں اسے منوسمرتی کے ورن آشرم کو ضرور زیر بحث لانا چاہیے۔[۱۳] اور قرآن سے اس کا تقابل کر کے اس کی خامیوں کو اجاگر کرنا چاہیے۔ برصغیر ہند کے پس منظر میں ہندو قوم کی اکثریت ہے۔اس لیے ہم نے اس کے معتقدات کو ابھار کر پیش کیا۔مخاطب کی تبدیلی سے یہی بات بدھ مت، جین مت اور سکھ کے علاوہ یہودیت اور نصرانیت پر عامل مخاطبین کی مناسبت سے کہی جا سکتی ہے۔قرآن کے درس میں ان کے مخصوص عقائد و مسلمات کو جس قدر زیر گفتگو لایا جا سکے گا اور ان کی خامیوں کو اجاگر کیا

جا سکے گا درس اتنا ہی موثر اور مطابق حال ہو گا۔ اور اسی کے بقدر مخاطب کے اس سے متاثر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

علم کے ساتھ عمل کا اہتمام، محبت و دلسوزی اور مناظرانہ طرز گفتگو سے اجتناب

اس علمی تیاری کے ساتھ غیر مسلم/ غیر مسلموں کے مدرس قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہو۔ ہر چند کہ سمجھداری کی بات یہ ہے کہ آدمی علم سے فائدہ اٹھائے چاہے اس کا دینے والا خود عمل میں کوتاہ ہو۔ شیخ سعدیؒ بہت پہلے نصیحت کر گئے ہیں اور اسی موقع پر اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کر گئے ہیں کہ سونے والا سونے والے کو کیا بیدار کر سکتا ہے:

گفت عالم بگوش حال بشنو ور نبا شد بگفتش کردار
عالم دین کی بات کو توجہ سے سنو گو کہ اس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو
باطل است آں کہ مدعی گوید خفتہ را خفتہ کے کند بیدار
کہنے والے کا یہ کہنا بے بنیا ہے کہ سونے والا سونے والے کو کیا جگا سکتا ہے
مرد باید کہ گیر واندر گوش ورنبشت ست پند بر دیوار
آدمی کو چاہیے کہ نصیحت کو دل میں اتار لے گر چہ وہ دیوار ہی پر لکھی ہوئی کیوں نہ ہو

حدیث میں بھی بے عمل عالم کی مثال اس پوکھرے اور تالاب سے دی گئی ہے جو خود تو اپنے اندر پانی کو روک کر دوسروں کی کھیتی اور باغ کی سیرابی کا سامان کرتا ہے لیکن خود اس کے اندر کوئی روئیدگی نہیں ہوتی۔ جس سے بالواسطہ اس سے استفادہ اور علم کو اس سے اخذ کر لینے کی ترغیب کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ حدیث میں اسی موقع پر عالم باعمل کی مثال اُس زرخیز زمین سے دی گئی ہے جو خود پانی کو جذب بھی کرتی ہے اور فصل اور پھل کو اگا کر دوسروں کی نفع رسانی کا سامان کرتی ہے۔ سب سے بدتر تیسرا شخص ہے جس کے پاس نہ علم ہو نہ عمل ہو۔ اس کی مثال اسی حدیث میں اس شور زمین سے دی گئی ہے جس کے اندر نہ پانی کو روکنے کی صلاحیت ہے نہ اس سے کوئی کھیتی اور فصل تیار ہوتی ہے۔[۱۴] لیکن واقعہ یہ ہے کہ تحریر ہو کہ تقریر آدمی کی گفتگو میں تاثیر اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ عالم باعمل

ہو، اپنی زبان اور قلم سے وہ جو کچھ کہہ رہا ہو، اس کا عمل بھی اس کے مطابق ہو۔ قرآن میں سچے مومن کا شیوہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے قول اور عمل میں تضاد نہ ہو:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتاً عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ (صف/۲-۳)

(اے مسلمانو! وہ بات کہتے کیوں ہو جو تم کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک سخت ناگوار ہے کہ جس پر تمہارا خود کا عمل نہ ہو تم اس کا اعلان کرتے پھرو۔)

حدیث کی رو سے بھی قیامت کے دن قرآن کا وہی عالم سرخرو ہوگا جو ساتھ ہی اس پر عمل پیرا بھی ہوگا اور اس کے تقاضوں کو عمل کی سطح پر پورا کرنے والا ہوگا۔ حضرت نواس بن سمعانؓ کی روایت سے اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

یوتی یوم القیامة بالقرآن و اهله الذین کانوا یعملون به فی الدنیا تقدمه سورة البقرة و آل عمران ، تحاجان عن صاحبهما، رواه مسلم۔[15]

(قیامت کے دن قرآن اور اس کے حاملین جو دنیا میں اس کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے ان کو بصد احترام لایا جائے گا۔ اس میں وہ سورہ بقرہ اور آل عمران سب میں پیش پیش ہوں گی جو اپنا حق ادا کرنے والوں کی لڑائی لڑیں گی۔)

اس حدیث میں سورہ بقرہ اور آل عمران کا جو خاص طور پر ذکر ہے تو اس لیے کہ قرآن کی یہ دونوں ابتدائی بڑی سورتیں دین کے علمی اور عملی تقاضوں کی جامع ہیں۔ دین کے تمام اہم مطالبات ان کے اندر سمٹ آئے ہیں اور باقی قرآن ایک طرح سے گویا ان کی تفسیر اور شرح ہے۔ سو جو کوئی مسلمان ان دونوں سورتوں کا حق ادا کرنے والا ہوگا وہ بقیہ قرآن کا بدرجہ اولیٰ حق ادا کرنے والا ہوگا۔ ان دونوں سورتوں کی اسی جامعیت کے پیش نظر دوسری احادیث میں بھی ان کے مخصوص فضائل بیان کیے گئے ہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پر دیکھی جا سکتی ہے۔

ادھر معاشرے میں بدقسمتی سے جو قدروں کا زوال آیا ہے تو اس سے طبقۂ علماء بھی اچھوتا نہیں ہے۔ ان کے اندر بھی اخلاق و عمل کی بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ زوال پذیر فقاہت میں عمل کی کمزوری کے ساتھ شاید کام چلاؤ فتویٰ نویسی تو کی جا سکتی ہے

دلوں کو چھونے والا درس قرآن پیش نہیں کیا جا سکتا۔[16] اس لیے قرآن کے مدرس کو اپنے کو بہت چوکس رکھنا ہوگا اور اپنی پوری زندگی میں اپنے کو صاحب قرآن ﷺ کے اخلاق وعمل سے قریب تر رکھنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کی اپنی تاثیر ہے اور وہ اپنے داخلی اثر سے زندگیوں میں انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔صدر اول میں اس نے اپنا یہ اثر دکھایا ہے۔اور یقیناً آج بھی وہ اپنا یہ اثر دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔لیکن عملی دنیا کی حقیقت ہے کہ زمین پر آج اس کا یہ اثر ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔نہ مسلمان پر اس کا یہ اثر دکھتا ہے، نہ غیر مسلم انسانیت پر اس کا عکس مرتب ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔قرآن تو آج بھی وہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام کے صدر اول میں تھا۔اپنے اور غیر ہر ایک کو اس کا اعتراف ہے کہ قرآن آج بھی من وعن بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ پر اترا تھا۔پھر آج سماج اور معاشرے پر اس کا وہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔اس کے جہاں دوسرے اسباب ہو سکتے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ آج ہمارے درمیان صاحب قرآن ﷺ اپنی جگہ مسلم معاشرے کی صفوں میں ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ وعلیؓ جیسے حاملین قرآن نہیں۔ بلا شبہ یہ اصحاب محمد ﷺ علم کے سمندر تھے اور قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کا معنی ان کے سامنے روشن تھا۔لیکن صدر اول میں ان کے ذریعہ قرآن کی اثر انگیزی کی وجہ اس سے کم نہ تھی کہ ساتھ ہی یہ حضرات سراپا پیکر عمل تھے۔اور ان کی زبان سے قرآن کا جو لفظ ادا ہوتا تھا وہ سننے والے کے ذہن ودماغ میں ترازو ہو جاتا تھا۔ بلا شبہ قرآن کی اثر انگیزی کی یہ شرط اس کے مسلمان سامع کے لیے بھی ہے۔لیکن اس کے غیر مسلم سامعین کے لیے بدرجۂ اولیٰ اس کی بڑھی ہوئی ضرورت کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ صاف کپڑا معمولی صابن اور ہلکے سرف سے بھی صاف ہو سکتا ہے۔لیکن اگر وہ میل سے کالا اور داغ دھبوں سے اٹا ہوا ہو تو اس کے لیے یقیناً غیر معمولی اثر کے ڈٹرجنٹ اور ہائی پاور کے واشنگ پاؤڈر کی ضرورت ہوگی۔ایمان کی دولت کے ساتھ اخلاق وعمل کی کثافتوں کو دھلنا نسبۃً آسان ہوگا۔لیکن شرک وکفر کی نجاست میں لت پت انسان کو اس سے پاک وصاف کرنے میں نسبۃً بڑھی ہوئی روحانیت اور صفائے باطن کی ضرورت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ غیر مسلم مخاطب کے سامنے قرآن کا درس پیش کرنے والے کا سینہ محبت ودلسوزی سے بھرا ہوا ہو۔ مرحوم مولانا سید حامد علیؒ دعوت کے ادب کے حوالہ سے کہا کرتے تھے کہ 'دماغ کو دماغ سے مت لڑائیے بلکہ دل کو دل سے آواز دیجیے۔'[۱۷] یہی بات غیر مسلم مخاطب کے مدرس قرآن کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے۔ ضروری ہے کہ یہ درس بے لوث ہو اور مخاطب کو دوزخ کی آگ سے نکالنے کے علاوہ اس کا دوسرا کوئی محرک نہ ہو۔ جیسا کہ داعی اعظم ﷺ نے اپنی دعوت کو ایسا ہی خالص اور بے آمیز رکھا تھا کہ 'میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو بچانا چاہتا ہوں لیکن تم ہو کہ دوزخ میں گرنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہو۔' غیر مسلم مخاطب کے درس قرآن کو بھی ایسا ہی خالص اور بے آمیز ہونا چاہیے۔ اس کو حکومت الٰہیہ کے قیام کے ایجنڈے سے نہ جوڑا جائے نہ اس کی آڑ میں سیاسی عزائم کی تکمیل کی راہ تلاش کی جائے۔ امت کے دین ودنیا کے مفادات کے تحفظ کے لیے سیاست کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ ہے۔ لیکن اس کی تکمیل کا طریقہ اور اس کے ذرائع الگ ہیں۔ دعوت دین اور درس قرآن وحدیث کو ہر حال میں اس سے آزاد رکھا جائے۔

مولانا سید حامد علی مرحوم کہا کرتے تھے کہ اسلام کی دعوت کے لیے سب سے بہترین کتاب قرآن مجید ہے۔ سو اس دعوت کی طرح اس کتاب کو بھی خالص اور بے آمیز رہنے دیا جائے۔ اسی کا ایک حصہ ہے کہ اس درس میں ہرگز ہرگز مناظرانہ رنگ نہ پیدا ہونے پائے۔ قرآن دعوت کی کتاب ہونے کے ساتھ مسلمانوں کے علم کلام کی بہترین نمائندہ ہے۔ اور اپنے وقت کے یہود ونصاریٰ ودیگر اور کفار ومشرکین کے معتقدات ومزعومات کو اس وقت رد کرنے کے ساتھ آج بھی اس کے اندر اس کی ایسی ہی صلاحیت ہے۔ لیکن قرآن نے ہر جگہ اپنے مقدمے کو دلائل کے زور سے جیتا۔ اپنے اندر کبھی مناظرانہ رنگ نہیں پیدا ہونے دیا۔ آج کے غیر مسلم مخاطب کے مدرس قرآن کو بھی اس کا ایسا ہی التزام اور اہتمام چاہیے۔ وہ آج کی غیر مسلم انسانیت کے باطل افکار وخیالات اور ان کے باطل مذاہب کا بھرپور رد کرے۔ لیکن یہ رد محبت بھرا اور درد بھرا ہو۔ اس کے بجائے مناظرانہ طرز گفتگو سے مخاطب کے مخالفانہ جذبات کو بھڑکانے کا سامان نہ کیا جائے۔[۱۸]

ایک نئی تفسیر کی ضرورت

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مقصد سے ایک نئی تفسیر لکھی جائے۔ بلاشبہ جیسا کہ گزرا، امت کی تفسیر کا ذخیرہ بہت مالدار ہے۔ لیکن اوپر کی ترجیح سے اردو اور عربی دونوں میں کوئی ایک تفسیر ایسی نہیں ہے جس سے غیر مسلم مخاطب کے مدرس قرآن کی تشفی کا سامان ہو سکے۔ اس تفسیر کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کا لکھنے والا 'بحر العلوم' اور جملہ مذاہب کا ماہر ہو۔ یہ چیز ممکن نہیں۔ اور اس کی خواہش کا انجام مایوسی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس تفسیر کا مخاطب متعین ہو۔ اور یہود ونصاریٰ، صابی، مجوس اور عام طور پر شرک وکفر سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ برصغیر ہند کے پس منظر میں قرآن کا مفسر ہندومت، بدھ مت، جین مت ور سکھ مت کے پیروکاروں کی ذہنی اور علمی تشفی کا سامان کر سکے۔ اس کے لیے جیسا کہ گزرا ہر حال میں ان مذاہب کا گہرا اور تفصیلی مطالعہ ضروری نہیں ہے۔ رخ واضح ہو تو برسر موقع وہ ان کی مبادیات کی طرف متوجہ ہوسکتا اور ان کے حوالہ سے مخاطب کی الجھن اور خلش کو دور کرسکتا ہے۔ سچے مذہب کی تلاش میں قرآن کا مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ اس کے صفحات کے ذریعہ بہت آسانی سے غیر مسلم انسانیت کو قرآن کی حقانیت اور آخری نبی ﷺ کی ختم نبوت کا قائل کیا جاسکتا ہے۔ ذہن صاف ہو اور ترجیحات واضح ہوں تو مذاہب کے مطالعہ میں کام کے مواد کو چھانٹا جاسکتا اور قرآن کے اپنے درس میں حسب موقع اس کو ٹانکا جاسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس گفتگو میں متعلق مذاہب کی جزئیات میں پھنسنے سے گریز کیا جائے، اصل دھیان اور اصل توجہ کلیات اور مذاہب کے بنیادی افکار وتصورات پر رہے۔ اس کے حوالہ سے مخاطب مطمئن اور قائل ہوگیا تو جزئیات کا معاملہ اپنے آپ آسان ہو جائے گا۔ صدر اسلام سے لے کر آج تک کے ذخیرۂ تفسیر کی اپنی قدر وقیمت ہے اور برصغیر ہند کا اردو کا ذخیرۂ تفسیر بھی بہت مالدار ہے۔ لیکن چونکہ ترجیح متعین نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ذریعہ غیر مسلم مخاطب کی ذہنی تشفی کا سامان بہم نہیں ہو پاتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے اردو میں اس مقصد سے ایک تفسیر تیار کی جائے

جو ایک ورنہ زیادہ سے زیادہ دو جلد کی ہو۔ پھر اس کا بڑے پیمانے پر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے۔ ۱۹

مدارس عربیہ میں اس مقصد سے سال بھر کا ڈپلومہ کورس

برصغیر ہند میں یہ مدارس عربیہ کی بدقسمتی ہے کہ ان کے نصاب اور نظام میں قرآن سرفہرست نہیں ہے۔ دیوبند اور اس کی پھیلی ہوئی شاخوں سے مفسر نہیں بلکہ مفتی تیار ہوتے ہیں۔ ندوہ اور دیگر کا معاملہ واضح نہیں ہے۔ مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح جہاں قرآن پر توجہ ہے وہاں بھی یہ مسلمان امت کے حوالے سے ہے۔ غیر مسلم انسانیت ان کی ترجیحی مخاطب نہیں ہے۔ مدراس عربیہ کے نصاب اور نظام میں کوئی اور اصلاح ہو نہ ہو، اللہ کی کتاب کو ان کے یہاں Centre Stage پر آنا چاہیے۔ معاصر ہندوستان میں ملت اسلامیہ ہندیہ کا ایک بہت بڑا چیلنج ہے کہ اس کے یہاں قرآن کا غیر مسلموں کے سامنے موثر درس دینے والے علماء تیار ہوں۔ مسلمانوں کی دینی تحریکات کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور کسی ایک کھونٹے سے نہ بندھ کر غیر مسلم انسانیت کے سامنے قرآن کو قرآن کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔ ۲۰ لیکن علم دین کی طرح تفسیر کا بھی اصل معدن مدارس عربیہ ہیں۔ سو اس کی طرف ان کی خصوصی توجہ ہونی چاہیے۔ ۲۱ غیر مسلموں کے سامنے قرآن کے درس کا حق ادا کرنے والے علماء ان کے احاطوں سے تیار ہوں اور پورے ملک میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک غیر مسلموں کے خصوصی حلقہائے درس قرآن کا اہتمام کیا جائے۔ الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا سے زیادہ ترجیحی طور یہ درس زمین پر اور غیر مسلموں کے درمیان براہ راست ہو۔ مدرس قرآن کے ساتھ غیر مسلم مخاطب کا براہ راست انکاؤنٹر ہو اور اس کے بہانے اس کو اپنے سوالات اور اشکالات کو کسی واسطے کے بغیر پیش کرنے کا موقع ملے۔ قرآن کے پیکر اخلاص باعمل مدرس قرآن سے وہ سیدھا رابطے میں آئے اور اس کے واسطے اس کو اللہ کی کتاب کی روشنی اور ٹھنڈک سے شاد کام ہونے کی سعادت حاصل ہو۔

ملک میں شمال سے لے کر جنوب، مشرق سے لے کر مغرب اور دیہات سے شہر تک غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جانے والا درس قرآن ضروری نہیں ہے کہ یہ قرآن کی موجودہ کتابی ترتیب کے مطابق ہی ہو۔ اس کے بجائے موقع اور مخاطب کی رعایت سے غیر مسلموں کے سامنے پیش کیے جانے والے درس قرآن میں اس ترتیب سے ہٹ کر بھی ہوسکتی ہے۔ پہلے توحید، رسالت اور آخرت سے متعلق قرآن کی چھوٹی مکی پھر بڑی سورتیں، بعد میں بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، نور، احزاب اور طلاق اور تحریم وغیرہ درس میں پیش کی جائیں۔ کسی وقت معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ مخاطب قرآن کی احکامی آیات سے اس کے نکاح وطلاق، پردے کے احکام یا اس کے حدود وتعزیرات کے نظام کو سمجھنا چاہتا ہو تو اس صورت میں اس کی طلب کے مطابق قرآن کی چھوٹی بڑی مدنی احکامی سورتوں یا ان کے منتخب اجزاء کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

دعوتی ماحول اور دعوتی اعتبار قائم کرنے کی ضرورت

صرف ترتیب میں آخر میں، ورنہ عملی طور پر سب سے پہلے غیر مسلموں کے سامنے اس درس قرآن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں مناسب دعوتی ماحول اور قرآن کے مدرس کا دعوتی اعتبار قائم ہو۔ غیر مسلموں میں دعوت کا کام عام حالات میں بھی آسان نہیں ہے لیکن ملک کی موجودہ فرقہ پرستی کی فضا میں یہ مشکل سے مشکل تر ہوگیا ہے۔ عام حالات میں بھی یہ دعوتی ادب سے غیر ہم آہنگ کہ آدمی اچانک قرآن کو لے کر غیر مسلم آبادی/بستی میں پہنچ جائے یا جہاں کہیں اسے غیر مسلم مجمع ہاتھ آجائے وہ اچانک ان کے سامنے قرآن کھول کر کھڑا ہوجائے، عام حالات میں بھی یہ مناسب نہیں ہے بلکہ دعوت کے ناگزیر ادب کی حیثیت سے اس کے لیے مخاطب کی ذہنی آمادگی اور مناسب موقع اور وقت کا لحاظ ضروری ہے۔ لیکن آزادی کے بعد خاص طور پر جس طرح ملک میں فرقہ وارانہ فضا پیدا ہوگئی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری بڑھتی جارہی ہے، اس کے پیش نظر بالخصوص جب تک پیشگی موافق دعوتی ماحول پیدا نہ کرلیا جائے، غیر مسلم انسانیت کے سامنے

درس قرآن کی اس مہم کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔اس کے لیے سب سے پہلے مخصوص بستیوں اور آبادیوں کو ٹارگٹ کرنا ہوگا۔اور اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار، اور خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کی اپنی تصویر کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہوگا۔نبوت سے پہلے مکہ میں داعی اعظم ﷺ کی جوامیج تھی کہ صلہ رحمی اور صدق گوئی: انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث ۔کے ساتھ آپ ﷺ درماندہ کو اوپر اٹھانے والے اور بیکار کو کام پر لگانے والے اور جو افتاد اور آفت کا شکار ہو جائے آپؐ اس کو اس سے ابھارنے والے تھے۔جیسا کہ اس سلسلے کی حضرت خدیجہؓ کی مشہور روایت کے بعد کا حصہ ہے: وتحمل الکل وتکسب المحروم وتعین علی توانب الحق ۔۲۲ اس سلسلے میں غازی، مجاہد اور فاتح پیغمبر کے بجائے آپ ﷺ کی مکہ اور مدینہ میں 'حلف الفضول' اور 'میثاق مدینہ' کی جوامیج تھی، غیر مسلموں کے قرآن کے مدرس کو بھی اپنی یہی امیج بنانی ہوگی۔۲۳ اور باقی امت کو اس مہم میں اپنی سرگرم حصہ داری درج کرانی ہوگی۔اس کے لیے زکوٰۃ کی مدات، فقراء، مساکین، غارمین اور رقاب میں اگر غیر مسلم نہ آسکیں تو ہمیں اس کی مولفۃ القلوب کی مد کو متحرک کرنا ہوگا۔اور زکوٰۃ کے ایک حصے کو غیر مسلموں پر صرف کرنے کی گنجائش پیدا کرنی ہوگی۔اور ان کی اخلاقی اور سماجی مدد کے علاوہ اپنی جیب سے ان کی مالی مدد کا اپنے کو عادی بنانا ہوگا۔

معاصر ہندوستان میں روایتی عالم دین کی عام تصویر ہے کہ وہ مسلمانوں سے بھی فاصلہ بنا کر رہتا ہے۔غیر مسلموں سے اس کی دوری مزید بڑھی ہوتی ہے۔غیر مسلموں کے مدرس قرآن عالم دین کو اپنی یہ تصویر بدلنی ہوگی۔اسی طرح بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی ذہن سازی کر کے ان کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔اسی صورت میں غیر مسلم آبادیوں کو وہ درس قرآن کے لیے ہموار کر سکے گا۔اور کتاب اللہ کی 'ھدی للناس' کی حیثیت کو ان سے منوانے میں کامیاب ہو سکے گا۔وما علینا الا البلاغ

حواشی ومراجع

(۱) امت کے ذخیرۂ تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی شاہ کار تفسیر تدبر قرآن کا مخصوص مقام ہے۔ بالخصوص دعوت کے پہلو سے اس کے مباحث بہت پرکشش ہیں۔ یہ ہمارے مخصوص طبقہ علماء کی محض ذہنی تنگ نظری ہے کہ تفسیر عثمانی کے فضائل کے بیان سے وہ نہیں تھکتے لیکن تدبر قرآن کا نام ان کی زبان پر نہیں آسکتا۔ تدبر قرآن کے اگر بعض کمزور مقامات ہیں تو تفسیر عثمانی اور معارف القرآن بھی کمزوریوں سے پاک نہیں۔ اس کے باوجود اگر ان تفسیروں سے استفادہ کیا جاتا ہے تو تفسیر تدبر قرآن سے بھی لازمی عوامی استفادہ کیا جانا ہے۔

(۲) امت کے ذخیرۂ تفسیر کے جائزے میں یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے کہ طبریؒ م۳۱۰ھ/۱۲۰۹ء اور آلوسیؒ م۱۸۵۴ء/۱۲۷۰ھ کے درمیان بغویؒ م۱۲۲۲ء، بیضاویؒ م۶۸۵ھ، خازن م۱۳۴۰ء، ابن کثیر ۷۷۴ھ اور قمیؒ نیساپوری م۱۷۰۰ء وغیرہ تک تفسیر میں ان میں کیا نیا ہے جو طبریؒ، زمخشریؒ اور رازیؒ میں نہیں ہے اور جسے ان پر اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

(۳) مثال کے طور پر تدبر قرآن کی سورۂ نور کی تفسیر میں زانی محصن کی سزا میں رجم کی بحث جو دراصل مولانا فراہی کے حواشی قرآن سے مستعار ہے جو اب مطبوعہ ہے۔ مرحوم مولانا ابواللیث اصلاحیؒ ندوی م۱۹۹۰ء ان حواشی کی اشاعت کے سلسلے میں اس وجہ سے بہت کچھ متردد تھے کہ کیا معلوم کہ مولانا فراہی نے اس میں مذکور اپنی بہت سی رایوں سے رجوع کرلیا ہو۔ یا تفہیم القرآن میں تفسیر سورۂ یوسف کے مخصوص مباحث جس کی تفصیل ہماری کتاب 'مسلمان اقلیتوں کا کردار' کے باب دوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مطبوعہ فکر و آگہی، بھور منو تکیہ کلاں اعظم

گڑھ، بار اول ۲۰۰۴ء۔ صاحب تفہیم کے حکومت الٰہیہ کے قیام کے حوالہ سے اگر ایسا مدرس قرآن ہندوستان میں ریلوے اور ڈاکخانے کے غیر مسلم مخاطبین کے سامنے اس پر مصر ہو کہ از روئے قرآن نظام باطل کا کل پرزہ بننا حرام ہے تو اغلب ہے کہ یہ بیچارے بیچ درس سے ہی اٹھ کر باہر چلے جائیں گے۔

(۴) اس کے حوالہ سے محترم مولانا محمد فاروق خاں صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ قرآن کی تفسیر کا مطلب ہے کہ اللہ میاں سے کہا جائے کہ آپ چپ رہیں، اب آپ کا مطلب ہم سمجھاتے ہیں۔ اس قول کو اس کے صحیح محل میں رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تفسیر کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن بہت بڑی حد تک قرآن خود اپنا شارح ہے۔ بسا اوقات ہوتا ہے کہ تعبیر کی کثرت سے خواب پریشان ہو جاتا ہے۔

(۵) دیگر مثالوں کا اضافہ الگ سے کیا جا سکتا ہے (توبہ: ۶۰) مصارف زکوٰۃ کی بحث میں چھوٹتے ہی اس کا اعلان نہ کر دے کہ آج کے زمانہ میں غیر مسلموں اور نو مسلموں کے حوالہ سے مؤلفۃ القلوب کی مد اب منسوخ ہے یا یہ کہ قرآن میں کفار و مشرکین کے سلسلے میں عفو در گذر کی جتنی آیات ہیں، آیاتِ قتال کے بعد سب کی سب منسوخ ہیں۔ جیسا کہ ان کے حوالہ سے صاحب جلالین کا یہی عام طرز ہے۔

(۶) اس سلسلے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے معتقدین تو اس درجے کے نہیں، لیکن مولانا مودودی کے معتقدین میں ایک طبقہ عملی طور پر اس خیال کا قائل ہے کہ ان سے غلطی کا صدور ممکن نہیں اور وہ قرآن کی تفسیر اور اس سے باہر جو کچھ ارشاد فرمادیں وہی برحق اور وہی عین حق وصواب ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تفہیم القرآن سمیت ان کی مخصص کتابوں کی ایڈیٹنگ کے بغیر اشاعت مناسب نہیں ہے اور مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کی فریضۂ اقامت دین، جیسی بے سند کتابوں کی اشاعت کا موشف ہو جانا بہتر ہے۔ مولانا مرحوم میرے محسن ہیں اگر حفاظت قرآن کی مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً ہم اس اظہار خیال سے گریز کرتے۔

(۷) عہد نامۂ قدیم کی کتاب پیدائش کے مطابق طوفان نوحؑ عالمگیر تھا جس کی زد میں اس وقت کی پوری دنیا آگئی تھی۔ مولانا آزادؒ کا اصرار ہے کہ طوفان نوح مقامی اور محلی Localised یعنی کہ محدود اور مخصوص علاقے کے لیے تھا۔ اس کے حوالہ سے کتاب پیدائش پر 'ترجمان القرآن' میں مولانا کا تبصرہ ہے کہ کتاب مقدس کی دوسری کتابوں (ابواب) کے بارے میں چاہے جو کہا جائے لیکن اس کی کتاب پیدائش کے محرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ تبصرہ کسی محقق کا ہی ہوسکتا ہے۔ مزید 'ترجمان القرآن' کے صفحات عہد نامۂ قدیم و جدید پر مولانا کی گہری نظر کے شاہد عدل ہیں۔ اور اس حوالہ سے وہ مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے تو پیش رو ہیں ہی، اس میدان میں ان کا رتبہ مولانا دریابادیؒ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جن کی صحف قدیم پر وسعت نظر اور دقت نظر کی مخصوص شہرت ہے۔

(۸) ملاحظہ کیجیے ہماری کتاب 'وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام' میں بدھ مت اور جین مت کی بحث ص ۳۷، دالتذکیر، لاہور، اشاعت ۲۰۰۶ء۔

(۹) هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِىْ الْأَسْوَاقِ ......۔ (فرقان: ۷)
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً...... (رعد: ۳۸)

(۱۰) 'وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام' میں 'اوتار واد' کی بحث ص ۲۰ اور اس سے آگے، محولہ بالا'۔

(۱۱،۱۲) ان دونوں آیات کریمہ میں 'فرادیٰ' اور 'فردا' اکیلے کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اپنے دنیا کے مال واسباب سے عاری اللہ کی جناب میں تن تنہا حاضر ہوں گے۔ لیکن اس صورت میں بھی بنی نوع انسان کا آواگون کے چکر سے کٹ کر قیامت کے دن اللہ کے حضور براہ راست پیش ہونے کا مضمون برقرار رہتا ہے۔

(۱۳) ورن آشرم کے لیے ہماری وحدت ادیان اور اسلام کا تصور مساوات کے علاوہ مفکر اسلام مولانا مودودی کی شاہ کار 'الجہاد فی الاسلام' کی متعلقہ بحث سے مراجعت مفید ہوگی۔

(۱۴) صحیح بخاری و مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین/ ۵۲۹، کتاب العلم، حدیث نمبر ۳۔ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر ۱۳۵۷ھ، طبع اولیٰ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت سے نبی ﷺ کی اس حدیث کے الفاظ ہیں: مثل ما بعثني الله به من الهدىٰ والعلم كمثل غيث اصاب ارضا فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبتت الكلأ والعشب الكثير، وكان منها اجادب امسكت الماء فنفع الله بها فشربوا منها وسقوا وزرعوا، واصاب طائفة منها اخرىٰ انما هي قيعان لاتمسك ماء ولاتنبت كلأ، فذلك مثل من فقه في دين الله ونفعه ما بعثني الله به فعلم وعلم، ومثل من لم يرفع بذلك رأسا ولم يقبل هدى الله الذي ارسلت به۔

(۱۵) صحیح مسلم بحوالہ ریاض الصالحین، ۴۳۰، محولہ بالا، کتاب الفضائل، باب فضل قرأة القرآن، حدیث نمبر ۲۔ قرآن کا درس دراصل دعوت کا حصہ ہے اور اس کا ادب قرآن میں معروف ہے کہ اسے عمل سے ہمرشتہ ہونا چاہیے۔ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ (حم السجدہ: ۳۳)

(۱۶) یہ بات ہم اس وقت کے حالات کے لحاظ سے دکھ کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ فقہ اسلامی کی یہ خاصیت نہیں ہے۔ فقہاء قدیم کا تقویٰ اور خدا ترسی میں مقام بہت بلند ہے۔ مشہور روایت کے مطابق صاحب ہدایہ اس کی تصنیف کے پورے تیئیس سالہ عرصہ میں باروزہ رہے۔ برصغیر ہند میں فقہ کے ساتھ اخلاق کی کمزوری کی روایت اب آئی ہے۔

(۱۷) مرحوم مولانا حامد علی کے قیمتی دعوتی رسالے 'تحریک اسلامی اور برادر وطن' میں یہ تحریر بھی محفوظ ہے۔ ص ۶۷، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، بار سوم ۱۹۹۰ء۔ اس کے اصل الفاظ ہیں: دماغ کو دماغ سے نہ ٹکرایئے، دل کو دل سے آواز دیجئے۔ مولانا حامد علی میدان کے داعی تھے۔ اور اس جملے کو ان کے طویل عملی ریاض کا حاصل کہا

جا سکتا ہے، صرف کتابوں کی مزاولت سے 'علم' کی یہ جنس ہاتھ نہیں آتی۔

(۱۸) ڈاکٹر ذاکر نائک کی پہلی کمزوری ہے کہ وہ اپنی تقریر اور سوال و جواب میں مناظرانہ رنگ اپنا کر اپنی ٹیم کے ساتھ مخاطب کو لاجواب کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اس سے وقتی طور پر تو وہ چپ ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر مخالفانہ ردعمل پیدا ہوتا ہے جو بعض صورتوں میں اس کو دور تک لے جاسکتا ہے، اور وہ اسلام کے خلاف طویل مخاصمت کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ غیر مسلموں کے درس قرآن کا طریقہ اس سے بالکل الگ ہونا چاہیے۔

(۱۹) افراد یہ کام اپنے طور پر بھی کر سکتے ہیں اور یہ ٹیم ورک بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس مقصد سے ایک سے زائد تفسیریں بھی ہو سکتی ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کو بھی تفہیم القرآن پر قانع نہ ہو کر اس مہم میں شامل ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے اپنے حصے کا حق ادا کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علماء ہند کے دونوں دھڑوں کو بھی تفسیر عثمانی سے اپنے کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کار خیر میں شریک کرنا چاہیے اور ان کے وسائل کا ایک حصہ اس پر صرف کرانا چاہیے۔

(۲۰) افسوس کہ مدارس عربیہ کی طرح ان تحریکات کی بھی اس کے سلسلے میں بے حسی ہے۔ تبلیغی جماعت کے یہ ایجنڈے میں نہیں ہے اور جماعت اسلامی اور جمعیۃ علماء کی اس سے بے نیازی ہے۔ کسی تفسیر کی صرف مارکٹ ویلیو اس کے حق میں دلیل نہیں ہے کہ امت کو اس کے حوالہ سے اس سے آگے کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲۱) اس مقصد سے ایک الگ مدرسے کے قیام پر بھی غور ہو سکتا ہے بلکہ اس کو ایجنڈے پر لایا جائے۔ جس سے تیار ہونے والے اختصاصی مفسرین سے، دیگر مدارس عربیہ استفادہ کر سکیں اور حسب ضرورت وہ ان کے اسٹاف کا حصہ بن سکیں۔ جب کہ موجود مدارس میں بلا استثناء غیر مسلموں میں درس قرآن کو ان کے ترجیحی ایجنڈے میں شامل ہونا چاہیے۔

(۲۲) اس میں ایک دفعہ آپ ﷺ کی مہمان نوازی کی بھی ہے: وتقری الضیف۔ روایت کے صحیح بخاری کے الفاظ ہیں: **كلا والله ما يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق**۔ صحیح بخاری، جلد ۱، ابتداء کتاب باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ ﷺ، ص ۳، بشیر حسن اینڈ سنز، کلکتہ؛ صحیح مسلم، جلد ۱، کتاب الایمان، باب بدء الوحی الیٰ رسول اللہ ﷺ، عامرہ، مصر میں لفظوں میں ہے: **كلا ابشر فو الله لايخزيك الله ابدا والله انك لتصل الرحم وتصدق الحديث وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق**۔ ص ۹۷

(۲۳) حرب فجار سے واپسی کے بعد نبوت سے پہلے بیس سال کی عمر میں رئیس قریش عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں آپ ﷺ نے حلف الفضول کے جس معاہدے میں سرگرم شرکت کی تھی اس کی دو اہم دفعات تھیں۔ مظلوم کی مدد اور ایک دوسرے کا معاشی تعاون: **لنكونن مع المظلوم حتى يؤدى اليه حقه ما بل بحر صوفة، وفى التاسى فى المعاش، فسمت قريش ذلك الحلف حلف الفضول**۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۱۲۸-۱۲۹، المعروف بہ طبقات بن سعد، دار صادر بیروت، طبع جدید، ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء۔ 'ہم مظلوم کے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ اس کا حق اس کو مل جائے جب تک کہ سمندر کے اندر ایک دھاگے کو بھی نم کرنے کی صلاحیت ہے یعنی کہ ہمیشہ کے لیے۔ اور معاش کے معاملے میں ہم ایک دوسرے کے ہمدرد و غمخوار ہوں گے۔ تو قریش نے اس معاہدے کو 'حلف الفضول' کا نام دیا۔ دوسرے موقع پر اس کی صرف مظلوم کی دادرسی کی دفعہ کا ذکر ہے اور یہ تفصیلی ہے: **فتعاقدوا وتعاهدوا علىٰ ان لايجدوا بمكة مظلوما من اهلها وغيرهم ممن دخلها من سائر الناس الاقاموا معه، وكانوا علىٰ من ظلمه حتي**

ترد علیه مظلمته؛ فسمت قریش ذٰلک الحلف حلف الفضول.
ابن ہشام: السیرۃ النبویہ: ۱/ ۱۴۸، طبع جدید، دارالفکر، القاہرہ، راجع اصولہا وعلق علیٰ حواشیہا نخبۃ من العلماء۔ سوانھوں نے پیمان کیا اور عہد باندھا کہ وہ مکہ کے اندر اس کے اندر کا یا باہر کا وہ جہاں کہیں کا بھی ہو جو مظلوم بھی پائیں گے تو وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے، اور جو ظالم ہوگا تو وہ اس پر شکنجہ کسیں گے یہاں تک کہ مظلوم کو اس کا حق مل جائے، تو قریش نے اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا۔ اسی موقع پر ہے کہ نبوت کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے اس معاہدے کے متعلق فرمایا: لقد شهدت في دار عبدالله بن جدعان حلفا ما احب ان لي به حمر النعم، ولو ادعیٰ به في الاسلام لاجبت، ابن هشام، محوله بالا۔ میں عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں ایک معاہدے میں شریک ہوا، مجھے پسند نہیں کہ اس کے مقابلے میں سرخ اونٹ بھی ملیں (جو عرب کی بہت قیمتی دولت ہے) تو میں اس سے دست بردار ہوسکوں۔ اب اگر اسلام میں بھی مجھ کو ایسے کسی معاہدے کے لیے بلایا جائے تو میں اس میں ضرور شامل ہوں گا۔ طبقات ابن سعد میں بھی آگے اس کی مظلوم کی دادرسی کی اس دفعہ کا ذکر ہے، ساتھ ہی آپ ﷺ کی اس کے متعلق مذکورہ خواہش کا اظہار ہے۔ تحالفوا ان یکونوا مع المظلوم ما بل بحر صوفة ولو دعيت به لاجبت وهو حلف الفضول۔ طبقات ابن سعد: ۱/ ۱۲۹، محولہ بالا۔ ان سب لوگوں نے قسم کھائی کہ وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے جب تک کہ سمندر کے اندر ایک دھاگے کو بھی نم کرنے کی صلاحیت ہے یعنی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اور اگر آج بھی مجھ کو اس کے لیے بلایا جائے تو میں طرح اس میں شامل ہوں گا۔ یعنی کہ وہی حلف الفضول کا معاہدہ۔ معاصر ہندوستان میں غیر مسلموں کے روبرو درس قرآن کی زیر نظر مہم کے لیے ہم کو 'حلف الفضول' کی اسی اسپرٹ کو تازہ اور متحرک کرنا ہوگا۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی۔

ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۳۱۵، ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس کے مضمون 'معاشی تحفظ کے نبویؐ اقدامات' میں جلد اور صفحہ کے بغیر طبقات ابن سعد کا اوپر کا پہلا حوالہ ہے۔ البتہ اس میں 'ما بل بحر صوفۃ' کے محاورے کو بدل کر 'ما بل بحر صدفہ' اور اس کا ترجمہ: جب تک کہ سمندر گھونگھے کو تر کرتا رہے، کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر مصنف طبقات ابن سعد سے رجوع کر لیتے تو وہ اس غلطی سے بچ جاتے۔ کونسا ثانوی مأخذ ان کی اس خطا کا ماخذ بنا ہے اس کی الگ سے تحقیق کی جا سکتی ہے۔ اس موقع پر تحقیقات اسلامی کا شعبۂ ادارت بھی زد میں آتا ہے کہ اس نے طبقات کے ناقص حوالے اور اس میں اون (صوفۃ) کو گھونگھا (صدفہ) بنانے کی فاحش غلطی کو کس طرح گوارا کر لیا؛ حلف الفضول کے ساتھ متن میں جو 'میثاق مدینہ' کا ذکر ہے اس کی افادیت برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لیے سیاسی معاہدات کے پہلو سے ہے کہ وہ بڑے دشمن کے مقابلے چھوٹے دشمن/دشمنوں سے معاہدے کر کے اس کو زیر کر سکیں۔ سیاست کے دائرے میں اس پر الگ سے تحقیق کی جائے۔ زیر نظر غیر مسلموں کے روبرو درس قرآن کی دعوتی گفتگو کے دائرے سے یہ باہر ہے۔ **وللناس فیما یعشقون مذاهب**۔ تحقیقات اسلامی کے محولہ مضمون کے مراجع میں ۱-ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی کتاب کا اردو ترجمہ 'اسلام اور معاشی تحفظ' اور ۲-دوسری کتاب ڈاکٹر نور محمد غفاری کی 'نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی' ہے۔ اوپر 'اون' 'صوفۃ' کو 'گھونگھا' 'صدفہ' کا منبع شاید انہی دونوں کتابوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی ہوں دلچسپی لینے والے اس سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر قرضاوی کی کتاب میں یہ نہیں اسے ہم نے دیکھ لیا۔ ڈاکٹر غفاری کی کتاب مراجعت کے لئے دستیاب نہ ہو سکی۔ اغلب ہے کہ یہ اسی میں ہو۔

تحریک درسِ قرآن اور اس کے تقاضے

عبیداللہ فہد فلاحی

نزولِ وحی کا مقصد ہدایت ہے:

قرآن کریم ہدایت کی کتاب ہے۔ یہ انسانوں کی رہنمائی کرتی اور انھیں اندھیروں سے روشنی میں لاتی ہے۔ اندھیرے خواہ جہالت کے ہوں یا جاہلیت کے، کفر وعناد کے ہوں یا نفاق اور دوہرے کردار کے، اوہام وخرافات کے ہوں یا نرے تعقل وتفلسف کے، قدامت پرستی اور تحجّر کے ہوں یا تجدّد اور صارفیت زدہ مدنیّت کے، قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ یہ فرقان ہے، نور ہے، کتاب مبین ہے۔ یہ تمام اندھیروں کو چھانٹ دیتا ہے اور انسان کی انگلی پکڑ کر اسے دن کی روشنی میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے خواہ وہ مغرب کے ہوں یا مشرق کے، مرد ہوں یا عورت، ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر، محکوم ہوں یا حاکم، ایشیائی ہوں یا یوروپی، پہاڑوں، صحراؤں اور بیابانوں کے باسی ہوں یا فلک بوس اور شاد وآباد عمارتوں میں رہائش پذیر ہوں، قرآن سب کی رہبری کرتا اور سب کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ خود قرآن کا اعلان ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ (البقرہ/۱۸۵)

(رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے، اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق وباطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔)

أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّآ أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّآ أَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا۔ (الأنعام/۱۵۷)

(اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم اُن سے زیادہ راست رَو ثابت ہوتے۔تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور اُن سے منہ موڑ لے!)

سچی طلب شرط ہے

قرآن کریم ہی کا یہ اعلان بھی ہے کہ:

الٓمٓ. ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔(البقرہ/۱-۲)

(الف، لام، میم- یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیزگار لوگوں کے لیے)

إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّمَن یَخْشٰی۔(النازعٰت/۲۶)

(اس میں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے)

إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ۔(قٓ/۳۷)

(اس میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات سنے)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف قرآن کو تمام انسانوں کے لیے ہدایت و عبرت کی کتاب قرار دیا گیا اور دوسری طرف اس سے نصیحت پکڑنے کے لیے تقویٰ اور پرہیزگاری کو لازمی صفت بتایا گیا، آخر ان دونوں میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟ مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴-۱۹۹۷ء) اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ:

''انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود مؤثر ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اندھا ہو تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے لیکن ایک شخص بہرا ہو تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف

اندوز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح قرآن کا نور ہونا، بصیرت ہونا، سرچشمۂ ہدایت ہونا مسلّم، لیکن اگر ایک شخص نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کر دی ہے جو اس نور اور اس چشمۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا؟''[1]

مولانا اصلاحی نے قرآن سے استفادہ کے لیے ضروری صفتِ تقویٰ سے مراد انسان کی فطری صلاحیت کو لیا ہے۔ ویسے فاضل مفسّر کے نزدیک قرآن میں تقویٰ کے دوسرے معانی بھی مراد لیے گئے ہیں جیسے:

۱- جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اُس سے بچنا۔ (سورہ مزّمّل/۱۷)

۲- کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا۔ (الأنفال/۲۵)

۳- اُس ربّ قدوس سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔ (زمر/۷۳)

۴- گناہ سے، اُس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا۔ (آل عمران/۱۷۹)

مولانا اصلاحیؒ چوتھے مفہوم کو بقیہ تینوں مفاہیم کا جامع مانتے ہیں اور اسی کو تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تقویٰ میں عمل کی نسبت کیفیت اور حال کا پہلو، اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو نمایاں ہے۔ گویا اُن کے خیال میں نفی اثبات پر غالب ہے۔[2]

قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہدایت و نصیحت کے حصول کے لیے انتہائی سازگار اور آسان ہے۔ یہ کتاب ہر سطح اور معیار کے انسان کی رہنمائی کرتی اور اس کو تشفی و تسلّی فراہم کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سائنس و ٹکنالوجی کا متخصّص ہو، فلسفہ اور سماجی علوم کا ماہر ہو، ادب اور شاعری کا ذوق رکھتا ہو، موسیقی اور فنون لطیفہ و جمالیاتی علوم سے اس کا رشتہ ہو، قرآن کریم میں اس کے ذوق کی بھرپور رعایت اور اس کے تخصص و تبحّر کے میدان میں اس کی عبرت و نصیحت کا مکمل سامان موجود ہے۔ ناخواندہ اور عامی بھی یکساں درجہ میں اس سے فیض یاب ہوسکتا اور روحانیت و تزکیہ کے اعلیٰ مقامات تک رسائی حاصل

کرسکتا ہے کیونکہ قرآن سے استفادہ کی شرط بس تقویٰ اور سچی طلب ہی بتائی گئی ہے جو کسی بھی ذہنی سطح کے کسی بھی فرد میں پائی جاسکتی ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور فطری شرافت اور انسانیت کی صفات سے متصف ہوں ان کی ہدایت کے دروازے اللہ تعالیٰ خود کھولتا اور فہم قرآن کی راہ ان کے لیے ہموار کرتا ہے یہ اصول بھی قرآن کریم ہی نے بیان کردیا ہے۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجۡعَل لَّهُ مِنۡ أَمۡرِهِ يُسۡراً ۔(الطلاق۴)

(جو شخص اللہ سے ڈرے اُس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کردیتا ہے)

آسان کتابِ ہدایت

سورہ القمر میں اللہ نے بار بار یہ صراحت فرمائی ہے کہ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کو آسان بنادیا ہے:

وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِن مُّدَّكِرٍ ۔(القمر/۱۷)

(ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنادیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟)

اس آیت کی تشریح میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے اُن لوگوں پر تنقید کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ "قرآن ایک آسان کتاب ہے، اسے سمجھنے کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ عربی زبان تک سے واقفیت کے بغیر جو شخص چاہے اس کی تفسیر کرسکتا ہے اور حدیث وفقہ سے بے نیاز ہو کر اُس کی آیات سے جو احکام چاہے مستنبط کرسکتا ہے"۔[۳]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ گرچہ اس مفہوم کو صحیح سمجھتے ہیں کہ اللہ نے قرآن کو حفظ کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کتاب بنایا ہے مگر اس آیت کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اُن کے نزدیک تیسر قرآن کے درج ذیل پہلو ہیں:

۱- یہ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے یعنی قریش کی فصیح و بلیغ ٹکسالی زبان میں، جس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔

۲- یہ کتاب بتدریج تھوڑی تھوڑی کرکے نازل ہوئی ہے تاکہ نبی ﷺ اسے بتدریج

اور بسہولت سنائیں اور تعلیم دے سکیں اور مسلمان اس کی تعلیمات کو آسانی سے ہضم کرسکیں۔

۳- قرآن کی بنیادی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے الفاظ اور فقروں میں نازل ہوئیں پھر اُن کی وضاحت وصراحت اور تفصیل آئی۔

۴- تصریفِ آیات کے اسلوب کے ذریعہ قرآن نے ہر بات کو گونا گوں پہلوؤں سے مختلف شکلوں میں، مختلف سوابق ولواحق اور نئے نئے اطراف و جوانب کے ساتھ بیان کی۔

۵- قرآن میں مکّی و مدنی سورتوں پر مشتمل سات گروپ ہیں اور یہ سب مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں۔[۲]

درج بالا دونوں مفسرینِ کرام نے قرآن کریم کے آسان کتابِ نصیحت ہونے کے مفہوم کو زیادہ لائق توجہ نہیں سمجھا ہے حالانکہ تیسیر قرآن کا متبادر مفہوم یہی ہے اور یہ مفہوم درج ذیل وجوہ سے اعجاز قرآن کا ایک اہم مظہر ہے:

۱- اگر یہ کتاب اپنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ آسان اور عام فہم زبان میں اور عامی سطح اور معیار کی رعایت رکھنے والی کتاب نہ ہوتی تو عربوں سے ہٹ کر دوسری قوموں کے لیے معجزہ نہ بن پاتی نہ ان کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوتی۔ یہ اس کتاب کا اعجاز ہے کہ دنیا کی ۶۵ سے زیادہ زبانوں میں آج اس کے تراجم موجود ہیں اور ترجمہ کرنے والوں میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اس ترجمہ کے ذریعہ ہر پڑھا لکھا شخص قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور روزمرہ کی زندگی میں عمومی رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔

۲- اگر قرآن ہر طالب ہدایت کے لیے آسان اور قابل فہم نہ ہوتا تو امت مسلمہ پر بھی ایک مخصوص مذہبی طبقہ کی چودھراہٹ ہوتی اور عیسائیت اور ہندومت کی طرح اس مذہب میں بھی مذہبی تفہیم وتشریح پر اس کی اجارہ داری ہوتی اور اسلام کی حرکیت، انقلابیت اور اس کے دوام پر حرف آتا۔ تقلید کی بندشوں میں امت

گرفتار ہوتی اور اجتہادی تنوع کی برکتوں سے دنیا محروم ہوتی۔

۳- قرآن کریم سے ہر فرد براہ راست تعامل کر کے اللہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ خدا سے براہ راست قربت اور معیت کا احساس اسے روحانیت اور خدا ترسی کی نئی جولان گاہوں سے متعارف کراتا اور ہر پل اس کے شعور اور تحت الشعور کو تازہ دم رکھتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے اقبال علیہ الرحمہ ''ہر فرد کے ضمیر پر نزولِ کتاب'' سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس کے بغیر گرہ کشائی ممکن نہیں ہے۔

درسِ قرآن کی معنویت

قرآن کریم آسان کتابِ ہدایت ہے مگر اب عام طور پر خواندگی اور مطالعہ کا ذوق کم ہو رہا ہے۔ ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ای میل اور موبائیل فون کی فراہم کردہ بے شمار سہولتوں نے انسان کو مطالعہ سے دور کر دیا ہے۔ دور جدید کی معاشی الجھنیں، کاروباری اور دفتری مصروفیات اور عائلی زندگی کے اضطرابات اور بحران اس پر مستزاد ہیں۔ دین دار اور علمی و ادبی گھرانوں میں بھی کتب بینی کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اِن حالات میں درس قرآن کے حلقوں، دینی اجتماعات اور مذہبی محفلوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

عید میلا دالنبی ﷺ کے جلسے، فضائل کے حلقے، دینی حکایات کی محفلیں، عرس او رسماع کی مجلسیں تو آراستہ ہوتی ہیں اور فاضل مقررین گھنٹوں اور خطابت کے جوہر دکھاتے اور سامعین سے داد و تحسین وصول کرتے ہیں مگر درس قرآن کے حلقوں میں عوام کو محیر العقول، سنسنی خیز اور طلسماتی مواد نہیں ملتا اور انھیں اس طرح کی مجلسیں بے رونق، پھیکی اور بدمزہ معلوم ہوتی ہیں اور جوش و خروش سے آغاز کردہ درس قرآن کا پروگرام رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگتا ہے، شرکاء کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور آخر میں وہ بے ثمر نظر آنے لگتی ہیں، البتہ پچھلے چند سالوں سے درس قرآن کی محفلوں میں کچھ تازگی، توانائی اور مقبولیت کا روز افزوں احساس ہونے لگا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قرآن کے مطالعہ اور درس کا رجحان بڑھا ہے۔ اس میں ایک وجہ بعض پرائیوٹ ٹیلی ویژن چینلوں کے ذریعہ درس قرآن

کے موثر اور نتیجہ خیز پروگراموں کی نشر و اشاعت ہے۔ایک طویل عرصہ تک پاکستان ٹیلی ویژن، قیوٹی وی اور اب پیس ٹی وی پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دروس قرآن نے عوام الناس میں فہم قرآن کی طلب پیدا کی ہے۔اس حقیقت کے ادراک سے طالبانِ علومِ قرآن کو خوشی اور فرحت کا احساس ہو رہا ہے مگر اب اُن کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔عوام تک قرآن کا صحیح پیغام مؤثر اور دل نشیں اسلوب میں پہونچانا طالبانِ قرآن کی ذمہ داری ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور پیاس کو دیکھ کر تاجرانِ قوم وملت ازکار رفتہ، غیر مؤثر اور بے ڈھنگے اسلوب میں درس قرآن کی محفلیں سجانے لگیں یا قرآن کے نام پر غیر قرآن کا درس شروع ہو جائے اور ملت اسلامیہ پھر بدک کر اپنی فضائل و حکایات کی دنیا کی طرف پلٹ جائے یا میلادی و سماعی مجلسوں میں گم ہو جائے۔امکان کی حد تک درس قرآن کے حلقوں میں اس کا اہتمام کیا جانا چاہئے کہ مدرّس عالم دین ہو، عربی زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہو اور اسلامی شریعت اور اس کے احکام پر اس کی گہری نظر ہو نیز جدید تقاضوں سے وہ بے خبر نہ ہو۔اور اس کی ذاتی زندگی میں نواہی سے اجتناب اور اوامر کی پابندی کی رعایت بھرپور طریقے سے ہو۔فرائض کی پابندی وہ کرتا ہو اور عوام الناس میں اس کی منفی امیج نہ ہو۔

قرآن کریم کی تعلیم وتعلّم اور تدریس وتلقین کی اہمیت احادیث رسول ﷺ میں پوری صراحت اور تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن پاک کی تلاوت، اس پر تدبر، اس کی دعوت وتبلیغ کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"تعلموا هذا القرآن فإنكم تؤجرون بتلاوته بكل حرف عشر حسنات أما أنّي لا أقول الم حرفٌ ولكن ألف ولام و ميم، بكل حرف عشر حسنات"۔[۵]

(اس قرآن کا علم حاصل کرو، اس کے ہر حرف کی تلاوت کے بدلے تمھیں دس نیکیاں ملتی ہیں۔میں الٓم کو ایک حرف نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ تو الف، لام اور میم (تین حروف) ہیں اور ان میں سے ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں کا اجر ہے۔)

قرآن مجید علم کا سمندر ہے، حکمت کا خزانہ ہے، معرفت کا سرچشمہ ہے، ہدایت و نصیحت کا مخزن ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کی عظمت اور بلندی، اس کی پاکیزگی اور رفعت بیان کرتے ہوئے ایک حدیث میں فرمایا جس کی تخریج امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے الحارث الأعورؒ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کی معرفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول کو کہتے ہوئے سنا:

"ألا إنّها ستكون فتنةٌ، فما المخرج منها يا رسول الله؟ قال: كتاب الله، فيه نبأ ما قبلكم، وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم، هو الفصل ليس بالهزل، من تركه من جبّار قصمه الله، ومن ابتغىٰ الهدى في غيره أضله الله، وهو حبل الله المتين، وهو الذكر الحكيم، وهو الصّراط المستقيم، هو الذى لاتزيغ بهٖ الأهواء، ولا تلبس بهٖ الألسنة، ولا يشبع منه العلماء، ولا يخلق من كثرة الردّ، ولاتنقضى عجائبُه، هو الذى لم تنته الجنُّ إذ سمعته حتى قالوا: إنّا سمعنا قرآناً عجباً يهدى إلىٰ الرشد فآمنها بهٖ، من قال بهٖ صدق، ومن عمل بهٖ أُجِر، ومن حكم بهٖ عدل، ومن دعا إليه هُدِى الى صراطٍ مستقيم."[۶]

(''ہوشیار رہو کہ فتنہ نمودار ہوگا''۔ میں نے پوچھا کہ اس سے نکلنے کی سبیل کیا ہوگی، اے اللہ کے رسول؟ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب۔ اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کی خبریں ہیں، اور تمھارے بعد آنے والے لوگوں کی بھی خبریں ہیں، وہ تمہارے درمیان حَکَم ہے۔ وہ قول فیصل ہے، کوئی ہنسی مذاق کی چیز نہیں ہے۔ جو سرکش اور جبّار اسے چھوڑ دے گا اللہ اسے توڑ کر رکھ دے گا۔ جو اسے چھوڑ کر ہدایت حاصل کرنا چاہے گا، اللہ اسے گمراہ کردے گا۔ یہ کتاب اللہ کی مضبوط رسّی ہے، یہ حکیمانہ نصیحت ہے۔ یہ صراط مستقیم ہے۔ یہی کتاب ہے جس میں ہوائے نفس کوئی کجی پیدا نہیں کرسکتی۔ زبانیں اس میں کوئی التباس پیدا نہیں کرسکتیں۔ علماء کبھی اس سے چشم سیر نہیں ہوسکتے۔ بار بار پڑھنے سے اس میں کوئی بوسیدگی نہیں آسکتی۔ اور نہ اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔ یہی کتاب ہے جسے سن کر جنّات کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ''ہم نے ایک عجیب وغریب قرآن سنا ہے جو صحیح راستہ

دکھاتا ہے، چنانچہ ہم اس پر ایمان لے آئے''۔ جس نے اِس کتاب کی حمایت کی وہ راست باز ٹھہرا، جس نے اس پر عمل کیا وہ اجر کا مستحق ٹھہرا۔ جس نے اس کی روشنی میں فیصلہ کیا، اس نے انصاف کیا۔ جس نے اُس کی طرف دعوت دی اُسے صراط مستقیم کی رہنمائی مل گئی۔)

قرآن کریم کی اس عظمت و جلالت کا تقاضا ہے کہ اس کے حقوق کی کما حقہ رعایت کی جائے۔ اہل ایمان اسے اپنے لیے حرز جان بنائیں۔ اس کی تلاوت سے ذہن وقلب کو شاد کام کریں۔ اس پر عمل کر کے اپنی زندگی سنواریں اور اس کی تعلیم و تدریس کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھیں۔ درس قرآن کی محفلوں کا اہتمام کریں تو ان کے آداب و شرائط کا پورا خیال رکھیں تا کہ ان کا بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔

تلاوت میں ترتیل کا اہتمام:

مدرِّس کے لیے بہتر ہوگا کہ درس کے وقت جب وہ قرآن کریم کی تلاوت کرے تو تجوید و ترتیل کا خیال رکھے۔ صحیح مخارج سے حروف کی ادائیگی، ترتیل اور صوتی نغمگی کا اہتمام مجلس کی رونق کو دوبالا کرتا اور سامعین پر وجد طاری کرتا ہے۔ بسا اوقات درس قرآن میں تو علم کا دریا بہایا جاتا اور حاضرین کو ہمہ تن گوش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر تلاوت بڑی بے دلی سے کی جاتی ہے یا صحیح مخرج سے حروف ادا نہیں کیے جاتے ہیں اور اس کا اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ تلاوت قرآن کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ ترتیل کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ ے ترتیل کا مطلب ہے کہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کیا جائے اور ایک ایک آیت کی خواندگی اس طرح سے ہو کہ دل پر اس کا براہ راست اثر مرتب ہو۔ اللہ کی ذات و صفات یا اس کے غضب اور عذاب کا تذکرہ آئے تو دل اللہ کی عظمت و جلال اور اس کے رعب و دبدبہ سے کانپ کانپ اٹھے اور اگر اللہ کی صفتِ رحمت و رحمانیت کا ذکر ہو یا اس کی نعمتوں کا بیان ہو تو دل جذباتِ تشکر سے، فرحت و انبساط سے لبریز ہو اٹھے۔

حضرت انسؓ سے رسول اکرم ﷺ کی قرأت کی کیفیت پوچھی گئی تو فرمایا کہ آپ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے، مثال کے طور پر انھوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم

پڑھ کر بتایا کہ آپ اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مدّ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ مسند احمد، ترمذی اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت امّ سلمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہر جاتے تھے۔ مثلاً الحمد لله رب العٰلمين پڑھ کر ٹھہر جاتے، پھر الرحمن الرحيم پر ٹھہرتے، اوراس کے بعد رُک کر ملٰک يوم الدين کہتے۔[۸]

براہ راست قرآن سے استفادہ:

تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ معرّیٰ قرآن کریم کے ذریعہ درس دینا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ کسی مخصوص ترجمہ یا تفسیر سے استفادہ سامعین کو گروہ بندی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ سامعین کسی نہ کسی بہانے سے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ مدرّس کا استعمال کردہ ترجمہ یا تفسیر کس عالم کی ہے۔ بسا اوقات وہ یہ صراحت بھی چاہتے ہیں کہ کون سا ترجمہ یا کون سی تفسیر زیادہ مفید اور درست ہے۔ مدرّس کو خود بھی محتاط رہنا چاہیے یعنی براہ راست قرآن سے استفادہ کرے، قرآن کریم اور سنت رسول سے استدلال کرے اور دورِ جدید کی تفاسیر کا، جن سے عوام منسوب ہو کر کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے وابستہ ہو چکے ہیں، بالکل حوالہ نہ دے۔ اور اگر سوال کیا جائے تو اس کا رویّہ تمام تفاسیر سے یکساں درجہ میں عقیدت و محبت کا ہونا چاہیے، یعنی وہ بتکرار یہ صراحت کرتا رہے کہ کسی بھی ترجمہ/تفسیر سے استفادہ میں حرج نہیں ہے۔ تمام تفسیریں قرآن فہمی کی راہ کھولتی ہیں اور قاری کو ہدایت تک لے جاتی ہیں بشرطیکہ طلبِ ہدایت کا سچا جذبہ اس کے اندر موجود ہو۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہے کہ مقصود قارئین اور سامعین کو قرآن پاک سے جوڑنا اور اللہ سے براہ راست ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ کسی مخصوص تفسیری مکتب یا منہج کی تبلیغ، حمایت و وکالت یا اس کی پشتیبانی مقصود نہیں ہے، خواہ مدرّس کو کسی تفسیری منہج یا مکتبِ فکر سے ذاتی طور پر انتساب اور عقیدت ہو۔ امت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو متحد کرنے کا یہی طریقہ ہے اور استفادۂ قرآن کا صحیح منہج بھی یہی ہے۔

گروہ بندی سے تنفّر:

بسا اوقات قرآن پاک کا درس دیتے وقت مدرِّس کسی خاص فقہی، مسلکی، تنظیمی یا جماعتی نقطۂ نظر کی پر جوش حمایت میں یہ نکتہ فراموش کر بیٹھتا ہے کہ مسلک قابل تقلید ضرور ہوسکتا ہے مگر قابل تبلیغ نہیں ہوسکتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جس نقطۂ نظر کو اس نے اختیار کیا ہے وہ زیادہ سے زیادہ اَقرب الیٰ الحق ہوسکتا ہے اور دوسرے نقطہ ہائے نظر میں بھی حق و صداقت کی موجودگی کی گنجائش ہے، اور یہ کہ فکری اختلافات اجتہاد کا شاخسانہ ہوتے ہیں اور اجتہاد کا معاملہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق ہمیشہ اجر اور برکت کا باعث ہوتا ہے اگر اجتہاد غلط ہوگیا تو ایک ثواب اور اگر صحیح ہوگیا تو دوہرا ثواب ملتا ہے۔

قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے وقت اس نکتہ کو بھی مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے کہ تفسیر ماثور کے سوا دوسری تفسیری آراء کے اظہار میں شدت اور بے جا اصرار مضر ثابت ہوتا ہے۔ ایک نقطۂ نظر کی حمایت میں معقول استدلال، دلائل عقل و نقل سے متوازن استشہاد مطلوب ہے مگر یہ استدلال جارحانہ ہرگز نہ ہو کہ دوسرے نقطۂ نظر کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ صحیح نقطۂ نظر کے اظہار میں بھی متانت، اعتدال، توسّع اور خوش خلقی کا مظاہرہ ہو۔ تشدّد، فکری جبر، انتہا پسندی، دوسروں کے خلاف فتوے بازی دعوتی اور دینی نقطۂ نظر سے مہلک ہے۔ اس سے بے جا تعصب کی افزائش ہوتی ہے۔ مسلکی و جماعتی تصلّب کو راہ ملتی ہے اور قبولِ حق کے امکانات مسدود ہوجاتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے میانہ روی، اعتدال اور متوازن فکر کی ستائش کی ہے اور غلو، انتہا پسندی، تشدّد اور انحراف سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے، متانت اور توازن کی راہ ہے۔ افکار و عقائد میں، زہد و تقویٰ میں، عبادات و نوافل میں، اخلاق اور رویّوں میں، معاملات اور قانون سازی میں ہر جگہ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور غلو اور مبالغہ آرائی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی المسند میں، امام نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے اپنی السنن میں اور

امام حاکمؒ نے اپنی المستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''إیّاکم والغلو فی الدین فإنما هلک من قبلکم بالغلو فی الدین''۔۹

(تم دین میں غلو کرنے سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ دین میں غلو کے باعث ہی ہلاک ہوئے۔)

اس حدیث میں قبلکم سے مراد سابقہ ادیان کے ماننے والے اہل کتاب ہیں اوران میں بطور خاص نصاریٰ سے خطاب ہے۔ایک دوسری حدیث ہے۔صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''هلک المتنطّعون''۔

(تشدد کرنے والے ہلاک ہوگئے)

اللہ کے رسول نے تین بار یہ جملہ دوہرایا۔امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہی جو بال کی کھال نکالتے ہیں، شدّت پسندی کا رویہ اپناتے ہیں اوراپنے قول وفعل میں حدود سے تجاوز کرجاتے ہیں۔

ایک تیسری حدیث ہے۔ابویعلیٰؒ نے اپنی المسند میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''لاتشدّدوا علیٰ أنفسکم فیشدّد علیکم فإنّ قوما شدّدوا علیٰ أنفسکم فشدّد علیهم فتلک بقایاهم فی الصوامع والدّیارات''۔۱۰

(اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ یہ سختی تم پر لازم کردی جائے گی۔ایک گروہ نے انتہا پسندی کا رویّہ اپنا کر اپنے اوپر سختی کی تو اس پر سختی کی گئی۔اس گروہ کے بچے ہوئے باقی افراد صوامع اور راہب خانوں میں ہیں۔)

ادبی،لغوی اور کلامی بحثوں سے اجتناب:

درس قرآن میں عربی زبان وادب کی لطافتوں اور لغت اور علم کلام کی بحثوں سے

عام سامعین اکتا جاتے ہیں۔انھیں اس بات سے بحث ہوتی ہے کہ قرآن میں ہدایت اور نصیحت کے نکتے کیا ہیں خاص طور سے دور جدید کے تناظر میں۔ربط آیات اور نظمِ کلام کے مباحث سے بھی انھیں سروکار نہیں ہوتا۔جاہلی کلام عرب سے استشہاد بھی ان کے دل کو نہیں بھاتا۔ایک بار درس قرآن کی ایک محفل میں ایک سامع نے اپنی یہ الجھن رکھی کہ عربی اشعار کو بار بار نقل کر کے مدرِّس ہماری حیرانگی میں اضافہ کرتے ہیں اور بس۔ہمیں تو اس سے غرض ہے کہ اللہ پاک کیا تعلیم دینا چاہتے ہیں۔حرام کیا ہے اور حلال کیا ہے۔اخلاقیات اور عقائد کے کون سے نکتے بیان ہو رہے ہیں۔درسِ قرآن کی عوامی محفلوں میں بہت زیادہ ادبی اور لغوی موشگافیاں مؤثر نہیں ہوتیں۔اردو میں تفہیم القرآن اور عربی میں فی ظلال القرآن کی عوامی مقبولیت کا راز یہ بھی ہے کہ فاضل مفسرین نے اس طرح کے مباحث سے عام طور پر کنارہ کشی کی ہے،اور ہدایت اور نصیحت کے پہلوؤں کو نکھارا ہے۔

سیرت طیبہ اور حیات صحابہ سے مفصل استدلال:

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور صحابہ وتابعین کے آثار و حالات کا مفصل بیان درس قرآن کو مؤثر، دل نشیں اور دل آویز بناتا ہے اور نظری وفکری مباحث کو رول ماڈل بھی فراہم کرتا ہے۔اس سے عوامی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے اور تفہیم مدّعا میں آسانی ہوتی ہے۔ نیپال کے اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈا نگریؒ (۱۹۱۰-۱۹۹۹ء) کے طول طویل خطابات کی اثر انگیزی مشہور ہے۔ وہ گھنٹوں بلا تکان خطاب کرتے تھے اور عوام میں کسی اکتاہٹ یا بیزاری کا شمّہ برابر اثر دکھائی نہیں دیتا تھا،وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے مستند واقعات مؤثر انداز میں بیان کرتے تھے۔قرآن کریم کا ایک مؤثر اور توانا اسلوب قصّوں کا بیانیہ انداز بھی ہے۔سورہ یوسف کو جو صرف حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے، اللہ رب العزت ''أحسن القصص'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔اس پورے قصّہ میں ایک خاص حقیقت کی جلوہ نمائی کی گئی ہے اور جس جس رخ سے دیکھیے اور جہاں کہیں دیکھیے اسی حقیقت کی نمود سامنے

آتی رہتی ہے یعنی انسان کی سیرت کی فضیلت اور اس فضیلت کی اٹل کامرانیاں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اس نکتہ کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اُن (حضرت یوسفؑ) کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اور اگر یہ سیرت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں جب بھی اس کی رفتار نہیں رکے گی۔ حوادث و وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے۔ افراد و جماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کرسکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشے میں فتح مندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے۔ وہ اعمال و نتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اسی لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز و درماندگی کی آلودگی کبھی اسے چھو نہیں سکتی''۔[۱۱]

مولانا اصلاحیؒ نے قصۂ یوسف علیہ السلام کے اَحسن القصص ہونے کے پانچ وجوہ سے بحث کی ہے:

۱- حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کی یہ سرگزشت خاص طور سے ایک آئینہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کو پہلے سے وہ تمام حالات دکھا دیے گئے جو آپ کی قوم کے ہاتھوں آپ کو پیش آنا تھے۔

۲- آنحضور ﷺ کے ذہین دشمنوں نے بھی اس قصہ کے پیرایہ میں اپنی عاقبت دیکھ لی ہوگی اور اس کا بھی امکان ہے کہ جن کے اندر صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔

۳- اس قصہ میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے اور پھر پوری سرگزشت ہر پہلو سے حضرت یوسفؑ کے اعلیٰ کردار و صفات کا ایک مرقع ہے۔

۴- تمام واقعات حیرت انگیز ہیں لیکن کوئی بات بے ربط اور رفتارِ حالات سے بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی۔

۵- حضرت یوسفؑ کو پیش آنیوالی آزمائشیں بیک وقت ذہانت، پاکیزگی، نبوت، بادشاہی، پاک دامنی اور قدرت کے ساتھ عفوو درگزر کی ایک زندہ جاوید مثال ہیں۔۱۲

قرآن کریم کا درس دیتے وقت ان مستند اور معتبر حکایات وآثار اور سیرت وتاریخ کے سچے واقعات سے مدد لی جائے تو تفہیم میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ چند مخصوص واقعات کی تکرار نہ ہوتی رہے بلکہ موضوع کی مناسبت سے متنوع اور مختلف واقعات بیان کیے جائیں۔

عملی مسائل اور معمول کے حالات پر تبصرہ:

اخبارات میں اور ٹیلی ویژن پر سماجی مسائل اور نت نئے حالات پر مختلف زاویوں سے تبصرے آتے ہیں۔عوامی الجھنوں اور مشکلات کا مبصّرین جائزہ لیتے ہیں۔ خودکشی کا بڑھتا رجحان، طلبہ اور نوجوانوں میں بڑھتا ہوا نفسیاتی دباؤ، دماغی خلجان اور فکری اضطراب، بے روزگاری اور مؤثر تعلیم وتربیت کے فقدان کی وجہ سے جرائم کا تنوّع، اولاد پر والدین کی کمزور پڑتی گرفت، سماجی ذمہ داریوں سے فرار، تخریب وتشدد اور لاقانونیت کے رویّے، گھریلو تشدّد، خواتین کی بے حرمتی اور ان کے حقوق کی پامالی، تعلیم یافتہ اور نام نہاد مہذب معاشرہ میں، رشوت، بدعنوانی اور صارفیت کا کلچر، انٹرنیٹ کے ذریعہ فحاشی اور اباحیت کا امنڈتا سیلاب، بوڑھوں، معذوروں اور پنشن یافتہ افراد کے ساتھ بے رحمی اور بے دردی کا سلوک، حکومتی مظالم کے خلاف سماجی، قانونی اور سیاسی ذرائع استعمال کر کے مؤثر احتجاج کرنے کے بجائے دوسرے غیر قانونی وسائل کی کھوج وغیرہ بے شمار مسائل ہیں جو جدید تہذیب کے پیدا کردہ ہیں۔ ان کا تعلق ملک کے تمام باشندوں سے ہے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ مسلم امت کسی جزیرہ میں نہیں بستی کہ ماحول کی آلودگی اور فکری و ارضی کثافت سے وہ خود کو محفوظ تصور کرے۔اس کی حیثیت خیر امت کی ہے جسے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے اللہ نے برپا کیا ہے وہ خدائی فوجدار ہے جو انسانیت کی فلاح کے

لیے فکر مند رہتی اور اس کے لیے منظّم جدو جہد کرتی ہے۔

مدرّس قرآن کا فرض ہے کہ ان عملی مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالے۔ اس کی باریکیوں اور فروعات کی تفصیل بیان کرے، محض سرسری ذکر پر اکتفانہ کرے۔ قرآن کریم کی روشنی میں ان کا مفصل تجزیہ پیش کرے۔ یہ تجزیہ خالص قرآنی ہونا چاہیے۔ قرآن نے عقائد و افکار، اصول و معیارات، اقدار و روایات کا جو عالم تعمیر کیا ہے اسی کے تناظر میں تبصرہ اور تجزیہ ہو۔

سہولت و بشارت پر ارتکاز:

اسلام کا مزاج سہولت فراہم کرنے، بشارت کی نوید سنانے، آسانیاں پیدا کرنے کا ہے۔ وہ اوہام و خرافات اور طلسمات کی بیڑیاں کاٹتا ہے۔ توہم پرستی، تحیّر خیزی، پُراسراریت، بداعتقادی اور مذہبی بھول بھلیّوں سے اسے نفرت ہے۔ سادگی، نرمی، کشادہ ظرفی، راست طریقہ گفتگو، سہولت و سازگاری اس کی سرشت میں داخل ہے۔ قرآن کریم نے خود اپنی یہ صفت گنائی ہے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ أَنزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا. قَيِّماً لِّيُنذِرَ بَأْساً شَدِيداً مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً حَسَناً. مَاكِثِيْنَ فِيْهِ أَبَداً۔ (الکہف ۱/-۳)

(تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کردے۔ اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

اس کتاب کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ خدا نے اس میں کوئی کج پیچ، کوئی منحرف فکر، راہ فطرت سے بغاوت کرنے والی کوئی تعلیم، فلاح انسانیت سے دور لے جانے والا کوئی پہلو نہیں رکھا ہے۔ زبان کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی پاکیزہ، مہذب اور شستہ، اور

رہنمائی، اس راستہ کی طرف جو صراط مستقیم ہے جس کی سیدھا اور سچا ہونے پر گواہی عقل و فطرت کے دلائل اور آفاق وانفس کے شواہد دے رہے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ملت اسلامیہ کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ وہ سادہ فطرت اور کشادہ ظرف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اصول ارتفاقات پر بحث کرتے ہوئے اسے فطری اور جبلّی قرار دیا ہے اور عمرانی ارتقا کو فطرت کی پکار سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کیا ہے مندرجہ ذیل حدیث سے:

"بعثت بالملة السمحة الحنيفية البيضاء"

(مجھے ایک ایسی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جو کشادہ ظرف، یکسو اور روشن و تابناک ہے)

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ السمحۃ سے مراد ہے کہ مذہب اسلام میں مشقت انگیز عبادتیں، ریاضتیں اور اطاعتیں نہیں ہیں جیسا کہ عیسائی راہبوں نے ایجاد کر لیا تھا۔ اس دین میں معقول عذر کے لیے رخصت موجود ہے۔ یہ دین طاقت ور اور کمزور، مصروف اور فارغ ہر ایک کے مناسب حال ہے۔ الحنیفیۃ سے حضرت ابراہیمؑ کی ملت مراد ہے اور البیضاء کا مطلب ہے کہ اس کے احکام، علتیں اور مقاصد سب واضح ہیں۔[۱۳]

امام بخاریؒ نے اسی مفہوم کی ایک حدیث روایت کی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"أحب الدين الى الله الحنيفية السمحة"۔[۱۴]

(اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دین وہ ہے جس میں کشادگی ہو اور ملت ابراہیمی کی یکسوئی ہو)

اللہ کے رسول ﷺ نے بعض پسندیدہ اعمال کو اپنے معمول کا حصہ نہیں بنایا اور نہ بطور خاص ان پر زور دیا مبادا کہ وہ امت کے لیے باعث زحمت بن جائے۔ مسواک کرنا آپ کی سنت تھی مگر آپ نے اسے احکام کی فہرست میں نہیں رکھا۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے

جس کی تخریج امام مسلم نے بھی کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"لولا أن أشق علیٰ أمتی لأمرتھم بالسواک"۔ ۱۵

(اگر مجھے اس کا خدشہ نہ ہوتا کہ میری امت زحمت میں مبتلا ہوجائے گی تو میں اسے مسواک استعمال کرنے کا ضرور حکم دے دیتا۔)

حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو بھی یہی ہدایت کی کہ وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ رخصتیں اور آسانیاں فراہم کریں۔ انھیں تنگی اور پریشانی سے بچائیں اور انھیں نفرت و وحشت سے دور رکھ کر بشارت اور زندگی بخش تعلیم سے ہم کنار کریں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ آپ نے جب انھیں یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی:

"یسرا ولا تعسّرا، بشرا ولا تنفرا"۔ ۱۶

(لوگوں کو آسانی فراہم کرنا، انھیں مشکل میں نہ ڈالنا، خوش خبری سنانا، نفرت کی باتیں مت کرنا۔)

آنحضرت ﷺ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میرا کام لوگوں کو زحمت میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ انھیں تنگیوں اور زحمتوں سے بچانا ہے۔ اور سہولت اور آسانی فراہم کرنا میرے فرائض میں شامل ہے:

"إن اللہ لم یبعثنی معنّتاً ولا متعنّتاً ولکن بعثنی معلماً میسراً"۔ ۱۷

(اللہ نے مجھے لوگوں کو سختی میں ڈالنے والا اور سختی اور تکلیف والا بنا کر مبعوث نہیں کیا بلکہ مجھے معلّم اور آسانی پہونچانے والا بنا کر مبعوث کیا ہے۔)

اللہ کے رسول کی اس نمایاں صفت اور ممتاز کردار کی وضاحت قرآن کریم نے بھی کی ہے۔ گزشتہ قومیں جن غیر ضروری مذہبی بندشوں اور دشواریوں میں مبتلا تھیں ان سے رسول رحمت ﷺ نے دنیا کو نجات دلایا۔ وہ سراپا رحمت بن کر تشریف لائے اور اپنے رحیمانہ و مشفقانہ اوصاف حمیدہ کی بدولت محبوبِ خلائق ثابت ہوئے۔ دیکھیے درج ذیل آیات کریمہ میں نبی کریم ﷺ کا ذکر جمیل:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔(التوبۃ/۱۲۸)

(دیکھو، تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔(الأنبیاء/۱۰۷)

(اے نبیؐ، ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔(الأعراف/۱۵۷)

(ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔)

مولانا مودودیؒ نے ترجمۂ قرآن مجید میں اس پر بڑی جامع حاشیہ آرائی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''یعنی ان کے فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے، ان کی راہبوں نے اپنے زہد کے مبالغوں سے، اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہمات اور خود ساختہ حدود وضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن جکڑ بندیوں میں کس رکھا ہے، یہ پیغمبر وہ سارے بوجھ اتار دیتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے''۔[۱۸]

علاّمہ یوسف القرضاوی کا یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے کہ شدت، انتہا پسندی، تشدّد اور سختی کا سب سے خراب اثر دعوت وتبلیغ کے کاموں پر ہوتا ہے۔ اسلامی دعوت کی کوشش کا معراج دل کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کو اندر سے بدلنا اور فکر وعقیدہ میں، احساسات وتصورات میں، سلوک اور معاملات میں اسے صراط مستقیم پر گامزن کرنا ہوتا ہے اور یہ کام حکمت ودانائی، حسن تدبیر اور نرمی سے ہی انجام پا سکتا ہے۔ برسوں کے جمے

جمائے تقلیدی ذہن کو راہ راست پر لانا، قدیم اور موروثی تصورات اور اوہام سے چمٹے ہوئے اور بحث و مباحثہ اور کٹ حجتی کو اپنا شعار بنائے ہوئے لوگوں کو ذہن تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہے اس کے لیے پیار اور محبت کی زبان، نرمی و بشارت کا طریقہ، حکمت اور فراست کا منہج ہی واحد کارگر تدبیر ہے۔قرآن کریم نے انبیائے کرام کی دعوتی جدوجہد کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں اس اسلوب کا استعمال سب سے زیادہ ملتا ہے۔۱۹ درس قرآن کا اہتمام کرنے والے علماء کے لیے اس اسلوب کی رعایت ناگزیر ہے۔

پچھلے چند سالوں میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے خلاف دشمنان دین کی یلغار نے نوجوانوں میں اضطراب اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی، افغانستان میں طالبان پر بمباری، عراق میں صدام حسین کی شہادت اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تشدد کی پرورش اور سازش، فلسطین میں حماس کی اسلامی حکومت کو ناکام ثابت کرنے کے لیے امریکہ اور اسرائیل کی ملی بھگت، ۱۱ر ستمبر کے حادثہ کے بعد دنیا بھر میں مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم، ڈنمارک اور مغرب کے اخبارات میں رسول رحمت ﷺ کے خلاف نفرت انگیز کارٹونوں کی اشاعت، اور ہمارے اپنے ملک میں ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے باصلاحیت مسلم نوجوانوں کی غیر قانونی گرفتاریاں اور فرضی پولیس انکاؤنٹر میں ان کی مظلومانہ شہادتیں یہ سب نوجوانوں کو پست حوصلہ، مایوس، مضطرب الفکر بنانے اور انہیں تخریبی کارروائیوں کی طرف دھکیلنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ مدرّسینِ قرآن کی ذمہ داری ہے کہ اللہ پر مسلمانوں کے اعتماد کو بحال رکھیں، صبر و استقامت اور قانونی و سیاسی مزاحمت کی تدابیر کی رہنمائی کریں اور مایوسی کے دلدل میں انہیں گرنے سے بچائیں کہ مایوسی اور شکست خوردگی قوموں کے لیے مہلک ہے اور امت مسلمہ کو خدا کی رحمت سے دور کرنے والی ہے۔

ترتیب وار پورے قرآن کا درس:

درس قرآن کے حلقوں میں عام طور سے جب قرآن کا درس دیا جاتا ہے تو مدرس اپنی پسند اور تیاری کے مطابق آیات کا انتخاب کرتا ہے اس طرح منتخب آیات ہی سامعین کے

سامنے آپاتی ہیں۔بعض دینی جماعتوں میں تربیت اور تزکیہ سے متعلق بطور خاص مکی آیات کا انتخاب درس اور مطالعہ کے لیے کیا جاتا ہے۔اس انتخابی منہج سے کئی نقصانات ہوتے ہیں:

۱- پورے قرآن کی تعلیم نہیں ہو پاتی۔احکامی آیات خاص طور سے نظر انداز ہو جاتی ہیں۔اس سے دین کا کلّی مفہوم اور شریعت کا ہمہ گیر تصور نگاہوں کے سامنے نہیں آپاتا۔فضائل پر ہی پوری عمر صرف ہو جاتی ہے اور مسائل سے واقفیت کی نوبت نہیں آپاتی۔

۲- بزعم خویش عقائد اور تعمیر سیرت سے متعلق مخصوص آیات کا مطالعہ ہماری تربیت کو بھی ناقص رکھتا ہے اور یک رخی تعلیم اور تدریس کی بنا پر مسلم شخصیت کا ارتقا بھی یک رخا ہوتا ہے۔بعض حلقوں میں روحانیت اور مذہبیت ہی کی ترویج ہوتی رہتی ہے اور دوسرے حلقے سماجی وسیاسی پہلوؤں پر ہی اپنی توجہ مرکوز کیے رہتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ایسا نظام فکر وعمل وجود میں نہیں آپاتا جس میں روحانیت بھی ہو اور سیاست بھی،تزکیہ بھی ہو اور جہانبانی کے طریقوں کی تربیت بھی،سیف بھی ہو اور قلم بھی،ابدی مذہبی تعلیم بھی ہو اور معاصر سائنسی علوم بھی۔

۳- اس انتخابی طریقۂ درس کی وجہ سے امت مسلمہ کے اندر مختلف گھروندے بن گئے ہیں اور ہر گھروندا تاج محل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ باہمی تعامل، افادہ و استفادہ،آپسی احترام اور ایک دوسرے کی رعایت مفقود ہے جب کہ قرآن کا مکمل اور ترتیب وار مطالعہ کیا جائے تو امت کے مختلف مکاتیب فکر، رویّوں اور مناہجِ فکر وعمل کے درمیان تعاون اور اجتماعی منصوبہ بندی کے تحت تخصّص کی راہیں نکالی جاسکتی ہیں اور یہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور دین کا مطالبہ بھی۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد اول (مقدمہ و تفاسیر آیت بسم اللہ، سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ)، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۲

۲۔ نفس مصدر، ص ۸۸-۸۹

۳۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد پنجم، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۴-۲۳۵

۴۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن جلد ہفتم، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۰-۱۰۱

۵۔ سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من قرأ القرآن۔

۶۔ ابن المرتضیٰ الیمانی (۷۷۵-۸۴۰ھ) کہتے ہیں کہ اس حدیث جلیل کی روایت السید الامام ابوطالب علیہ السلام نے اپنے اَمالی میں حدیث معاذ بن جبلؓ کی ایک دوسری سند سے انہی الفاظ میں کی ہے اور ابوالسعادات ابن الأثیر نے جامع الأصول میں ایک تیسرے طریق سے حدیث عمر بن الخطابؓ سے اسے بیان کیا ہے۔ علماء برابر اس حدیث کو بیان کرتے رہے۔ یہ حدیث اپنی شہرت کی وجہ سے علماء حدیث کی شرائط کے مطابق علماء اصول کے ہاں حدیث مقبول کی ضمن میں تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ اجماع اور منقول ومعقول کے تقاضوں کے مطابق اس حدیث کا مفہوم درست ہے۔ دیکھیے ابوعبد محمد بن المرتضیٰ الیمانی المشہور بابن الوزیر، ترجیح اسالیب القرآن علیٰ اسالیب الیونان، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع اول، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء، ص ۱۵

۷۔ قرآن کریم، المزّمل ۴

۸۔ بعض دیگر روایات کی تفصیل کے لیے دیکھئے مودودی، تفہیم القرآن، جلد ششم،

دہلی مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۶-۱۲۷

۹۔ علامہ شاکر کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ المناوی نے الفیض (جلد ۳، ص ۱۲۶) میں علامہ ابن تیمیہؒ سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی سند امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ مزدلفہ پہنچے تو آپؐ نے ابن عباسؓ سے فرمایا: منیٰ میں رمی جمار کے لیے کنکریاں لاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں چُن کر آپ کو دیں۔ آپؐ نے ان کنکریون کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: نعم بأمثال هٰؤلاء، إياكم والغلو في الدين فإنما هلك من قبلكم، بالغلوّ في الدين (ہاں ایسی ہی کنکریاں۔ اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ دین میں غلو ہی کے باعث ہلاک ہوئے۔) یعنی لوگوں کو شدت اور انتہا پسندی کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ رمی جمار میں بڑی کنکریوں کا استعمال زیادہ موثر اور باعث اجر ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ إياكم والغلو في الدين عام ہے اور اس کا تعلق عقائد اور اعمال دونوں سے ہے۔

۱۰۔ ان تینوں احادیث کو علامہ یوسف القرضاوی نے نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کی دعوت اعتدال پسندی کی اور غلو سے پرہیز کی دعوت ہے۔ دیکھیے مصنف کی کتاب الصحوۃ الاسلامیۃ بین الجحود والتطرف، اردو ترجمہ از سلمان ندوی، اسلامی بیداری- انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱-۱۴

۱۱۔ آزاد، ابوالکلام، ترجمان القرآن، جلد سوم، نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۹-۸۴۰

۱۲۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، جلد چہارم، دہلی، تاج کمپنی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۴-۱۸۶

۱۳۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ ،مصر، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ ،جلد اول، ص ۱۲۸

۱۴۔ صحیح بخاری، کتاب الإیمان جلد اول ،ص ۲۳، ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''دین کی تمام خصلتیں پسندیدہ ہیں، لیکن اس کی جو باتیں آسان ہیں وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہیں۔ یہاں دین کا لفظ بطور جنس کے استعمال ہوا ہے یعنی تمام ادیان میں سب سے زیادہ پسندیدہ دین۔ ادیان کا مطلب تحریف و نسخ سے پہلے کی ماضی کی شریعتیں ہیں اور حنیفیت سے مراد ملت ابراہیمی ہے''۔ علی متقی برہان پوری، کنز العمال، جلد اول، ص ۱۷۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے نظریہ ارتفاق کے مبنی بر فطرت و عقل ہونے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی کا مقالہ شاہ ولی اللہ کا نظریۂ ارتفاقات - ایک مطالعہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، ج ۲۴، شمارہ ۳، جمادی الاخری - شعبان، ۱۴۲۶ھ/ جولائی - ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۷۷-۹۶

۱۵۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ ، باب السواک یوم الجمعۃ ؛ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب السواک، حدیث نمبر ۱۷۳۲

۱۶۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف فی الحرب وعقوبۃ من عصیٰ امامہ؛ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الأمر بالتیسیر وترک التنفیر، حدیث نمبر ۱۷۳۲

۱۷۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب بیان أن تخییر إمرأتہ لا یکون طلاقاً بنیۃ، حدیث نمبر ۱۴۷۸

۱۸۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی، دہلی مرکزی مکتبہ اسلامی، ستمبر ۱۹۸۲ء، ص ۴۵۱-۴۵۳، حاشیہ ۴۳

۱۹۔ القرضاوی، حوالہ بالا، ص ۴۵-۵۱

قصصِ قرآنی۔ مناہج ومقاصد

صفدر سلطان اصلاحی

قرآن مجید بنیادی طور سے ایک صحیفۂ ہدایت ہے۔ اس کا مقصد انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی کو صلاح وفلاح سے ہم کنار کرنا اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابدی انعامات کے حصول کا مستحق بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید نے دیگر وسائل اور دلائل کی طرح واقعہ نگاری یا قصہ نگاری کو بطور وسیلہ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید کا مقصد نہ تاریخ بیان کرنا ہے اور نہ تاریخ کے واقعات وحادثات کی تفصیل فراہم کرنا ہے، بلکہ اس کا مقصد عبرت ونصیحت کے سامان اور حکمت وبصیرت کے اسباب فراہم کرنا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے بیان کردہ واقعات کی اس معنویت اور مقصدیت پر خود روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَـٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (ھود/۱۲۰)

اور اے نبیؐ، یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَـٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ. (یوسف/۱۱۱)۔

بلاشبہ اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جارہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے

آئی ہوئی ہیں ان ہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل۔ اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔

قرآنی قصوں کی مذکورہ بالا افادیت اور خاصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ حمیدالدین فراہیؒ نے سورہ یوسف کی تفسیر کی ابتدا میں بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''تمام قرآنی قصص عبرت اور یاددہانی کے سامان ہیں۔ یہ ایسی تصاویر ہیں جن میں انبیاء، صلحاء اور ان کے مخالفین ابتلاء اور کشمکش سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہ قصص ان کی اخلاقی او رتمدنی صورت حال کے ترجمان اور عکاس ہیں۔ یہ عبرت اور نصیحت اس لیے ہیں کیونکہ ان میں تمام فریقوں کے عواقب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عبرت حاضر کی صورت کو غایب پر قیاس کرنے کا نام ہے۔ پس یہ سورہ (سورہ یوسف) حضرت یوسفؑ کی زندگی کی تصویر کشی کرتی ہے۔ لیکن جب تم غور سے کام لوگے تو تمھیں اس کے اندر نبی آخرالزماں کی زندگی اور حالات نظر آئیں گے۔ اور تم اسے دیکھ کر مبہوت اور حیرت زدہ ہو کر رہ جاؤ گے۔ اس طرح یہ قصہ تمہارے سامنے ایک حقیقت واقعی بن کر اس طرح سامنے آئے گا کہ اس میں احساس اور خیال کی بھرپور نمائندگی شامل ہوگی۔ تمہارے اس احساس میں مزید اضافہ اس وقت ہوگا جب تم جامۂ یوسفی میں جمال مصطفوی کا مشاہدہ کرو گے۔ اس طرح تمھیں پوری سورہ فی الواقع نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے مراحل کو پیش کرتی نظر آئے گی''[1]۔

اقسام قصص:

قصص القرآن سے مراد قرآن مجید کی بیان کردہ وہ خبریں اور واقعات ہیں جو سابقہ اقوام، ان میں مبعوث انبیاء و رسل، ان کی دعوت کے نکات اور اس کے مراحل اور ان کے مخاطبین کے احوال اور رویوں وغیرہ سے متعلق ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں تاریخ انسانیت کی بعض اہم اقوام کی دینی، اخلاقی، تہذیبی و سماجی صورت حال اور ان کی رفعت

اور تنزل کے اسباب وغیرہ کے بارے میں اتنی وافر تفصیلات ہیں کہ ان کی بنیاد پر ان اقوام کی فکری اور تمدنی زندگی کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

قرآن مجید میں مذکور قصص پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بڑا حصہ درج ذیل تین اقسام سے متعلق ہے:

پہلی قسم میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ان واقعات کو شامل کیا جاسکتا ہے جن میں ان کی دعوت، اس کے مختلف مراحل، ان سے صادر محیر العقول واقعات، ان کے مخاطبین کا ان کے ساتھ طرز عمل، حق اور باطل کی کشمکش، حق کا غلبہ اور باطل کی شکست یا اصحاب کفر و شرک کی ہلاکت اور بربادی کی تفصیلات ہیں۔ ان انبیاء میں حضرت نوح، حضرت شعیب، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت یونس، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوسری قسم سے مراد قرآن مجید میں مذکور وہ واقعات ہیں جن سے متعلق مزید تفصیلات تاریخ کی مستند کتابوں اور مصادر میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ عہد نامہ قدیم وجدید میں اگر کچھ تفصیلات ہیں تو وہ تضاد اور اختلاف کی بنا پر غیر مستند اور غیر معتبر ہیں۔ گویا ہمیں ان سے متعلق صرف قرآن مجید میں موجود تفصیلات پر اکتفا کرنا پڑے گا[۲]۔ اس طرح کے واقعات میں حضرت آدمؑ کے دو بیٹے، طالوت و جالوت، اصحاب کہف، ذوالقرنین، قارون، اصحاب سبت اور اصحاب اخدود وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

تیسری قسم میں وہ واقعات ہیں جن کا تعلق نزول قرآن اور عہد رسالت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے۔ کافرین و مشرکین نے آپ ﷺ کی دعوت کا کس طرح مذاق اڑایا۔ اس کی مخالفت میں کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ بالآخر کئی مرتبہ حق و باطل ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے اور کئی معرکے مثلاً غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ تبوک اور غزوۂ حنین وغیرہ بپا ہوئے۔ مجموعی طور سے حق کا بول بالا ہوا اور باطل شکست و ریخت سے دوچار ہوا۔ ان سب کی اور ان کے علاوہ آپ ﷺ کی زندگی میں پیش آئے بعض اہم واقعات جیسے واقعۂ معراج، واقعہ ہجرت اور واقعہ مرور جن وغیرہ کی تفصیلات قرآن مجید کی بعض سورتوں

میں بیان کی گئی ہیں۔۳۳

مصالح قصص

قرآنی قصص کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عبرت اور نصیحت کے بہت سے سامان موجود ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ مشکل ہے۔ اس لیے چند اہم پہلوؤں کا انتہائی اختصار سے تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

۱- دعوت الی اللہ کی بنیادوں کی وضاحت اور ان شریعتوں کے اصول و مبادی کی صراحت جنھیں مختلف انبیاء کرام اپنے ساتھ لے آئے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيْهِ أَنَّهُۥ لَا إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ (الانبیاء/۲۵)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

۲- پیارے نبی ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے قلوب کو اللہ کے دین کی صداقت و حقانیت پر مطمئن کرنا، اللہ کی نصرت و تائید، حق کے غلبہ اور باطل کی شکست پر ان کے یقین واعتماد کو پختہ اور مستحکم کرنا، اس مقصد کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ ٱلرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِى هَٰذِهِ ٱلْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (ھود/۱۲۰)

اور اے نبیؐ، یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم لکھتے ہیں:

''اوپر حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سرگزشتیں ہم اس لیے سناتے ہیں کہ ان کے وہ پہلو تمہارے سامنے لائیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں تاکہ تم حالات کا پامردی اور استقلال کے ساتھ

مقابلہ کرسکو جو تمھیں پیش آرہے ہیں یا آئندہ پیش آسکتے ہیں۔ اور یہ اطمینان رکھو کہ ان واقعات سے حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی جو تاریخ تمہارے سامنے آئی ہے یہ تمام تر حقائق پر مبنی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ یہ سنت الٰہی ہے اور سنت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی''۔[۴]

۳- انبیاء سابقین اور ان کے احوال و کوائف کا تذکرہ اور اس کے ذریعہ خاص طور سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کی تصدیق۔ کیونکہ ان کے ساتھ بھی اُسی طرح کے واقعات پیش آئے جیسا اِن سے پہلے کے انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اور ان کے مخالفین کا اندازِ تکذیب اور طریقہ ایذارسانی اُسی طرح کا تھا جیسا ان سے پہلے کے انبیاء کے مخالفین کا تھا[۵]۔ ارشاد ربانی ہے:

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ (آل عمران/۱۸۴)

اور اے نبی اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جاچکے ہیں۔

كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولاً (مزمل/۱۵)

جس طرح فرعون کی طرف ہم نے ایک رسول بھیجا تھا۔

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاء مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (الشوریٰ/۵۲)

تمھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے؟ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

''وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ'' (یوسف/۳)

ورنہ اس سے پہلے تم (اُن چیزوں سے) بالکل ہی بے خبر تھے۔

۴- اہل کتاب کو دلائل و براہین سے اس بات کا قائل بنادینا کہ انھوں نے حق و انصاف کی راہ سے انحراف کیا ہے۔ کتمان حق کا جرم عظیم کیا ہے اور آسمانی

کتابوں میں تحریف و تلبیس کی شنیع حرکت کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے حضرات انبیاء کرام کی تصویریں مسخ کی ہیں اور ان پر بے بنیاد الزامات عاید کیے ہیں۔ اس لیے اب قرآن مجید جو کچھ بیان کر رہا ہے اس کی حقانیت اور صداقت کو تسلیم کیا جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّ هَـٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ (آل عمران/٦٢)

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ (الکہف/١٣)

ہم ان کا قصہ تمھیں ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔

إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔ (النمل/٧٦)

یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔

۵- مخاطبین کے لیے تذکیر اور نصیحت اور فہم حق کو آسان بنا دینا، کیونکہ قصص اور حکایات میں سامع کو ایک خاص قسم کا لطف آتا ہے اور بات اس کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (یوسف/١١١)۔

اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔

علامہ عبدالحمید فراہیؒ قصص قرآن کے اس پہلو کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں:

''قصص کی پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کی تاویل مخاطبین کے احوال کے مطابق ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ ایسی مثالیں ہیں جو ان ہی کے لیے بیان کی گئی ہیں اس لیے وہ ان سے سبق لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ انسانی نفوس میں صاف اور براہ راست گفتگو کے بالمقابل زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ نفس کو حرکت اور نشاط عطا

کرتے ہیں۔اس لیے لوگ مردوں اور عورتوں کے درمیان عشق و محبت کی داستانوں کو بہت شوق سے سنتے اور پڑھتے ہیں اور انھیں والدین اور ان کی اولاد کے درمیان پائی جانے والی محبت کی تفصیلات پر ترجیح دیتے ہیں"۶۔

وہ تفسیر سورہ البقرہ میں قصہ آدم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے پیش نظر مطالب کی وضاحت کے لیے قصہ کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اور ان مطالب کے لیے صاف اور سیدھے طریقہ بیان سے احتراز کیا ہے۔کیونکہ قصہ نگاری کی صنف زیادہ موثر اور کارگر ہوتی ہے"۷۔

۶- منکرین حق اور مفسدین ارض کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے ڈرانا اور اس کی تفصیلات سے آگاہ کرنا، تاکہ وہ تکذیب و افتراء اور کفر و شرک کی راہ ترک کرکے راستی اور حقانیت کا راستہ اختیار کرلیں۔یہ تفصیلات قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں حضرات انبیاء کرام اور ان کی اقوام کے تذکرہ کے دوران بیان کی گئی ہیں۸۔بعض مقامات پر عذاب کی شکلوں میں سے کئی کا تذکرہ ایک ساتھ کردیا گیا ہے۔مثلاً سورہ العنکبوت میں ہے:

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِباً وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (العنکبوت/۴۰)

آخرکار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسادیا اور کسی کو غرق کردیا۔اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا۔مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کررہے تھے۔

سورہ الفجر میں ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ. إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ. الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ. وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ. وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ. الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ. فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ. فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ

عَذَابٍ. إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ. (الفجر/٦-١٤)

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی؟ اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا کے ملکوں پر بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلا دیا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہیں۔

۷- اللہ تعالیٰ کی بے پناہ طاقت اور قوت کا اظہار اور اثبات، خاص طور سے حضرات انبیاء کرام کے ذریعہ محیّر العقول واقعات کے اصدار سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں کی امداد اور نصرت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اسے اس نے کیسے پورا کیا؟ اور وہ آج بھی اس پر قادر ہے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا کہ اس دنیا میں جو قوانین جاری ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ کے تابع ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیں ان قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں اور نا مساعد حالات کو مساعد اور ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں ۹۔ سورہ الملک میں ارشاد باری ہے:

أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ. أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِباً فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ (الملک/١٦-١٧)

کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمھیں زمین میں دھنسا دے اور یکا یک یہ زمین جھکولے کھانے لگے، کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے۔

سورہ الدخان میں ہے:

كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْماً آخَرِينَ. فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ (الدخان/٢٨-٢٩)

یہ ہوا ان کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔ پھر نہ آسمان ان لوگوں پر رویا اور نہ زمین۔ اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔

۸- حضرات انبیاء کرام کے بارے میں ان کے متبعین نے جو بے بنیاد باتیں عام کر رکھی تھیں ان کی تردید اور صحیح صورت حال کی وضاحت۔اس شنیع حرکت کا ارتکاب خاص طور سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہوا تھا۔انھوں نے توریت اور انجیل میں مذکور انبیاء اور رسولوں کی پاکیزہ اور صاف ستھری زندگیوں کو بے سروپا الزامات اور اتہامات سے آلودہ اور داغدار قرار دے کر پیش کیا تھا،جن کے مطالعہ سے ان پاکیزہ ہستیوں کی اتباع اور تقلید تو کجا،انھیں (نعوذ باللہ) عالم صالح افراد میں شمار کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔قرآن مجید نے اس قسم کے جن انبیاء کرام کی ذات گرامی سے متعلق بے بنیاد پروپگنڈہ کا ازالہ کیا ہے ان میں خاص طور سے حضرت سلیمانؑ،حضرت داؤدؑ،اور حضرت عیسیٰؑ قابل ذکر ہیں۔بطور مثال سورہ بقرہ آیت ۱۰۲، الانبیاء، آیت ۷۸ تا ۸۱، سورہ ص آیت ۱۷ تا ۴۰، آل عمران، آیت ۴۲ تا ۵۹، النساء، آیت ۱۵۷-۱۵۹، المائدہ، آیت ۱۱۰-۱۱۸، سورہ مریم، آیت ۱۶-۳۵،وغیرہا ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے یہود و نصاریٰ کے ان اتہامات اور بہتان طرازیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''جن لوگوں کی نظر تورات اور اسرائیلی روایات پر ہوگی وہ اس تکلیف دہ حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ عقل و دیانت کے ان دشمنوں نے انبیاء کی پاک سیرتوں کو داغ دار بنا کر دکھانے میں کسی کوتاہ دستی سے کام نہیں لیا-العیاذ باللہ-حضرت لوط کو اپنی بیٹیوں سے زنا کرنے والا،یا حضرت موسیٰ کو نظر باز اور مبروص قرار دیا،حضرت ہارون کو گوسالہ پرستی کا مجرم اول ٹھہرایا،حضرت داؤد کو عیاش اور عیار بنا کر پیش کیا،حضرت سلیمان کو جادوگر اور مشرک تک مشہور کیا اور حضرت عیسیٰ تو کچھ نہ پوچھیے کہ ان کا یہ ذوق بہتان طرازی کس حد کو جا پہنچا۔ان اتہامات میں سے اکثر وبیشتر تو ایسے ہیں جنھیں ان لوگوں نے تورات میں درج کر ڈالا اور کچھ صرف ان کی زبانوں پر گردش کرتے رہے۔قرآن مجید کی مختلف صفات میں سے ایک صفت ''مہیمن'' ہونے کی بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ان اہم غلطیوں اور بہتانوں کی اصلاح وتردید کرنے والا ہے جن کو اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں شامل کر دیا ہے''۔[۱۰]

مذکورہ سطور میں قصص قرآن کے چند بنیادی اور نمایاں دروس نصیحت وحکمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ قصص جملہ مقاصد نزول قرآن کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ان کی جتنی تشریح اور تفصیل بیان کی جائے وہ کم ہے۔الحمدللہ قدیم وجدید مسلم مفکرین اور علماء نے ان کے تعارف اور تذکرہ پر مبنی قیمتی تحریریں (کتابیں اور مقالات) سپرد قلم کی ہیں [۱۱]۔جن سے افرادِ امت کی اصلاح اور رہنمائی کا خاطر خواہ کام انجام پایا ہے۔تفصیل اور استفادہ کے طالبین کے لیے ان کی طرف مراجعت بے حد مفید ہوگی۔

اسالیب قصص

قرآن مجید میں مذکور قصوں کے اسالیب کی وضاحت تحریک اسلامی ہند کے قائد اول مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کے ایک مقالہ سے ماخوذ درج ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

''قرآن ایک صحیفہ ہدایت ہے۔وہ تاریخ بیان کرنے کے لیے نہیں اتارا گیا ہے بلکہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ دنیا کے لیے مشعل ہدایت ہو اور تاریکیوں میں لوگوں کی رہنمائی کرے۔وہ ایک صور ہے جو سوئی ہوئی قوموں کو جگا دینا چاہتا ہے۔ایک نور ہے جو راستہ سے بھٹکے ہوئے کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے۔ایک پیام ہے جس کی غرض دنیا کے عقائد و اعمال کی تصحیح واصلاح ہے۔اس مقصد کے لیے واقعات کی تاریخی ترتیب کچھ زیادہ سود مند نہیں۔قرآن میں انبیاء کرام اور گزشتہ قوموں کے حالات تاریخی حیثیت سے بیان نہیں کیے جاتے کہ ان میں ترتیب زمانی اور تفصیل جزئیات کا اہتمام ہو۔وہ استدلال اور تذکیر و موعظت کے لیے بیان ہوتے ہیں۔اس لیے نظم کلام،موقع بیان اور مخاطب کے اعتبار سے کبھی اجمال سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی تفصیل سے۔کبھی بعض انبیاء کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور بہتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔کبھی کسی کو ایک جگہ مقدم کر دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ موخر،یہ تقدیم وتاخیر اور اجمال وتفصیل بلا سبب یا تاریخ سے بے خبری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ....اور واقعہ یہ ہے کہ جو کلام مخاطب اور موقع ومحل کی رعایت سے خالی ہوگا ہرگز مفید نہیں ہوسکتا بلکہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔قرآن کی

بلاغت کا ایک راز یہ بھی ہے اور قرآن ہی نہیں بلکہ ہر سمجھ دار اس کو گفتگو میں ملحوظ رکھتا ہے۔ مخاطب کی معلومات، اس کے عقائد، اس کے جذبات اور اس کی فہم وغیرہ کو اگر گفتگو میں ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے۔ قرآن ان میں سے ہر چیز کا شدت سے لحاظ کرتا ہے"[۱۲]۔

ان اسالیب کی مزید وضاحت عصر حاضر کے مایہ ناز مفکر سید قطب شہیدؒ کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کے درج ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

"اس سورہ میں اس قصہ کا اس انداز میں بیان کیا جانا قرآن کے اس اسلوب کے مطابق ہے جو اس نے قصوں کے بیان کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے اس کا مقصود اصلاً کچھ متعین حقائق کا اثبات ہوتا ہے۔ یہ حقائق وہی ہوتے ہیں جو متعلقہ سورہ کے مرکزی موضوع/موضوعات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں چنانچہ قصص کے بیان کرنے کے لیے وہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے اور قصص کے اُتنے ہی حصے بیان کیے جاتے ہیں جن سے ان حقائق کی پیش کش اور وضاحت میں مدد ملے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قصوں کا حقائق کی پیش کش اور انھیں دلوں میں جاگزیں کرنے میں ایک خاص کردار ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ حقائق اپنی واقعی اور حقیقی شکل میں انسانی زندگی میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہ تاثیر کے اعتبار سے نفس انسانی میں مجرد حقائق کو پیش کرنے کے بالمقابل زیادہ مفید ہوتے ہیں"[۱۳]۔

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے قرآنی قصص کے اسالیب کا ایک عمومی تعارف نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اگلی سطور میں ان کے بعض مخصوص پہلوؤں کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

ان کا ایک خاص وصف تکرار ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک سے زائد مقام پر بیان کیے گئے ہیں۔ مختلف مقامات پر ان کے تذکرہ کا انداز اور اسلوب ایک دوسرے سے الگ ہے۔ کہیں کسی قصے میں کوئی بات مقدم ہو گئی ہے تو وہی بات دوسری جگہ مؤخر ہو گئی۔ کسی جگہ کسی بات کی بہت زیادہ تفصیل آئی ہے تو دوسری جگہ اسی بات کو بہت اجمال اور اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب میں کئی مصلحتیں کار فرما ہیں۔

۱- فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین مراتب کا بیان، کیونکہ بلاغت کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ ایک معنی اور مفہوم کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے۔قرآن مجید میں جو قصے بار بار بیان ہوئے ہیں ان کا اسلوب بیان ہر جگہ الگ ہے اور ایک دوسرے سے ممتاز اور نمایاں ہے۔ان کی ساخت اور ظاہری اجزاء بھی الگ الگ ہیں۔اسی لیے ان کا قاری ان کی تکرار کے باوجود انھیں انتہائی دلچسپی سے پڑھتا ہے بلکہ اُسے ہر قصے میں کچھ ایسے نئے معانی اور مفاہیم حاصل ہوتے ہیں جو اُسی قصے میں دوسرے مقام پر حاصل نہیں ہو سکے تھے۔

۲- قرآن مجید کے اعجاز بیان کا اثبات اور اس کی تاکید وتائید، کیونکہ ایک معنیٰ اور مفہوم کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیش کرنے سے عربوں کا عجز اور ان کی بے مائیگی ثابت ہوتی تھی، وہ اپنے مطالب کی اس طرح سے ادائیگی پر قادر نہیں تھے۔اس سے قرآن مجید کا وہ چیلنج (تحدی) اور زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ عربوں کے سامنے آتا تھا جو اس نے متعدد مقامات پر انھیں قرآن جیسا کوئی کلام یا اس کی ایک سورہ جیسی کوئی سورہ یا کئی سورتیں پیش کرنے کے حوالے سے دیا تھا[۱۴]۔

۳- قصوں کے تذکرہ سے اس بات کا اہتمام کہ ان کے لائق عبرت اور قابل نصیحت پہلو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں۔کیونکہ تکرار سے معانی میں تاکید اور ان کے مہتم بالشان ہونے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔جیسا کہ فرعون کے ساتھ موسیٰؑ کے واقعہ میں ہے۔یہ واقعہ حق اور باطل کی کشمکش کا بہت اچھوتے اور دلنشیں انداز میں نقشہ پیش کرتا ہے،جس کے مطالعہ سے لوگوں کو بے شمار دروس و نصائح حاصل ہوتے ہیں۔اہل ایمان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اہل کفر و اہل طغیان پر ان کی روش کے ہولناک نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اسلوب تکرار کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالحمید فراہیؒ لکھتے ہیں:

''قوم لوط، فرعون، ثمود اور قوم نوح کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ کہیں مفصل کہیں مجمل، اسلوب ہر جگہ بدلا ہوا ہے تا کہ بے فائدہ تکرار کا عیب کلام میں کہیں پیدا نہ ہونے پائے۔ ایجاز و اختصار ہر جگہ ملحوظ ہے۔ عبرت و نصیحت کے مقصد سے جتنی بات جس جگہ کہنی مناسب ہوئی کہی گئی.......... یہ اسلوب کلام زبور میں بھی ملتا ہے۔ اس میں بھی اکثر مشہور واقعات کی طرف اشارے کر دیے جاتے ہیں۔ اگر قرآن کے اس طرح کے مقامات سے آدمی سرسری طور سے گزر جائے تو اس پر کلام کا نظم اچھی طرح واضح نہیں ہوسکتا'' ۱۵؎۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے اس اسلوب کی بہت عمدہ وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لیکن تکرار کے لفظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ایک ہی بات کو لفظاً و معناً جوں کا توں جگہ جگہ دہرایا گیا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے، قرآن کریم میں اس کے باوجود کہ ایک ہی حکم، ایک ہی قصہ اور ایک ہی استدلال دسیوں، بیسیوں مقامات پر بیان کیا گیا ہے لیکن تکرار محض کہیں بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ہر مقام پر تذکیر و تفہیم کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو پیدا کر دیتا ہے................ ان باتوں سے جہاں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کو ایک ہی عبارت اور ایک ہی اسلوب میں سنتے سنتے طبیعتوں میں ناگواری نہیں محسوس ہوتی، جی اکتا اور کان تھک نہیں جاتے وہاں اس سے یہ بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ تذکیر اور استدلال بدل جاتے ہیں اور حکمت الٰہی کے کچھ نئے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے سمجھنے اور سمجھانے والوں پر ہر بار ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے'' ۱۶؎۔

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ نے دائرہ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ) کے ترجمان ''الاصلاح'' میں ''قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم و شیطان'' کے عنوان سے ایک وقیع اور تجزیاتی مقالہ لکھا تھا، جسے بعد میں ادارہ علوم القرآن نے ''قرآنی مقالات'' کے نام سے شائع شدہ مجموعہ مقالات میں شامل کرلیا ہے ۱۷؎۔ اس مقالہ کے بارے میں پاکستان کے معروف محقق ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''قصص میں تکرار کے موضوع پر ہندوستان ہی کے ایک مشہور صاحب قلم مولانا ابو اللیث اصلاحی نے ایک بڑا عالمانہ مقالہ تحریر کیا تھا جو کئی بار شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں مولانا نے بڑی تفصیل سے تکرار کے موضوع پر گفتگو کی ہے اور بطور مثال یہ بتایا ہے کہ قصہ آدم و ابلیس میں تکرار کیوں ہے؟''[۱۸]۔

قرآن حکیم میں مذکورہ قصوں کے اسالیب اور طرز بیان پر غور کرنے سے ایک اور اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہ قصے کسی ایک سورہ میں مکمل صورت میں بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ مختلف سورتوں میں جستہ جستہ بیان کیے گئے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید کی ہر سورہ کا ایک مرکزی عنوان ہے اس لیے اس سورہ میں مذکور واقعے کا صرف وہ حصہ بیان کیا گیا ہے جو اس کے عنوان سے مطابقت رکھتا ہو۔ ساتھ ہی موقع و محل اور بلاغت و فصاحت کے اقتضا کا بھی پاس و لحاظ رکھا گیا ہے[۱۹]۔ کبھی کبھی کسی واقعے کا تذکرہ کا محرک اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی تفصیل پیش کرنا ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ''وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ'' (آیت نمبر ۲۶۰) ترجمہ: اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے جب ابراہیم نے کہا تھا کہ ''میرے مالک، تو مجھے دکھا دے تو مردہ کو کیسے زندہ کرتا ہے) اور سورہ کہف میں اصحاب کہف کے واقعے کے تذکرہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی اسی طاقت و قوت اور قدرت و سلطنت کا بیان ہے۔

قرآنی قصص کے اسالیب کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں خطاب بالعموم نبی کریم ﷺ سے ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ کبھی نبی ﷺ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کی دعوت برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام حق اپنے نیک بندوں کے ذریعہ ہر دور اور ہر قوم میں بھیجا ہے اور اس کی تائید کے لیے بوقت ضرورت خارق العادت واقعات (معجزات) کا ظہور بھی کیا ہے اور کبھی کبھی پیارے نبی ﷺ کی زبانی اہل کفر و عناد کو ان کے انجام بد اور سوء عاقبت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خطاب کبھی سوال کی صورت میں ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ مخاطبین کو متوجہ کرنے اور انھیں شوق و رغبت سے سننے کی دعوت دی جاتی ہے۔ سورہ الفیل میں اصحابِ فیل کے واقعے کے تذکرہ کا یہی مقصد ہے، اہلِ عرب اس بات سے بخوبی

واقف تھے کہ اصحابِ فیل اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کے شکار ہوئے تھے لیکن وہ اس لعنت اور غضب کی شدت سے واقف نہیں تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء سورہ میں دو سوالات کیے۔ پھر تین آیتوں میں ان کے جوابات دیے۔ جن کے ذریعہ انتہائی بلیغ اور مؤثر انداز میں عذاب اور لعنت کی شدت سامنے آ گئی۔ بلاشبہ یہ واقعہ عربوں میں معروف تھا۔ اس لیے اس کے تذکرہ سے ان کی معلومات میں اضافہ کرنا مقصود نہیں بلکہ انتہائی مختصر لیکن جامع الفاظ میں اللہ کی گرفت کی شدت کو پیش کرنا تھا، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اتنے بڑے واقعے کو محض پانچ آیات میں پیش کر کے ایجاز واختصار کا ایک حیرت انگیز نمونہ رکھ دیا گیا ہے۔

قرآنی قصص کے طرز بیان اور اسالیب کے مطالعہ کے وقت ان کا ایک وصف اور امتیاز یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ان کی ابتدا اور آغاز مختلف طریقوں سے ہوئی ہے۔ کسی واقعہ میں بالکل آغاز ہی میں ایک یا دو آیت کے اندر اس واقعے کا پورا خلاصہ پیش کر دیا گیا۔ مثلاً سورہ کہف میں فرمایا گیا ”نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى“۔ (الکہف/۱۳) (ہم ان کا قصہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔) اس اسلوب بیان سے قاری کے اندر اس قصے کی مزید تفصیلات جاننے کا شوق پیدا ہوا، اس کے بالمقابل بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن میں قرآن مجید نے شوق اور رغبت دلانے کے لیے آغاز قصہ ہی میں اس کی بہترین الفاظ میں تعریف کی اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی مثلاً سورہ یوسف میں قصہ یوسف کا آغاز اس طرح ہوا: ”نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ“ (آیت/۳) (اور اے نبیؐ، ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں۔) بعد میں فرمایا کہ اس کا مقصد لوگوں کو تاریکیوں اور غفلتوں سے نکال کر روشنی اور بیداری کی طرف لانا ہے اور انہیں رشد و ہدایت سے ہم کنار کرنا ہے، پھر اس کے بعد حضرت یوسف کے خواب، باپ سے تذکرہ اور ان کی ہدایت کہ بھائیوں سے نہ ذکر کریں، ان سب سے قارئین وسامعین کے اندر پورے واقعہ کی جانکاری کی طلب اور خواہش پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد وہ پورا واقعہ پڑھنے کے لیے بے چین

ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ سورہ میں بیان کردہ تمام تفصیلات از بچپن تا حصول اقتدار (بشمول امراۃ عزیز کا معاملہ، حضرت یوسفؑ کی قید اور رہائی وغیرہ) پڑھ ڈالتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔

قصہ اور حکایت کی پیش کش کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس میں دور تک انجام کو پردۂ خفا میں رکھا جائے اور کسی مقام پر اچانک قاری کو اس سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس اسلوب کے ذریعہ قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے جذبہ شوق کو تحریک ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ موسیٰؑ کا واقعہ، اللہ تعالیٰ کے ایک انتہائی مخصوص بندے کے ساتھ (الکہف/۶۵-۸۲) اور ملکہ سبا کا واقعہ سلیمانؑ کے ساتھ (سورۃ النمل آیت ۱۶-۴۴) اس کی بہترین مثال ہیں۔ جن کے مطالعہ کے وقت قاری کا شوق اور طلب آخر تک باقی رہتی ہے ملکہ سبا کے واقعہ میں تو اُس کا تجسس اخیر تک باقی رہا۔ خود ملکۂ سبا بھی اُس عرش کے بارے میں صاف جواب نہیں دے سکیں اور "کأنه هو" کہنے پر اکتفا کیا۔

قرآنی قصص کا ایک امتیازی اسلوب یہ ہے کہ اس میں الفاظ وتراکیب کے استعمال میں انتہائی احتیاط اور لطافت کا خیال رکھا گیا ہے اور بڑے سے بڑے واقعے کا کم سے کم الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ قصص کی آیت "وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ" (القصص/۲۳) (اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی دے رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰؑ نے ان سے پوچھا "تمھیں کیا پریشانی ہے"۔ انھوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ یہ چرواہے اپنے جانور نہ لے جائیں۔ اور ہمارے والد بہت بوڑھے آدمی ہیں۔) ایجاز واختصار کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں وارد بعض الفاظ خاص طور سے لفظ "تذودان" پر غور کرنے سے بے شمار معانی اور مفاہیم سامنے آتے ہیں اور بچیوں کی قوم کی اخلاقی حالت کے زوال اور بچیوں کی حیا وشرم کے زیور سے آراستگی اور ان کے احتیاج اور ضعف پر روشنی ملتی ہے۔ اس لفظ کے بغیر کسی اور لفظ سے اتنے

معانی کا بیان ممکن نہیں تھا، اسی طرح سورہ قمر کی آیات ''كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ. إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحاً صَرْصَراً فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ. تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ''(۱۸-۲۰) (عاد نے جھٹلایا، تو دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔) میں قوم عاد کی تکذیب اور عذاب کی نوعیت پر بہت مختصر اور جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ آیت ''وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ''(البقرہ/۳۰) (یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا'' کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا) میں لفظ جاعل، فساد اور سفک دم کا استعمال بہت معنی خیز ہے۔ جاعل (اسم فاعل) کے استعمال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کی ذمہ داری حضرت آدمؑ کی ذات تک نہیں بلکہ پوری نسل آدمؑ تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اور ملائکہ کے قول میں فساد اور سفک دم کے استعمال اور بعد میں سورہ بقرہ ہی کے اندر آدم کے دو بیٹوں میں باہمی نزاع اور ایک کے قتل کے واقعہ کے ذکر سے بنی نوع انسان کی اس اخلاقی کمزوری سے پردہ اٹھانا تھا جو اُس اقتدار و استیلاء کا لازمی نتیجہ ہے جس سے نسل آدم سرفراز کی جارہی تھی۔

قصص کی اہمیت وافادیت

اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ عمدہ اور دل کش انداز میں بیان کیے ہوئے قصوں میں سامع/قاری کے لیے ایک عجیب وغریب قسم کی دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ قصہ نگاری اور قصہ گوئی سے نفس انسانی بہت آسانی اور سرعت سے باتوں کا اثر قبول کرتی ہے اور اس کے احساسات وجذبات میں حرکت وارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد عقل

انسانی بقدر ضرورت واستطاعت ان قصوں میں پنہاں اور مخفی ثمرات ونتائج کو اخذ کر لیتی ہے اور انھیں وقتاً فوقتاً استعمال کرتی ہے۔قصوں اور حکایات کے بالمقابل اگر کوئی بات تبلیغ و تلقین کے دیگر ذرائع سے کہی جائے تو نفس انسانی بہت جلد تکان اور بے رغبتی کا شکار ہو جاتی ہے اور جذبات واحساسات میں کوئی ارتعاش نہیں پیدا ہوتا چنانچہ نفس پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا، اور مطلوبہ نتائج کا حصول بہت مشکل اور دیر سے ہوتا ہے۔

قصوں کی اس افادیت کو عالم عرب کے معروف مفکر اور داعی بہی الخُولی نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''قصوں اور داستانوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے گوشوں کی منظر کشی کرتی ہیں۔آپ کے سامنے عظیم شخصیات، ان کی سرگرمیوں، ان کے اخلاق، ان کے افکار وخیالات اور ان کا طبعی وزمانی ماحول سب کچھ پیش کر دیتی ہیں اور یہ ساری چیزیں ان کے اعمال وتصرفات اور باہم معاملات کے لبادے میں ہمارے سامنے رکھتی ہیں...... ان قصوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نفس ان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور انھیں سننا پسند کرتے ہیں۔تجسس اور انھیں جاننے کی فطرت سامعین کے کان، ان کی آنکھوں اور ان کے ذہن کو قصہ کے بقیہ حصے کی طرف متوجہ رکھتی ہے اور انسان قصے کے اگلے مرحلے کو جاننے کے لیے بیتاب رہتا ہے، قصہ اپنی ان دو امتیازی خصوصیات کی وجہ سے داعیان دین کے لیے بہترین وسیلہ ثابت ہوسکتا ہے۔اس سے وہ اپنی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں اتار سکتے ہیں''[۲۰]۔

قصوں اور حکایتوں سے انسان کو کچھ فطری مناسبت حاصل ہے۔انسان جب عہد طفولت میں ہوتا ہے تو وہ کہانی سننے، اس سے اثر لینے اور اُسے یاد کر لینے میں اور بعد میں اسے بیان کر لینے پر بہت جلد قادر ہو جاتا ہے۔جب کہ دیگر چیزوں کے تعلق سے اس کا یہ معاملہ نہیں ہوتا ہے[۲۱]۔انسان کی اس فطری خوبی اور وصف سے تعلیم وتربیت کے ماہرین نے فائدہ اٹھایا ہے اور تعلیمی اور تربیتی ضروریات کی تکمیل کے لیے قصوں اور کہانیوں کا استعمال کیا ہے خاص طور سے دینی تربیت کے لیے ان کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے۔

بلا شبہ قرآنی قصوں میں ایک خاص قسم کی اثر انگیزی ہے اس لیے یہ تربیت نفوس کے کام میں بے حد مددگار ثابت ہوئے ہیں۔البتہ اس کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ ان قرآنی قصوں کو اس اسلوب میں پیش کیا جائے جو طالبین تربیت کے فکری معیار کے مطابق ہو۔ بلا شبہ اس ضمن میں کچھ قابل قدر کام ہوئے بھی ہیں۔عربی زبان میں سید قطب شہید، سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور استاد السحار اور ڈاکٹر جارم وغیرہ کی بعض کتابیں اس کے لیے بہترین نمونے ہیں۔اردو زبان میں بھی اس طرح کی کاوشیں ہوئی ہیں اور ان کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصانیف خاص طور سے قابل ذکر ہیں[۲۲]۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ''تاریخ ارض القرآن'' اپنے موضوع کی بہت معرکۃ الآراء اور بحث وتحقیق کے مسلم اصولوں اور معیارات کے مطابق ہے۔مستقل کتابوں کے علاوہ اردو زبان میں مطبوعہ بعض کتابوں کے کسی ایک باب یا کئی ابواب میں قرآنی قصص میں سے ایک یا کئی قصوں کا تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان میں موجود دروس عبرت ونصیحت کو عمدہ اور جاذب نظر اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔اس طرح کی کتابوں میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی کتاب ''قرآن کی دعوت فکر''، عرب مفکر بہی الخولی کی کتاب (اردو ترجمہ) ''تحریک اور دعوت''، اخوانی رہنما اور مفکر سید قطب شہید کی کتاب (اردو ترجمہ) ''قرآن کے فنی محاسن'' اور علامہ محمد الغزالی کی کتاب (اردو ترجمہ) ''قرآنی مباحث کے پانچ محور'' خاص طور سے قابل ذکر اور لائق مراجعت ہیں۔

دور حاضر میں قرآن فہمی اور رجوع الی القرآن کی جو مبارک اور مسعود کوششیں انفرادی اور اجتماعی سطح سے ہو رہی ہیں انھیں اور منظم اور تیز کرنے اور اس کے لیے تمام ممکنہ اور مفید ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ان ذرائع و وسائل میں سب سے اہم خود قرآن مجید کے موضوعات اور ان کے اثبات کے لیے اس کے فراہم کردہ دلائل اور براہین سے عامۃ الناس کو آگاہ اور روشناس کرانے کی منصوبہ بندی اور اس کا نفاذ ہے۔ چونکہ ان موضوعات میں سے اکثر وبیش تر کا احاطہ، قرآن مجید میں وارد قصص و واقعات میں

کیا گیا ہے اس لیے مختلف زاویوں سے ان کا مطالعہ اور مختلف طریقوں سے ان کی پیش کش سے عوام وخواص نہ صرف یہ کہ ان میں پنہاں مواعظ اور نصائح سے مستفید ہوں گے بلکہ وہ قرآن مجید کے مکمل مطالعہ اور اس کے موضوعات سے پوری آگہی کی طرف مائل ہوں گے اور اس کی تعلیمات سے اپنی زندگیوں کو آراستہ کر کے ابدی انعامات اور حقیقی کامیابی سے سرفراز ہوں گے۔

حواشی ومراجع

۱؎ عبدالحمید فراہی، تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم، الجزء الاول، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، طبع اول ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۶۔ علامہ فراہیؒ نے اس انداز کی بحث اپنے تفسیری حواشی میں کئی مقامات پر کی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، سورہ ابراہیم (حوالہ سابق)، ص ۳۲۸-۳۲۹۔ ان کی تفسیر ''نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان'' کے جزء سورۃ البقرۃ، ص ۳۶-۴۶ (الدائرۃ الحمیدیۃ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، طبع اول ۲۰۰۰ء) پر اس طرح کی ایک عمدہ بحث ہے جس میں انھوں نے بنی اسرائیل کے واقعات سے حاصل شدہ اسباق پر روشنی ڈالی ہے اور امت مسلمہ کے نزول قرآن کے عہد کے حالات اور بعد کے حالات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

۲؎ اس سلسلے میں دور حاضر کے مشہور مفسر قرآن سید قطب شہیدؒ کا موقف بہت واضح ہے۔ وہ سورہ البقرہ کے تحت لکھتے ہیں:

''قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ان حوادث اور واقعات کے بارے میں محض مجمل انداز میں کچھ اشارے کرنے پر اکتفا کرتا ہے جو مخاطبین کے یہاں مشہور ہوتے ہیں۔ یہ اجمال واختصار قرآن کے مقصود کی وضاحت کے لیے کافی ہوتا ہے۔

مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں میں نے قصوں کی اس طرح کی تفصیلات سے اجتناب اوراحتراز کی پالیسی اختیار کررکھی ہے، کیونکہ ان سے متعلق جو روایات ہیں وہ غیر ثابت شدہ اور ناقابل استناد ہیں''۔(تفسیر ''فی ظلال القرآن''، ج۱،ص ۹۷، دارالشروق، بیروت، طبع ہشتم، ۱۹۷۹ء)

سورہ الاعراف آیت ۱۳۵ کے تحت انھوں نے لکھا ہے:

''اس طرح کے مواقع پر ہم نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہم قرآنی نصوص پر اعتماد اور اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے قرآن وسنت کی طرف مراجعت کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ اسرائیلیات اور ان بے بنیاد اقوال اور روایات سے احتراز کیا جاسکے جو کتب تفسیر میں موجود ہیں۔ اس سے کوئی تفسیر مستثنیٰ نہیں ہے حتی کہ ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی تفاسیر اپنی عظمت اور قدر و قیمت کے باوجود اس بڑی کمزوری سے محفوظ نہیں رہ سکی ہیں''۔ (فی ظلال القرآن، جلد سوم، ص ۱۳۵)

۳ قرآنی قصوں کی یہ تقسیم عربی زبان کی متداول کتاب ''مباحث فی علوم القرآن'' سے لی گئی ہے۔اس کے مصنف مناع خلیل القطان ہیں۔(مطبوعہ مکتبہ اشاعت الاسلام، چوڑی والان، دہلی، ص ۳۱۷) اس کے علاوہ ان قصوں کی تقسیم ان کے بعض دوسرے خصائص اور امتیازات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ مثلاً تاریخی قصے، تمثیلی قصے، یا واقعاتی قصے، بشری قصے، یا تاریخی قصے، تمثیلی قصے، افسانوی قصے، رمزی قصے، موخر الذکر تقسیم عربی زبان کے ایک ادیب محمد احمد خلف اللہ نے کی ہے۔ جس پر بجا طور سے کافی تنقید ہوئی ہے اور اسے قرآن کی روح کے خلاف بتایا گیا ہے۔

۴ تدبر قرآن، ج ۴، تاج کمپنی دہلی، باراول ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۸

۵ قصص کی اس اہمیت اور افادیت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی شہرہ

آفاق تفسیر تفہیم القرآن میں جابجا اظہار خیال کیا ہے۔بطور مثال ملاحظہ ہو۔جلد دوم،(سورہ یوسف) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، اپریل ۲۰۰۶ء،ص ۳۷۸-۳۷۹ / جلد سوم (سورہ کہف) محولہ بالا،ص ۷-۸،۱۰-۱۱،۱۹-۲۰۔مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''معرکہ ایمان و مادیت'' (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، باردوم ۱۹۷۵ء) میں کئی مقامات پر اس مسئلہ سے متعلق قیمتی مباحث ہیں بطور مثال ملاحظہ کریں،ص ۴۶-۴۷

۶ تعلیقات، محولہ بالا،ص ۲۹۷-۲۹۸

۷ تفسیر سورۃ البقرہ (محولہ بالا)،ص ۲۱۶

۸ علامہ حمید الدین فراہیؒ کا خیال یہ ہے کہ سابقہ اقوام پر عذاب تیز وتند، غبار آلود ہواؤں کے ذریعہ آیا ہے۔ملاحظہ ہو ان کی تفسیر نظام القرآن سے تفسیر سورہ ذاریات، (اردو ترجمہ) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء،ص ۱۲۹-۱۳۸)

۹ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سورہ کہف آیت ۲۲ کی تشریح کرتے ہوئے اس مصلحت اور حکمت پر انتہائی بلیغ اور عمدہ بحث کی ہے۔ملاحظہ ہو،'تفہیم القرآن' ج ۳،ص ۱۹-۲۰

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''معرکہ ایمان و مادیت'' میں ص ۴۱ تا ۵۱ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۰ تیسیر القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۲۰۰۶ء،ص ۱۳۸-۱۳۹

۱۱ بطور نمونہ ملاحظہ ہو، سید قطب، التصویر الفنی فی القرآن، دارالشروق بیروت، قاہرہ، ب ت،ص ۱۱۸-۱۴۶، نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان، سورۃ البقرۃ،ص ۳۶،۴۶،ص ۲۱۱، ۲۱۷، قرآن مجید میں جہاں کہیں کوئی قصہ یا قصص بیان ہوا ہے/ ہوئے ہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفاسیر میں ان کی تشریح کرتے ہوئے ان میں

پنہاں عبرت وموعظت کے پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔مولانا مودودیؒ نے بہت اہتمام سے متعلقہ سورتوں کے تعارفی کلمات میں ان کے اغراض ومقاصد کا جائزہ لیتے ہوئے اس عنوان/موضوع کا احاطہ کیا ہے۔سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب معرکہ ایمان و مادیت اس موضوع پر ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے، عبرت ونصیحت کے گوشوں کو اجاگر کرنے میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔بہی الخولی، تحریک اور دعوت (اردو ترجمہ) ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، طبع اول جنوری ۱۹۸۳ء، ص۷۲، ۱۱۵، علامہ محمد غزالی، قرآنی مباحث کے پانچ محور (اردو ترجمہ)، مکتبہ اشاعت القرآن دہلی، طبع اول ۲۰۰۴، ص۹۲، ۱۳۸، عبدالماجد دریابادی، قصص ومسائل، اسلامک پبلشر لکھنؤ، جنوری ۱۹۹۴ء، ص۹۳-۹۶/ ۱۰۴، ۱۰۶، ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات قرآنی، اریب پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص۲۹۲-۲۹۳، محمد حنیف ندوی، مطالعہ قرآن، فرید بکڈپو، دہلی، جنوری ۲۰۰۵ء، ص۲۲۳، ۲۳۱، محمد سعود عالم قاسمی، قرآن کی دعوت فکر، فیکلٹی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص۵۷-۷۲

۱۲۔ قرآنی مقالات (مقالہ مولانا ابواللیث اصلاحیؒ)، ادارہ علوم القرآن، سرسید نگر علی گڑھ، طبع اول ۱۹۹۱، ص۱۳۶-۱۳۷

۱۳۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، دارالشروق بیروت، قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ج۱، ص۳۹۰

۱۴۔ مراد قرآن مجید کی درج ذیل آیات ہیں:
سورہ الاسراء، آیت ۸۸، سورہ البقرہ، آیت ۲۳، سورہ ہود، آیت ۱۳

۱۵۔ تفسیر نظام القرآن، سورہ ذاریات (اردو ترجمہ)، ص۱۲۹

۱۶۔ صدرالدین اصلاحی، قرآن کا تعارف، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی، بار اول جون ۱۹۶۳ء، ص۱۲۲

۱۷۔ مولانا کا یہ مقالہ ”قرآنی مقالات“ (محولہ بالا) کے ص۱۵۴ تا ۱۸۵ میں موجود ہے۔

۱۸ محاضرات قرآنی، محولہ بالا، ص۲۹۳۔ تکرار کے اسلوب پر علامہ محمد غزالی (ملاحظہ ہو: قرآنی مباحث کے پانچ محور، محولہ بالا، ص۵۲-۹۲) اور مولانا محمد تقی عثمانی نے بہت عمدہ بحث کی ہے اور کچھ نئے پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ (علوم القرآن، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، طبع اول ۲۰۰۵ء، ص۳۱۶-۳۱۸)

۱۹ مذکورہ سطور میں اس اسلوب کے مصالح اور فوائد پر متعدد مفسرین کرام اور مفکرین امت کی آراء اور خیالات نقل کیے جا چکے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو۔ تیسیر القرآن، (محولہ بالا)، ص۳۸۳

۲۰ حوالہ سابق، ص۷۳، ان کی کتاب ''تحریک اور دعوت'' کا صفحہ ۱۱۵ بھی لائق مطالعہ ہے۔

۲۱ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے قصص اور واقعات کی اس اثر پزیری اور عبرت انگیزی کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے، اس کا تذکرہ مذکورہ سطور میں آ چکا ہے۔

۲۲ ملاحظہ فرمائیں: قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، (چار مجلدات، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۴۹ء)، ارض القرآن، مولانا سید سلیمان ندوی، (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۰۰ء) سفر نامہ ارض القرآن (مرتبہ محمد عاصم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۲۰۰۰ء)، نیز تفسیر تفہیم القرآن (مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی) میں قصص اور واقعات سے متعلق مباحث، اصحاب کہف، ابوالکلام آزاد) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، فروری ۱۹۷۸ء) اور اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں، عبدالماجد دریابادیؒ، صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ، بدون تاریخ) اور قصص و مسائل، عبدالماجد دریابادی، (اسلامک پبلشر، لکھنؤ، ۱۹۹۴ء)۔ اسی طرح اردو زبان میں اس موضوع پر ایک اور عمدہ کتاب ''انوار انبیاء'' کے عنوان سے ہے۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے لاہور اور کراچی سے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے۔

قرآن پاک اور ہمارا تعلیمی نظام

محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

یہ ایک سانحہ ہے کہ دینی مدارس، دینی درس گاہیں، اور بڑے بڑے دار العلوم ،جنہیں دین وملت کا قلعہ کہا جاتا ہے، وہ آج بہت حد تک اپنی افادیت کھو چکے ہیں، ہمارا موجودہ نظام تعلیم، جو آج ہمارے دار العلوموں اور دینی اداروں میں رائج ہے، وہ بری طرح ناکام ہو چکا ہے، یہ نظام تعلیم نہ علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے، نہ طلبہ کو اسلامی کردار کی بلندیوں سے آشنا کرتا ہے، نہ ان کے اندر کچھ بننے اور کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

یہ نظام تعلیم ایسی نسلیں تیار کرتا ہے جن کے سامنے زندگی کا کوئی بلند تصور، اور کوئی اعلی مقصد نہیں ہوتا، جن کا اپنے تابناک ماضی سے کوئی ذہنی اور فکری رشتہ نہیں ہوتا، اللہ تعالی نے ایک بندہ مومن کو خلافت ارضی کا جو زریں تاج پہنایا ہے، اور عام انسانوں کے مقابلے میں اسے جو اونچا منصب عطا کیا ہے، اس کا ان کے اندر کوئی خاص شعور نہیں ہوتا۔

یہ تنہا ہمارا احساس نہیں، کہ اسے قنوطیت یا تاریک بینی کا نام دے کر نظر انداز کر دیا جائے، آج ملت کا باشعور طبقہ عموما یہی احساس رکھتا ہے، اور اس صورت حال سے سخت پریشان ہے۔

غالبا یہی وجہ ہے کہ ان اداروں سے اب لوگوں کو وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے کبھی دیکھی جاتی تھی، آج ان اداروں میں عموما وہی لوگ اپنے بچوں کو بھیجتے ہیں، جن کے وسائل محدود ہوتے ہیں، اور جو سیکولر تعلیمی اداروں کے مصارف اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ صورت حال کتنی افسوس ناک اور کتنی خطرناک ہے !

یہ صورت حال کیونکر پیدا ہوئی؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں ؟

ضرورت ہے کہ ملت کے اکابر، اور دینی اداروں کے ذمہ داران آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں، اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کریں، وہ نہایت باریک بینی اور بے لوثی سے اس

بات کا جائزہ لیں کہ پانی کہاں مر رہا ہے ؟ اور اصل بیماری کی گانٹھ کہاں بن رہی ہے؟ اور جس قدر جلد ممکن ہو اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کریں۔

اس صورت حال کا تجزیہ مختلف انداز سے کیا جا سکتا ہے، اور اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں، اور وہ سب باتیں ایک حد تک صحیح بھی ہو سکتی ہیں، مثال کے طور پر اگر کوئی اس صورت حال کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے، کہ ان دینی اداروں اور دار العلوموں کو وہ تعلیمی وسائل نہیں حاصل ہیں جو آج کے سیکولر اداروں کو حاصل ہیں، یہی وجہ ہے وہ اپنے مطلوبہ معیار سے بہت پیچھے ہیں، اگر کوئی موجودہ صورت حال کا اس طرح تجزیہ کرتا ہے، تو اس کا یہ تجزیہ غلط نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی یہ کہتا ہے، کہ عربی اداروں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں معیاری اور تربیت یافتہ اساتذہ کم یاب ہیں، آج ان اداروں اور دار العلوموں میں ایسے اساتذہ کی بھرمار ہے، جو اپنے طلبہ کو فیض پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، بلکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کلاس میں پڑھنے والے طلبہ اپنے اساتذہ سے زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں، اور وہ اساتذہ ان کلاسوں میں بیٹھ کر صرف ان طلبہ کا وقت ضائع کرتے ہیں۔

اگر کوئی ان اداروں کی ناکامی کی یہ وجہ بتاتا ہے، تو اس کا یہ تجزیہ بھی غلط نہیں ہوگا، بلکہ صورت حال کے عین مطابق ہوگا۔

اصل بیماری کچھ اور ہے:

البتہ ہم یہ کہیں گے کہ موجودہ مدارس اور تعلیمی اداروں کی ناکامی کے یہ اور اس طرح کے اور دوسرے اسباب بھی گنائے جا سکتے ہیں، اور وہ سب کے سب انتہائی اہم ہو سکتے ہیں، مگر یہ سارے اسباب فروعی اور اضافی ہوں گے، اصل سبب، یا اصل مرض کچھ اور ہے جس سے ہم یکسر غافل ہیں، اور جب تک ہم اس مرض کا علاج نہیں کریں گے، ہمارے یہ ادارے کبھی صحت مند نہیں ہو سکتے۔

ہم چاہے کتنے ہی تعلیمی وسائل فراہم کر لیں، اور چاہے کتنے ہی اچھے اور باصلاحیت

اساتذہ حاصل کرلیں، اصل مرض کا علاج کیے بغیر ہم اپنے مدارس اور دارالعلوموں کی خستہ صورت حال میں کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کر سکتے۔

اگر ہماری سمت سفر صحیح نہیں، تو چاہے کتنی ہی آرام دہ اور برق رفتار سواریوں کا ہم انتظام کرلیں، کبھی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تعلیم کا رخ صحیح ہو، اور طبیعت میں روانی اور جولانی موجود ہو، تو وسائل کی قلت، اور معیاری اساتذہ کی نایابی کے باوجود بھی کتنے ہی رازی وغزالی، کتنے ہی فراہی وشبلی، اور کتنے ہی مودودی وحسن البنا پیدا ہو سکتے ہیں، اور اگر رخ غلط ہو، تو ساری سہولتوں اور سارے دسائل کے باوجود بھی کتنی ہی صلاحیتیں برباد ہو جاتی، اور کتنے ہی عبقری خاک میں مل جاتے ہیں!

نہایت ضروری ہے کہ ہم فروعی اور اضافی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اصل مرض کا سراغ لگائیں، کہ اصل مرض سے غفلت کی صورت میں ہماری مثال اس بدنصیب مریض کی سی ہوگی، جس کے اصل مرض کی تشخیص نہ ہوسکی ہو، اور وہ نہایت قیمتی دواؤں اور نہایت اعلی غذاؤں کے بل پر اچھی صحت کا آرزومند ہو۔ ظاہر ہے اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوسکتی، اس کے برعکس وہ (مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!) کی ایک عبرت ناک مثال بن کر رہ جائے گا۔

ناکامی کی جڑ قرآن سے بیگانگی!

ہم اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد مبارک کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے، آپ نے اپنے جاں نثاروں کو آئندہ خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کسی موقع پر فرمایا تھا:

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین. (صحیح مسلم۔باب فضل من یقوم بالقرآن۔رقم الحدیث:۱۹۳۴۔ ط: دارالجیل۔بیروت)

(اللہ تعالی اس قرآن عظیم کے ذریعہ کچھ لوگوں کو سربلندی عطا کرے گا، اور کچھ دوسرے لوگوں کو، جو اس سے اعراض کریں گے پستی کی کھڈ میں ڈھکیل دے گا۔)

اس ارشاد گرامی پر جب ہم غور کرتے ہیں، تو ہمیں ڈر لگتا ہے، اور کلیجہ کانپنے لگتا

ہے، بدقسمتی سے اس آئینہ میں واضح طور سے ہمیں اپنی تصویر نظر آتی ہے، آج ہمارے مدارس اور دارالعلوموں کے اندر جو نظام تعلیم رائج ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ اس نظام تعلیم میں کتاب الٰہی کو سرتاسر نظرانداز کیا گیا ہے، اسے اس نظام تعلیم میں کوئی باعزت مقام نہیں دیا گیا ہے؟

ہماری معلومات کی حد تک آج اس برصغیر تو کیا، اس کرۂ ارضی پر کوئی ایسا ادارہ، اور کوئی ایسا دارالعلوم نہیں ہے، جہاں کے نظام تعلیم میں قرآن پاک کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہو۔

عام طور سے ہمارے دینی اداروں اور دارالعلوموں کا حال یہ ہے کہ وہاں براہ راست قرآن پاک کے بجائے کسی معروف تفسیر کے کچھ اجزاء پڑھائے جاتے ہیں، کہیں جلالین، کہیں بیضاوی، کہیں روح المعانی، کہیں تفسیر ابن کثیر، کہیں بیان القرآن، کہیں تفہیم القرآن، کہیں تدبر قرآن وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے ان تفسیروں کی تدریس کو تدریس قرآن کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ تفسیروں کی خواندگی اور چیز ہے، قرآن پاک کی تعلیم اور چیز ہے۔

پھر تعلیم قرآن کے نام پر جو یہ تفسیریں پڑھائی جاتی ہیں، ان کی حیثیت بھی تحلۂ للقسم سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ ورنہ پورے نظام تعلیم میں اصل زور حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم الکلام، علم العقیدہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ پر ہوتا ہے، اور یہ زور بھی متعلقہ کتابوں کی خالص خواندگی پر ہوتا ہے، بحث و تحقیق سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

یہ تو بڑے بڑے دارالعلوموں اور دینی اداروں کا حال ہے، جہاں تک چھوٹے چھوٹے مدارس، مکاتب، اور قرآنی مراکز کا معاملہ ہے، تو وہاں بس ناظرہ، اور حفظ و تجوید کا اہتمام ہوتا ہے، جس کا ظاہر ہے علم قرآن اور فہم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ ہمارے تمام دینی ادارے تعلیم قرآن سے یکسر غافل ہیں، آج کوئی ایک ادارہ بھی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس نے اپنے نظام تعلیم میں قرآن پاک کو اس کا واقعی مقام دیا ہے۔

ایسی صورت میں اگر ہمارے ادارے اپنے مقصد میں ناکام ہیں، اگر وہ اچھی صلاحیتیں اور بلند کردار پیدا کرنے سے عاجز ہیں، اگر وہ علماء کی ایسی ٹیمیں تیار کرنے سے

قاصر ہیں، جو اس دور میں اسلام کی صحیح نمایندگی کر سکیں، اور امت کا کھویا ہوا وقار اسے واپس دلا سکیں، تو اس پر کچھ بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

تمام علوم کا محور قرآن پاک:

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم کیسا ہونا چاہیے؟ وہ کون سا نظام تعلیم ہوگا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے گا کہ اس میں قرآن پاک کو اس کا واقعی مقام دیا گیا ہے؟

یہ سوال جتنا اہم ہے، اتنا ہی واضح ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں قرآن پاک کا واقعی مقام یہ ہے، کہ پورے نظام تعلیم پر قرآن پاک کی ہی چھاپ، اور قرآن پاک کی ہی بالا دستی ہو، ہمارے ہاں جو علوم بھی پڑھائے جائیں، چاہے وہ شرعی علوم ہوں، یا غیر شرعی علوم، ان سب علوم کا محور قرآن پاک ہو، وہ سارے علوم قرآن پاک کی ہی روشنی میں پڑھائے جائیں۔

تفاسیر یا علوم قرآن کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
کتب حدیث پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
فقہ یا قانون کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
علم المیراث یا فرائض کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
عقیدے کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
سیرت کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
تاریخ اسلام یا تاریخ عالم پڑھائی جائے تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
سیاسیات کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
علم الاخلاق پڑھایا جائے، تو قرآن پاک کی روشنی میں۔
علم الاجتماع یا علم الاقتصاد پڑھایا جائے تو قرآن پاک کی روشنی میں۔

مختصر یہ کہ ہمارا نظام تعلیم ہر طرف سے قرآن پاک سے جڑا ہوا ہو، اس نظام تعلیم

میں قرآن پاک کی حیثیت ایک ایسے آفتاب عالم تاب کی ہو جس کے گرد تمام علوم کے سیارے گردش کررہے ہوں، اور اسی سے روشنی حاصل کررہے ہوں۔

ہماری یہ باتیں عام قارئین یا سامعین کے لیے شاید کچھ اجنبی ہوں، اس لیے کہ قرآن پاک اک عرصہ دراز سے ہمارے درمیان اجنبی بنا ہوا ہے، ہم نے اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اس کی ایک ایک سورہ میں رب کریم نے علوم کے جو خزانے رکھ دیے ہیں، ان خزانوں کو دریافت کرنے کی جدوجہد نہیں کی۔

قرآن پاک جو اک کتاب زندگی، یا اک صحیفۂ حیات بن کر آیا تھا، جو اس لیے آیا تھا کہ کارزار زندگی میں ہماری مکمل رہ نمائی کرے، اور علمی وفکری لحاظ سے ہمیں ہمدوش ثریّا کردے، تاکہ ہمارے رب نے خلافت ارضی کا جو زرّیں تاج ہمارے سروں پر رکھا ہے، اس کی ذمہ داریوں کو باحسن طریق ادا کرسکیں، اور زندگی کے ہر میدان میں امم عالم کی قیادت کرسکیں، اس کتاب عظیم کو ہم نے مصاف زندگی سے الگ کر کے محض تبرک کی ایک کتاب بنا کر رکھ دیا ہے۔

ایسی صورت میں عام لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا آسان نہ ہوگا کہ قرآن پاک کو علوم کی شاہ کلید، اور بزم علم ودانش کا صدرُ الصدور سمجھا جانا چاہیے، لہٰذا ان باتوں کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

احادیث رسول کی اصل:

جہاں تک احادیث کا مسئلہ ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے بارے میں محققین کا یہ کہنا ہے کہ یہ سب قرآن پاک کی روشنی میں نبی ﷺ کے اجتہادات واستنباطات ہیں، یعنی کوئی بھی حدیث صحیح ہوگی تو اس کی اصل کسی نہ کسی صورت میں قرآن پاک میں موجود ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں:

اذا حدثتکم بحدیث انبأتکم بتصدیقه من کتاب الله.

(جب بھی میں تم سے کوئی حدیث بیان کروں گا، کتاب الٰہی سے اس کی دلیل تمہیں بتادوں گا۔)

حضرت سعیدؒ بن جبیر فرماتے ہیں:

ما بلغني حديث على وجهه الا وجدت مصداقه في كتاب الله تعالى.

(جب بھی کوئی صحیح حدیث مجھ تک پہنچی اس کی تایید یا اس کی اصل مجھے کتاب اللہ میں مل گئی)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

جميع ما تقوله الأئمةشرح للسنة، وجميع السنة شرح للقرآن.

(ائمہ کرام جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب سنت کی تشریح ہے، اور پوری سنت قرآن پاک کی تشریح ہے۔)

وہ مزید فرماتے ہیں:

كل ما حكم به رسول الله ﷺ فهو مما فهمه من القرآن لقوله ﷺ: اني لا احل الا ما احل الله في كتابه، ولا احرم الا ما حرم الله في كتابه۔

(رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا، وہ آپ نے قرآن پاک سے سمجھا تھا، خود آپ کا ارشاد ہے: میں بس وہی چیزیں حلال کرتا ہوں جنہیں اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا ہے، اور وہی چیزیں حرام کرتا ہوں جنہیں اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں حرام فرمایا ہے۔)

(ان ساری تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

۱- مقدمہ البرہان فی علوم القرآن۔ امام زرکشی۔ جلد اول۔ ص:۶، دار المعرفۃ، بیروت

۲- الاتقان فی علوم القرآن۔ امام سیوطی۔ باب فی العلوم المستنبطۃ من القرآن: جلد۴۔ ص:۳۰، دار الفکر۔ لبنان،

۳- قواعد التحدیث۔ شیخ محمد جمال الدین القاسمی: ص:۵۹، دار احیاء الکتب العربیۃ۔ طبع دوم)

حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں:

ما تساء ل اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شيء الا وعلمه في القرآن، ولكن قصر علمنا عنه.

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جس چیز کے بارے میں بھی پوچھتے تھے، اس کا علم قرآن پاک میں موجود ہے، مگر، ہمارے علم کی رسائی وہاں تک نہ ہوسکی۔)

(خطیب بغدادی۔الفقیہ والمتفقہ۔القول فی الاصل الاول۔رقم:۱۹۴۔دار ابن الجوزی۔السعودیہ)

سعیدؒ بن جبیر حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لايسمع بي احد من هذه الامةيهودي ولا نصراني لايؤمن بي الا كان من اصحاب النار. فقلت ما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا وهو في كتاب الله عزوجل، فقرأت فوجدته:ومن يكفر به من الاحزاب فالنار موعده۔

(یہودی قوم، یا عیسائی قوم کا کوئی بھی فرد اگر میرے نبی ہونے کی اطلاع پاتا ہے، اور مجھ پر ایمان نہیں لاتا، تو وہ اہل جہنم میں سے ہوگا۔)

ابوموسی اشعریؓ فرماتے ہیں: یہ ارشاد مبارک سن کر میں نے دل میں سوچا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے، تو یقیناً وہ اللہ کی کتاب میں ہوگی، میں نے قرآن پاک میں تلاش کیا، تو وہ بات مل گئی: (**ومن يكفر به من الاحزاب فالنار موعده.** سورۃ ہود:۱۷) (سنن سعید بن منصور:۵۔۳۴۱۔دار العصیمی۔الریاض۔طبعہ اولی۔۱۴۱۴ھ)

یہاں بہت زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، ورنہ علماء راسخین کی ایک بڑی تعداد ہے جو یہی رائے رکھتی ہے، اور یہی بات قرین عقل بھی معلوم ہوتی ہے۔

احادیث کی تحقیق و تعلیم:

ایسی صورت میں کیا یہ ضروری نہیں ہو جاتا، کہ احادیث کو قرآن پاک کی روشنی میں پرکھا جائے، اور ان کی اصل قرآن پاک میں تلاش کی جائے، جو حدیثیں قرآن پاک کے موافق ہوں، وہ صحیح قرار دی جائیں، اور اگر کوئی روایت قرآن پاک کے خلاف ہے، تو اسے رد کر دیا جائے، چاہے وہ کتنی ہی اونچی سند سے آئی ہو ؟

اگر تاویل کرنی ہو تو روایت کی تاویل کی جائے، نہ کہ آیت کی، کسی بھی صورت میں آیت پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دی جائے، ہمیشہ احادیث کو قرآن پاک کے تابع رکھا جائے، کبھی قرآن پاک کو احادیث کے تابع نہ کیا جائے۔

اب تک روایات کو عموماً راویوں کی بنیاد پر پرکھا جاتا رہا، اگر راوی قابل قبول ہیں، تو روایت صحیح مان لی گئی، اور اگر راوی کم زور ہیں، تو روایت رد کر دی گئی، یہ بات کہیں پر تو صحیح ہو سکتی ہے، ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

کتنا ہی ایسا ہوتا ہے کہ سند صحیح ہوتی ہے، اور متن قابل غور ہوتا ہے، اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سند کم زور ہوتی ہے، اور متن سورج کی طرح روشن ہوتا ہے، لہذا کسی حدیث کو قبول کرنے یا رد کرنے کے لیے محض تحقیق سند پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، متن حدیث کی صحت کی طرف سے اطمینان ضروری ہے، اور متن حدیث کو پرکھنے کے لیے قرآن پاک سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں ہو سکتی۔

ضروری ہے کہ تحقیق سند، یا راویان حدیث کے احوال کی چھان بین کے ساتھ ساتھ روایت کو قرآن پاک کی کسوٹی پر پرکھا جائے، اگر ایسا کیا گیا، تو بارہا ایسا ہوگا کہ سند کے لحاظ سے کوئی روایت کمزور ہوگی، مگر متن کے لحاظ سے وہ قوی اور نا قابل رد ہوگی، اور کبھی صورت حال اس کے برعکس ہوگی، یعنی کوئی روایت سند کے لحاظ سے مضبوط ہوگی، مگر خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہوگی۔

آج ہمارے کرنے کا کام صحاح ستہ کا دورہ، اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا ختم و

افتتاح نہیں، آج کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ قرآن پاک کی روشنی میں تمام احادیث کا مطالعہ کیا جائے، اور ان کی وہی تشریح کی جائے جو قرآنی نصوص یا قرآنی روح سے ہم آہنگ ہو۔

اسی طرح قرآن پاک کی کسوٹی پر حدیثوں کو پرکھا جائے، جو حدیثیں اس کسوٹی پر صحیح اتریں، وہ صحیح قرار دی جائیں، اور جو قرآن پاک کے مطابق یا اس سے ہم آہنگ نہ ہوں، انہیں الگ کر دیا جائے۔

فقہ وقانون کی تعلیم:

اسی طرح فقہ وقانون کی کتابیں پڑھائی جائیں تو قرآن پاک کی روشنی میں پڑھائی جائیں، کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہوئے محض اتنی بات پر اکتفا نہ کیا جائے کہ اس مسئلے میں فلاں امام کی یہ رائے ہے، اور فلاں امام کی یہ رائے ہے۔

رایوں کے ساتھ دلیلیں بھی سامنے آنی چاہییں۔ اور رایوں پر اس حیثیت سے گفتگو ہونی چاہیے کہ ان میں سے کون سی رائے قرآن پاک سے مستنبط، اور قرآنی اصولوں یا عام قرآنی تعلیمات سے قریب تر ہے۔

خاطر خواہ بحث وتحقیق کے نتیجے میں اگر کسی رائے کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے، کہ وہ قرآنی آیات، یا آیات کے سیاق وسباق، یا آیات کے انداز واسلوب، یا آیت کے کسی لفظ سے مستنبط ہے، تو اس رائے کو قبول کرنے میں کوئی تأمل نہیں ہونا چاہیے، پوری خوش دلی سے اسے قبول کر لینا چاہیے، چاہے وہ اپنے امام مذہب، یا ائمہ مذہب کی رائے سے مختلف ہو۔

ہماری اصل غرض کتاب الٰہی کی پیروی ہے، نہ کہ کسی امام یا ائمہ کی۔ کسی امام یا ائمہ کی پیروی ہم صرف اس اعتماد پر کرتے ہیں، کہ ان کی پیروی ہمیں کتاب الٰہی سے وابستہ رکھے گی، اس سے ہمیں دور نہیں ہونے دے گی۔

ہماری ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی سے جوڑے

رکھیں، مسلکی تعصب سے پرہیز کریں، کسی فقہی مسلک سے ہماری وابستگی اتنی نہ بڑھ جائے، کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے یا سننے کے روادار نہ ہوں، یا اس کی کسی غلطی کو غلطی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ یہود و نصاریٰ کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله ۔ (سورہ توبہ:۳۱)

(انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے یہودی عالموں اور عیسائی پادریوں کو رب بنالیا)

یہود و نصاریٰ کی یہ مذمت ہمارے لیے ایک تنبیہ ہے، کہ ہم اپنے علماء اور ائمہ کے ساتھ ایسا نہ کریں۔

شخصیت پرستی، پیر پرستی، امام پرستی، یہ بیماریاں اس طرح دبے پاؤں آتی ہیں کہ آدمی ان کا شکار ہو جاتا ہے، اور اسے محسوس بھی نہیں ہوتا، حد یہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ بھی ان بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو دوسروں کو ان بیماریوں پر سختی سے ملامت کیا کرتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے، کہ وہ بری طرح ان بیماریوں کے شکنجوں میں کسے ہوئے ہوتے ہیں، اور آخر تک اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ وہ ان بیماریوں سے پاک ہیں!

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

یہ حقیقت ہے کہ آج کتاب الٰہی کی روشنی میں پوری فقہ اسلامی کو کھنگالنے کی ضرورت ہے، ہماری فقہ میں کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جن کی بنیاد انتہائی کمزور روایات پر رکھی گئی ہے، جب کہ ان کے سلسلے میں کتاب الٰہی کی رہنمائی کچھ اور ہے۔

ہماری فقہ سے مراد یہاں کوئی مخصوص فقہ نہیں، مسلم امت میں جتنے فقہی مذاہب رائج ہیں، وہ سب ہماری فقہ ہیں، یہ پورا فقہی سرمایہ اس لیے نہیں ہے کہ اس پر ہمیشہ کے لیے جمود اختیار کر لیا جائے، علماء اور ائمہ کے اجتہادات کی کبھی یہ حیثیت نہیں ہوا کرتی، کہ انہیں حرف آخر سمجھ لیا جائے۔

غور و فکر اور اصلاح و ترمیم کا عمل برابر جاری رہنا چاہیے۔ اور آخری حد تک یہ کوشش

ہونی چاہیے کہ ہماری فقہ اور ہمارا قانون مکمل طور سے کتاب الٰہی سے ہم آہنگ رہے۔

اجماع کا مسئلہ:

ہوسکتا ہے اس موقع پر کوئی اجماع اُمت کا حوالہ دے، مگر یہاں اجماع امت کا حوالہ دینا صحیح نہیں ہوگا، اس لیے کہ اس طرح کے مسائل میں اجماع ثابت کرنا آسان نہیں ہے، چار، چھے آدمیوں کے کہد ینے یا لکھ دینے سے کوئی اجماع ثابت نہیں ہوتا، عام طور سے ہماری فقہ وقانون کی کتابوں میں جو اجماع کے حوالے ہوتے ہیں، وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں، کسی مسئلے میں دو چار علماء نے لکھ دیا، یا کہہ دیا کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے، بس اتنی بات کافی ہوگئی اس مسئلے میں اجماع کا دعوی کرنے کے لیے!

ثبوت اجماع کے لیے ضروری ہے کہ اتنے علماء اور ائمہ کا مستند رکارڈ پیش کیا جائے، جن سے اجماع ثابت ہو سکے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن پاک کے کسی حکم کے خلاف اجماع ناممکن ہے، اور اگر بالفرض اس طرح کا کوئی اجماع کہیں سے کوئی ڈھونڈ نکالے، تو اس طرح کا اجماع خود اپنے خلاف حجت ہوگا!

ایسے اجماع کی بھلا کیا حیثیت ہوگی جو قرآن پاک سے ہم آہنگ نہ ہو؟

فقہی ابواب تحقیق طلب:

اسلامی حدود و تعزیرات جو عام طور سے ہماری فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، وہ قرآنی نصوص سے ہم آہنگ نہیں ہیں، ضرورت ہے قرآنی نصوص کی روشنی میں پھر سے ان پر غور کیا جائے، ہر مرتد کی سزا قتل، ہر شادی شدہ زانی کی سزا رجم، تین درہم، یا دس درہم کی چوری پر ہاتھ کاٹنا، یہ موضوعات ایسے ہیں، جن پر متعلقہ آیات کی روشنی میں غور کرنا ضروری ہے۔

طلاق ونکاح اور عدت کے بہت سے مسائل ہیں، جن پر قرآن پاک کی روشنی میں پھر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حامل بیوۂ وفات کی عدت وضع حمل قرار دینا

، یہودی یا عیسائی عورت سے ایک مسلم کا نکاح جائز قرار دینا، ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بعد شوہر اور بیوی کی علحدگی کو حتمی قرار دینا، چھوٹی بچی اور چھوٹے بچے کے نکاح کو جائز قرار دینا، یہ اور اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں، جو سنجیدہ غور وفکر کے طالب ہیں۔ان تمام مسائل میں ان روایات پر اعتماد کیا گیا ہے، جو اگرچہ سند کے لحاظ سے قابل قبول ہیں، لیکن قرآنی نصوص سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہیں۔

مروّجہ علم میراث قابل غور!

اسی طرح آج جو علم الفرائض ہماری درس گاہوں اور دارالعلوموں میں پڑھایا جاتا ہے، اور اسی کے مطابق مسلم خاندانوں میں وراثت کے حصے تقسیم کیے جاتے ہیں، اس کو قرآن پاک سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے، یہ علم الفرائض جگہ جگہ قرآنی قانون میراث سے ٹکراتا، اور حصوں کی صحیح تقسیم میں لڑکھڑاتا ہے!

ہمارے نظام میراث میں دادا، دادی، یا نانا، نانی کی وراثت سے پوتوں، پوتیوں، یا نواسوں، نواسیوں کی محرومی، یہ ایک ایسا ظلم ہے، جو قرآنی نصوص اور قرآنی روح کے یکسر خلاف ہے، ہمارے رب نے قرآن پاک میں وراثت کا جو قانون نازل فرمایا ہے، وہ یتیم بچوں کے ہی سیاق میں نازل فرمایا ہے، چنانچہ قانون وراثت سے بالکل متصل جو آیت آئی ہے، وہ اس طرح ہے:

ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا. (سورۃ النساء: ۱۰)

(بے شک جو لوگ یتیموں پر ظلم کرتے، اور ان کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں، اور وہ دن دور نہیں، جب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔)

اس آیت کے معاً بعد پورا قانون وراثت بیان ہوا ہے، اس سیاق وسباق کا واضح اشارہ یہ ہے کہ یہاں اس قانون سے اصلاً یتیموں کے حقوق وراثت کا تحفظ مقصود

ہے۔اب اگر ہمارا نظام میراث انہی یتیموں کو حق وراثت سے محروم کر دیتا ہے،تو یہ کتنی عجیب اور کتنی خطرناک بات ہے!

ہمارے نظام وراثت میں قرآن پاک کے مزاج ،اوراس کے واضح بیانات و اشارات سے ہٹی ہوئی صرف یہی ایک بات نہیں ہے،اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں،جن کی تفصیل اس مختصر سے مقالے میں ممکن نہیں۔

پورے نظام میراث کا بار بار جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں،کہ ہمارا پورا نظام میراث قابل غور ہے،وہ اس قابل ہے کہ قرآن پاک کی روشنی میں اس پر نظر ثانی کی جائے ،اوراسے مکمل طور سے قرآن پاک سے ہم آہنگ کیا جائے۔

کتب سیرت کی زبوں حالی!

سیرت رسول اور سیر صحابہ وصحابیات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں،انہیں بھی قرآن پاک کی کسوٹی پر پرکھنا،اورقرآن پاک کی ہی روشنی میں پڑھانا ضروری ہے،ان میں کتنی ہی چیزیں ایسی آگئی ہیں،جوقرآن پاک کی روح اوراس کے نصوص سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔

سیرت رسول سے متعلق تمام کتابیں اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا،تواس وقت وہ بہت کم سن تھیں،بس چھے سال کی ،اور رخصتی ہوئی تو اس وقت بھی کم سن ہی تھیں،بس نو سال کی!

یہ بات جہاں درجنوں تاریخی قرائن کے خلاف ہے،وہیں قرآنی نصوص کے بھی خلاف ہے،قرآن پاک نے نکاح (نساء) یعنی بالغ عورتوں سے جائز کیا ہے،کم سن بچیوں سے نہیں،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء . (سورۃ النساء: ۳)

(اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم عورتوں کو سنبھال نہیں پاؤ گے،یا صحیح طور سے ان کے حقوق نہیں ادا کر پاؤ گے،تو جو تمہارے لیے حلال اور تمہارے مناسب حال ہوں ان

سے نکاح کرلو۔)

سیرت کی کتابوں میں ہے کہ آپ نے ام المومنین حضرت سودہ کو بغیر کسی معقول سبب کے طلاق دیدی تھی، یا طلاق دینے کا ارادہ کرلیا تھا، پھر آپ نے طلاق سے رجوع کرلیا، یا طلاق دینے کا ارادہ ترک کردیا، جب حضرت سودہؓ اس بات کے لیے راضی ہوگئیں، کہ وہ اپنی باری سے حضرت عائشہؓ کے حق میں دست بردار ہوجائیں گی۔

قرآن پاک اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک تھے، کیا یہ واقعہ آپ کے خلق عظیم سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟

قرآن پاک بار بار عدل اور قیام بالقسط کی تاکید کرتا ہے، کیا اس واقعہ میں عدل اور قیام بالقسط کی کوئی جھلک نظر آتی ہے ؟

کہا جاتا ہے، حضرت سودہؓ نے خوشی خوشی اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دیدی تھی، لہذا اس میں کوئی دقت، یا کوئی اشکال نہیں ہے!

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت سودہؓ نے خوشی خوشی اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دی تھی؟ روایت تو یہ بتاتی ہے کہ انہوں نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا کہ آپ انہیں اپنی زوجیت میں باقی رکھیں، طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے سے الگ نہ کردیں!

یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، ورنہ نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جو سیرت کے لٹریچر میں در آئی ہیں، اور وہ آپ کی سیرت کو واضح طور سے داغ دار کرتی ہیں، ضروری ہے کہ سیرت کے لٹریچر کو ان غلط اور بے بنیاد باتوں سے پاک کیا جائے۔

تطہیر کا یہ عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن پاک کی روشنی میں اس پورے لٹریچر کو کھنگالا نہ جائے۔ اور جب طلبہ کو سیرت کے مباحث پڑھائے جائیں تو قرآن پاک کی ہی روشنی میں پڑھائے جائیں۔

آپ کی سیرت قرآن پاک کا عکس تھی، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بیان ہے۔ کسی نے ان سے آپ کی سیرت کے بارے میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا: کان خلقه القرآن۔ قرآن پاک ہی آپ کی سیرت، اور قرآن پاک ہی آپ کا اخلاق

تھا۔لہذا آپ کی مستنداور صحیح ترین سیرت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو قرآن پاک میں تلاش کیا جائے۔

کتب تاریخ میں رطب ویابس!

تاریخ اسلام پر مشتمل جولٹریچر ہم تک پہنچا ہے، وہ بھی رطب ویابس کا مجموعہ ہے،ضروری ہے کہ اسے بھی قرآن پاک کی کسوٹی پر پرکھا جائے،اور قرآن پاک کی ہی روشنی میں پڑھایا جائے۔

تاریخ ہمارے سامنے ہجرت اسلام کا غلط تصور پیش کرتی ہے،مسلمانوں نے عہد رسالت میں جو بھی ہجرت کی ،دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لیے نہیں کی ، بلکہ اشاعت اسلام کے لیے نئی جگہیں اور نئے امکانات تلاش کرنے کے لیے کی ،یہی وجہ ہے حبشہ کی طرف ہجرت ہوئی،تو مکے کے با اثر اور صاحب حیثیت لوگوں نے ہجرت کی ،کمزور اور ستائے ہوئے لوگوں نے نہیں کی۔

جن لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی ،ان میں سے چند کے نام یہ ہیں ،جن پرغور کرنے سے ہجرت حبشہ کی روح بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے :

۱-حضرت عثمانؓ بن عفان ،۲- حضرت جعفرؓ بن ابی طالب ،۳-حضرت عبد الرحمانؓ بن عوف ،۴-حضرت زبیرؓ بن عوام ،۵-حضرت مصعبؓ بن عمیر ، ۶- حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ ،۷-حضرت عثمانؓ بن مظعون ،۸- حضرت عمروؓ بن سعید بن العاص ،۹-حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ،۱۰-حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان ۔(ابن کثیر۔البدایہ والنہایہ : جلد۳۔ ص:۸۵۔۸۶۔داراحیاء التراث العربی)

یہ سب مکے کے با اثر اور صاحب حیثیت لوگ تھے،جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت اپنی جان بچانے کے لیے نہیں کی تھی ، بلکہ دین اسلام کی دعوت واشاعت کے لیے نئے میدان تلاش کرنے کے لیے کی تھی۔

یہی وجہ ہے جب رسالت مآب ﷺ نے مدینے ہجرت کی ،تو مہاجرین حبشہ

میں سے کچھ لوگ تو مدینے آپ کے پاس آ گئے، مگر صحابہ کی اچھی خاصی تعداد حبشہ میں ہی مقیم رہی، اور وہ سارے لوگ سنہ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد مدینے واپس آئے۔

ظاہر ہے وہ حبشہ میں اتنی مدت تک پناہ گزیں کی حیثیت سے نہیں رہے، بلکہ وہاں اسلام کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہے، اور جب تک انہوں نے حبشہ کو دعوت اسلامی کا ایک مضبوط مرکز نہیں بنا دیا، اور افریقہ کے صحراؤں کو اسلام کی کرنوں سے منور کرنے کا قابل اطمینان انتظام نہیں کر دیا، وہاں سے واپس آنا پسند نہیں کیا۔

اور یہ جو کچھ ہوا، ظاہر ہے حضور ﷺ کی اجازت یا آپ کے حکم سے ہوا۔

اسی طرح مکے سے مدینے ہجرت اس لیے نہیں ہوئی، کہ قریش نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا تھا، اور آپ کو کسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی، بلکہ اس ہجرت کا پروگرام بہت پہلے سے بن چکا تھا، اور صحابہ کرام نے وقفہ وقفہ سے ہجرت کرنی شروع بھی کر دی تھی، اور جس وقت رسالت مآب ﷺ نے ہجرت فرمائی ہے، اس وقت تک صحابہ کی اکثریت مدینے ہجرت کر چکی تھی۔

اصل یہ ہے کہ نبی کسی قوم میں اسی وقت تک رہتا ہے، جب تک وہاں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور جب اس قوم پر حجت تمام ہو جاتی ہے، تو نبی وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے، اور یہ سب اللہ تعالی کے اذن سے ہوتا ہے۔

رسالت مآب ﷺ نے مدینہ ہجرت اس لیے فرمائی تھی، کہ وہاں سے اک نئے انداز سے کام کو آگے بڑھایا جائے، چنانچہ وہاں سے کام بہت تیزی سے آگے بڑھا، اور بڑھتے بڑھتے سارے عالم میں پھیل گیا۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ!

اسی طرح بدر میں پیارے نبی ﷺ اور صحابۂ کرام ابوسفیان کا تجارتی قافلہ لوٹنے نہیں نکلے تھے، جیسا کہ تاریخ کا الزام ہے، اس کے برعکس وہ اپنے گھروں سے لشکر قریش کا مقابلہ کرنے، اور اپنے دین کا بول بالا کرنے کے لیے نکلے تھے، جیسا کہ قرآن

پاک کا بیان ہے۔

بدر کے مال غنیمت کے سلسلے میں مہاجرین وانصار میں کوئی اختلاف یا جدال نہیں ہوا تھا، جیسا کہ تاریخ کا الزام ہے، اس موقع پر جو کچھ جدل وجدال ہوا تھا، وہ ان منافقین کی طرف سے ہوا تھا، جو آپ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنے کے بجائے نہایت بزدلی کے ساتھ مدینے میں بیٹھ رہے تھے، اور بلا جہاد کے مال غنیمت میں حصہ لگانا چاہتے تھے۔

اس موقع کی آیات پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

اسی طرح میدان احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ تاریخ کا اصرار ہے، اس کے برعکس انہیں فتح عظیم حاصل ہوئی تھی، جس نے قریش کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

یہی وجہ ہے قریش کے اندر دوبارہ مسلمانوں سے پنجہ آزمائی کی ہمت نہیں رہی، انہوں نے یقیناً میدان احد سے چلتے وقت ڈینگتے ہوئے کہا تھا، کہ آئندہ سال پھر ہمارا مقابلہ ہوگا، اور میدان بدر میں ہوگا، مگر یہ صرف اپنی کھسیاہٹ مٹانے کی بات تھی، اس لیے کہ وقت مقررہ پر نبی ﷺ اپنے سپاہیوں کے ساتھ میدان بدر پہنچ گئے، مگر قریش کا کہیں دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ غزوۂ احد میں ان کی کمر بالکل ٹوٹ چکی تھی، اور انہوں نے اپنے طور سے یہ طے کر لیا تھا، کہ اب کبھی انہیں شیر کے منہ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا ہے!

بلا شبہ غزوۂ احد کے دو سال بعد غزوۂ خندق ہوئی، مگر وہ قریش کی جنگ نہ تھی، وہ حقیقت میں یہود کی جنگ تھی، انہوں نے قریش کو ایک بار اور مسلمانوں سے ٹکر لینے پر اکسایا، مگر قریش کسی صورت سے تیار نہ ہوئے، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

جب یہود نے دیکھا کہ سارا کھیل بگڑ رہا ہے، تو انہوں نے تمام قبائل عرب میں گھوم گھوم کر سب کو قریش کا ساتھ دینے، اور مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اکسایا، اور جب بہت سے قبائل یہ جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے، تو انہوں نے دوبارہ قریش سے جنگ کے لیے اصرار کیا، اور انہیں سمجھایا، کہ اس بار تمہاری فتح یقینی ہے، اس بار تم تنہا نہیں ہو، تمہاری پشت پناہی کے لیے اتنے ہزار جنگ جو سپاہی ہر طرح سے تیار ہیں!

مگر قریش کو خواب میں بھی مسلم مجاہدین کی تلواریں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں، انہوں نے اب بھی انکار کیا،اس پر یہود نے انہیں بزدلی کا طعنہ دیا،اور بالآخر کسی نہ کسی طرح انہیں پھر یہ خطرہ مول لینے پر آمادہ کرلیا۔

(ملاحظہ ہو: امام طبری۔تاریخ الأمم والملوک۔ذکر الخبر عن غزوۃ الخندق۔ج:۲ص:۹۰۔دارالکتب العلمیۃ۔بیروت۔والبدایۃ والنہایۃ لابن کثیر۔غزوۃ الخندق: جلد۴۔ص ۱۰۸۔داراحیاء التراث العربی۔وتاریخ ابن خلدون۔ج:۲،ص:۲۹)

اس سے صاف واضح ہے، کہ غزوۂ احد میں قریش کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی،اور مسلم فوج کو زبردست فتح حاصل ہوئی تھی،مگر تاریخ کی غلط بیانی سے فاتح مفتوح،اور مفتوح فاتح بن گیا!

ہمیں اس سے انکار نہیں، کہ کچھ دیر کے لیے مسلمانوں کی صفوں میں کچھ افراتفری پیدا ہوگئی تھی ،جس کے نتیجے میں ان کے کچھ قیمتی افراد شہید ہوگئے، بہت سے لوگ زخمی ہوگئے،خود نبی ﷺ کے سر مبارک میں زخم آئے،او ردندان مبارک شہید ہوگئے،مگر وہ افراتفری بھی محض منافقین کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں ہوئی تھی، ورنہ جاں نثاروں نے آپ ﷺ پر اپنی جانیں چھڑکنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

پھر اگر کچھ شہسوار میدان میں گر گئے، یا زخمی ہوگئے،تو یہ ان کی جاں بازی وسرفروشی تھی ،یہ ان کی شکست نہیں،فتح تھی۔

یہ تمام باتیں قرآن پاک کے بیانات پر غور کرنے سے بالکل واضح ہوجاتی ہیں۔

اسی طرح قرآن پاک کی ترتیب وتدوین رسول اللہ کی وفات کے بعد نہیں ہوئی، جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے،قرآن پاک آپؐ کی زندگی میں بالکل اسی طرح مرتب اور مدون تھا،جس طرح آج ہمارے ہاتھوں میں ہے،جیسا کہ قرآن پاک کے بیان سے صاف واضح ہے۔

قرآن پاک پر نقطے اوراعراب اموی حکمراں عبدالملک بن مروان کے دور میں نہیں لگے،جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے،آیات پر نقطے اوراعراب کا اہتمام اسی روز سے شروع

ہو گیا تھا جس روز سے وحی کا آغاز ہوا، اور عہد رسالت اور عہد خلافت میں قراءت قرآن کے معاملے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، سب کا قرآن ایک تھا، سب کی قراءت ایک تھی، اس سلسلے میں قرآنی تصریحات بالکل واضح ہیں۔ اب اگر تاریخ کچھ ایسی باتوں کا انکشاف کرتی ہے جو اس سے مختلف ہیں، تو ان کی تحقیق ہونی چاہیے۔

ایک اور بھیانک غلطی!

اسی طرح تاریخ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نعوذ باللہ اَن پڑھ تھے، اور آپ کی پوری قوم اَن پڑھ تھی، یہ بات بالکل اسی طرح جھوٹ ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ چاندی کالی ہوتی ہے، اور انگبیں کڑوا ہوتا ہے!

عرب قوم اپنے زمانے کی سب سے اونچی اور پڑھی لکھی قوم تھی، اور نبی ﷺ اس اعلیٰ ترین قوم کے چشم و چراغ تھے۔ قرآن پاک نے نبی ﷺ کو اُمی، اور آپ کی قوم کو امیین اس لحاظ سے کہا ہے، کہ وہ امّ القریٰ، یعنی مکۂ مکرمہ سے تعلق رکھتے تھے اور جو بھی اُمّ القریٰ میں پیدا ہوا اور وہیں پلے بڑھے، اسے عربی گرامر کی رو سے اُمّی ہی کہا جائے گا۔

یہ بات ہرگز نہ تھی کہ آپ کی قوم علم و تمدن سے نا آشنا تھی، اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی، جو شخص بھی صاف ذہن سے قدیم عربی لٹریچر کا مطالعہ کرے گا، اور اس وقت کی دوسری قوموں کے لٹریچر سے اس لٹریچر کا موازنہ کرے گا، وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا، کہ عرب قوم اپنے زمانے کی سب سے ذہین اور سب سے متمدن قوم تھی۔

بنی اسماعیل کے خلاف یہ محض یہودیوں کا جھوٹا پروپیگنڈا تھا، جس کے پیچھے جذبۂ حسد کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہ اس طرح نبی ﷺ اور آپ کی قوم کی تحقیر و تذلیل کرنا چاہتے تھے، مگر برا ہو روایت پرستی کا، کہ ہم نے معاملے کی حقیقت پر کچھ بھی غور نہ کیا، اور بے سوچے سمجھے اسے تاج رسالت کا سب سے قیمتی ہیرا سمجھ کر سینے سے لگا لیا، اور اپنے دل و دماغ میں بسا لیا!

ہم نے کہا، یہی نبی آخر الزماں کی نبوت کی دلیل ہے، کہ اُمّی بمعنی اَن پڑھ

ہوتے ہوئے بھی دنیا کو آپ نے ایک ایسی عظیم کتاب لا کر دی، جو تمام علوم کا خزانہ ہے! جس کے علوم کی کوئی حد نہیں !

ہم نے یہ نہیں سوچا کہ یہ کتاب عظیم رسول ﷺ کے اَن پڑھ ہونے کا کرشمہ نہیں، رب کریم کا عطیہ ہے !

اس عطیۂ الٰہی کی عظمت ثابت کرنے کے لیے اس کی قطعاً ضرورت نہیں، کہ ہم آپ کو اَن پڑھ ثابت کریں، جس کتاب کی عظمت کا یہ عالم ہے، کہ سارے جن وانس مل کر بھی اس کتاب کی کسی سورہ جیسی کوئی ایک سورہ نہیں لا سکتے، اس کتاب کی عظمت میں بھلا اس سے کیا کمی آ سکتی ہے، کہ ہم رسول امّی ﷺ کو پڑھا لکھا انسان مان لیں؟

اگر اُمّی کے معنی اَن پڑھ ہوتے، اور اَن پڑھ ہونا کسی بھی درجے میں نبوت ورسالت کی دلیل بن سکتا، تو شروع سے جتنے بھی انبیاء ورسل آئے، سب کے سب اُمّی ہوتے، اس لیے کہ سب کو اپنی نبوت ورسالت کی دلیل درکار تھی، جسے وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کر سکیں، مگر ایسا نہیں ہوا، اُمّی صرف آپ کو کہا گیا، اس لیے کہ تنہا آپ ہیں، جو اُمّ القری یعنی مکہ میں پیدا ہوئے، آپ کے علاوہ کسی اور نبی یا رسول کا وطن مکہ نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن پاک میں ہی نہیں، پچھلی کتابوں میں بھی آپ ﷺ کا تعارف اُمّی کے ہی لفظ سے کرایا ہے، یہ دراصل آپ کے مقام بعثت کی نشاندہی تھی، تاکہ آپ کو پہچاننے اور آپ تک پہنچنے میں لوگوں کو حیرانی نہ ہو۔

پچھلی کتابوں میں جہاں آپ کے ظہور قدسی کی بشارت دی گئی، وہیں مقام بعثت کی بھی وضاحت کر دی گئی، اس لیے کہ مقام بعثت اگر نامعلوم ہو، تو بشارت نامکمل رہ جاتی ہے۔

قرآن پاک میں بھی آپ کی اس صفتِ اُمّی کا حوالہ اسی حیثیت سے آیا ہے، کہ آپ وہی نبی ہیں، جس کی نبوت کے چرچے آج سے سیکڑوں ہزاروں سال پہلے سے کیے جاتے رہے ہیں، دعائے ابراہیمی کے بعد جتنے بھی نبی اور رسول آئے، وہ اسی طور سے آپ کے چرچے کرتے رہے، اور اس کے بعد جتنی کتابیں آئیں، وہ سب بھی اسی حیثیت سے آپ کا تعارف کراتی رہیں۔

جہاں تک آپ کے پڑھے لکھے ہونے کا تعلق ہے، تو قرآن پاک اس سلسلے میں بالکل واضح ہے، وہ یہ صراحت کرتا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، رہیں اس سلسلے کی کچھ روایات، جن سے بظاہر دوسرے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے، تو انہیں قرآن پاک کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے، قرآن پاک کی روشنی میں ان پر غور کیا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا، اور ساری پیچیدگی دور ہو جاتی ہے۔

ضروری وضاحت:

یہ چند مثالیں ہیں، جو تاریخ کی غلطیوں، یا غلط بیانیوں کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے، کہ آج جو چیز تاریخ اسلام کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہ اپنوں کی نہیں اغیار کی تیار کی ہوئی ہے!

اغیار نے غایت درجہ عیاری کے ساتھ کہانیاں بنائیں، اور ان میں میٹھے زہر کی آمیزش کی، اور اپنوں نے نہایت سادگی اور بڑی ایمان داری کے ساتھ بلا کم و کاست وہ کہانیاں مرتب کر کے ہم تک پہنچا دیں، اور وہ ہمارے قیمتی لٹریچر کا قیمتی حصہ بن گئیں !

ضروری ہے کہ پوری تاریخ اسلام قرآن پاک کی روشنی میں پڑھی اور پڑھائی جائے۔ اور اس میں جو زہر ہلاہل ملا ہے، اس سے خود بھی ہشیار رہا جائے، اور طلبہ کو بھی ہشیار کیا جائے۔

تاریخ اسلام کے سلسلے میں یہ تنہا ہمارا تاثر نہیں، ہم سے پہلے بہت سے لوگ اس طرح کے احساسات رکھتے رہے ہیں، اور برملا ان کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں، الأستاذ محبّ الدین الخطیبؒ فرماتے ہیں:

تاريخ الأمة العربية الإسلامية لم يُكتب بعدُ !

(جسے ملت اسلامیہ عربیہ کی تاریخ کہا جا سکے، وہ تاریخ اب تک نہیں لکھی جا سکی !)

(ڈاکٹر عبداللہ طنطاوی۔ حول التاریخ۔ انٹرنیٹ)

تاریخ کی تدوین جدید:

سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں:

(آج تاریخ اسلام کے دو نمونے پائے جاتے ہیں، ایک نمونہ تو وہ ہے جو قدیم عربی مصادر میں نظر آتا ہے، اسے بہت مشکل سے ہی تاریخ کا نام دیا جاسکتا ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اسے تاریخ کا نام دینا ممکن ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تاریخ مجموعہ ہے متفرق حادثات اور منتشر واقعات کا، کچھ کہانیوں، اور کچھ زبانی بیانات کا، کچھ کٹی پٹی ادھوری باتوں اور کچھ ہوائی چٹکلوں کا، کچھ بے سروپا خرافات اور کچھ بے بنیاد داستانوں کا، بے شمار روایات ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، بیانات کا ایک انبار ہے جو باہم متعارض ہے!

لیکن پھر بھی وہ ایک تاریخی رکارڈ ہے، جو خام مٹیریل سے مالامال ہے، جس سے ہر وہ شخص کام لے سکتا ہے، جو بحث وتحقیق کا حوصلہ رکھتا ہو، جو صبر کے ساتھ اسے چھان پھٹک کر اس میں سے کام کی چیزیں نکال لینے کی قدرت رکھتا ہو۔

بلاشبہہ اس تاریخی رکارڈ میں وہ ساری ابتدائی اور ضروری چیزیں موجود ہیں جو تاریخ کا ہیکل (اسٹرکچر) تیار کرنے میں بنیاد کی اینٹ بن سکتی ہیں۔

لہذا ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ پھر سے لکھی جائے، نئی بنیادوں پر، اور نئی روشنیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، تاکہ اس کے تمام سربمہر حقائق روشن ہوسکیں، اس کے تمام جلوے بے نقاب ہوسکیں، کوئی اہم گوشہ چھوٹنے نہ پائے، کوئی اہم پہلو دبنے نہ پائے۔

تاریخ اسلام کا دوسرا نمونہ یورپی مؤرخین کی کتابوں میں نظر آتا ہے، خاص طور سے مستشرقین کی کتابوں میں، یہ بگڑا ہوا نمونہ کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ تفصیل اس کی پیچھے گزر چکی ہے۔) (ڈاکٹر عبداللہ طنطاوی۔حول التاریخ۔انٹرنیٹ)

علامہ علی طنطاویؒ فرماتے ہیں:

یہ تاریخ کی کتابیں حقیقت میں تاریخ کا ابتدائی مٹیریل ہیں، یہ تاریخ نہیں

ہیں، کیونکہ ہماری تاریخ لکھی ہی کب گئی؟

ضروری ہے کہ پہلے اس مٹیریل کی چھٹائی اور صفائی کی جائے، پھر اسے صحیح ترتیب دیا جائے، پھر اسے تاریخ سازی کی فیکٹری سے گزارا جائے، تاکہ اسے تاریخ کا اعتبار حاصل ہو جائے۔

بحالت موجودہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے شہد میں زہر، یا جیسے دہی میں مُسہل!

(علی طنطاوی۔ قصص من التاریخ۔ دیباچہ کتاب ص: ۱۶۔ دار المنارہ۔ طبع اول)

تاریخ اسلام کے تعلق سے یہ چند احساسات ہیں، جو صورت حال کی نزاکت، یا معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں، یہ تمام احساسات اس بات پر متفق ہیں کہ تاریخ اسلام کی نئی تدوین ضروری ہے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ تاریخ اسلام کی صحیح تدوین اسی وقت ممکن ہے جب قرآن پاک کی مشعل ہاتھ میں ہو۔

قرآن پاک کی روشنی اور اس کی رہنمائی سے بے پروا ہو کر اس کام کو انجام دینا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی سرپھرا انتہائی گھٹاٹوپ تاریکی میں روشنی کا کوئی انتظام کیے بغیر کسی نامعلوم جنگل کا سفر کرنے کے لیے نکل پڑے!

نہ صرف تاریخ اسلام، بلکہ تاریخ عالم کا مطالعہ بھی قرآن پاک کی ہی روشنی میں ہونا چاہیے۔ بلاشبہ قرآن پاک نے پورے عالم کی تاریخ نہیں بیان کی ہے، لیکن مطالعۂ تاریخ کے لیے کچھ اہم اصول ضرور دیے ہیں، ان اصولوں کو سامنے رکھ کر ہم صحیح اور غلط، جھوٹ اور سچ میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں۔

ہمارے رب کریم کا یہ بہت بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے قرآن پاک کی صورت میں ہمیں علوم کی ایک ایسی شاہ کلید عطا کر دی ہے، کہ اس سے ہم تمام علوم کے بند تالے کھول سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ شاہ کلید حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ہم اس کے سلسلے میں سنجیدہ نہ ہوں۔

آج ہم قرآن پاک کے سلسلے میں اتنے بھی سنجیدہ نہیں ہوتے، جتنے سنجیدہ اخبارات ورسائل کے سلسلے میں ہوتے ہیں، روز صبح سویرے نیوز پیپر کے لیے جو بھوک اور

جو بے چینی ہمارے اندر پائی جاتی ہے، وہ کتاب الٰہی کے لیے نہیں پائی جاتی !

شاہ کلید کی دست یابی کیونکر؟

قرآن پاک کے علوم بے کراں سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عظمت کا ہمیں بھر پور شعور ہو، ایسا شعور ہو، کہ اس کے آگے دنیا کی تمام لائبریریاں ہیچ نظر آنے لگیں، تمام حکماء وفلاسفہ اس کے سامنے بونے نظر آنے لگیں۔

اس کی محبت سے ہمارا دل سرشار ہو، اس طرح سرشار ہو، کہ اس کے اندر سے ہم اپنے رب کریم کی آواز سننے لگیں اور یوں محسوس کرنے لگیں گویا براہ راست ہمارے قلب پر اس کی آیات کا تازہ تازہ نزول ہو رہا ہے۔

قرآن پاک سے یہ جذباتی لگاؤ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے، جب ہم براہ راست اس سے جڑنے کی کوشش کریں، براہ راست اس کی آیتوں پر ڈیرے ڈالیں، اور گھنٹوں گھنٹوں، پہروں پہروں اس پر غور وتدبر میں مصروف رہیں۔

تدبر قرآن کے وقت صرف قرآن پاک ہمارے پیش نظر ہو، آیات کے الفاظ، ان الفاظ کے صحیح معانی، لغت عرب میں ان کے معروف استعمالات، آیات کا پس منظر، آیات کا ماحول، آیات کا انداز واسلوب، آیات کے نظائر، سورہ کا پس منظر، یہی چیزیں ہیں جو آیات کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہیں، اور قرآن پاک پر غور وفکر کرتے وقت انہی چیزوں پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں تدبر قرآن کی یہی بنیادیں ہوا کرتی تھیں، لوگ قرآن پاک پر براہ راست غور کرتے تھے، اور اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے کہ آیات کا مفہوم رسالت مآب ﷺ سے دریافت کریں، یا کبار صحابہ سے معلوم کریں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اس بات کا پابند سمجھتا تھا کہ وہ کتاب الٰہی پر تدبر کرے، اور اسے اطمینان ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے، صحیح سمجھ رہا ہے،

اس لیے کہ اللہ تعالی نے یہ کتاب سب کے لیے اتاری ہے، اور نہایت آسان اور واضح زبان میں اتاری ہے، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو، اور وہ دیانت داری سے اسے سمجھنے کی کوشش کرے، اور باوجود کوشش کے اسے سمجھنے سے عاجز رہے۔

عہد صحابہ کے بعد، جب کہ فتنوں کا دور شروع ہو چکا تھا، غلط طور سے یہ پروپیگنڈا کیا گیا، کہ یہ قرآن پاک سب کے سمجھنے کی چیز نہیں، لہذا ضروری ہے کہ حدیث رسول، یا کبار صحابہ اور ان کے تلامذہ کے اقوال و آثار پر اعتماد کیا جائے، اور انہی اقوال و آثار کو تفسیر قرآن کے لیے کافی سمجھا جائے۔ خود اپنی طرف سے آیات کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

تفسیر بالمأثور کی تاریخ:

یہ مہم بہت ہی زور و شور سے چلائی گئی، اور نہایت خوب صورت اور دلفریب عنوان سے چلائی گئی، وہ عنوان تھا تفسیر بالمأثور۔

بظاہر یہ بات بڑی اچھی اور ذہنوں کو اپیل کرنے والی تھی، اسی لیے عام طور پر قبول کر لی گئی، لیکن حقیقت میں یہ بات تھی بڑی خطرناک، کیونکہ تفسیر بالمأثور کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہ تھا کہ لوگوں کو قرآن پاک پر غور و تدبر کرنے سے روک دیا جائے، اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر کمزور روایات، لوگوں کے خود ساختہ اقوال و آثار، اور بیہودہ اسرائیلیات سے کریں!

چنانچہ وہی ہوا، جو سوچنے والوں نے سوچا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اسرائیلیات اور بے سرو پا روایات و آثار کا بازار گرم ہو گیا، اور ہر طرف تفسیری مجالس میں انہی کے چرچے ہونے لگے!

تفسیر قرآن کے سلسلے میں مرفوع حدیثیں نہ ہونے کے برابر تھیں، صحابہ کے صحیح تفسیری اقوال و آثار بھی بہت کم تھے، چنانچہ امام احمدؒ نے نہایت جرأت سے للکارا:

ثلاثة كتب ليس لها اصول: المغازی والملاحم والتفسير.

(تین قسم کی کتابیں ہیں، جن کے اصول کا وجود نہیں: سیرت، غزوات اور تفسیریں)

(البرھان فی علوم القرآن۔ النوع الحادی والأربعون: جلد:۲، ص:۱۵۶)

یہ کتنی بڑی بات تھی، جو کسی بھی صورت میں نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی، مگر ذہنوں پر تفسیر بالمأثور کا جادو اس طرح چل چکا تھا، کہ امام احمدؒ کی یہ پر زور آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی!

تفسیر بالمأثور کی تبہ کاریاں:

نتیجہ ظاہر تھا، عام و خاص کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ قرآن پاک ہمارے سمجھنے کی چیز نہیں، یہ بس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بزرگ صحابہ کے ہی سمجھنے کی چیز تھی! لہذا اس پر غور و تدبر کرنا چہ معنی دارد؟

اس طرح انہوں نے فہم قرآن سے مایوس ہو کر اس پر تدبر کرنا چھوڑ دیا۔ اور جب قرآن پاک پر تدبر کرنا چھوڑ دیا، تو گویا ہاتھ میں جو قندیل تھی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور نور و ظلمت اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کوئی چیز ان کے پاس نہ رہی۔

یہ قرآن پاک کے خلاف بہت ہی سوچی سمجھی سازش تھی، جسے عام علمائے حق نے یا تو بروقت محسوس نہیں کیا، یا محسوس کیا اور اس سازش کی قلعی کھولنے کی کوشش بھی کی، لیکن اس وقت کے وسائل اعلام (میڈیا) پر دوسروں کا قبضہ تھا، اس طرح وہ اس فتنے کا مقابلہ نہ کر سکے، اور اپنی مخالفت میں ناکام رہے۔

بہر کیف تفسیر بالماثور کا جادو ایسا چلا کہ اس نے عام طور سے ذہنوں کو مسحور کر لیا، اور لوگوں نے ہر طرف اسی کی ڈگڈگی بجانی شروع کر دی اور اگر کسی نے اپنے طور سے قرآن پاک پر غور و تدبر کی جرأت کی تو اسے تفسیر بالرأی کا طعنہ دیا گیا اور ہر طرح سے اسے نیچا دکھانے، اور مسلم سماج میں اسے بے اثر بنانے کی کوشش کی گئی۔

تفسیر بالمأثور کا اس طرح جادو چل جانے کے بعد دشمنان اسلام اور دشمنان قرآن کے سامنے راستہ بالکل صاف تھا، انہوں نے تفسیر بالماثور کے پردۂ سیمیں میں تمام اسرائیلیات اور من گھڑت روایات تفسیروں میں بھر دیں!

حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت علی بن ابی طالب،

حضرت عبداللہ بن عباس اور دیگر اکابر صحابہ کے نام سے وہ ساری روایتیں گھڑ گھڑ کے ہر طرف پھیلا دیں جو قرآن پاک میں معنوی تحریف کا کام آسان کر سکتی تھیں!

ان اکابر صحابہ کے نام سے جب روایات و آثار کی ہوا چلی، تو لوگ ان کے احترام میں سب کچھ قبول کرتے چلے گئے، انہوں نے اس احتمال کو سامنے نہیں رکھا، کہ ہوسکتا ہے یہ ان بزرگوں کے اقوال و آثار نہ ہوں، بلکہ کوفہ اور بغداد کے کارخانوں میں ڈھلے ہوئے کھوٹے سکے ہوں، جو تازہ تازہ ڈھال کر مارکٹ میں بکھیر دیے گئے ہوں!

خطرناک مغالطہ!

کچھ لوگ جو براہ راست قرآن پاک پر غور وتدبر کے قائل، اور اپنے اس موقف پر مصر تھے، انہوں نے قرآن پاک کی روشنی میں جب بہت سے اقوال و آثار پر نقد کیا، کہ یہ تو قرآنی الفاظ اور قرآنی نصوص کے خلاف ہیں، تو انہوں نے یہ کہہ کر ان کی آواز دبانے کی کوشش کی کہ حدیث قرآن کی شارح ہے، قرآن کو اسی کی روشنی میں سمجھنا ہے، حدیث و قرآن میں اگر اختلاف نظر آئے، تو فیصلہ حدیث کے ہاتھ میں ہوگا، قرآن کے ہاتھ میں نہیں:

(السنة قاضية على الكتاب، وليس الكتاب قاضيا على السنة)

(سنت قرآن پر حاکم ہوگی، قرآن سنت پر حاکم نہیں ہوگا۔)

(شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی۔ مناھل العرفان فی علوم القرآن، جلد اول، ص:۲۹۹ مطبعۃ عیسی البابی الحلبی وشرکاؤہ)

یہ بات کس قدر غلط، اور کتنی نامعقول ہے! یہ کیسی شوخی، اور کیسی ڈھٹائی ہے اپنے رب کے ساتھ، اور رب کی اس عظیم کتاب کے ساتھ؟

تمام محقق علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک قطعی ہے، اور تمام احادیث ظنی ہیں، ظاہر ہے جو چیز ظنی ہے وہ قطعی کے تابع ہوگی، قطعی چیز کیوں کر ظنی کے تابع ہوگی؟

فہم قرآن یا تفسیر قرآن میں یقیناً احادیث سے مدد لی جائے گی، لیکن آیات کے الفاظ واسالیب اور سیاق وسباق کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے، اور اگر ایسی صورت پیش

آجاتی ہے کہ روایت کو ماننے کی صورت میں آیت کے لفظ واسلوب اور سیاق وسباق کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے، تو ایسی صورت میں اس روایت کو ترجیح دینا قرآن پاک کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتی ہے۔ یہ قرآن پاک کی تفسیر نہیں ہوگی، قرآن پاک میں تحریف ہوگی!

فہم قرآن اور تفسیر قرآن میں صحیح احادیث سے مدد لینا، یا ان سے فائدہ اٹھانا اور چیز ہے، اور آیات کو روایات کے تابع کر دینا اور ان کے لفظ واسلوب اور سیاق وسباق سے صرف نظر کر لینا اور چیز ہے۔ پہلی چیز مطلوب اور مستحسن ہے، دوسری چیز ناخوب اور غیر مطلوب ہے۔

الغرض تفسیر بالماثور کے نظریہ نے نہ صرف کتب تفسیر کو اسرائیلیات اور خود ساختہ روایات وآثار کا جنگل بنا دیا، بلکہ امت کو فہم قرآن سے مایوس کر کے قرآن اور قرآنی شاہ راہ سے بہت دور ڈال دیا!

اس طرح قرآن پاک زندگی کی کتاب، روشنی کی مشعل، اور علوم کی شاہ کلید ہونے کے بجائے محض نماز بے روح کی کتاب بن کر رہ گیا، زندگی کے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ مسلم امت کی تعلیم وتربیت، اور اس کی نمود وترقی میں اس کا کوئی رول نہیں رہا۔

علمی رسوخ اور دینی غیرت وحمیت کا تقاضا تھا، کہ بعد میں آنے والے علماء تفسیر بالماثور کے ان خطرناک نتائج کو سمجھتے، لوگوں کو ان سے آگاہ کرتے، اور اس کے سحر کو توڑنے کی مہم چلاتے، وہ امت کو براہ راست کتاب الٰہی پر غور وتدبر کرنے، اور اس سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی دعوت دیتے، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود حقائق سے چشم پوشی کرتے رہے، وہ اسی پرانی روش پر چلتے رہے، اور اپنے تلامذہ کو یہی سبق پڑھاتے رہے، کہ تفسیر قرآن کا سب سے افضل طریقہ تفسیر بالماثور ہے!

ضروری ہے کہ ہمارے علماء اپنے موقف پر نظر ثانی کریں، اور تفسیر بالماثور کے نظریہ سے ماضی میں جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے، اور آج تک ہو رہا ہے، اس کا ادراک کریں، اور اس کے صحیح اور افضل ہونے پر بے جا اصرار نہ کریں۔

داستان دل خراش!

یہ تفسیر بالمأثور کی ہی دین ہے کہ شیخ المفسرین امام ابن جریر جیسا شخص امت مسلمہ کی تابناک تاریخ کی سب سے اہم کڑی ہی کھو بیٹھا، وہ ذبیح کے مسئلے میں بھٹک گیا، اور ذبیح اللہ ہونے کا دمکتا ہوا تاج حضرت اسماعیل کے بجائے حضرت اسحاق کے سر پر رکھ دیا! (تفسیر طبری۔ تفسیر سورہ صافات: جلد ۲۱۔ص: ۷۴۔ مؤسسۃ الرسالۃ۔ طبعۃ اولی)

یہ تفسیر بالمأثور کی ہی دین ہے، کہ عام مفسرین نے قرآن پاک کی آخری دونوں سورتوں کو ٹونا ٹوٹکا اور جادو اتارنے کا منتر سمجھ لیا، اور یہ باور کرلیا کہ رسالت مآب ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا، جس کے علاج کے لیے یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں!

یہ تفسیر بالمأثور کی ہی دین ہے کہ قصۂ زیدؓ وزینبؓ کے پردے میں رسالت مآب ﷺ کی شخصیت پر غلیظ کیچڑ اچھالی گئی، اور آپ کے خلق عظیم کو نہایت ڈھٹائی سے چیلنج کیا گیا!

یہ تفسیر بالمأثور کی ہی دین ہے، کہ ہمارا پورا نظام میراث بالکل الٹ کر رہ گیا، اور وہ نظام جو سرتاسر عدل ورحمت کا آئینہ دار تھا، ظلم ونا انصافی اور بے رحمی کی ایک تصویر بن گیا!

ہم اس داستان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے، کہ یہ بڑی ہی دردناک اور انتہائی دل خراش داستان ہے! صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرنا ہو، تو اس کے لیے اتنی مثالیں کافی ہیں۔

کرنے کے ضروری کام:

ضروری ہے کہ آج امت کو تفسیر بالمأثور کے بحر مُردار سے نکال کر قرآن پاک کے چشمۂ حیات سے جوڑنے کی کوشش کی جائے، اور پیہم کی جائے، جس جس طرح ممکن ہو اس اس طرح کی جائے، اور کسی بھی صورت میں طاغوت سے ہار نہ مانی جائے۔

ضروری ہے کہ آج امت کو پھر سے براہ راست قرآن پاک پر غور وتدبر کرنے کا عادی بنایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ یہ کتاب سب کے لیے ہے، اور سب کے سمجھنے کی ہے۔ جس طرح وہ پہلے سمجھی جاتی تھی، آج بھی سمجھی جاسکتی ہے، اور بہت اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے۔

ضروری ہے کہ آج امت کو پھر سے کتاب الٰہی کی وہ حیثیت یاد دلائی جائے، جس سے وہ زمانۂ دراز سے غافل چلی آرہی ہے۔

ضروری ہے کہ امت کو پھر یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے، کہ اللہ کی یہ کتاب تمام علوم کی شاہ کلید ہے، لہٰذا مرعوبیت کے ساتھ اغیار کی نقالی کرنے کے بجائے، ہر میدان میں اس سے رہ نمائی حاصل کرو۔ اغیار کی نقالی تمہیں ان کا ذہنی اور جسمانی غلام بنائے گی، اس کتاب سے رہ نمائی حاصل کرو گے، تو دنیا کی امامت کرو گے، ساری دنیا تمہارے پیچھے چلے گی۔

ضروری ہے کہ عربی درس گاہوں، اور دار العلوموں میں تدریس قرآن کا انداز بدلا جائے، جملوں کی نحوی ترکیبوں، اسباب نزول کی کمزور روایتوں، آیات کے لفظی ترجموں، اور سورتوں کے سرسری مفہوموں پر اکتفانہ کیا جائے، بلکہ طلبہ کو اس جہان علم ودانش کے عجائبات سے متعارف کرایا جائے، انہیں اس بحر بے کراں کی وسعتوں کا احساس دلایا جائے، انہیں اس قلزم معرفت میں شناوری کرنے، اور اس کی گہرائیوں میں علم وحکمت کے موتی تلاش کرنے کے تجربے کرائے جائیں۔

انہیں بتایا جائے کہ یہ قرآن پاک صرف جنت اور جہنم کے تذکرے نہیں کرتا، یہ صرف روزے نماز، اور حج وزکات کی تعلیم نہیں دیتا، یہ صرف نکاح وطلاق، اور حلال وحرام کی تفصیلات نہیں بتاتا، بلکہ وہ سب کچھ بتاتا ہے، جس کا انسان کبھی بھی ضرورت مند ہوتا ہے۔

وہ افراد کی بھی ضرورتیں پوری کرتا ہے، اور قوموں کی بھی ضرورتیں پوری کرتا ہے، وہ گھریلو معاملات میں بھی رہ نمائی کرتا ہے، اور حکومت وسلطنت کے مسائل بھی حل کرتا ہے، اور اس طرح حل کرتا ہے، کہ کوئی دوسرا اس طرح نہیں حل کرسکتا۔

کامیاب ترین تجربہ!

کتاب الٰہی کی یہ خصوصیت ہمارے ذہن نارسا کی اپج نہیں، یہ ہماری اندھی بہری عقیدت کا کرشمہ نہیں، یہ علمی اور تاریخی دنیا کا کامیاب ترین تجربہ ہے، اسی زمین پر اسی کتاب کی بدولت وہ عظیم علمی اور فکری انقلاب آیا، جس جیسا انقلاب چشم فلک نے کبھی دیکھا نہیں، کائنات کے کانوں نے کبھی سنا نہیں۔

دنیا نے دیکھا کہ صحرائے عرب سے ایک قوم اٹھتی ہے، جو لوٹ مار اور غارت گری کے علاوہ کچھ نہیں جانتی تھی، جو مدتہائے دراز سے گم رہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی، وہی صحرائی قوم دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر ابر رحمت بن کر چھا جاتی ہے، اور اسی کتاب کے ذریعہ سے پوری دنیا کو علم سے سیراب کرتی، تمدن کے زیور سے آراستہ کرتی، اور جہالت میں ڈوبی ہوئی اس زمین کو علم وتمدن کا گہوارہ بنا دیتی ہے!

وہ قوم اسی قرآن کی رہ نمائی میں ایک نئی تہذیب کی داغ بیل ڈالتی ہے، اور اس تہذیب کی اساس پر ایسی عظیم الشان اور بابرکت سلطنت قائم کرتی ہے، کہ پھر ویسی عظیم الشان اور بابرکت سلطنت کے لیے دنیا ترس گئی، ویسی سلطنت دوبارہ قائم نہ ہوسکی۔

ویسی سلطنت دوبارہ کیوں نہ قائم ہوسکی؟

اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ دوبارہ ویسی قرآنی امت وجود میں نہیں آسکی، جو اس طرح قرآن پاک سے محبت کرنا جانتی ہو، جس طرح اس امت نے کی تھی۔

وماعلینا الا البلاغ!

ضروری ہے کہ ایک بار پھر ویسی ہی قرآنی امت منظر عام پر آئے:

جو اس جلتی بھنتی اور سلگتی دنیا کو خود اس کی دہکائی ہوئی جہنم سے نجات دلا سکے۔

جو قرآن پاک کی روشنی میں اس کی عقلی، ذہنی، روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج کر کے اسے صحت مند بنا سکے۔

جو اسے ذلت ونامرادی کے عذاب سے نکال کر عزت وحرّیت کی نعمت سے ہم کنار کر سکے، اور اسے باور کرا سکے کہ قرآن کیا ہے؟ قرآنی نظام کیا ہے؟ اور اس کے علوم کا سمندر کتنا بے پایاں، اور اس کی برکتوں کی دنیا کتنی لامحدود ہے !!

یہ قرآنی امت کہاں سے وجود میں آسکتی ہے؟ اور کیونکر وجود میں آسکتی ہے؟ اس کا تشفی بخش جواب فراہم کرنا ہمارے دارالعلوموں اور ہماری عربی درس گاہوں کا کام ہے!

اور اگر یہ دارالعلوم اور یہ درس گاہیں اس عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار نہیں، تو پھر انہیں سوچنا چاہیے کہ آخر ان کے کرنے کے کام ہیں کیا؟ اور وہ کس لیے باقی رہنا چاہتے ہیں؟ وما علینا الا البلاغ!

عصری درسگاہوں میں قرآنی تعلیم کا جائزہ

محمد مبین سلیم

قرآن کریم اللہ کی نازل کردہ کتاب ہدایت وارشاد ہے، تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے دنیا وآخرت میں کامیابی وکامرانی کے بصائر ونورانی اصول کا واحد محفوظ وثیقہ ہے، نزول سے لے کر آج تک اس کی تعلیم مسلسل تواتر کے ساتھ جاری ہے، عہد استعمار سے پہلے دینی ودنیاوی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا وجود نہیں تھا چوں کہ اسلام میں دونوں میں کوئی فرق نہیں، وہ صرف نافع وغیر نافع علوم کی تقسیم کو مانتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عصر اسلامی میں اس طرح کی درسگاہوں سے بڑے بڑے سائنسداں واطباء وفلاسفہ فارغ ہوئے، یہ سچ ہے کہ اتقان وتخصیص کے لیے بنیادی تعلیم کے بعد اسلامی منہجیت کے ساتھ تمام ہی نافع علوم کی تدریس بھی مطلوب نافع علوم میں شامل ہے، البتہ عہد استعمار کے بعد دینی ودنیاوی کے نام سے دوطرح کے اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے، اسلامی ملکوں میں بھی چند استثناءات کے بعد تقریباً صورت حال یہی ہے۔ اس صورت حال کے پس منظر میں عصری درسگاہوں میں دینی تعلیم کی اہمیت عمومی طور پر اور قرآنی تعلیم کی اہمیت خصوصی طور پر بہت معنویت کی حامل ہے، زیر بحث مقالہ میں عالم اسلام کی چند مشہور عصری درسگاہوں میں قرآنی تعلیم بطور نمونہ پیش کرنے کا یہی مقصد ہے۔

مبحث اول: سعودیہ عربیہ میں قرآنی تعلیم کا جائزہ:

تمہید: سعودیہ میں قرآنی تعلیم - اہمیت وادارے

سعودیہ عربیہ مہبط وحی ہے، یہی وہ مبارک خطۂ ارض ہے جہاں پر کعبہ مبارکہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں ودعوت کی علامت وشعار ہے، یہیں پر غار حرا سے قرآن کریم کا نزول شروع ہوا پھر مدینہ مبارکہ میں ہجرت کے بعد تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں

مکمل ہوا اور تدریجاً پوری دنیا میں منتشر ہو گیا۔ یہ مبارک خطہ از بعد نزول قرآنی تعلیم کا مرکز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ معاصر حکومت نے بھی تمام عصری وخصوصی تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم کا اہتمام کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمی وادبی تمام شعبوں میں تمام تعلیمی مراحل میں اس کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔

اسکول میں قرآن کریم کی تعلیم:

بنیادی قرآن کریم حفظ کی تعلیم دو طرح سے ہوتی ہے:

اول: خصوصی مدارس حفظ، دوم: عمومی مدارس اسکولس

اول کے بارے میں سعودی دستور، باب خامس: سعودی میں سیاست تعلیم کے فصل خامس میں دفعہ ۱۷۳ میں اس بات کی صراحت ہے کہ حکومت حفظ قرآن کریم اور اس کے علوم کی اشاعت کا اہتمام کرے گی ''**تعمل الدولة على اشاعة حفظ القرآن الكريم، ودراسة علومه، قياما بالواجب الاسلامي في الحفاظ على الوحي، وصيانة ترائه**''۔ اس سلسلہ میں دفعہ ۱۷۴ کے مطابق دو طرح کے حفظ کے مدارس کھولے گئے، ایک صباحی مدارس دوسرے مسائی مدارس جن کی تعداد مختلف جگہوں پر سنہ ۱۴۲۱ھ میں ۵۲۰ مدارس تھے، مجموعی طلبہ کی تعداد 60485 تھی۔ یہ تین مرحلوں پر مشتمل تعلیم ہے۔

پہلا مرحلہ: ابتدائی، مدت: ۶ سال، ۱۵ پارے حفظ، سورہ کہف سے سورہ ناس تک۔

دوسرا مرحلہ: متوسط، مدت: ۳ سال، باقی ۱۵ پارے حفظ، سورہ بقرہ سے سورہ اسراء تک۔

تیسرا مرحلہ: ثانوی، مدت: ۳ سال، پورے قرآن کا دور ومراجعہ۔

یہ قرآنی تعلیم صرف حفظ قرآن کے خصوصی مدارس میں ہی نہیں بلکہ تمام تعلیمی عام کے ابتدائی ومتوسط وثانوی مراحل کے علمی وادبی شعبوں میں بھی حفظ قرآن کی مقدار داخل نصاب ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: **حفظ القرآن الكريم وتعليمه في جميع مراحل التعليم والتعليم الجامعي** (تقریر)

جامعی مرحلہ میں قرآن کریم کی تعلیم:

سعودیہ عربیہ میں بہت سی مؤقر یونیورسٹیاں ہیں لیکن ہم نمونہ کے طور پر صرف دو پر اپنی بحث مرکوز کریں گے، ایک جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض، دوسری جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ۔

☆ جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض

یہ ایک بڑا مؤقر علمی ادارہ ہے، اس کے تحت اسکولس، معاہد، جامعہ، دراسات علیا، ماسٹر و پی ایچ ڈی لیول کی تعلیم ہوتی ہے، اور یونیورسٹی نے نظام جامعہ کی دفعہ نمبر ۲۹ کے بموجب تمام مراحل میں فارغ ہونے کے لیے حفظ قرآن کو لازمی شرط قرار دیا ہے، جس کی مقدار ہر مرحلہ میں الگ الگ ہے:

۱- علمی معاہد (Schools of Science): آٹھ پارے، ۲۱ تا سورہ تحریم، ۶ تعلیمی سالوں پر منقسم۔

۲- انڈر گریجوائیٹس: آٹھ پارے، پارہ اول تا آخر پارہ آٹھ۔ ۸ تعلیمی سیمسٹرس پر منقسم، ہر سیمسٹر میں ایک پارہ۔

۳- ماسٹر ڈگری: ۶ پارے، پارہ ۹ تا پارہ ۱۴۔

۴- پی ایچ ڈی: ۶ پارے، پارہ ۱۵ تا ۲۰

اسی طرح داخلہ کے لیے بھی حفظ قرآن شرط ہے:

۱- داخلہ علمی معاہد (Schools of Science): ۲ پارہ

۲- داخلہ انڈر گریجوائیٹس: ۳ پارہ۔

۳- داخلہ ماسٹر ڈگری: ۵ پارہ۔

۴- داخلہ پی ایچ ڈی: ۵ پارہ۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں قرآنی تعلیم ایک تعارف:

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بہت اہم یونیورسٹی ہے، اس کے زیر نگرانی معہد

تعلیم اللغة العربیة (تعلیمی مدت چار سال)، مرحلہ متوسط (تعلیمی مدت تین سال)، مرحلہ ثانویہ (تعلیمی مدت تین سال) ان سب میں قرآن کریم کی تعلیم، تجوید، حفظ، تفسیر، علوم تفسیر کے مضامین کے ذریعہ ہوتی ہے، اس محترم یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ (F/o Law) کلیۃ القرآن (F/o Quran)، کلیۃ الحدیث (F/o Hadith)، کلیۃ اللغۃ العربیۃ (F/o Arabic Language)، کلیۃ الدعوۃ واصول الدین (F/o Dawah & Theology)، ہیں۔ ہم آئندہ سطور میں صرف قرآنی تعلیم پر تخصصی فیکلٹی ہی کا جائزہ لیں گے۔

کلیۃ قرآن کریم اور قرآنی تعلیم مراحل ونصاب:

یہ عالم اسلام کی تین بڑی قرآنی فیکلٹیوں میں سے ایک ہے، اس میں دو مرحلے ہیں، ایک جامعی یا عالی، دوسرا علیا یا ہایر اسٹڈیز۔ پہلا مرحلہ: چار سال پر مشتمل ہے، سال اول میں چودہ مضامین ہیں:

۱- قراءت عشرہ، ۲- رسم قرآن، ۳- عدد آیات، ۴- تفسیر، ۵- علوم قرآن، ۶- مناہج مفسرین، ۷- حدیث، ۸- مصطلح حدیث، ۹- توحید، ۱۰- مناہج بحث، ۱۱- نحو، ۱۲- عرض قرآن بالقراءات، ۱۳- علم نفسیات، ۱۴- اسلامی تربیت

سال دوم میں بارہ مضامین ہیں:

۱- قراءات عشرہ، ۲- رسم وضبط قرآن، ۳- تفسیر، ۴- علوم قرآن، ۵-حدیث، ۶- توحید، ۷- سیرت نبوی، ۸- فقہ، ۹- اصول فقہ، ۱۰- نحو، ۱۱- صرف، ۱۲- تعلیمی مناہج

سال سوم میں بارہ مضامین ہیں:

۱- قراءات عشرہ، ۲- تفسیر، ۳- تفسیر موضوعی، ۴- اعجاز قرآن، ۵- حدیث، ۶- توحید، ۷- فقہ، ۸- اصول فقہ، ۹- نحو، ۱۰- صرف، ۱۱-تاریخ مملکت سعودیہ، ۱۲- تعلیمی وسائل۔

سال چہارم میں بارہ مضامین ہیں:

۱- قراءت عشرہ، ۲- تفسیر، ۳- ادیان وفرق، ۴- تاریخ اسلامی، ۵- حاضر العالم الاسلامی، ۶- اصول دعوت وطریقے، ۷- تنظیم وادارہ، ۸- تدریس کے طریقے، ۹- فقہ، ۱۰- فرائض/میراث، ۱۱- نحو، ۱۲- صرف۔

ماسٹر ودراسات علیا

دوسرے مرحلہ کے دوشعبے ہیں قراءات وتفسیر۔

پہلے شعبہ میں ماسٹر مرحلہ چار سیمسٹر پرمبنی ہے، پہلے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- المدخل لدراسة القراء ات،

۲- دراسة القراء ات العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۳- الوقف والابتداء

دوسرے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- دراسة القراء ات العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۳- الوقف والابتداء،

۴- مناهج البحث

تیسرے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- دراسة القرأت العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۲- طبقات القراء

۳- اعجاز القرآن

چوتھے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- دراسة القراء ات العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۲- تاريخ المصحف

۳- مناهج المفسرين

پی ایچ ڈی (ڈاکٹریٹ) دوسیمسٹر کی تعلیم اور مقالہ پر مبنی ہے، پہلے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- دراسة القراء ات العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۲- دراسة القراء ات الشاذة وتوجيها

۳- دراسة اسانيد القراء

دوسرے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- دراسة القراء ات العشر الكبرى عرضا وتوجيها

۲- دراسة القراء ات الشاذة وتوجيها

۳- الآيات التي اشكل تفسيرها

دوسرے شعبہ میں ماسٹر مرحلہ صرف دوسیمسٹر پر مبنی ہے۔ پہلے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- تفسیر تحلیلی تجزیاتی تفسیر ۲- مصادر تفسیر ۳- مناہج بحث

دوسرے سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- تفسیر موضوعی ۲- علوم قرآن

۳- طبقات مفسرین اور ان کے مناہج وطریقے

پی ایچ ڈی (ڈاکٹریٹ) ایک سیمسٹر کی تعلیم اور مقالہ پر مبنی ہے، سیمسٹر میں تین مضامین ہیں:

۱- الآيات التي اشكل تفسيرها ۲- علوم قرآن

۳- علم تفسير ۴- الوقف والابتداء (۱)

مبحث دوم: مصر میں قرآن کریم اور قراءات کی تعلیم کا جائزہ

☆ تمہید: مصر میں قرآنی تعلیم: اہمیت وادارے

مصر ایک ایسا مبارک ملک ہے، جو زمانۂ قدیم سے انبیاء وصالحین کا مرکز رہا، اس کی بابرکت زمین کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء عظام کی دعوت کا میدان، وطن یا ان کی گذرگاہ بنایا،

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کے ساتھ مصر آئے، وہاں کے بادشاہ کے ساتھ آپ کا قصہ مشہور ہے جیسا کہ بخاری کی روایت میں وارد ہے:" **واتخذ الله ابراهيم خليلا**) یعقوب، یوسف، موسی، ہارون، اسباط، آسیہ، ہاجرہ علیہم السلام وغیرہ کا مصر سے تعلق کسی سے مخفی نہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد سے ہی اسلام سے مصر کا تعلق قوی تر ہوتا گیا، ماریہ قبطیہ ام المومنین مصری ہی تھیں، فتح مصر کے بعد سے یہ ایک طاقت ور اسلامی ملک ہے، اللہ تعالی نے یہاں کے باشندوں کو قرآن پڑھنے، سننے، اس کے علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ مصر فتح اسلامی سے لے کر آج تک قرآنی علوم کا ناشر وحامل ہے، تاریخ اس پر شاہد عدل ہے آج جدید مصر میں قرآنی تعلیم مختلف اداروں کے ذریعہ سے جاری ہے، ان میں سب سے اہم اور مرکزی ادارہ ازہر شریف ہے جو اپنے معاہد، اسکولس، یونیورسٹی، ڈپارٹمنٹس کے ذریعہ سے تعلیمی مہم میں مسلسل تاریخی رول ادا کر رہا ہے۔

☆ ازہر شریف میں قرآن کریم اور قراءات کی تعلیم؛ مفصل جائزہ:

ازہر شریف میں قرآن کریم کی تعلیم کو ہمیشہ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے، نیز اسے مختلف شعبوں میں مختلف طریقوں سے انجام دیا جاتا ہے، اسے مندرجہ ذیل سطور میں بیان کیا جاتا ہے:

تعلیم تخصص قراءت وتفسیر میں قرآن کریم اور قراءت کی تعلیم کا جائزہ:

قراءت کی تعلیم معاہد القراءت اور کلیۃ القرآن کے ذریعہ انجام پاتی ہے جب کہ مختلف فیکلٹیوں کے شعبہائے تفسیر، اپنے تفسیری تخصص کے ساتھ قراءات کو بھی شامل نصاب کرتے ہیں، مندرجہ سطور میں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

☆ معاہد القراءت اور قرآنی تعلیم:

مختصر تعارف: عالم اسلامی کا سب سے پہلا قراءت کا معہد ازہر شریف نے سن

۱۹۴۵ء میں قائم کیا جو شروع میں صرف فیکلٹی آف عربک لینگویج کا شعبہ تھا، پھر مستقل اس نے ایک معہد کی حیثیت حاصل کی۔ اسی طرح ۳۱/اگست سن ۲۰۰۵ میں شیخ الازہر محمد سید طنطاوی نے صرف لڑکوں کے لیے قراءت کا ایک تخصصی معہد قائم کیا جو اس سلسلہ میں عالم اسلامی کا پہلا معہد ہے۔

معہد القراءات شبرا میں تعلیم ۹ سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے اور داخلہ کے لیے حافظ قرآن ہونا ضروری ہے، ٹیسٹ تحریری اور زبانی دونوں لازمی ہے۔ بحیثیت مجموعی تعلیم آٹھ سال پر مشتمل ہے اور تین مرحلوں میں منقسم ہے:

پہلا مرحلہ (مرحلۃ التجوید): مرحلہ تجوید کے نام سے موسوم ہے۔ تعلیم کی مدت دو سال ہے۔ طالب علم قراءت حفص کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ دو کتابیں فہم وحفظ کے ساتھ مقرر ہیں: ۱) متن تحفۃ الاطفال ۲) متن الجزریہ۔ اس کورس کے آخر میں پاس ہونے والے طالب علم کو ''شہادۃ التجوید'' کی ڈگری تفویض ہوتی ہے جو ازہری تعلیم عام میں اعدادیہ کی ڈگری کے برابر ہوتی ہے۔

نصاب تعلیم (Syllabus):

پہلا سال (اولی تجوید):

۱- تجوید علمی ۲- غریب القرآن ۳- فقہ شافعی
۴- حدیث شریف ۵- توحید ۶- سیرت نبوی
۷- نحو

دوسرا سال (ثانیہ تجوید):

۱- تجوید علمی ۲- غریب القرآن ۳- فقہ شافعی
۴- حدیث شریف ۵- توحید ۶- سیرت نبوی
۷- نحو

دوسرا مرحلہ: (عالیۃ القراءات) یعنی قراءت عالیہ کے نام سے موسوم ہے۔ تعلیم کی مدت تین سال ہے۔ طالب علم قراءت عشرہ صغری (القراءات العشر

الصغری) کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ دو کتابیں فہم وحفظ کے ساتھ مقرر ہیں:

۱- متن الشاطبیہ ۲- متن الدرة

اس کورس کے آخر میں پاس ہونے والے طالب علم کو ''شہادة عالیة القراءات'' قراءات عالیہ کی ڈگری تفویض ہوتی ہے جو ازہری تعلیم عام میں ثانویہ کی ڈگری کے برابر ہوتی ہے۔

نصاب تعلیم (Syllabus):

پہلا سال (اولیٰ عالیہ):

۱- قراءات علمی ۲- تفسیر ۳- فقہ شافعی
۴- حدیث شریف ۵- توحید ۶- صرف
۷- نحو ۸- عروض ۹- مطالعہ ونصوص
۱۰- متون

دوسرا سال (ثانیہ عالیہ):

۱- تجوید علمی ۲- غریب القرآن ۳- فقہ شافعی
۴- حدیث شریف ۵- توحید ۶- سیرت نبوی
۷- نحو ۸- رسم قرآن ۹- عروض وقافیہ
۱۰- قرآن کریم

تیسرا سال (ثالثہ عالیہ):

۱- تجوید علمی ۲- غریب القرآن ۳- فقہ شافعی
۴- حدیث شریف ۵- توحید ۶- سیرت نبوی
۷- نحو ۸- رسم قرآن ۹- عروض وقافیہ
۱۰- قرآن کریم

تیسرا مرحلہ: (التخصص) یعنی مرحلہ اختصاص کے نام سے موسوم ہے۔ تعلیم کی

مدت تین سال ہے۔ طالب علم قراءت عشرہ کبری (القراءت العشر الکبری) کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ کتاب متن طیبۃ النشر از ابن الجزری مقرر ہے۔ اس کورس کے آخر میں پاس ہونے والے طالب علم کو ''شہادۃ التخصص''، تخصص قراءت کی ڈگری تفویض ہوتی ہے جو ازہری تعلیم عام میں فوق متوسط کی ڈگری کے برابر ہوتی ہے۔

نصاب تعلیم (Syllabus):

یہ قراءات عشرہ، رسم قرآن، علوم قرآن، تفسیر، حدیث، علوم حدیث، فقہ شافعی، منطق، نحو، صرف، بلاغہ و بیان، ادب و نصوص پر مشتمل ہے۔

طریقہ تدریس: معہد میں متن کے مضمون کو پڑھانے کے تین طریقے جاری ہیں۔

۱- حفظ متون: اس کا مستقل استاذ ہوتا ہے۔

۲- شرح متون: اس کا مستقل استاذ ہوتا ہے۔

۳- تطبیق و پریکٹس: اس کا مستقل استاذ ہوتا ہے۔

معہد القراءت سے فارغ ہونے والا طالب علم اپنی تعلیم عالی کے لیے کلیۃ القرآن طنطاوی میں داخلہ لے سکتا ہے جس کی تفصیل آ رہی ہے۔

کلیۃ القرآن طنطاوی اور قرآن کریم اور قراءات کی تعلیم:

چند سطور کلیہ (فیکلٹی) کے بارے میں:

یہ بحیثیت مستقل فیکلٹی، بذریعہ پارلیمنٹ آرڈیننس ۱۵۰۳ سنۃ ۱۹۹۱ء مصر کے مشہور شہر طنطا میں قائم ہوئی، جامعۃ الازہر کی واحد ایسی فیکلٹی ہے جہاں متواتر قراءت کی تمام اعتبار سے مکمل تعلیم ہوتی ہے، مصر میں اس کی کوئی نظیر نہیں اور عالم اسلامی کی تین قرآنی فیکلٹیوں میں سے ایک ہے۔

اس کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ یہاں پر قرآن کریم اور قراءات سے متعلق تمام مواد کو پڑھایا جاتا ہے جیسا کہ اس کے مقررات و نصاب سے معلوم ہوگا۔

علمی ڈگریاں و تخصص کے شعبے: مجلس فیکلٹی کی درخواست پر مجلس جامعۃ الازہر

مندرجہ ذیل ڈگریاں عطا کرتی ہے:

۱- عالیہ ڈگری (انڈر گریجویٹ ڈگری (Undergraduate degree) یا بیچلر ان قراءات اینڈ سائنسز (درجۃ الاجازۃ العالیۃ "اللیسانس" فی القراءات وعلوم القرآن)

۲- ماسٹر ڈگری ان قراءات وعلوم قراءات (درجة التخصص "الماجستير" في القراء ا ت وعلومها).

۳- ڈاکٹریٹ ڈگری ان قراءات وعلوم قراءات (درجة العالية "الدكتور" في القراء ات وعلومها).

عالیہ ڈگری (Undergraduate degree)

بیچلر ان قراءات عالیہ ڈگری اینڈ قرآنک سائنسز (درجة الاجازة العالميةُ "الليسانس" في القراء ات وعلوم القرآن)

تعلیمی مدت: چار سال سیمسٹر نظام کے مطابق۔ پاس ہونے والے طالب علم کو "بکالوریوس/لیسانس" کی ڈگری تفویض ہوتی ہے۔ داخلہ کے لیے ازہر کے معاہد القراء ات سے تخصص کی ڈگری ضروری ہے یا ازہر کے تعلیم عام کے اعتبار سے ثانویہ ادبی ہو بشرطیکہ طالب علم قرآن وتجوید میں امتحان قبول تحریری وزبانی (داخلہ ٹیسٹ) کو پاس کرے۔

شعبہائے فیکلٹی: یہ فیکلٹی دو شعبوں پر مشتمل ہے:

۱- شعبۂ قراءات ۲- شعبۂ علوم قرآن

شعبہ قراءات کے اختصاص میں یہ مضامین داخل نصاب ہیں:

۱- القـراء ات المتواتره نظرياً وعملياً من طريقي العشرة الصغرى. العشرة الكبرى

۲- القراء ات الشاذة وتوجيها

۳- التحرير والعز و (تحرير أوجه طرق القراء ات وعزوها الى رواتها

۴- الوقف والابتداء

۵- الفواصل

۶- توجیه القراء ات المتواترة

۷- تاریخ القرآن والقراء ات

۸- تاریخ المصحف

۹- الرسم العثمانی والضبط

۱۰- اللهجات

۱۱- الأصوات

شعبہ علوم قرآن کے اختصاص میں یہ مضامین داخل نصاب ہیں:

۱- التفسیر

۲- علوم القرآن الکریم

۳- مناهج المفسرین

۴- اعجاز القرآن الکریم والبلاغة القرآنية

۵- الدلالات اللغوية والأساليب القرآنية

۶- دفع المطاعن عن القرآن والقراء ات

۷- النحو واعراب القرآن

طریقہ تدریس وتقویم:

لکچرس ومناقشہ، تحریری وزبانی امتحان، بحث کی تمرین وغیرہ۔

☆ ماسٹر ڈگری ان قراءات وعلوم قراءات (درجة التخصص "الماجستر" فی القراء ات وعلومها)

مدت تعلیم: کم ازکم تین سال، دوسال طالب علم کی اختصاص کی تعلیم کے لئے اور ایک سال مقالہ کے لئے، مقالہ کا اعلانیہ مناقشہ ضروری ہے جس کے کم ازکم دومشرف ہوتے

ہیں۔ یہ مدت قانونی کارروائی کے بعد مشرف کی اجازت و درخواست پر مزید بڑھائی جا سکتی ہے لیکن پورا مرحلہ آٹھ سال سے زیادہ نہ ہو۔ پاس ہونے والے طالب علم کو''ماسٹر'' کی ڈگری تفویض ہوتی ہے حقیقی معنی میں یہ ماسٹر اور ایم فل کو شامل ہے، مقالہ کی کارروائی پی ایچ ڈی ہی کی طرح ہے۔ داخلہ کے لیے کلیۃ القرآن کی عالیہ کی ڈگری ضروری ہے یا اس کے مساوی و معادل ڈگری بشرطیکہ طالب علم حفظ قرآن کریم میں امتحان قبول تحریری و زبانی (داخلہ ٹیسٹ) کو پاس کرے۔

نقشہ تعلیمی نظام اوقات برائے فاضل:

☆ ڈاکٹریٹ ڈگری ان قراءت و علوم قراءت (درجة العالمية ''الدكتوراه'' في القراءات وعلومها)

مدت تعلیم: کم از کم دو سال تاریخ رجسٹریشن سے زیادہ سے زیادہ چھ سال۔ یہ مدت قانونی کارروائی کے بعد مشرف کی اجازت و درخواست پر مزید بڑھائی جا سکتی ہے لیکن پورا مرحلہ بارہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ مقالہ کے رجسٹریشن و مناقشہ و اشراف و دیگر طریقہ کار و قوانین و کارروائی کے بعد پاس ہونے والے طالب علم کو''پی ایچ ڈی'' کی ڈگری تفویض ہوتی ہے، داخلہ کے لیے کلیۃ القرآن کی ماسٹر یا اس کے مساوی و معادل ڈگری ضروری ہے۔(۲)

جامعہ ازہر کی مختلف فیکلٹیوں کے شعبہائے تفسیر میں قرآن و قراءات کی تعلیم

☆ کلیۃ أصول الدین، جامعۃ الازہر القاہرہ، المنصورہ....

تخصصات: چار شعبوں میں ہوتا ہے اور بیچلر ڈگری کے تیسری سال سے شروع ہوتا ہے:

۱- تفسیر و علوم القرآن ۲- حدیث و علوم حدیث ۳- عقیدہ و فلسفہ
۴- دعوت اور اسلامی ثقافت

شعبہ تفسیر و علوم قرآن میں تفسیر، علوم قرآن، مناہج مفسرین، دخیل تفسیر وغیرہ

مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔(۳)، اسی طرح از ہر شریف تمام تعلیمی مراحل میں تفسیر واصول تفسیر سے طالب علموں کو ضرور واقف کراتا ہے، چاہے وہ علمی شعبے ہوں یا ادبی۔

مبحث ثالث: ملیشیا میں قرآنی تعلیم کا جائزہ

ملیشیا ان خوش قسمت ملکوں میں سے ایک ہے جس نے از خود اپنی مرضی سے تاجر داعیوں کی دعوت پر لبیک کہا اور آج عالمی سطح پر ایک باعزت ملک کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا مضبوط تعلیمی نظام دنیا بھر میں مشہور ہے، قرآن وحدیث کی اہمیت کے پیش نظر تعلیم اسلامی، قرآن کریم کی تعلیم کو بہت منظّم تربیتی طریقہ سے انجام دیا جاتا ہے، یہاں پر صرف جامعہ اسلامیہ میں تعلیم قرآن زیر بحث ہوگی۔

☆ جامعہ اسلامیہ عالمیہ میں قرآنی تعلیم ایک تعارف

☆ کلیۃ معارف وحی وانسانی علوم، جامعہ اسلامیہ ملیشیا اور قرآنی تعلیم مراحل ونصاب

Kulliyyah of Islamic Revealed and Human Sciences

اس فیکلٹی میں دو ڈپارٹمنٹس ہیں: ایک علوم انسانی (Human Sciences)

دوسرا معارف وحی اسلامی (Bachelor of Islamic Revealed knowledge & Heritage (Honours))، ہر ایک شعبے میں تعلیم دو مرحلوں میں منقسم ہے، پہلا مرحلہ عالیہ (جامعی) اور دوسرا مرحلہ علیا ہے، پہلے ڈپارٹمنٹ کے پہلے مرحلہ کے بیچلر ان قرآن اینڈ سنہ اسٹڈیز میں شعبے ہیں:

۱- عربی زبان (Arabic Language, Literature & Linguistic)

۲- فقہ (Islamic Jurisprudence)

۳- دراسات قرآن وسنت (Quran & Sunnah Studies)

۴- اصول دین وتقابلی مطالعہ (Usul al-Din & Comprative Religion)

دوسرا مرحلہ ماسٹر ان قرآن اینڈ سنۃ اسٹڈیز اور پی ایچ ڈی)(۴)

مبحث رابع: ہندوستان میں قرآنی تعلیم کا جائزہ

ہندوستان میں قرآن کریم کو دخول اسلام سے آج تک بہت اہمیت حاصل رہی ہے، البتہ مسلم دور حکومت کے بعد یہ تعلیم عام طور پر آزاد غیر حکومتی اسلامی مکاتب ومدارس کے ذریعہ انجام دیجاتی ہے، البتہ یہاں پر چند حکومتی مسلم ادارے ہیں جہاں پر اس کی طرف توجہ بہت اہمیت کی حامل ہے، ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے، اللہ تعالیٰ نے سرسید رحمۃ اللہ علیہ کے چمن کو پائدار وپھل دار بنایا ہے، اس میں قرآنی تعلیم کا تعارف مذکورہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قرآنی تعلیم، ایک تعارف:

یہ وہ مبارک ادارہ ہے جہاں پر تھیالوجی کے علاوہ کے۔اے۔نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز صرف قرآنی تعلیم وریسرچ کا متخصص ادارہ ہے، امید ہے کہ آنے والے ایام میں اپنے میدان میں عالمی معیار کا واحد مرکزی ادارہ ہوگا۔

☆ فیکلٹی آف دینیات اے ایم یو علی گڑھ اور قرآنی تعلیم مراحل ونصاب

فیکلٹی میں دو شعبے ہیں:

۱- سنی دینیات ۲- شیعہ دینیات

دونوں میں مرحلہ عالیہ وعلیا وڈاکٹریٹ نیز سارٹیفکٹ وڈپلومہ کورسز چلائے جاتے ہیں۔ سنی دینیات کے مرحلہ عالیہ میں قرآن وعلوم قرآن کی تعلیم بذریعہ تفسیر، مطالعہ قرآن، علوم تفسیر جیسے مضامین کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہی حال تقریباً شیعہ تھیالوجی کے نصاب تعلیم میں بھی ہے صرف مقرر کتابوں میں فرق ہے۔(۵)

سارٹیفکیٹ وڈپلوما کورسز

دونوں ہی شعبوں میں سارٹیفکیٹ ان قراءات اور ڈپلوما ان قراءات کورسز ہیں۔

مرحلہ علیا

مرحلہ علیا (M.th) کی تعلیم چارس سیمسٹرس پر مبنی ہے، اس میں تعلیم قرآن وعلوم

قرآن بذریعہ مندرجہ مضامین ہوتی ہے:

پہلے سمسٹر میں تفسیر واصول تفسیر(Tafseer wa usool-e- Tafseer I)

دوسرے سیمسٹر میں تفسیر واصول تفسیر(Tafseer wa usool-e- TafseerII) تیسرے سیمسٹر میں(Mutalia -e- Quran I)چوتھے سیمسٹر میں(Mutalia -e- QuranII)

شعبہ دینیات کے مرحلہ عالیہ میں قرآن وعلوم قرآن کی تعلیم

مرحلہ علیا (M.th) کی تعلیم چار سیمسٹرس پر مبنی ہے، اس میں سے صرف پہلے دو سیمسٹر میں تعلیم قرآن بذریعہ مندرجہ مضامین ہوتی ہے:

پہلے سیمسٹر میں تفسیر واصول تفسیر(SHM7001 Tafseer wa usool-e- Tafseer)

دوسرے سیمسٹر میں مناہج تفسیر (SHM8001 Manahij-e-Tafseer)(۶)

خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن اے ایم یو علی گڑھ اور قرآنی تعلیم مراحل ونصاب

یہ اے یم یو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک عظیم الشان اقدام ہے کہ اس نے ہندوستانی یونیورسٹیز میں پہلا تاریخی اقدام کیا اور قرآنی علوم وسائنسز میں اختصاصی مرکز کا قیام کیا جس کا مقصد عالمی معیار کا قرآنی ریسرچ وتعلیم کا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے، یہ ایک نیا سینٹر ہے، پانچ سرٹیفکیٹ کورسز ڈزائن کیے گئے ہیں۔

۱- قرآنی عربی(Quranic Arabic)

۲- قرآنی علوم(Introduction to Quranic Sciences)

۳- قرآنی تعلیم بذریعہ لینگویج لیب(earning Quran (Language Lab)

۴- تجوید(Recitation of Quran (Tajwid))

۵- قراءات(Recitation of Quran (Qirat))(۷)

خاتمہ:

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ:

۱- قرآن کریم کی تعلیم عالم میں جاری ہے۔

۲- عصری درسگاہیں بھی اس کی تعلیم کا اہتمام کرتی ہیں۔

۳- عالم اسلام کی عصری درسگاہوں میں حفظ قرآن کو بھی بڑی اہمیت دیجاتی ہے۔

۴- عصری درسگاہوں میں مختلف شعبوں وفیکلٹیوں میں اس کی تعلیم ہوتی ہے، بعض میں صرف اس کی تعلیم کی تخصصی تعلیم کا اہتمام ہے۔

۵- عالم عرب کی نصاب تعلیم میں شبہ یکسانگی پائی جاتی ہے۔

٦- ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس سلسلہ میں قابل مدح ہے۔

۷- عصری درسگاہوں کا نظام ونصاب تعلیم ہندوستانی دینی مدارس کے نظام ونصاب سے مختلف ہے، اگرچہ بنیادیں یکسانگی ہو۔

المراجع

۱- قرآن کریم

۲- صحيح البخارى لامام محمد بن اسماعيل البخارى ت ۲۵٦ هـ مع شرحه فتح البارى للحافظ ابن حجر، بتحقيق: محب الدين الخطيب، وترقيم: فؤاد عبد الباقى، المكتبة السلفية، ودار الريان، القاهرة، الطبعة الثالثة، ۱۴۰۷

۳- فتح البارى للحافظ ابن حجر، بتحقيق: محب الدين الخطيب، وترقيم: فؤاد عبد الباقى، المكتبة السلفية، ودار الريان القاهرة، الطبعة الثالثة، ۱۴۰۷

۴- فضائل مصر واخبارہا لابن زولاق، مکتبہ الاسرۃ، مصر، ۱۹۹۹ء فضائل مصر الکندی ایضاً

۵- سياسة التعليم فى المملكة العربية السعودية.

٦- الائحة الداخلية لتنظيم مدارس تحفيظ القرآن الكريم للمراحل

الثلاث: الابتدائية والمتوسطة والثانوية- وزارة المعارف

۷- حفظ القرآن الكريم وتعليمه فی جميع مراحل التعليم والتعليم الجامعی (تقرير) اعداد. حمد بن ناصر بن عبد الرحمن العمار الاستاذ المشارك وعميد كلية الدعوة والاعلام بجامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامية

۸- المناهج الدراسية بالجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة از عمادة البحث العلمی، ۱۴۲۲ھ ۲۰۰۲م و

http://www.iu.edu.sa/colleges/our/About/Pages/default.aspx

۹- / /

http://www.ahlalhdeeth.com/vb/showthread.php?t=142132,http:
alquirat.montadamoslim.com

۱۰- دليل الكلية از كلية القرآن الكريم للقراء ات وعلومها بمدينة طنطا التابعة بجامعة الأزهر ص: ۱-۱۷.

http://www.facultyofquran.edu.eg/.

۱۱- http://www.azhar.edu.eg/osolbfac_mansora/branches.htm
'http://www.elazhar.com/azharux/about.asp

۱۲- http://www.jjum.edu.my/irkhs/programmes

۱۳- مناہج سنی وشیعہ تھیالوجی، ڈپارٹمنٹ آف سنی/ فیکلٹی آف تھیالوجی اے ایم یو علی گڑھ۔

۱۴-

Faculty of Theology on Move, A Brief Report 2008-2009, Aligarh Muslim University Aligarh 202002 (India)

۱۵-

http://www.amucontrollerexams.com/courses.html

قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم-مختلف طریقہ ہائے تدریس کا جائزہ

عبدالبر اثری فلاحی

حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ علم اٹھ جائے گا'' اس پر ایک انصاری بول اٹھے ''علم کیسے اٹھ سکتا ہے جب کہ کتاب اللہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں تک کو اس کی تعلیم دیتے ہیں'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں تو تجھے مدینے کے داناؤں میں خیال کرتا تھا'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کا ذکر فرمایا جو کتاب اللہ کی موجودگی میں گمراہ ہو گئے''۔ [1]

اس روایت کو جب سے میں نے پڑھا ہے، اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس روایت میں ہمارے احوال کی پوری عکاسی کی گئی ہے۔ جو حال کتاب اللہ کی موجودگی میں اہل کتاب کا تھا تقریباً وہی حال قرآن کی موجودگی میں ہمارا ہے اور جس غلط فہمی کا شکار انصاری تھے، اسی غلط فہمی کا شکار آج تمام مسلمان ہیں کہ صرف قرآن کی رسمی تعلیم بلکہ صرف ناظرہ قرآن سیکھنے اور سکھانے پر قانع و مطمئن ہیں۔ مقصد نزول قرآن — ہدایت — کے حصول کا تو خیال تک نہیں آتا۔ قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو اور نئی نسل کو ڈھالنا تو دور کی بات ہے۔ حالانکہ خود ناظرہ قرآن سیکھنے سکھانے کی کوششیں بھی انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق مدراس و مکاتب (خواہ وہ کل وقتی ہوں یا جز وقتی) کے ذریعہ صرف ۲۰ یا ۲۵ فیصد بچے ہی سیکھ سکھا رہے ہیں بقیہ سرکاری اداروں اور پرائیوٹ اداروں میں تعلیم پانے والے ۷۵ رفیصد بچے قرآن کی تعلیم سے نابلد ہیں۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ہر ایک کے لئے قرآن کی تعلیم کا جامع منصوبہ بنایا جائے اور ایسی تحریک چلائی جائے کہ ہر ایک

ضروری حد تک قرآن سیکھ اور سکھا سکے اور اپنے آپ کو اور اپنی آل واولاد کو قرآن کے رنگ میں رنگ سکے۔منصوبہ بندی سے پہلے موجودہ نظام اور طریقہ کار کا جائزہ ضروری ہے، اس لئے ذیل کے سطور میں اس پر روشنی ڈالی جارہی ہے اور تجاویز بھی پیش کی جارہی ہیں تاکہ اس کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکے۔گفتگو کا مرکز چونکہ صرف قرآن کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم ہے اس لئے سب سے پہلے اس کا دائرہ سمجھ لینا ضروری ہے۔قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم کے دائرے میں چار چیزیں آتی ہیں:

(۱) ناظرہ قرآن (۲) حفظ قرآن (۳) ترجمہ قرآن (۴) تعلیمات قرآن

۱- ناظرہ قرآن:

ناظرہ قرآن کی تعلیم ایک نرالا تجربہ اور عمل ہے۔دنیا کی کسی زبان کی تعلیم حروف شناسی سے آگے بغیر سمجھے ایک قدم نہیں بڑھتی لیکن قرآن مجید سے بے مثال لگاؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ بے سمجھے الفاظ بھی پڑھے جاتے ہیں۔آیات بھی پڑھی جاتی ہیں حتی کہ زبانی یاد بھی کرلی جاتی ہیں اور گاہے بگاہے زندگی بھر پڑھی جاتی رہتی ہیں۔یقیناً اس کا فائدہ ہے کہ ہمارا قرآن سے تعلق قائم ہے۔نماز اور دیگر عبادات میں قرآن اور دعائیں اصلی عربی میں پڑھنے کے لائق ہم ہو جاتے ہیں۔لیکن ان فوائد کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہیں۔ ناظرہ قرآن سیکھنے کو ہی ہم نے قرآن کی تعلیم سمجھ لیا ہے چنانچہ نہ سمجھنے کی فکر لاحق ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے رہنمائی حاصل کرنے اور اپنے آپ کو اس کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش ہوتی ہے جو قرآن مجید کے مقصد نزول ہدایت کے سراسر خلاف ہے۔ غالباً اسی لئے مولانا مودودیؒ نے ناظرہ قرآن کے اس طریقہ تعلیم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔خود مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ان کے درد کو ملاحظہ فرمائیں ”میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی، جس کو بعد میں میں نے بُری طرح محسوس کیا۔وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے بھی سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھا کر قرآن مجید پڑھوایا گیا۔یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور آج تک کئے جارہے ہیں۔اس کا نقصان یہ ہے کہ بچہ دنیا کی ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھتا ہے مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک

ایسی کتاب ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں۔اس غلط طریقے کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن مجید کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چل کر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی، اس وقت بھی برسوں تک قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا رہا۔۲۱ برس کی عمر میں مجھ کو پہلی دفعہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جائے اور انہیں قرآن اس وقت پڑھایا جائے جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ سکیں''۔[۲]

اسرار عالم صاحب نے تو اس طریقہ کار کو دشمنان اسلام کی سازش لکھا ہے۔ کیونکہ اس سے قرآن سے براہِ راست اثر پذیری کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ بے معنی الفاظ کے پڑھنے میں جو زحمت اور مشکلات پیش آتی ہیں وہ الگ۔ بے سمجھے فن تجوید کی مشکل اصطلاحات کو ہضم کرنا کتنا گراں ہوتا ہے وہ اس راہ کے راہی ہی بتا سکتے ہیں۔گرچہ سہولت پیدا کرنے کے لئے کچھ نئے اور دوسرے طریقے بھی وضع کئے گئے ہیں لیکن وہاں دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

☆ ناظرہ قرآن کی تدریس کے دو طریقے رائج ہیں:

الف: ناظرہ قرآن مع قواعد قرأت و تجوید:

اس طریقے میں قرأت و تجوید کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ناظرہ قرآن سکھایا جاتا ہے اور مشق کرائی جاتی ہے۔اس سلسلے میں سب سے زیادہ دو کتابوں سے مدد لی جاتی ہے''نورانی قاعدہ''اور''یسّرنا القرآن''ان کے علاوہ''جمال القرآن''مولانا اشرف علی تھانویؒ،''فوائد مکیہ''عبدالرحمٰن مکی اور''مفتاح القرآن''مولانا محفوظ الرحمٰن نامی وغیرہ کتابیں بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہیں۔اہل حدیث حلقے میں''تحبیر التجوید''محمد عاصم قاری اور شیعہ حلقے میں''تجوید القرآن''پڑھائی جاتی ہے۔

اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ عربی زبان کی باریکیوں کے مطابق پڑھنے والا پڑھنا سیکھتا ہے اور ادائیگی کی غلطیاں نہیں ہوتیں لیکن نقصان یہ ہے کہ فنی باریکیاں سیکھنے کے لئے بہت سے غیر مستعمل الفاظ کا بوجھ بھی بچوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔اسی طرح فنی باریکیوں کو

گرفت میں لانے کے لئے اتنی توجہ دینی پڑتی ہے کہ تعلیمات قرآن اور ہدایت قرآن سے ذہول ہو جاتا ہے بلکہ تکلف آفرینی ایسی ہوتی ہے کہ فطری انداز مار کھانے لگتا ہے۔ چنانچہ انہی خرابیوں سے بچانے کے لئے کچھ اہل علم نے دوسرا طریقہ وضع کیا ہے۔

ب: ناظرہ قرآن بغیر قواعد قرأت و تجوید:

اس طریقے میں ہجاء سے زیادہ تلفظ کی ادائیگی کی مشق پر توجہ دی جاتی ہے اور دوسری زبان کی مدد سے رواں پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ اس طریقے میں اصطلاحات اور تکلف کی پیچیدگیوں سے پڑھنے والا آزاد ہو جاتا ہے۔ اس طریقے کی سب سے کامیاب کتاب مولانا سید حامد علیؒ کی تیار کردہ کتاب ''تیسیر القرآن'' ہے۔ اس طریقے میں وقت کی بچت بھی ہوتی ہے، اور طلبہ سہولت بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن نقصان یہ ہے کہ طلبہ فنی باریکیوں سے آگاہ نہیں ہوتے۔

ان دونوں طریقوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے ایک تیسری کوشش ڈاکٹر ف۔ عبدالعزیز عبدالرحیم (سابق استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کی کتاب ''التبیان'' (قرآنی قاعدہ) آئی ہے جو ایک بہترین کوشش کہی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں اسے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے شائع کیا ہے۔ لیکن اسے پڑھانے کے لئے استاذ کی تربیت اور مشق پر توجہ انتہائی لازمی ہے۔

۲۔ حفظ قرآن:

اللہ کا فضل ہے کہ امت کے اندر حفظ قرآن پر کافی توجہ ہے۔ گرچہ امراء کے یہاں کم ہے لیکن غرباء کے یہاں زیادہ ہے۔ آپ دنیا میں کہیں چلے جائیں ہر جگہ آپ کو حافظ قرآن مل جائیں گے۔ البتہ حفظ قرآن کے طریقہ کار میں مشرق و مغرب میں فرق ہے۔ مشرق میں ناظرہ قرآن کے بعد حفظ کرایا جاتا ہے پھر فہم قرآن کی کوشش شروع ہوتی ہے یا پھر صرف حفظ پر قناعت کر لیا جاتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بچپن میں حافظہ مضبوط ہوتا ہے اس لئے حفظ میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن بغیر سمجھے حفظ قرآن کے بھی ویسے ہی برے اثرات سامنے آتے ہیں جیسے ناظرہ قرآن کے۔ نہ خود کوئی اثر قبول کر پاتے ہیں اور نہ

ہی سامع پر کوئی اثر ڈال پاتے ہیں۔ پڑھنے پڑھانے میں معنوی غلطیاں اس پر مستزاد ہیں۔اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ذرا حضرت عمرؓ کا درج ذیل طرز عمل ملاحظہ فرمائیں:

''عراق کے بعض گورنروں نے حضرت عمرؓ کے پاس یہ اطلاع دیتے ہوئے خط لکھا کہ کچھ لوگوں نے کتاب اللہ کو حفظ کرلیا ہے۔تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ ان کا وظیفہ مقرر کردو۔ پھر طالبین قرآن کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو ایک گورنر کی جانب سے ان کو خط ارسال کیا گیا کہ سات سو لوگوں نے قرآن مجید کو حفظ کرلیا ہے۔تو حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ تفقہ فی الدین سے قبل قرآن مجید کے حفظ کے سلسلے میں جلد بازی کرنے لگیں گے اس لئے انہوں نے لکھ بھیجا کہ وہ انہیں کچھ نہ دیں''۔ ۳؎

اسی طرح امام مالکؒ سے سات برس کے ایک بچے کے متعلق دریافت کیا گیا جس نے قرآن حفظ کرلیا تھا تو انہوں نے فرمایا ''میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا ہوں''۔ ۴؎

ہمارے یہاں عموماً حفاظ ہی امام ہوتے ہیں۔تراویح میں قرآن پڑھنے کا جو انداز وہ اپناتے ہیں اور جس طرح کی بھونڈی غلطیاں وہ کرتے ہیں اس کو سامنے رکھنا اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔اسی کا شاخسانہ ہے کہ بہت سی نئی چیزیں لزوم کی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔مثلاً تراویح میں آیات سجدہ پر امام کا مقتدی کو پہلے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ذرا فتاویٰ رحیمیہ کا ایک استفتاء ملاحظہ فرمائیں:

''سوال: تراویح میں سجدۂ تلاوت کا اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں رکعت میں سجدہ ہے اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟''

''جواب: خیر القرون میں عرب وعجم میں کثیر تعداد میں جہلاء اور نو مسلم ہونے کے باوجود سلف صالحین سے اعلان ہذا ثابت نہیں حالانکہ وہ اسلامی اعمال کی تبلیغ میں نہایت چست اور عبادات کی درستگی کے بڑے حریص تھے۔فقہاء نے بھی اس طرح کے اعلان کی ہدایت نہیں کی ہے اگر ضرورت ہوتی تو ضرور تاکید فرماتے جیسے کہ مسافر امام کو خصوصی طور پر تاکید فرمائی ہے کہ نمازیوں کو اپنے مسافر ہونے کی اطلاع دے دے، چاہے نماز سے پہلے ہو یا بعد میں کہ ''میں مسافر ہوں'' کیونکہ یہاں ضرورت ہے لیکن سجدۂ تلاوت میں عام طور

پر ایسی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر بلا ضرورت یہ طریقہ جاری رہا تو قوی اندیشہ ہے کہ جس طرح بعض شہروں کا رواج ہے کہ نماز جمعہ کے وقت اعلان کیا جاتا ہے "الصلوٰة سنة قبل الجمعة " یا یہ کہا جاتا ہے "انصتوا رحمکم الله " اور دوسرا اعلان سنت یا فعل حسن سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سجدہ تلاوت کا یہ اعلان بھی ضروری اور یہ بھی ممکن ہے سنت سمجھا جانے لگے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ مباح چیز کو ضروری سمجھنے سے دیگر خرابی کے سواء اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مباح کو مسنون سمجھ لیا جائے اور غیر مسنون کو مسنون سمجھ لینا تحریف دین ہے ("ازالۃ الخفاء" مجلس نمبر ۵) البتہ اگر مجمع کثیر ہو جیسا کہ بڑے شہروں میں ہوتا ہے کہ صفیں دور تک ہوتی ہیں۔ کچھ صفیں بالائی منزل میں بھی ہوتی ہیں اور وہاں مغالطہ کا قوی احتمال رہتا ہے کہ لوگوں کو سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلے اور سجدہ کے بجائے رکوع کرنے لگیں تو ایسے موقع پر بے شک بموجب "الضرورات تبیح المحذورات" اعلان کی اجازت دی جا سکتی ہے مگر ہر جگہ کا یہ حکم نہیں ہے۔ ہمارے یہاں اس کی (اعلان کی) ضرورت نہیں میرا اپنا برسوں کا تجربہ ہے لہٰذا اس کا ترک ضروری اور اس کی پابندی غلط ہے"۔ [۵]

مشرق میں جو طریقہ رائج ہے اس میں درج ذیل خامیاں ہیں:

(۱) طریقہ مشکل ہے کیونکہ کسی چیز کو سمجھنے کے بعد یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس طریقہ میں بغیر سمجھے یاد کرنا ہوتا ہے جو مشکل کام ہے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ وہ یاد کرا دیتا ہے۔

(۲) بغیر سمجھے یاد کرنے کی وجہ سے معنوی غلطیوں سے بچنا ممکن نہیں۔

(۳) اثر پذیری اور اثر اندازی ممکن نہیں ہوتی چنانچہ وہ تلاوت قرآن کی حلاوت سے محروم رہتا ہے۔

(۴) ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سے تخلیقی صلاحیتیں مجروح ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں اسلاف کا جو طریقہ تھا اور جسے مغرب میں رہنے والوں نے اختیار کیا ہے وہی بہتر ہے کہ پہلے قرآن سمجھا جائے پھر حفظ کیا جائے۔ اس طریقے میں قرآن

کے مقصد نزول ''ہدایت'' کے حصول کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ حفظ میں آسانی ہوتی ہے۔ وقت کا ضیاع نہیں ہوتا ہے چنانچہ حسن البناءؒ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا ''لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ حفظ قرآن مجید پہلے مرحلے کی تعلیم کا جز ہے، اس وجہ سے کہ اس عمر میں قوت حافظہ اور یاد رکھنے کی صلاحیت قوی ہوتی ہے اور اس کے بعد اس کو یاد کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ بات عرف عام کی صورت اختیار کر چکی ہے، لوگ اس کی مخالفت کرنے میں بہت حرج محسوس کرتے ہیں اور ان کو ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کا ضیاع ہے۔ آپ دوسرے پہلو سے دیکھیں کہ اس عمر میں طلبہ کا پورے قرآن مجید کو حفظ کرنے میں مشغول رہنا ان کی بہت سی عقلی صلاحیتوں کو کام میں لانے سے محروم کر دیتا ہے اور ان کی بہت سی نفسیاتی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے، اور ان کے ذہنوں اور دلوں میں قرآن ایسے الفاظ کی شکل میں مرتسم ہوتا ہے، جو بے معنی ہیں۔ اور آئندہ زندگی میں انہیں بغیر غور و فکر کے پڑھنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس طریقے سے اگرچہ وہ قرآن مجید کا حافظ بن کر نکلتا ہے تاہم قرآن پر تدبر اور اس کے معانی و مقاصد پر تفکر کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔'' [۶]

جامعہ ازہر مصر جو سب سے قدیم یونیورسٹی ہے وہاں حفظ قرآن کا یہی طریقہ رائج ہے اور کامیاب ہے۔ وہاں کے طریقہ کار میں تو یہ بات بھی شامل ہے کہ حافظ رسم الخط سے بھی آگاہ ہو چنانچہ وہاں حفاظ کا تحریری امتحان بھی لیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی کے بعد سر ٹیفکیٹ دی جاتی ہے۔ [۷]

پاکستان میں کچھ مقامات پر اس طریقہ کا تجربہ کیا گیا اور وہ زیادہ بہتر اور مؤثر رہا ہے۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ تفصیلات کے دیکھئے ''سیارہ ڈائجسٹ'' قرآن نمبر ،لاہور پاکستان۔ مضمون قرآنی خدمت کی ایک خاموش تحریک از حافظ نذر محمد صفحہ: ۲۰-۳۲۔

۲- ترجمہ قرآن:

قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلے میں ایک طریقہ تو وہ ہے جو ترجمہ قرآن مع مختصر تشریح پڑھانے کا ہے۔ یہ طریقہ عموماً مدارس میں رائج ہے۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جو عموماً کلاسز کی شکل میں یا مساجد میں یا انفرادی طور پر

سکھانے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی ابتدائی طور پر گرامر/صرف ونحو کی بنیادی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ایک ترتیب سے پورے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ سکھایا جاتا ہے۔ حسب ضرورت معلم اپنی طرف سے کہیں کہیں وضاحتی بیان دیتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو میں حافظ نذر احمد صاحب کا لفظی ترجمہ سب سے زیادہ مقبول و مستفاد ہے اور انگریزی میں The Glorious Qur'an ڈاکٹر شہناز شیخ و محترمہ کوثر کھتری کا ترجمہ رائج ہے۔ ان دونوں طریقوں سے فہم قرآن کی راہ تو کھلتی ہے اور تعلیمات قرآن تک رسائی بھی ہوتی ہے لیکن ان دونوں طریقوں میں بعض چیزیں محل نظر ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہوسکتا اس لئے ترجمہ سے اصل کی روح حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اصل کو کلام اللہ کی حیثیت حاصل ہے اور ترجمہ کو کلام انسان کی، ظاہر ہے کہ کلام انسانی کے ذریعہ کلام اللہ کی وسعت کا احاطہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ایک زبان سے دوسری زبان میں من وعن تمام باتیں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ہر زبان کا اپنا پس منظر، اپنا رنگ اور اپنا انداز ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ دوسری زبان میں بھی پایا جاتا ہو۔ جب تک دونوں زبانوں پر یکساں عبور نہ ہو تو ترجمہ کے ذریعہ مدعا کی منتقلی آسان نہیں۔ ترجمہ کی نزاکت کو سمجھنے کے لئے صرف اس ایک جملے کے ترجمہ پر غور کریں۔

آمنت باللہ   میں اللہ پر ایمان لایا   I believed in Allah

اس وضاحت سے صاف واضح ہے کہ ترجمہ کے بجائے اصل عربی سکھانا اور اصل سے تعلق جوڑنا ہی سب سے بہتر اور محفوظ و مطلوب طریقہ ہے۔ لیکن بدرجہ مجبوری اگر یہ طریقہ اختیار کرنا ہی ہو تو اس طریقہ میں پائے جانے والے نقائص کو دور کرنا ضروری ہے۔

☆ پہلے طریقے میں درج ذیل نقائص پائے جاتے ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے:

(۱) پورے قرآن کا ترجمہ کہیں نہیں پڑھایا جاتا۔ نصاب میں کہیں کہیں شامل بھی ہے لیکن عموماً مکمل نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے قرآن پر مجموعی نظر سے بچے محروم رہ جاتے ہیں۔ مکمل ترجمہ قرآن سیکھنے سکھانے کو یقینی بنانا چاہیئے۔

(۲) مدعا و مطلوب تک رسائی اس وقت ممکن ہے جب تک زباندانی پختہ نہ ہو عموماً زباندانی پختہ ہونے سے پہلے یہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔جس طرح ادھ پکا کھانا اپنا اثر دکھاتا ہے اسی طرح آدھی زبان دانی اپنا اثر دکھاتی ہے اور بہت مضحکہ خیز شکلیں سامنے آتی ہیں مثلاً ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے اپنے ترجمہ قرآن میں سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۱۶ ''اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا'' کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''ہم تو جا کر ایک طرح کی کبڈی کھیلنے لگے اور یوسفؑ کو ہم نے اسباب کے پاس چھوڑ دیا''۔

کبڈی ایک ہندوستانی کھیل ہے جس کے ذریعہ ''نَسْتَبِقُ'' کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

جبکہ اس کا مناسب ترجمہ دوڑ میں مسابقت ہے دوڑ میں آدمی دور نکل جاتا ہے جبکہ کبڈی ایک ہی دائرہ میں ہوتی ہے۔اس طرح کی بہت سی مثالیں مختلف تراجم سے نقل کی جاسکتی ہیں۔

(۳) چونکہ زباندانی پختہ نہیں ہوتی اس لئے کسی مترجم کے ترجمہ کا سہارا لیا جاتا ہے اور مترجم کے سارے نقائص بھی پڑھنے والوں کو منتقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فطری اور قرآنی رنگ کے بجائے مترجم کا رنگ چڑھتا ہے۔مختلف تراجم کو سامنے رکھا جائے تو بہتر تک پہنچا جاسکتا ہے۔

(۴) استاد عموماً کسی خاص رنگ میں رنگا ہوتا ہے تو وہ طلبہ کو بھی اس رنگ میں رنگتا ہے۔اس کا مزاج اگر ادبی ہے تو ادبی رنگ چڑھاتا ہے۔اس کا مزاج اگر کلامی ہے تو کلامی رنگ چڑھاتا ہے اس کا مزاج اگر فقہی ہے تو فقہی رنگ چڑھاتا ہے وغیرہ۔گویا بچہ جامع رنگ اور قرآنی رنگ میں رنگنے کے بجائے ان رنگوں میں رنگ جاتا ہے۔ اس لئے استاد کے اندر وسعت نظری پیدا کرنا چاہئے اور تدریس قرآن کی تربیت دی جانی چاہئے۔

(۵) ترجمے کی باریکیوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔قرآن کی روح اور تعلیم منتقل کرنے پر کم توجہ ہوتی ہے۔

(۶) اصول ترجمہ عموماً سکھائے نہیں جاتے بلکہ زیادہ زور لفظی ترجموں پر ہوتا ہے جس

کی وجہ سے عموماً ترجموں میں سلاست اور چاشنی نہیں ہوتی۔اس کے اصول بھی ابتداء میں بتانے چاہئیں اور عملی تطبیق سکھانی چاہئے۔

☆ دوسرے طریقہ میں درج ذیل نقائص پائے جاتے ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے:

(۱) ''نیم حکیم خطرہ جان'' کے مصداق ''نیم گرامر خطرہ زبان'' کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ابتدائی شدبد سے اتنا بڑا معرکہ سر کر لینا ممکن نہیں۔ یہ حقیقت سب سے پہلے پڑھنے والوں کو سمجھنا اور سمجھانا چاہئے اور انہیں تکمیل کی راہ دکھانی چاہئے۔ ناقص معلومات کو کامل سمجھ کر الجھنے کا رویہ انتہائی خطرناک ہے جس کی مثالیں عموماً سامنے آتی رہتی ہیں اس لئے یا تو مکمل گرامر سکھایا جائے یا پھر صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جائے۔

(۲) وضاحتی بیان چونکہ معلم کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے اس لئے وہی خرابی در آتی ہے جو معلم کے اندر پائی جاتی ہے۔ اور سیکھنا وسکھانا صاف وشفاف نہیں رہتا۔ معلم اگر اہل حدیث مزاج کا ہے تو وہ رنگ چڑھتا ہے۔تبلیغی مزاج کا ہے تو وہ رنگ چڑھتا ہے اور تحریکی مزاج کا ہے تو وہ رنگ غالب آتا ہے۔ وسعت نظری کے ساتھ اساتذہ کی تربیت کے بغیر اس مسئلہ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر ف۔عبدالعزیز عبدالرحیم ڈائرکٹر انڈر اسٹینڈنگ اکیڈمی حیدرآباد وسابق استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا مختصر کتابچہ ''قرآن کو سمجھئے آسان طریقہ سے'' شارٹ (مختصر مدتی) کورس بہت بہتر کوشش ہے اور طریقہ تدریس بھی مؤثر اپنایا گیا ہے۔اسے آزمانا چاہئے۔

۴۔ تعلیمات قرآن:

قرآن کی تعلیمات کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے لئے مختلف طریقے رائج ہیں:

(۱) سب سے معروف طریقہ تو دینیات کی تعلیم کا ہے۔لیکن اس میں خالص تعلیمات قرآن ہی نہیں ہوتیں بلکہ انسانی تجربات اور رجحانات کا بھی دخل ہوتا ہے، چنانچہ جتنی دینی تعلیم کی کتابیں ہیں ہر جگہ کوئی نہ کوئی چھاپ ضرور نظر آتی

ہے۔ براہ راست صرف قرآن کی تعلیمات سکھائی جائیں اس کا اہتمام کم پایا جاتا ہے۔ حالانکہ عافیت اسی راہ کو اپنانے میں ہے۔

(۲) تفسیر قرآن اور دروس قرآن کا طریقہ مقبول خاص و عام ہے لیکن یہاں بھی آمیزش اور رجحانات کا دخل نظر آتا ہے جس کی قید سے عموماً ادارے اور اساتذہ آزاد نہیں ہیں۔

(۳) دورہ حدیث کی طرح ''دورہ قرآن'' کا بھی طریقہ کہیں کہیں اختیار کیا جارہا ہے۔ دورے کا طریقہ عمومی آگاہی کے لئے تو موزوں کہا جاسکتا ہے لیکن حصول ہدایت کے لئے موزوں نہیں۔

دورہ قرآن کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے متعارف کرایا تھا۔ لیکن ایک دوسرا طریقہ بھی رائج ہے جو الھدیٰ انسٹی ٹیوٹ آف کینڈا (http://www.site.alhudainstitute.ca) نے متعارف کرایا ہے۔ لکچر کے ذریعہ تفہیم کرائی جاتی ہے اور سوال و جواب کے ذریعہ حل کرا کر ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ پہلے طریقے سے نسبتاً بہتر ہے۔ دھیرے دھیرے اب اسے قبول عام حاصل ہورہا ہے۔

(۴) اسی سے ملتی جلتی چیز ایک اور سامنے آئی ہے یعنی کوئز کے پیرائے میں قرآنی تعلیمات کو پیش کرنے کا۔ چنانچہ اس نہج پر ڈاکٹر ذوالفقار کاظم کی تیار کردہ ''قرآن حکیم انسائیکلوپیڈیا'' فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی ہے، لیکن اس کا تجربہ وسیع پیمانے پر''فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ممبئی'' کررہا ہے۔ مختلف سورتوں کو کوئز کے پیرائے میں ڈھال کر اسے یاد کرایا جاتا ہے اور مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کوئز اور عم پارہ کوئز اس نے تیار کرائے ہیں دیگر سورتوں کی تیاری بھی جاری ہے۔ اس نئے انداز کو کافی پذیرائی مل رہی ہے اور تعلیمات قرآن کو عام کرنے کا بہترین وسیلہ ثابت ہورہا ہے۔ تعلیمات قرآن کو حالات پر منطبق کرکے پیش کرنے کا معاملہ انتہائی نازک اور مشکل ہے۔ کوئز کی شکل میں کسی نہ کسی درجے میں اس کی بھی رعایت ممکن نظر آتی ہے۔

قرآن کی ابتدائی تعلیم کی سب سے بہتر شکل تو وہ ہے جو ان چاروں پہلوؤں کو محیط ہوتا کہ وقت کی بچت بھی ہو۔ انتشار ذہن سے بھی بچا جا سکے اور جامع انداز میں بچے کی ضرورت کی تکمیل ہو جائے۔ اس سمت میں اب تک کوئی پختہ کوشش سامنے نہیں آئی ہے جسے قبول عام حاصل ہو حالانکہ اس ضرورت کو سبھی محسوس کر رہے ہیں جیسا کہ مختلف بیانات سے لگتا ہے۔ چونکہ یہ ایک بڑا اور مشکل کام ہے اس لئے کوئی جلدی ہمت نہیں جٹا پا رہا ہے۔ اس سلسلے کی دو کوششیں سامنے آئی ہیں پہلے ان کا جائزہ لے لیں پھر مطلوبہ کوشش کے خدوخال پر گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی کوشش اقرأ انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو، امریکہ کی ہے۔ جس کی سربراہی عالمی شہرت یافتہ ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد اللہ غازی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے جدید نصاب میں ان تمام پہلوؤں کو سمونے کی کوشش کی ہے اور تجربات کر رہے ہیں لیکن درج ذیل باتیں کھٹکتی ہیں:

(۱) نصاب کا خاکہ اور ڈھانچہ طویل ہے جو عام بچوں کے بس کی بات نہیں۔

(۲) ترتیب دیا ہوا نصاب جدید تکنیک کے مطابق ہے لیکن عام لوگوں تک جدید تکنیک پہنچی نہیں ہے اور نہ ہی رسائی آسان ہے۔

(۳) نصاب میں ہر چیز کو اسی تناسب سے جگہ دینا جو اسے ملنا چاہئے۔ اس میں کمی نظر آتی ہے۔ بعض پہلو ابھر گئے ہیں اور بعض پہلو دب گئے ہیں۔

(۴) امریکی تعلیمی نظام اور ماحول کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، اس لئے یہاں کے احوال میں کہیں کہیں فٹ بیٹھتا نظر نہیں آتا۔

ان تمام نقائص کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہ نصاب موجودہ حالات میں بسا غنیمت ہے۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے [8]

دوسری کوشش مفتی پنجاب وسابق استاذ دارالعلوم دیوبند مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب کی سامنے آئی ہے کتاب کا نام ہے ''قاعدہ تعلیم القرآن'' (تین حصے) جس میں حروف شناسی کے ساتھ سادہ انداز میں تجوید کے قواعد اور معانی کو سمجھانے کی بھی کوشش

کی گئی ہے بلکہ تحریر کے ذریعہ ذہن نشین کرانے کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔اس طریقہ تعلیم کے تجربے کے لئے انہوں نے دیوبند میں ''مرکز الجلیل لتحفیظ القرآن'' کے نام سے ایک ادارہ بھی ۱۵؍اکتوبر ۲۰۰۹ء میں قائم کیا ہے۔ پتہ ہے ۴/۲۳۵، شاہ رمز الدین اسٹریٹ دیوبند، 247554 ضلع سہارن پور (یوپی)۔

اس منصوبے کے مطابق ابھی صرف تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جنہیں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلاواسطہ ناظرہ وتجوید اور فہم کا راستہ کھولنے کی بہترین کوشش ہے۔ البتہ تعلیمات قرآن کا عکس اس میں نظر نہیں آتا ہے شاید اگلے حصوں میں اس کا اہتمام و التزام کیا گیا ہو۔

ان تمام مباحث اور تجزیے کی روشنی میں اب ہم یہ طے کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن کی ابتدائی تعلیم کا متوقع خاکہ کیا ہونا چاہئے۔اس سے پہلے کہ خاکہ پیش کروں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس خاکہ کی حیثیت مشورے کی ہے، اس میں حسب ضرورت حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے اور اس سے بہتر مشوروں کو اس میں شامل کر کے اسے اور مفید و قابل عمل بنایا جاسکتا ہے۔

(۱) قرآن کی ابتدائی تعلیم کو مرکزی اور لازمی حیثیت دی جانی چاہئے۔قرآن کے سرچشمہ علم وہدایت اور دنیا کی بہترین کتاب ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے۔اسے عام مضامین کی طرح ایک مضمون کی حیثیت نہیں دی جانی چاہئے۔

(۲) حروف شناسی کے بعد ناظرہ (ترتیل) حفظ (حسب ضرورت) ترجمہ (فہم و ہدایت کے لئے) اور تعلیمات سے آگاہی ساتھ ساتھ سکھانی چاہئے تاکہ قرآن سے تعلق کے ساتھ ساتھ قرآن کے اثرات بھی نمایاں ہوں۔آج کے حالات کے مطابق نصاب وضع کیا جانا چاہئے اور طریقہ کار بھی فطری اور دلچسپ اختیار کیا جانا چاہئے اس کا ایک رف نقشہ کچھ اس طرح ہوسکتا ہے۔

اس خاکہ کو دس مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر مرحلہ کے بنیادی پہلو کو پیش کیا جارہا ہے۔ضرورت پڑنے پر تفصیل بھی تیار کی جاسکتی ہے۔آخری دو مراحل کا تعلق تکمیل

سے ہے لیکن ابتدائی مراحل کو پختہ بنانے کے لئے ضروری ہے۔اس لئے ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

☆ حروف شناسی تصاویر کی مدد سے کی جائے ۔اصول اور قواعد کے بجائے براہِ راست صحیح مخارج کی ابتداء ہی سے مشق کرائی جائے۔معلم خود والہانہ انداز سے نمونہ پیش کرے اور طلبہ سے اجتماعی وانفرادی طور پر اتنی مشق کرائی جائے کہ وہ رواں پڑھنے لگیں۔ لکھنے کی بھی مشق کرائی جائے جس سے شکلیں بہتر انداز میں ذہن نشین ہوں گی۔

☆ الفاظ اور ان کا جوڑ با معنی ہو، بے معنی الفاظ پڑھنے اور پڑھانے سے گریز کیا جائے ۔ جوڑ کی شکلوں کو فطری اور دلچسپ پیرائے میں ذہن نشین کرایا جائے ۔کوشش رہے کہ زیادہ قرآن واحادیث کے الفاظ ہی استعمال ہوں اور اصول و قواعد مشکل پیرائے کے بجائے آسان انداز میں بتائے جائیں۔

☆ قرآنی قصص سنائے جائیں اور اس سے ملنے والی عبرتیں ونصیحتیں بتائی جائیں۔ چند پہلو اجاگر کر کے مزید پہلو معلوم کئے جائیں۔

☆ عمّ پارہ کی مختصر سورتیں یاد کرائی جائیں اور اس کے مضامین جدید اسلوب میں ذہن نشین کرائے جائیں۔مثلاً سورۃ الناس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

۱- اللہ کون ہے؟

رب الناس	یعنی انسانوں کی تربیت کرنے والا اور ان کے معاملات کی تدبیر کرنے والا۔
ملک الناس	یعنی جو لوگوں کا مکمل طور سے مالک ہے۔
اله الناس	یعنی جو لوگوں کا حقیقی معبود ہے۔وہی ان کی حفاظت کرتا ہے،اور انہیں پناہ دیتا ہے۔

۲- بندوں پر اللہ کے کیا حقوق ہیں؟

اللہ ہی سے پناہ طلب کرنا اور ہر مصیبت میں اسی سے التجا کرنا۔

۳- انسان کون ہے؟

اپنے رب کا غلام کیونکہ اللہ ''ملک الناس'' ہے

وہ کمزور ہے اور ہمیشہ اپنے رب کی حمایت کا محتاج ہے۔

اس کے اندر برائی قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور شیطانی کام کرسکتا ہے۔

۴- شیطان کون ہے؟ (من الجنۃ والناس)

وسوسہ ڈالنے والا، دبک جانے والا، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

۵- کیا ہمارا تعلق صرف دنیا سے ہے یا وسیع وعریض کائنات سے؟

ہمارے آس پاس کچھ ایسی مخلوقات بھی ہیں، جن کو ہم نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ مثلاً (جن)

۶- عملی کام

شیطان مردود سے ہمیشہ اللہ کی پناہ طلب کرنا۔

فوائد اور فضیلت کے پیش نظر سورۃ الناس کا کثرت سے مطالعہ کرنا۔

☆ ترجمہ قرآن کے اصول بتائے جائیں، نمونوں کی مشق کرائی جائے، شروعات قرآنی قصص سے کی جائے، پھر اخلاق وآداب والی آیات کا انتخاب کر کے انہیں پڑھایا جائے۔

☆ تعلیمات قرآن سے متعلق آیات کا انتخاب پڑھایا جائے بالخصوص ایمانیات (توحید، رسالت، آخرت، جنت وجہنم) عبادات ومعاملات وغیرہ مباحث پر مشتمل آیات کی تعلیم فطری انداز میں دی جائے۔

☆ علوم قرآن کی بنیادی معلومات بہم پہنچائی جائے۔ اصول وکلیات اور مثالوں تک محدود رہا جائے۔ جزئیات اور اختلافات سے گریز کیا جائے۔

☆ دورہ قرآن مکمل ترجمہ اور مختصر تشریحات کے ذریعہ ہوتا کہ بحیثیت مجموعی پورے قرآن پر ایک نظر ہو جائے اور حسب ضرورت پیش آمدہ معاملات میں متعلقہ آیات سے رجوع کرنا آجائے۔

☆ تخصص فی القرآن اس کے ذریعہ ماہرانہ صلاحیت بہم پہنچائی جائے اور عصر حاضر کے مختلف پیچیدہ مسائل میں غور وفکر اور رہنمائی کا ملکہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ تدریب فی القرآن مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق خدمات انجام دینے کی صلاحیت پیدا کرنے کیلئے ٹریننگ دی جائے البتہ ہر ایک کا محور قرآن ہو اور قرآن کی روشنی میں یہ چیز کیسے ممکن ہے اس کی صلاحیت سے آراستہ کیا جائے تا کہ قرآن کی مرکزیت اور عملیت کو ثابت بھی کیا جاسکے اور قرآنی قیادت و سیادت کے خلا کو پُر بھی کیا جاسکے۔

(۳) ابتداء ہی سے باریکیوں سے آگاہ کرنے کے بجائے عمومی پہلوؤں پر ہی توجہ دینی چاہیے۔ جس میں عمر اور علم کی سطح کا لحاظ ہو اور بتدریج اس کو گہرائی و گیرائی سے آشنا کرنے کا اہتمام ہو۔

(۴) قرآن کی تعلیم ہدایت کے نقطہ نظر سے ہو اور حالات پر تطبیق کا پہلو لامحالہ شامل رہے۔ قرآن سیرت ساز اور انقلاب انگیز کتاب ہے اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و رموز بتائے گئے ہیں جن سے واقفیت اور آج کے حالات میں رہنمائی کا حصول ضروری ہے۔

(۵) معلم کی تربیت کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان تھا ''قرآن کی تعلیم صرف وہی شخص دے جو زبان کا جانکار ہو''۹ اسی طرح ماہرانہ مقام کے لئے امام ابوحنیفہؒ حفظ قرآن کو ضروری سمجھتے تھے چنانچہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ امام محمدؒ، امام ابوحنیفہؒ کے علمی مجلس میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا ''کیا تم نے قرآن حفظ کیا ہے''؟ امام محمدؒ نے جواب نفی میں دیا تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا'' جاؤ پہلے حفظ کرو پھر محفل مباحثہ میں آؤ''۔ چنانچہ وہ رخصت ہو گئے اور پہلے حفظ مکمل کیا پھر مجلس میں حاضر ہونا شروع کیا۔۱۰ گویا فقہی رائے قائم کرنے اور لوگوں کی رہنمائی کے لئے وہ حفظ قرآن کو لازم سمجھتے تھے۔ کیا آج تعلیم قرآن کا فریضہ انجام دینے والوں کے لئے کوئی معیار قائم کرنے اور اس کے مطابق تربیت دینے کی ضرورت نہیں ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود رہنمائی فرمائی تھی کہ قرآن چار ماہرین قرآن سے سیکھو (۱) عبداللہ بن مسعودؓ (۲) سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ (۳) معاذ بن جبلؓ (۴) ابی بن کعبؓ۔

(٦) قرآن کی تعلیم کے سلسلے میں جو توجہ ناظرہ اور حفظ پر دی جاتی ہے۔اتنی ہی توجہ فہم اور تعلیمات سے آگاہی و ہدایت کے حصول پر بھی دی جانی چاہئے۔فہم قرآن کی راست کوشش کو خطرناک قرار دے کر محروم کرنا اچھا نہیں۔ جہالت کی صورت میں شدید گمراہی کا اندیشہ ہے جبکہ غور وفکر کی صورت میں اگر احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو خطرات مسدود ہو جاتے ہیں اور افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ابوالدرداءؓ کے پاس ایک شخص آیا اور خوش خبری سنائی کہ ''میرا بیٹا حافظ ہوگیا ہے۔ یہ سن کر ابوالدرداءؓ نے فرمایا'' اے اللہ اس کی مغفرت فرما قرآن مجید کی حفاظت تو محض اس شخص نے کی جس نے اس کو سنا اور اس کی اطاعت کی''[١١] گویا حفظ تو ذریعہ اور وسیلہ ہے اصل چیز ہدایت ورہنمائی اور اتباع کے ذریعہ آخرت کی کامیابی کا حصول ہے۔

حوالہ جات

١؎ علامہ ابن عبدالبرؒ مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی ''العلم والعلماء (جامع بیان العلم و فضلہ) ندوۃ المصنفین دہلی۔٦ جنوری ١٩٤٧ء صفحہ:١١٢

٢؎ ڈاکٹر سید اسعد گیلانی ـــ مولانا مودودیؒ سے ملئے ، مرکزی مکتبہ دہلی۔٢٥ ، فروری ٢٠١٠ء صفحہ:٤٩

٣؎ ڈاکٹر مجدی ہلالی مترجم رئیس احمد فلاحی، رجوع الی القرآن، ادارہ علمیہ اعظم گڑھ (یو پی) صفحہ ٢٠٦

٤؎ علامہ ابو بکر طرطوشی، الحوادث والبدع، صفحہ:٢٠٦

٥؎ سید عبدالرحیم لاجپوریؒ، فتاویٰ رحیمیہ، دارالاشاعت کراچی، پاکستان ٢٠٠٣ء جلد پنجم، صفحہ ١٩٩

۶۔ ڈاکٹر مجدی ہلالی مترجم رئیس احمد فلاحی، رجوع الی القرآن، ادارہ علمیہ اعظم گڑھ (یوپی) صفحہ:۳۱۹-۳۲۰
(منقول از: نظرات فی التربیۃ والسلوک، مقالات لحسن البنأ)

۷۔ انیس چشتی، بدلتی دنیا اور پیاسا تعلیمی عمل، مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد مہاراشٹر، اشاعت دوم اپریل ۲۰۱۲ء صفحہ:۸۹

۸۔ سہ ماہی ''نظام القرآن'' اعظم گڑھ جلد۱۲، شمارہ۴، صفحہ:۴۶تا۵۳ پر ڈاکٹر اشہد رفیق ندوی کا مضمون ''قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم ایک جدید نصاب اور تکنیک کا تعارف''

۹۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی، سیر الصحابہ (اسوہ صحابہ جلد دوم) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، جلد پنجم صفحہ۲۰۳، بحوالہ کنز العمال جلد۱، صفحہ۲۲۸

۱۰۔ محمد اویس سرور، ائمہ اربعہ کے دلچسپ واقعات، اریب پبلی کیشنز دریا گنج، نئی دہلی-۲ سن اشاعت ۲۰۱۰ء صفحہ۸۴، بحوالہ بلوغ الامانی صفحہ۵-۶

۱۱۔ ابوعبید، فضائل القرآن صفحہ:۷۳

فہم قرآن کے لئے علوم قرآن کا فہم ناگزیر ہے

محمد عمر اسلم اصلاحی

قرآن مجید انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس نے اسے اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر اس لئے نازل فرمایا کہ آپ ﷺ اسے عام انسانوں تک پہنچادیں اور لوگ اسے سمجھ کر پڑھیں اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی گزاریں۔ انسانوں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق جس جس قسم کی رہنمائی کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں ان تمام شعبوں سے متعلق تفصیلی رہنمائی فراہم کردی ہے۔ اب یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو پڑھیں، سمجھیں، اسے سے فائدہ اٹھائیں اور صحیح سمت میں زندگی کا سفر طے کریں۔

یوں تو قرآن مجید کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا اپنے ظرف اور صلاحیت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائے گا لیکن اس سے مکمل رہنمائی حاصل کرنے اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اس طرح مطالعہ کیا جائے جس طرح دنیا کی سب سے عظیم کتاب کا مطالعہ کیا جانا چاہیے اور اس طرح کا مطالعہ کرنے کے لیے قرآنی علوم کی معرفت ناگزیر ہے۔ کیوں کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ قرآن کیا ہے؟ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ وہ ہم کو کیا دینا چاہتا ہے؟ اس کے پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا رنگ وآہنگ کیا ہے؟ اس کا اسلوب وانداز کیا ہے؟ اس میں آفاق، انفس اور تاریخ سے بحث کیوں ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے نزول کی کیفیت کیا رہی ہے؟ اسباب نزول اور شان نزول کا مطلب کیا ہے؟ اس کے جمع وترتیب کب اور کیسے ہوئی؟ مکی اور مدنی سورتوں کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تلاوت کے آداب کیا ہیں؟ ناسخ اور منسوخ سے کیا مراد ہے؟ قرآن کے مفردالفاظ کا فہم کس قدر ضروری ہے؟ اس کی آیات کی تاویل کے کیا اصول

ہیں؟ اس کے فہم میں نظم کی کیا اہمیت ہے؟ قرآنی قسموں کی نوعیت کیا ہے؟ امثال قرآنی کا مقصود کیا ہے؟ حکمت قرآن کا مطلب کیا ہے؟ وغیرہ۔ اس وقت تک قرآن سے صحیح طور سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس حقیقت کے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ صحیح فہم قرآن کے لیے فہم علوم قرآن ناگزیر ہے۔

علوم قرآن کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا لیکن اس مختصر مقالہ میں ان تمام کا استقصا ممکن نہیں، اس لیے یہاں چند اہم اور بنیادی علوم سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر محض انہی علوم سے واقفیت بہم پہنچ جائے تب بھی فہم قرآن بہت حد تک آسان ہو جائے گا۔

اس مقالہ میں جن بنیادی علوم سے بحث کی جا رہی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

قرآن کے نام اور ان کی وجہ تسمیہ، کیفیت نزول قرآن، اسباب نزول، جمع و ترتیب قرآن، مکی اور مدنی سورتیں، آداب تلاوت، ناسخ اور منسوخ، مفردات قرآن، نظم قرآن، اقسام قرآن، امثال قرآن اور حکمت قرآن وغیرہ۔

قرآن کے نام اور ان کی وجہ تسمیہ:

قرآن کے مشہور نام چار ہیں: القرآن، الفرقان، الکتاب، الذکر۔

قرآن:

یہ قرأ یقرأ سے مصدر ہے، اس کے لغوی معنیٰ ہیں جمع کرنا، یہ لفظ پڑھنے کے معنیٰ میں اس لیے استعمال ہونے لگا کہ اس میں حروف اور کلمات جمع کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں اس لفظ کو اس معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ فرمایا:

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا۔ (بنی اسرائیل/۷۸)

(نماز کا اہتمام کرو سورج ڈھلنے سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک، فجر میں پڑھنے کا خصوصی اہتمام کرو، بے شک فجر کا پڑھنا حضوری قلب کے ساتھ پڑھنا ہے۔)

پھر یہ لفظ پڑھی جانے والی چیز کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور اس کثرت سے استعمال ہوا کہ خود قرآن مجید میں اس کا استعمال مصحف قرآنی کے لیے پچاس سے زائد مقامات پر ہوا۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ۔(البقرہ/۱۸۵)

(وہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔)

چونکہ قرآن دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے، اس لیے اس کا نام ہی قرآن پڑ گیا۔

الفرقان:

قرآن مجید کا دوسرا مشہور نام ''الفرقان'' ہے۔ فرقان کے معنیٰ ہیں فرق کرنے والی چیز کے، یہ نام قرآن سے پہلے تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تورات کے لیے اس لفظ کا استعمال قرآن مجید کی اس آیت میں ہوا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ ۔(الانبیاء/۴۸)

(اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو الفرقان عطا کی۔

اور قرآن کے لیے اس کا استعمال اس آیت میں ہوا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ ۔(الفرقان/۱)

(بہت ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر الفرقان اتاری)

چونکہ تورات بھی تحریف سے پہلے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ''الفرقان'' کا نام دیا اور قرآن تو آج تک حق و باطل میں امتیاز کی کسوٹی ہے اس لیے اس کی فرقانیت ہنوز باقی ہے۔ اور انشاء اللہ تا قیامت باقی رہے گی۔

الکتاب:

قرآن کا تیسرا مشہور نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن مجید میں ''الکتاب'' پانچ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱- نوشتۂ تقدیر کے معنیٰ میں: مثلاً: لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ (الانفال/۶۸)

(اگر نوشتہ الٰہی گزر نہ چکا ہوتا تو جس چیز میں تم مبتلا ہوئے اس کے باعث تمھیں ایک دردناک عذاب آ پکڑتا۔)

۲- اللہ تعالیٰ کے اس رجسٹر کے معنیٰ میں جس میں ہر چیز کا ریکارڈ ہے: مثلاً وَعِندَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ۔ (ق/۴)

(اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے محفوظ رکھنے والی)

۳- خط اور پیغام کے معنیٰ ہیں: مثلاً: أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ۔ (النمل/۲۹)

(میرے پاس ایک گرامی نامہ بھجوایا گیا ہے)

۴- احکام وقوانین کے معنیٰ میں: مثلاً: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (الجمعۃ/۲)

(اور وہ ان کو احکام شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

۵- اللہ کے اتارے ہوئے کلام کے معنیٰ میں: اپنے اس معنیٰ کے لحاظ سے یہ لفظ کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ۔ (الاعراف/۱۷۰) (اور جو کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں)

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معانی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنیٰ کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر قرآن مجید کے لیے بولا جانے لگا۔

الذکر:

قرآن کا چوتھا مشہور نام ''الذکر'' ہے۔ اس لفظ کا استعمال بھی قرآن مجید کے لیے بار بار ہوا ہے۔ ''ذکر'' کے معنیٰ یاددہانی کے ہیں۔ اس نام نے قرآن کے اس پہلو کو اجاگر کیا

ہے کہ یہود و نصاریٰ نے حق و ہدایت اور حکمت و موعظت کی جو راہیں بند کر دی تھیں قرآن نے ان کو پھر سے کھول دیا ہے اور ان کا بھولا ہوا سبق پھر سے ان کو یاد دلا دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ عقائد و ایمانیات کیا ہیں؟ اصول معیشت کیا ہیں؟ انداز معاشرت کیا ہو؟ معاملات کس قسم کے ہونے چاہئیں؟ اور سیاست کیسی مطلوب ہے؟ تو وہ قرآن کے پاس آئے قرآن نے ان تمام گم شدہ راہوں کو پھر سے کھول دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اسی پہلو کو سامنے رکھ کر فرمایا:

ذَلِکَ نَتْلُوهُ عَلَيْکَ مِنَ الآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ۔ (ال عمران/۵۸)

(یہ ہم تم کو آیات اور پر حکمت یاد دہانی میں سے سنا رہے ہیں)

کیفیت نزول قرآن:

قرآن مجید کا نزول حضرت جبریل امینؑ کے توسط سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ہوا۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق اس کا نزول شب قدر میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ (القدر/۱)

(بلاشبہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔)

اور قرآن ہی کے بیان کے مطابق شب قدر رمضان کے مہینہ کی ایک رات ہے۔ فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ۔ (البقرہ/۱۸۵)

(وہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)

ان دونوں آیات سے یہ بات تو طے ہے کہ جس رات میں قرآن مجید کا نزول ہوا وہ رمضان کے مہینہ کی ایک رات تھی۔ رہی یہ بات کہ وہ کون سی رات ہے تو اس سلسلہ میں قطعی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ بیشتر معتبر روایات بتاتی ہیں کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ کی کوئی طاق رات ہے۔ یعنی اکیسویں، تیئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں میں سے کوئی ایک رات۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر من رمضان ۲؂

(شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق رات میں تلاش کرو)

شب قدر کے بالکل متعین نہ ہونے کی جمہور نے توجیہ یہ کی ہے کہ ''شب قدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں''۔ ۳؂

شب قدر میں قرآن کے نازل ہونے کی کیفیت کے سلسلہ میں علماء کے کئی اقوال ہیں جن میں سے دو قول زیادہ مشہور ہیں اور علمائے امت کی اکثریت نے انھی میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

۱- اس رات میں پورا قرآن حامل وحی فرشتوں کے حوالہ کر دیا گیا وہاں سے اس گروپ کے سرخیل حضرت جبریل امینؑ حالات و واقعات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آتے رہے۔ اور پورے قرآن کے نزول کی برسوں ۲۳ سالوں میں ہوئی۔

۲- قرآن مجید کے نزول کی ابتدا شب قدر سے ہوئی اس لیے ابتداء کی رعایت سے ''إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ'' کہا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں اقوال درست ہوں اور شکل یہ ہوئی کہ پورا قرآن لوح محفوظ سے سماء دنیا میں حامل وحی فرشتوں کے حوالہ بھی اسی رات میں ہوا ہو اور نزول قرآن کی ابتدا بھی اسی رات سے ہوئی ہو۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اپنے بندوں سے جو ہم کلام ہوا اس کی کیا کیا شکلیں رہی ہیں اور نزول قرآن کا تعلق کس شکل سے رہا ہے تو قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں سے اللہ تعالیٰ کی وحی یا ہم کلامی کی کل پانچ شکلیں رہی ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- رویا کے ذریعہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے بذریعہ خواب اپنے بندے کو کوئی حکم دے دیا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہا ہوں۔ انھوں نے اس

خواب کو وحی الٰہی پر محمول کیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹے! اللہ کا حکم تو سامنے آ گیا اب تم بتاؤ کہ اس تعمیل حکم کے سلسلہ میں تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ تو بیٹے اسماعیلؑ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ ابو جان! آپ حکم رب کی تعمیل فرمایئے میں اس کے لیے بطیب خاطر آمادہ ہوں۔ قرآن اس رؤیا کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔ (الصّٰفّٰت ۱۰۲/)

(بس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں، تو غور کر لو تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا: ابو جان! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے آپ اس کی تعمیل فرمایئے۔ آپ انشاء اللہ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔)

اس رؤیا کو اللہ تعالیٰ نے بلاء مبین سے تعبیر فرمایا ہے جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی ہی کی ایک شکل تھی۔

۲- فرشتہ انسانی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اللہ کا فیصلہ یا پیغام بندے تک پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً اللہ کے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے، چونکہ وہ انسانی شکل میں آئے تھے اور دیکھنے میں باہر کے مہمان معلوم ہو رہے تھے اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان نئے مہمانوں کے لیے ان کے معیار کے مطابق شاندار ضیافت کی، لیکن جب انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور یہ بتایا کہ ہم انسان نہیں فرشتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ کچھ گھبرائے اور ان کی اہلیہ تو اور بھی زیادہ پریشان ہوئیں کہ معلوم ہوتا ہے خیریت نہیں ہے، لیکن جب ان فرشتوں نے بتایا کہ ہم دراصل قوم لوط کے پاس بھیجے گئے ہیں تو سارہ کو قدرے اطمینان ہوا۔ البتہ یہاں ٹھہرنے کی انھوں نے اپنی غرض یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے سارہ کے بطن سے بیٹے کی پیدائش اور پھر اس بیٹے کے بیٹے کی پیدائش کی بھی بشارت

دی ہے جو ہم آپ تک پہنچانے آئے ہیں۔اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؑ تک فرشتوں نے اللہ کا جو پیغام پہنچایا وہ اسی دوسرے قبیل کی چیز ہے،قرآن اس واقعہ کو یوں نقل کرتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُواْ سَلاَماً قَالَ سَلاَمٌ فَمَا لَبِثَ أَن جَاء بِعِجْلٍ حَنِيذٍ. فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لاَ تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُواْ لاَ تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطٍ. وَامْرَأَتُهُ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاء إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ. قَالَتْ يَا وَيْلَتَى أَأَلِدُ وَأَنَاْ عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخاً إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ۔(ھود/۶۹-۷۲)

(اورابراہیم کے پاس ہمارے فرستادے بشارت لے کر آئے۔انھوں نے سلام کیا اس نے بھی سلام کا جواب دیا پھر اس نے تھوڑی دیر کے بعد ان کے سامنے بھنا ہوا بچھڑے کا گوشت پیش کیا پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس کو اچھنبھا ہوا اور ان کی طرف سے اسے اندیشہ لاحق ہوا۔وہ بولے اندیشہ نہ کرو۔ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اس کی بیوی پاس کھڑی تھی تو وہ ہنسی پس ہم نے اسے اسحاق اور اس کے پیچھے یعقوب کی بشارت دی۔وہ بولی۔ہائے میری شامت۔کیا اب میں بچہ جنوں گی جب کہ میں خود ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی انتہائی بوڑھے ہیں۔یہ تو نہایت عجیب بات ہے۔)

۳- تیسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دل میں کوئی بات ڈال دیتا ہے اور اس پر اطمینان عطا فرما دیتا ہے۔مثلاً جس زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے وہ زمانہ بنی اسرائیل کے لیے بڑا سخت زمانہ تھا۔فرعون نے بنی اسرائیل کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔جب حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے تو ان کی والدہ کو فطری طور سے بڑی بے چینی ہوئی۔اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں جو بات ڈالی اور جس پر انھیں شرح صدر عطا کیا قرآن نے اس کے لیے بھی وحی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ارشاد ہے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَى. إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّكَ مَا يُوحَى. أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي۔ (طٰہٰ/۳۷، ۳۹)

(اور ہم نے تم پر ایک بار اور اپنا بڑا فضل کیا ہے جب کہ ہم نے تمھاری ماں کو وحی کی وہ بات جو اب تمھیں وحی کی جارہی ہے کہ اس کو صندوق میں رکھ دو اور اس کو دریا میں ڈال دو اور دریا اسے کنارے ڈال دے کہ اس کو اٹھالے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ اور میں نے تم پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا (تاکہ یہ تمھارا محافظ بن جائے) اور تاکہ تمھاری پرورش میری نگرانی میں ہو۔)

وحی کی اس شکل کو احادیث میں ''القاء فی الروع'' یا ''نفث فی الروع'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً صحیح ابن حبان میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إن روح القدس نفثت فی روعی أن نفسا لن تموت حتی تستکمل رزقها وأجلها فاتقوا الله وأجملوا فی الطلب۔[۴]

(بے شک روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کسی کو موت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک وہ اپنے حصہ کا رزق حاصل نہ کرلے اور اپنی زندگی کی مدت پوری نہ کرلے، پس اللہ سے ڈرو اور طلب رزق کا بہترین طریقہ اختیار کرو۔)

۴- وحی الٰہی یا اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے ہم کلامی کی چوتھی شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ پردے کے اوٹ سے اپنے بندوں سے بات کرتا ہے۔ یعنی ہر چند کہ بندہ اللہ کو نہیں دیکھتا ہے لیکن اس کی آواز سنتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ مدین سے واپسی پر جب وہ طور کے دامن میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک روشنی کے بہانے طور پر بلایا اور وہاں حضرت موسیٰ سے بات کی۔ قرآن کہتا ہے:

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا۔ (النساء/۱۶۴)

(اور اللہ نے موسیٰ سے خوب خوب بات کی)

۵- وحی کی پانچویں شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فرشتہ بھیجتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنا

کلام اپنے بندے تک پہنچاتا ہے۔قرآن مجید کے نزول کا تعلق وحی کی اسی شکل سے ہے۔ پورا کا پورا قرآن اللہ کے فرشتہ جبریل امینؑ کے توسط سے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ تک پہنچا۔قرآن خود بیان کرتا ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ. ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ. مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ۔(التکویر/۱۹،۲۱)

(بلاشبہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ عرش والے کے یہاں اس کا خاص مقام ہے۔اس کی بات مانی جاتی ہے۔ پھر وہ بڑا امانت دار بھی ہے۔

جہاں تک کیفیت نزول کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں روایات سے بنیادی طور پر دو شکلوں کا پتہ چلتا ہے۔صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حارث بن ہشام نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

أحيانا ياتيني مثل صلصلة الجرس وهو أشده على فيفصم عني وقد وعيت ما قال وأحيانا يتمثل لي الملك رجلا فيكلمني فأعي مايقول۔[۵]

(کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ شکل میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ پھر جب یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو جو کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے وہ میں محفوظ کر چکا ہوتا ہوں۔اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک آدمی کی صورت میں آتا ہے اور مجھ سے بات کرتا ہے تو میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی ایک شکل گھنٹی کی سی آواز بجنے کی ہے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ جبریل امینؑ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس انسان کی صورت میں آتے اور اللہ کا پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ دوسری شکل کی کیفیت تو بالکل واضح ہے لیکن پہلی شکل کی توجیہ کسی ایسے شخص کے لیے ممکن نہیں ہے جسے اس کا تجربہ نہ ہو۔

اسباب نزول:

کسی سورہ یا آیت کو سمجھنے میں جس طرح کلام کا نظم رہنمائی کرتا ہے اسی طرح اس سورہ یا آیت کا سبب نزول بھی رہنمائی کرتا ہے جسے مفسرین عام طور سے شان نزول سے تعبیر کرتے ہیں، سبب نزول یا شان نزول کا پتہ لگانے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود سورہ یا آیت یا اس کے سیاق وسباق پر غور کیا جائے۔ اگر اس کا ماحول اور سیاق و سباق یا اس کے اندر کے الفاظ اور جملے شان نزول کی طرف رہنمائی کر دیں تو اس سے بہتر کچھ اور نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان سے واقعہ کی تصویر سامنے نہ آتی ہو تو احادیث و آثار پر نظر ڈالی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ ان میں اس سورہ یا آیت سے متعلق کیا رہنمائی موجود ہے؟ اگر وہاں کوئی رہنمائی مل جاتی ہے تو اس سے بے تکلف فائدہ اٹھایا جائے گا کیوں کہ احادیث و آثار کی رہنمائی کے بغیر پورے قرآن کی مشکلات کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ إِلَى اللّٰهِ۔ (المجادلۃ ۱/۱)

(اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی)

یہاں "**التی تجادلک**" سے کون سی عورت مراد ہے اور اس کا کیا معاملہ تھا؟ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ معاملہ ظہار کا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ واقعہ کس عورت کا ہے اور ان کے شوہر کون تھے؟ حدیث سے رجوع کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاتون خولہ بنت ثعلبہ تھیں اور ان کے شوہر اوس بن صامت۔ قرآن کے الفاظ اور حدیث دونوں کو سامنے رکھا جائے تو نفس مسئلہ بالکل منقح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن دشواری مندرجہ ذیل صورتوں میں پیش آتی ہے۔

(الف) جب ایک ہی آیت کے تحت متعدد اقوال احادیث و آثار میں نظر آتے ہیں۔

(ب) جس شان نزول کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کا موقع و محل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(ج) جس شان نزول کو تسلیم کر لینے سے نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرامؓ کا تقدس پامال ہو رہا ہو۔

الف کی مثال: قرآن مجید کی ایک آیت ہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ۔(التوبۃ/۱۱۳)

(نبی اور مومنوں کے لیے روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگیں اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ ان پر یہ ظاہر ہو چکا ہو کہ یہ جہنم میں جانے والے ہیں۔)

اس آیت کے شان نزول میں تین واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

۱- امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے کہ ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: چچا جان! آپ ''لا الہ الا اللہ'' کہہ دیجیے۔ میں اللہ سے آپ کے لیے سفارش کردوں گا۔ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ وہیں موجود تھے۔ جب انھوں نے ابوطالب کو ایمان کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو بول پڑے۔ کیوں جناب! آپ عبدالمطلب کے دین سے برگشتہ ہو رہے ہیں؟ تو ابوطالب نے کہا: میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: میں آپ کے لیے اللہ سے استغفار کرتا رہوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[۶]

۲- امام ترمذی نے ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لیے استغفار کرتے سنا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمھارے والدین تو مشرک تھے۔ اس نے کہا، حضرت ابراہیمؑ کے والد بھی تو مشرک تھے لیکن انھوں نے اپنے والد کے لیے استغفار کیا تھا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو اس پر یہ آیت اتری۔[۷]

۳- امام حاکم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک دن قبرستان تشریف لے گئے اور ایک قبر پر دیر تک بیٹھ کر مناجات کرتے رہے اور روتے

رہے۔ پھر فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا تھا وہ میری والدہ کی قبر تھی۔ میں نے اپنے پروردگار سے ان کے لیے دعاء کی اجازت چاہی تو اس پر یہ آیت اتری۔ 8

اس طرح کے متعدد شانہائے نزول کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ آیت متعدد بار نازل ہوئی۔ اس لیے ہر شان نزدل بالکل درست ہے۔

شان نزول کے سلسلہ میں علامہ حمید الدین فراہی کا یہ تبصرہ نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے کہ:

''شان نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے لوگوں کی وہ حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسرموقع حاوی ہوتا ہے''۔ 9

(ب) اس کی مثال سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے:

وَلاَ تَنكِحُواْ الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلاَ تُنكِحُواْ الْمُشِرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُواْ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ۔ (البقرہ/۲۲۱)

اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے۔ اگر چہ وہ تمھیں بھلی لگے۔ اور مشرکوں کو اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور ایک مومن غلام ایک مشرک آزاد سے بہتر ہے اگر چہ تمھیں وہ مشرک آزاد بھلا لگے۔

اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مَرثَد غنوی کے عَنَاق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ ہجرت کر آئے اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں ہی رہ گئی۔ ایک مرتبہ کسی کام سے حضرت مرثد مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثد نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر تم سے نکاح کر سکتا ہوں۔ مدینہ آکر حضرت مرثد نے آپؐ سے نکاح کی

اجازت چاہی تو آپؐ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔اس پر یہ آیت اتری۔[10]

یہ آیت جس سیاق سے تعلق رکھتی ہے اس کا موقع ومحل بتاتا ہے کہ یہاں یتیموں کی بہبود سے متعلق گفتگو چل رہی ہے۔اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی یتیم کی پرورش کے لیے اس کی ماں سے نکاح کرلیا جائے جس کے لیے وہ آمادہ بھی ہو تو کیا حرج ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ تو مستحسن ہے لیکن یہ دھیان میں رہے کہ نکاح کے لیے اس یتیم کی ماں کا مومنہ ہونا ضروری ہے ورنہ سماج میں متعدد مفاسد کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔اور جب بات مومنہ سے شادی کی آئی تو یہ اصول بھی بیان کردیا گیا کہ ایک مومنہ کے لیے بھی ایک مومن ہی کا انتخاب ہونا چاہیے۔اس طرح ایک مکمل تعلیم سامنے آگئی۔

غور کیجیے کہ بیان کردہ شان نزول کا اس سیاق سے کیا تعلق ہے؟ اور اس شان نزول سے ایمان لانے کے باوجود ایک بدکردار عورت سے حضرت مرثد کی جس دلچسپی کا اظہار ہورہا ہے وہ صحبت نبویؐ سے فیض پانے کے باوجود کیا کسی مسلمان کی سیرت سے میل کھاتا ہے؟

(ج) اس کی مثال سورۂ عبس کی ابتدائی آیات ہیں۔ان آیات کے سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے بڑے بڑے سرداروں سے گفتگو میں مشغول تھے۔اور انھیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے لیکن ان لوگوں کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس جماعت میں معذوروں اور سماج کے دبے کچلے لوگوں کی اکثریت ہے۔ہم ان کے درمیان کیسے رہ سکتے ہیں؟ اتنے میں ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آگئے۔آتے ہی انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے وہ سکھایئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا ہے۔ حضرت ابن ام مکتومؓ کا اس موقع پر آجانا اور آتے ہی کچھ سکھانے کی درخواست کرنا کفار قریش کے اعتراض کا ثبوت فراہم کردینا تھا اس لیے آنحضورؐ کو اس موقع پر ان کی آمد گراں گزری۔آپؐ نے منہ بسورا اور بے اعتنائی برتی، اللہ تعالیٰ کو آنحضرت ﷺ کی یہ ادا ناگوار گزری تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر عتاب فرمایا۔[11]

عتاب کسی بڑے جرم پر ہوتا ہے۔اگر اس شان نزول کو تسلیم کرلیا جائے تو آنحضرت ﷺ (نعوذ باللہ) ایک بڑے مجرم نظر آتے ہیں جب کہ صورت حال سے حمایت حق میں حد سے تجاوز تو نظر آتا ہے لیکن آپ ؐ کی یہ بے اعتنائی جرم کے زمرے میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتی پھر عتاب کیوں؟ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ ؐ کو تنبیہ ہے اور اسی تنبیہ میں اصل عتاب ان سرداران قریش پر ہے جو کسی بھی طرح حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جمع وترتیب قرآن:

قرآن نے انسانی زندگی سے متعلق تمام امور و مسائل کو بہت واضح انداز میں پیش کردیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔(النحل/۸۹)

(اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے)

اس کتاب کے نزول کے ساتھ ہی دین وشریعت کی تکمیل بھی ہوگئی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيْناً۔(المائدہ/۳)

(آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کردیا، تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمھارے لیے بطور دین اسلام کو پسند کرلیا۔)

چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لیے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے اس لیے اس کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ یہ کتاب بالکل واضح ہو اور سارے لوگوں کو اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے رہنمائی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔یہ کتاب اس تقاضا کو پورا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۔(القمر/۱۷)

(اور یقیناً ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی اس سے ہادہانی حاصل کرنے والا؟)

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے تا کہ قیامت تک کے انسانوں کو رہنمائی ملتی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تقاضا کی تکمیل بھی فرما دی اور ارشاد فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (الحجر/۹)

(ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت بھی کریں گے۔)

اور اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کی جمع و ترتیب کا کام بھی حامل وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی انجام پا جائے تا کہ اس کے اندر کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر کا کوئی اختلاف نہ رہے۔ یہ کام بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مکمل کرا دیا۔ اور پورے قرآن کا با قاعدہ اس کی اصلی ترتیب کے ساتھ آپ کی وفات سے پہلے ہی جبریل امینؑ کے ساتھ مذاکرہ بھی دوبار ہو گیا۔ اور صحابہٴ کرام کی ایک بڑی اکثریت کو پورا قرآن اس کی اصلی ترتیب کے ساتھ یاد بھی ہو گیا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیات: إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ. فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (القیامۃ/۱۷-۱۸) خود بتاتی ہیں کہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اسے اس کی اصل ترتیب کے ساتھ اپنے پیغمبر کو پڑھا دینا اللہ تعالیٰ کی ہی ذمہ داری تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری عہد نبوی ہی میں پوری بھی ہوئی تھی۔

علامہ جلال الدین سیوطی، امام زرکشی اور امام ابو جعفر بن زبیر کا خیال ہے کہ قرآنی آیات کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ علامہ سیوطی نے امام ابو جعفر کے حوالہ سے لکھا ہے:

ترتيب الآيات في سورها واقع بتوقيفه ﷺ وأمره من غير خلاف في هذا بين المسلمين۔[۱۲]

سورتوں میں ان آیات کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اور حکم سے عمل میں آئی ہے اور اس میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

سورتوں کی آیات کی طرح تمام سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ علمائے امت کا بڑا طبقہ اسی کا قائل ہے۔ اور جن چند علماء نے اس کی ترتیب کو صحابہؓ کے اجتہاد پر مبنی قرار دیا ہے ان کے اس خیال کی بنیاد ایک ضعیف روایت ہے۔ ڈاکٹر صبحی صالح لکھتے ہیں۔

''جن قلیل التعداد سورتوں میں اختلاف کی گنجائش ہے ان کی اصل و اساس ایک ضعیف بلکہ بے بنیاد روایت پر رکھی گئی ہے۔اس کا راوی یزید الفارسی اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتا ہے۔امام بخاری نے اس کو ضعیف راویوں میں شمار کیا ہے۔اس لیے وہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔بصورت قبول یہ حدیث قرآن کریم کی ان سورتوں میں تشکیک کی موجب ہوگی جو قراءۃً وسماعاً اور مصاحف لکھے جانے کی رو سے تواتر قطعی کے ساتھ ثابت ہیں۔ سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کی تحریر بھی اس حدیث کی رو سے مشکوک ٹھہرے گی۔''[۱۳]

ظاہر ہے کہ ایک ضعیف روایت کی بنیاد پر اتنی اہم بات نہیں کہی جا سکتی۔

جمع قرآن کی اصل حقیقت یہ ہے کہ پورا کا پورا قرآن نبی کریمﷺ کے زمانہ ہی میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور جبریل امینؑ کی ہدایت کے مطابق ترتیب پا چکا تھا اور تکمیل قرآن کے بعد آنحضرتﷺ کا حضرت جبریل امینؑ سے مذاکرہ بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہوا تھا۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ پورا قرآن کسی ایک صحیفہ میں جمع نہیں ہوا تھا اور اثنائے نزول میں یہ ممکن بھی نہیں تھا بعد میں حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں باقاعدہ اسے ایک صحیفہ میں جمع کیا گیا۔ یہ کام حضرت ابو بکرؓ کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ کی سرکردگی میں انجام پایا۔اس کے بعد سے یہی نسخہ اصل قرار پایا اور اسی کو سرکاری نسخہ کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد یہی نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور ان کی شہادت کے بعد یہی نسخہ حضرت حفصہؓ کی تحویل میں چلا گیا۔ پھر عہد اسلامی میں جب اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع ہوا اور قبائل کے اختلاف لہجات کی وجہ سے حروف و الفاظ کی ادائیگی میں اختلاف رونما ہوا اور اندیشہ یہ ہو چلا کہ اس اختلاف لہجات کی وجہ سے باہم کشاکش ہو سکتی ہے، بلکہ ۳۰ھ میں فتح آرمینیہ وآذربائیجان کے وقت شام اور عراق کی فوجیں جب ایک جگہ جمع تھیں ان دونوں کی قرأت میں شدید اختلاف کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں بھی نکال لی تھیں اور بڑے پیمانہ پر خون خرابہ کا اندیشہ ہو گیا تھا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ سارے لوگوں کو ایک لہجہ اور ایک ہی قرأت پر مجتمع کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حضرت سعیدؓ بن ابی العاص اور عبدالرحمٰنؓ

بن حارث بن ہشام کو اس کام کے لیے مقرر فرمایا کہ قرآن مجید کو نبوی رسم الخط میں تحریر کر دیا جائے اور اسی قرأت کو ترجیح دی جائے جو تواتر سے ثابت ہو۔ اسی ہدایت کے مطابق حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ کے تیار کردہ نسخے سے اس کا موازنہ کر کے اس کی متعدد نقلیں کروائی گئیں اور تمام صوبوں میں ایک ایک نسخہ بھیج دیا گیا اور یہ ہدایت کر دی گئی کہ سارے لوگ اسی لہجہ اور قرأت کی پابندی کریں۔ اس کے علاوہ باقی جتنے لوگوں کے ذاتی نسخے تھے حضرت عثمانؓ نے سب کو نذر آتش کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے اس اقدام کی تمام صحابہؓ نے تائید کی اور امت آج تک اس کارنامہ کو حضرت عثمانؓ کے بڑے کارناموں میں شمار کرتی ہے۔ اس طرح حضرت ابو بکرؓ ''جامع القرآن علی صحیفة واحدة'' اور حضرت عثمانؓ ''جامع الناس علی صحیفة واحدة وعلی قرأة واحدة'' قرار پاتے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا کارنامہ انجام دیا خلاف واقعہ ہے۔[۱۴]

مکی اور مدنی سورتیں:

سورتوں کا مکی ہونا مقامات نزول کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مکی اور مدنی سورتوں کی قطعی تقسیم ثابت نہیں ہے۔ اسی لیے بعض سورتوں اور آیتوں کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کے درمیان اختلاف بھی رہا ہے۔ مثلاً سورۃ الحج کو بعض علماء نے مکی قرار دیا ہے اور بعض نے مدنی۔ اسی طرح سورۃ النصر تا سورۃ الناس بعض مفسرین کے نزدیک مکی ہیں اور بعض کے نزدیک مدنی۔[۱۵]

بعض ایسی بھی مکی سورتیں ہیں جن کی کچھ آیات مدنی ہیں اور بعض ایسی سورتیں بھی ہیں جن کی کچھ آیات مکی ہیں۔ اس باب میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے۔ مثلاً سورۃ الحج ہی لے لیجیے، بہت سارے مفسرین اس سورہ کو مدنی قرار دیتے ہیں لیکن اس کی چار آیات ''وما ارسلنا من قبلک من رسول ......'' (آیت:۵۲) تا ''عذاب یوم عقیم'' (آیت: ۵۵) کو مکی مانتے ہیں؛ جب کہ بعض مفسرین اس سورہ کو مکی مانتے اور اس کی چار

آیتوں ''إن اللہ یدافع عن الذین ......'' (آیت:۳۸) تا''وللہ عاقبۃ الأمور'' (آیت:۴۱) کو مدنی قرار دیتے ہیں۔[۱۶]

چونکہ مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے اس لیے ان کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ سورتوں کے مضامین ہی سے ہوگا۔ کیوں کہ اس بارے میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے مزاج اور مضامین جداگانہ ہیں۔ اب اگر مضامین کی تعیین اور مزاج کے فہم میں فرق ہوگا تو مکی اور مدنی سورتوں کی تعیین میں بھی اختلاف ناگزیر ہے، مکی اور مدنی سورتوں کی تعیین کا توقیفی نہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ان کی تعیین میں اختلاف پیدا ہو جائے تو قرآن سے استفادہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا ورنہ شاید یہ تعیین وتقسیم بھی توقیفی ہی ہوتی۔

جہاں تک مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے پہلے تو یہ اصولی بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جو آیتیں اور سورتیں مکہ کے عہد نبوی میں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں اور جو مدینہ کے عہد میں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں خواہ ان کا نزول کسی مقام پر اور کسی حالت میں ہوا ہو۔ پھر خصوصیات کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے سلسلہ میں لمبی گفتگو کی جا سکتی ہے اور متعدد علمائے تفسیر نے بہت ساری خصوصیات کا ذکر کیا بھی ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ مکہ کے عہد نبوی میں مخاطب زیادہ تر عرب کے بت پرست تھے اس لیے اس عہد میں زیادہ زور عقائد کی اصلاح، کفر وشرک کی تردید اور اخلاق کی درستی پر دیا گیا ہے۔ جب کہ مدینہ میں نبی آخر الزماں کے پہنچتے ہی وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تھی اور اب اس اسلامی ریاست میں نمونہ کی اسلامی زندگی مطلوب تھی۔ اس لیے حدود وفرائض اور احکام وقوانین کی بڑی اہمیت ہوگئی تھی چنانچہ مدنی آیتوں اور سورتوں میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے چنانچہ مکی اور مدنی آیتوں اور سورتوں کی شناخت کے لیے یہ کسوٹی کافی ہے کہ جن کا غالب عنصر عقائد واخلاق ہوں وہ مکی ہیں اور جن کا بڑا حصہ احکام وقوانین اور حدود و فرائض پر مشتمل ہو وہ مدنی ہیں۔

آداب تلاوت:

تلاوت قرآن کے کئی آداب ہیں، ان میں سے چند اہم آداب مندرجہ ذیل ہیں:

۱- قرآن مجید کی تلاوت زیادہ سے زیادہ کی جائے۔

ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إقرء وا القرآن فإنه ياتي يوم القيامة شفيعا لأصحابه۔[17]

(قرآن پڑھو کیوں کہ یہ قیامت کے روز اپنے قاری اور تالی کی شفاعت کرے گا۔)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

نوروا منازلكم بالصلاة وقرأة القرآن ۔[18]

(اپنے گھروں کو نماز اور تلاوت قرآن سے منور رکھو۔)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

أفضل عبادة امتی قرأة القرآن۔[19]

میری امت کی سب سے افضل عبادت تلاوت قرآن ہے۔

۲- قرآن کی تلاوت سمجھ کر اور اطمینان سے کی جائے۔

مسلم بن مخراق فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے کہا: کچھ لوگ ہیں جو پورے قرآن کو ایک ہی رات میں دو یا تین بار ختم کرتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ایسے لوگوں کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہے۔ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ پوری رات نماز میں کھڑی رہی، اس میں آپؐ نے صرف سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کی تلاوت کی۔ اس دوران جب کوئی آیت تبشیر کی آتی تو آپ دعا فرماتے اور اس سے اپنی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کرتے اور جب کوئی آیت تخویف کی آتی تو اللہ سے دعا کرتے اور اس کی پناہ مانگتے۔[20]

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اقرءوا القرآن فی شھر . قلت: إنی أجد قوۃ حتی قال فاقراہ فی سبع ولا تزد علی ذلک۔۲۱

(قرآن ایک مہینہ میں ختم کرو۔ میں نے کہا: میں اس سے کم وقت میں اسے ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایسی ہی گفتگو ہوتی رہی یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا: سات دن میں ختم کرو۔ اس سے زیادہ جلدی نہ کرو۔

۳- تلاوت قرآن سے پہلے تعوذ کا اہتمام کیا جائے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔(النحل/۹۸)

(پس جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو۔)

۴- قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کی جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً۔(المزمل/۴)

(اور قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کرو۔)

قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام حروف والفاظ پوری وضاحت کے ساتھ ادا کیے جائیں اور مد و وقف کی پوری صراحت ہو۔

۵- قرآن کی تلاوت حسن صوت کے ساتھ کی جائے۔

ابن حبان کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

زینوا القرآن بأصواتکم۔۲۲

(قرآن کی تلاوت کو اپنی اچھی آواز سے مزین کرو۔)

دارمی کے الفاظ یہ ہیں:

حسنوا القرآن بأصواتکم۔۲۳

(تلاوت قرآن کو اپنی آواز سے حسین بناؤ۔)

اور بزار نے یہ روایت نقل کی ہے:

حسن الصوت زینۃ القرآن ۔۲۴

(اچھی آواز قرآن کی زینت ہے۔)

۶- قرآن کی تلاوت فہم وتدبر کے ساتھ کی جائے۔

علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

تسن القرأة بالتدبر و التفهم فهو المقصود الأعظم و المطلوب الأهم۔[۲۵]

(قرآن کی تلاوت تدبر وتفہم کے ساتھ مسنون ہے اور یہی نزول قرآن کا مقصود اعظم اور مطلوب حقیقی ہے۔)

ناسخ ومنسوخ:

ناسخ اور منسوخ علوم قرآن کی ایک اہم بحث ہے اس لیے اس سے واقفیت بہم پہنچانا بہت ضروری ہے۔

نسخ کے لغوی معنیٰ ہیں مٹانا، ازالہ کرنا۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ۔(الحج/۵۲)

(اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے، پس اللہ مٹادیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو۔ پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے۔)

اور اصطلاح میں نسخ کی تعریف یہ ہے:

رفع الحکم بدلیل شرعی متأخر۔[۲۶]

(کسی حکم کو کسی بعد والے حکم شرعی کے ذریعہ ختم کرنا۔)

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ میں اس وقت کے حالات کے تحت ایک حکم شرعی دیا لیکن بعد میں حالات کسی اور حکم کے متقاضی ہوئے تو اس نے پہلا حکم منسوخ کرکے کوئی دوسرا حکم دے دیا۔

نسخ کے سلسلہ میں امت تین گروہوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ نے تو نسخ کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ جن آیتوں کے ذریعہ کسی حکم عام کو خاص کیا گیا ہے یا کسی مجمل حکم کی

تفصیل بیان کی گئی ہے وہاں بھی وہ نسخ تسلیم کر لیتے ہیں۔اس لیے اس گروہ کے نزدیک ناسخ اور منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

دوسرا گروہ نسخ کا بالکل منکر ہے۔ یہ گروہ کسی حکم کو مطلق منسوخ تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ اسے حالات کا تابع بتاتا ہے لیکن اس رائے کو تسلیم کرنے سے فتنوں کے بہت سارے دروازے کھل سکتے ہیں۔ پھر تو لوگ اپنے اپنے لحاظ سے حالات کا تعین کریں گے اور اپنی اپنی رائے اور ترجیح کے مطابق فتوی دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کشاکش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نسخ کو چند احکام تک محدود مانتے ہیں۔اسی گروہ کی رائے سب سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔قرآن مجید میں ہے:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔(البقرہ/۱۰۶)

(ہم جس آیت کو بھی منسوخ کرتے ہیں یا اسے نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند دوسری آیت لاتے ہیں)

اس آیت پر سیاق وسباق کی روشنی میں تدبر کی نظر ڈالیے تو مندرجہ ذیل حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱- اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے جو وعدہ فرمایا تھا کہ تمھارے بعد ہم ایک ایسا نبی اور رسول بھیجیں گے جو ہماری شریعت کی تکمیل کرے گا، طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرے گا اور ان بہت ساری پابندیوں سے لوگوں کو نجات دلائے گا جو ان کے اپنے کرتوت کے نتیجہ میں ان پر عائد کردی گئی تھیں۔ نزول قرآن اس وعدہ کی تکمیل ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ. الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ

وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِیَ أُنزِلَ مَعَهُ أُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (الاعراف/۱۵۶، ۱۵۷)

(اور میری رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے سو میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکاۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی جو پیروی کریں گے اس رسول اور نبی امی کی جس کو وہ اپنے یہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں۔ وہ ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور ان پابندیوں کو جو ان پر پہلے سے تھیں پس جو ایمان لائے اس پر اور جنھوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔)

اس پہلو سے دیکھا جائے تو قرآن پچھلی شریعتوں کی بعض چیزوں کا ناسخ قرار پاتا ہے، اسی میں یہود و نصاریٰ کی وہ مزخرفات بھی شامل ہیں جو انھوں نے شریعت میں ملادی تھیں۔ مثلاً خنزیر اور گردن مروڑے ہوئے جانوروں کو انھوں نے جائز قرار دے لیا تھا۔ اور اسی میں عقائد و ایمانیات کی وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کو انھوں نے یا تو یکسر ختم کر دیا تھا یا انھیں دوسری چیزوں سے بدل دیا تھا۔ مثلاً قبلہ یا ذبیح کا معاملہ۔

۲- قرآن کے بعض احکام تدریجی نفاذ کے متقاضی تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں ایک حکم دیا لیکن جب بعد میں حالات سازگار ہوئے اور طبیعت میں احکام الٰہی کو بے تکلف قبول کر لینے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تو بعد میں اس عارضی حکم کو منسوخ کر کے حتمی حکم نازل فرما کر دین کی تکمیل کر دی۔ مثلاً جب تک میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اور ابتدائی مرحلہ میں ان کا نزول خلاف حکمت بھی تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایک عارضی حکم یہ دیا تھا کہ لوگ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کر کے جائیں کہ کن قرابت داروں کو کتنا حصہ ملے گا؟ چنانچہ فرمایا:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْراً الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (البقرہ/۱۸۰)

(جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض

کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا۔ اللہ سے ڈرنے والوں پر یہ واجب ہے۔)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیات وصیت نازل فرما دیں جن میں تمام قرابت مندوں کے حقوق متعین ہو گئے تو وہ عارضی حکم منسوخ ہو گیا جو اوپر نقل کیا گیا، اللہ کے رسول ﷺ نے انھی آیات کی روشنی میں یہ اعلان فرمایا: لا وصیة لوارث۔[۲۷]

اس پہلو سے دیکھیے تو قرآن کی بعض آیات بعض آیات کی ناسخ معلوم ہوتی ہے۔

البتہ جن علماء نے قرآن کی بعض آیات کو بعض ایسی آیات سے منسوخ مانا ہے جو موجودہ نسخۂ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس سے باہر حدیث کی کتابوں میں ہیں، ان کے اس دعویٰ کی معقولیت سمجھ سے باہر ہے، کیوں کہ یہ امر نا قابل فہم ہے کہ متعدد منسوخ آیتیں تو قرآن کے اندر موجود ہیں اور کئی ناسخ آیتیں مصحف سے باہر ہیں۔ بالفاظ دیگر جن کا حکم باقی نہیں وہ تو اندر ہیں اور جن کا حکم باقی ہے وہ باہر ہیں۔

اسی طرح یہ امر بھی نا قابل فہم ہے کہ قرآن کے کسی حکم کی ناسخ حدیث ہے۔ یہ بات نا قابل فہم اس لیے ہے کہ اولاً: اللہ تعالیٰ نے کس حکمت کے تحت اپنے بعض احکام کی منسوخی کا اختیار اپنے رسول کو دیا۔ خود اسی کے منسوخ کر دینے میں کیا چیز مانع تھی؟ جب کہ متعدد مقامات پر اس نے خود ایسا کیا ہے۔ ثانیاً: کیا رسول کا یہ مقام ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو منسوخ کر سکے؟۔

مفردات القرآن:

صحیح فہم قرین میں قرآن کے مفرد الفاظ کے صحیح فہم کی خصوصی اہمیت ہے۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ایک سے زائد معانی ہوتے ہیں اور تمام معانی کسی ایک جگہ موزوں نہیں ہوتے۔ اب اگر کسی آیت میں ایک لفظ کا وہ معنیٰ مراد لے لیا جائے جو سیاق کلام کے خلاف ہو تو آیت کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ اسی طرح بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقی معنی کچھ اور ہوتا ہے اور اس کا کوئی اور مفہوم سمجھ لیا جاتا ہے جو

بالکل غلط ہوتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدعائے کلام ہی یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔اس لیے مفرد الفاظ کا صحیح فہم بہت ضروری ہے۔مثلاً ایک لفظ ہے: ''نزع'' قرآن مجید میں اس کا استعمال مختلف شکلوں میں بارہ مقامات پر ہوا ہے۔اور تمام جگہوں پر مفسرین نے اس کا حقیقی معنی ہی بیان کیا ہے سوائے ایک جگہ کے جہاں اکثر مفسرین سے سہو ہوا ہے۔اور وہ جگہ ہے سورہ قصص (آیت:۷۵)۔لغت میں ''نزع'' کا اصل معنٰی ہے کھینچ نکالنا اور قرآن مجید میں بھی ہر جگہ یہ الفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے لیکن سورہ قصص کی آیت:۷۵ میں مفسرین نے اسے اٹھا کھڑا کرنے کے معنیٰ میں لے لیا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کلام کا مدعا ہی یکسر تبدیل ہو گیا اور وہ آیت جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اپنے سیاق وسباق سے کٹ گئی۔ بلکہ خود اس آیت کے جملے بھی ایک دوسرے سے غیر متعلق اور غیر مربوط ہو گئے۔[۲۸]

اسی طرح کے قرآنی الفاظ میں سے ایک لفظ ہے ''الآلاء'' یہ اِلیٰ ، اِلیٰ اور اِلیٰ کی جمع ہے۔اس کے معنیٰ تمام ائمہ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں۔حالانکہ سورہ رحمان میں اس لفظ کے سارے استعمالات کو دیکھیے تو ہر جگہ یہ معنی درست نہیں معلوم ہوتا۔علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں اس لفظ کے حقیقی معنی سے بحث کی ہے۔وہ بحث انتہائی اہم اور قیمتی ہے۔میں انہی کی بحث سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے اس لفظ کے حقیقی معنیٰ کی نشان دہی بھی ہو جائے گی اور سورۂ رحمان میں اس لفظ کے متعدد استعمال کا موقع ومحل بھی واضح ہو جائے گا۔علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں:

''الآلاء'' أجمعوا علی أن معناه النعم ولکن القرآن وأشعار العرب یاباه والظاهر أن معناه الفعال العجیبة فارسیته ''کرشمه'' لما کان غالب فعاله تعالی الرحمة، ظنوا أن الآلاء هی النعم۔[۲۹]

(ہر چند کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ الآلاء کے معنیٰ نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کلام عرب کے تتبع اور لفظ کے مواقعِ استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنیٰ کارناموں، کرشموں اور عجائبات قدرت وحکمت کے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب

حصہ آیات رحمت پر مشتمل ہے اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کرلیا کہ ''آلاء'' کے معنیٰ نعمت ہی کے ہیں۔'' ۱۳۰

اس طرح کی پچاسوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ محض ایک لفظ کے عدم فہم کے نتیجہ میں بات کچھ سے کچھ ہوگئی۔ اس لیے مفردات قرآن کا صحیح فہم، فہم قرآن کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

علوم اصول تاویل:

اصول تاویل بھی ایک اہم قرآنی علم ہے، اس علم کی معرفت کے بغیر معنی مراد تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ علامہ حمید الدین فراہیؒ سے پہلے کے علمائے تفسیر نے اس پر قرار واقعی توجہ کیوں نہیں دی؟ غالباً اسی وجہ سے قدیم علمائے تفسیر کے یہاں فہم معنیٰ قرآن میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور انہی اختلافات کی وجہ سے متعدد تفسیری مذاہب وجود میں آگئے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ علم اصول تاویل پر خاطر خواہ توجہ صرف کی جائے، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی لیکن اس مقالہ میں اس کی زیادہ گنجائش نہیں ہے اس لیے انتہائی اختصار کے ساتھ اس علم کا محض تعارف کرایا جارہا ہے لیکن محض اس کے تعارف سے بھی اس کی اہمیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

وہ اصول جو فہم قرآن میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ''اصول تاویل'' کہلاتے ہیں اور یہ دو طرح کے ہیں۔

ایک تو وہ جو تاویل کے باب میں کج روی سے حفاظت کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان حکمتوں کی جانب رہنمائی کرتے ہیں جن پر کلام الٰہی مشتمل ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں طرح کے اصول معلوم ہوں گے نظم قرآن پر غور کرنے سے کیوں کہ نظم وہ حبل متین ہے جسے تھامنے والا زیغ و ضلال سے محفوظ رہتا ہے اور یہ وہ سراج منیر ہے جو حکمتوں کے تمام پہلوؤں کو منور و مجلی کر دیتا ہے۔ ۱۳۱

واضح رہے کہ صحیح تاویل تک پہنچنے کے لیے متعدد پہلوؤں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً قرآن کی تاویل قرآن سے، نظم کلام کی رعایت، موقع ومحل کے لحاظ سے معنیٰ کا تعین، الفاظ اور مختلف الوجوہ معانی پر غور وتدبر، سورتوں کے مضامین کی ترتیب کی حکمتوں کا فہم، الفاظ ومعانی اور نفی واثبات کی مختلف جہات پر نظر، اسم، فعل اور صفت کے اطلاق کے فرق کا فہم، افراد کے بجائے صفات کے حکم کی حکمتوں کا علم، مطلق اور جامع کلمات کے متعلقات پر نظر، حقیقت مطلقہ اور حقیقت مصطلحہ کے فرق کا فہم، وجوہ کلام اور تاویل کلام کو جاننے کی کوشش، بیان اور ابہام کا فرق، محذوفات پر نظر، وجوہ نظم اور مواقع تدبر پر نگاہ وغیرہ۔

یہ سب وہ پہلو ہیں جن کا جاننا فہم قرآن کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

نظم قرآن:

فہم قرآن میں نظم کی کلیدی اہمیت ہے۔ نظم قرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک منظّم اور مربوط کلام ہے۔ اس کی ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہوتا ہے اور سورہ کی تمام آیتیں اسی مرکزی مضمون کی توضیح وتشریح کرتی ہیں۔ اسی طرح جملہ سورتیں باہم مربوط ہیں۔ اور پورا قرآن ایک حسین وحدت ہے۔

نظم قرآن کی خصوصیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ حمید الدین فراہیؒ فرماتے ہیں:

’’یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ نظم کلام کلام ہی کا ایک جز ہوتا ہے، چنانچہ اگر اس سے صرف نظر کیجیے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے معنیٰ کا ایک حصہ جاتا رہے گا، اس کا سبب یہ ہے کہ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو ایک چیز کے متفرق اجزاء میں الگ الگ نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ جو شخص فہم نظام سے محروم رہا تو وہ کلام کے مفہوم کے ایک بڑے حصہ سے محروم رہا۔ بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس کا بھی وہی حال ہو جائے جو اس سے پہلے اہل کتاب کا ہوا جن کے بارے میں ارشاد ہے: ’’فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا

بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ''(انھوں نے ایک بڑا حصہ فراموش کردیا اس کا جس کے ذریعہ ان کو یاددہانی کی گئی تھی چنانچہ ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان دشمنی اور تصادم کی آگ بھڑکادی)۔''۳۲

اور مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے اور نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کردی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہوگیا جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہلچل پیدا کردی، اذہان وقلوب بدل ڈالے، فکر وعمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا''۔۳۳

ان دونوں تبصروں سے نظم قرآن کی حقیقت، حیثیت اور اہمیت اجاگر ہوجاتی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ نظم قرآن قرآن کا ایک ایسا جزو ہے جسے نظر انداز کرکے قرآن مجید کو صحیح طور سے نہیں سمجھا جاسکتا، اس لیے فہم قرآن کے لیے فہم نظم قرآن ناگزیر ہے۔

اقسام قرآن:

اقسام قرآن بھی ایک انتہائی اہم قرآنی علم ہے۔ اس موضوع پر قدیم وجدید علماء نے اچھا خاصا لکھا ہے۔ ان تمام کا استقصاء اس مختصر مقالہ میں نہ ممکن ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ ذیل میں اس موضوع سے متعلق صرف وہ باتیں درج کی جارہی ہیں جن سے قرآنی قسموں کی نوعیت اور حکمت واضح ہوجائے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جو قسمیں کھائی ہیں ان پر تین طرح کے اشکالات

اور شبہات وارد کیے گئے ہیں۔

۱۔ پہلا اشکال یہ ہے کہ جب متکلم اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے اور اسے اعتماد نہیں ہوتا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے لوگ اسے باور کر لیں گے تو وہ قسم کھاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت کی شان اس سے اعلیٰ وارفع ہے۔ پھر اس کے قسم کھانے کے کیا معنی؟

۲۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن امور پر قسمیں کھائی گئی ہیں وہ نہایت اہم ہیں مثلاً توحید، رسالت اور آخرت۔ واقعہ یہ ہے کہ جن کا ایمان ان چیزوں پر ہے وہ پہلے ہی سے ان چیزوں کو تسلیم کیے ہوئے ہیں پھر ان کے لیے قسم کھانے کی کیا ضرورت؟ اور جن کا ایمان ان چیزوں پر نہیں ہے وہ محض قسم کھا لینے سے ان چیزوں کو تسلیم کرنے سے رہے ایسے لوگوں کو تو دلیل چاہیے پھر ان کے لیے قسم کھانے کا کیا حاصل؟

۳۔ تیسرا اشکال یہ ہے کہ قسم کسی عظیم الشان اور بلند رتبہ چیز کی کھائی جاتی ہے لیکن قرآن مجید میں چونکہ قسم کھانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس سے بڑا اور عظیم المرتبت پوری کائنات میں کوئی نہیں تو اس کو قسم زیب نہیں دیتی ہے؟ ۳۴

یہ سارے اشکالات اس وجہ سے وارد کیے گئے ہیں کہ قسم کی اصل نوعیت کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے، قرآنی قسموں کے الفاظ و اسالیب پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ بسا اوقات قسم مقسم بہ کے ذکر کے بغیر کھائی جاتی ہے اس صورت میں قسم کے لیے جو الفاظ عموماً استعمال کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔ یمین، نذر، ایلاء، قسم اور حلف۔ ان الفاظ کے ذریعہ جو قسم کھائی جاتی ہے اس سے مقصود محض تاکید اور جزم کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ بعض اوقات قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر مقسم بہ کو بھی ملا لیا کرتا ہے ایسے موقعوں پر جو حروف عموماً قسم کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں ب، و، ت۔ جو معیت اور صحبت کے مفہوم کے لیے بہت معروف ہیں۔ ۳۵

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ قسمیں دراصل تاکید اور جزم کے اظہار کے لیے کھائی جاتی ہیں اور ان سے مقصود مقسم بہ کو شہادت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔اس میں بلاشبہ کہیں کہیں تعظیم اور تقدیس کا پہلو بھی ہوتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب قسم کھانے والا انسان ہو۔لیکن اگر قسمیں اللہ تعالیٰ کھا رہا ہو تو اس میں تعظیم اور تقدیس کا پہلو سرے سے ہوتا ہی نہیں اس میں محض اظہار تاکید اور عرض شہادت کا پہلو ہوتا ہے۔اس لحاظ سے قرآنی قسموں کا جائزہ لیا جائے تو وہ اشکالات بھی رفع ہو جاتے ہیں اور ان قسموں کی صحیح نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔اس مختصر تبصرہ سے خود بخود یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی قسموں کا علم وفہم کس قدر ناگزیر ہے۔

امثال قرآن:

امثال کے دو پہلو ہیں۔ایک کا نام ''قصص'' ہے اور دوسرے کا ''امثال''، قصص میں سے زیادہ تر کا تعلق ماضی سے ہے لیکن بعض کا تعلق مستقبل سے بھی ہے۔

ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ نے بیش تر انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے قصے بیان فرمائے ہیں جن سے مقصود اہل ایمان کی تثبیت وتسلی ہے اور اہل کفر وشرک کو وعید و تہدید۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جن انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے قصے مختصر یا مفصل بیان فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت الیسعؑ، حضرت سموئیلؑ، حضرت داوٗدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عزیرؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

ان میں سے بعض کی تفصیلات بتائی ہیں، بعض کا محض نام لیا ہے اور بعض کی محض صفات یا ان کے حوالے ہیں۔اسی طرح بعض دیگر افراد، جماعتوں اور قوموں کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

اصحاب القریۃ، حضرت لقمان، اصحاب السبت، اصحاب الرس، حضرت ذوالقرنین، اصحاب الکھف والرقیم، قوم سبا، اصحاب الفیل اور اصحاب الاخدود۔

ان تمام کے ذکر کا مقصد عبرت اور موعظت ہے۔

مستقبل کے جن واقعات کا قرآن میں ذکر ہے ان میں قیامت، جنت و دوزخ، یاجوج و ماجوج کا خروج اور صور اسرافیل وغیرہ ہیں اور بعض مفسرین کے نزدیک اصحاب الاخدود کا تعلق بھی مستقبل ہی سے ہے۔ ان واقعات کے ذکر کا مقصد پیش گوئی ہے۔ کیوں کہ ان کا کوئی تجربہ کسی کو بھی ماضی میں نہیں ہوا ہے۔

قصص کے علاوہ قرآن نے جو امثال بیان کیے ہیں وہ بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو کسی بات کو سمجھانے کے لیے بطور تمثیل پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّئَةُ حَبَّةٍ۔(البقرہ/۲۶۱)

(جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جس نے سات بالیاں نکالی ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔)

دوسرے وہ ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہوں۔ مثلاً

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ۔(الرحمٰن/۶۰)

(احسان کا بدلہ احسان ہی ہے۔)

جو لوگ قرآنی امثال و قصص کی حقیقتوں کو نہیں سمجھیں گے وہ ان امثال و قصص کو لطف اندوزی کا ذریعہ تو بنا سکتے ہیں لیکن ان کے بیان کرنے کا جو مقصد ہے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہے گا۔ اس لیے صحیح فہم قرآن کی خاطر ان کو بھی ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حکمت قرآن:

حکمت ''ح، ک، م'' مادہ سے مشتق ہے۔ اسی مادہ سے دوسرا اسم ''حکم'' ہے۔ ''حکم'' کے معنٰی قرآنی بیانات کے مطابق فیصلہ کرنے کے ہیں۔ مثلاً قرآن کہتا ہے:

مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ (القلم/۳۶)

(تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ۔ (المائدہ/۵۰)

(کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں؟)

اور حکمت کے معنٰی ہیں ''وہ قوت جو عقل ورائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا گیا:

وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ (ص/۲۰)

(اور ہم نے اس کو حکمت اور معاملہ کے فیصلہ کی صلاحیت عطا کی۔)

سورہ بنی اسرائیل میں چند اخلاقی ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا:

ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ۔ (بنی اسرائیل/۳۹)

(یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے تمھاری طرف وحی کی ہے۔)[۳۶]

حکمت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس طرح دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے، جس طرح روشنی سے اردگرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حکیم آدمی دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دلنشیں ہوتا ہے۔ اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے۔''[۳۷]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب و

حکمت کو بھی شامل کیا ہے۔ کتاب اور حکمت دونوں کا تعلق قرآن مجید ہی سے ہے۔ کتاب سے قرآن مجید کے ایک ضابطۂ شریعت ہونے کا مفہوم نکلتا ہے جب کہ قرآن حکمت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں شریعت کی حکمت، صحیح عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ۳۸

حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور و فکر کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کرلے حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمت کا تحمل یکبارگی نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ ۳۹

حکمت کے کئی مقامات ہیں۔ اس کا پہلا مقام دل ہے، دوسرا مقام کلام ہے، اور تیسرا مقام علم و عمل ہے۔ اسی لیے حکمت جس کے دل میں اتر جاتی ہے اس کے کلام پر حاوی ہوجاتی ہے۔ اور جس کے کلام پر حکمت حاوی ہوجائے وہ علم و عمل کا پیکر بن جاتا ہے۔

جس کو وہ حکمت مل جاتی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اس کو اللہ کی نعمتوں کی شناخت حاصل ہوجاتی ہے چنانچہ وہ ان نعمتوں کو پانے کے بعد اپنے منعم حقیقی کا شکرگزار ہوتا ہے۔ اسی حکمت کے ذریعہ وہ حق و باطل کے وجود کا پتہ لگاتا ہے اور خیر و شر میں تمیز کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود حکیم ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پیغمبر کو بھی حکمت عطا کی۔ اور اس پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ امت کو بھی اس حکمت کی تعلیم دے۔ چنانچہ اس نے اپنے پیغمبر کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (الجمعۃ/۲)

(وہی ہے جس نے بھیجا امیوں میں ایک رسول انھیں میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔)

اگر حکمت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں غلطی ہوگی تو نبی کریم ﷺ کے منصب و فرائض کو بھی صحیح طور سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس لیے حکمت قرآن کا جاننا بھی بہت ضروری ہے۔

یہ ہیں وہ چند اہم علوم قرآن جن کا ذکر اس مقالہ میں کیا گیا۔ان علوم سے واقفیت کے بغیر صحیح فہم قرآن ممکن نہیں ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم قرآن ہیں جیسا کہ مقالہ کے شروع میں بتایا گیا لیکن ان تمام کا استقصاء کسی مختصر مقالہ میں نہیں کیا جا سکتا۔

مراجع وحواشی

۱ مولانا امین احسن اصلاحی، تفسیر تدبر قرآن، جلد ا، تفسیر سورۃ البقرہ ۱/۱

۲ الصحیح للبخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الأواخر

۳ تلخیص تفہیم القرآن، مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ملخص مولانا صدرالدین اصلاحی، تفسیر سورۃ القدر

۴ تفسیر ابن کثیر، فی تفسیر سورۃ الشوریٰ تحت آیۃ ''وما کان لبشر......الخ، ۵۱

۵ الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ، باب کیف بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ

۶ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفیٰ البابی، ۱۳۹۸ھ، ص ۴۴

۷ ایضاً

۸ ایضاً

۹ علامہ حمیدالدین فراہی، مقدمۃ تفسیر نظام القرآن، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، بحث: شان نزول

۱۰ الواحدی، اسباب النزول، مصطفیٰ البابی مصر، ۱۳۷۹ھ، ص ۳۸

۱۱ بیشتر مفسرین نے اس کا یہی شان نزول بیان کیا ہے۔

۱۲ الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، ص ۸۰

۱۳ ڈاکٹر صبحی صالح، علوم القرآن، ترجمۃ غلام احمد حریری، مطبوعہ تاج پرنٹرد ہلی، ص۱۰۶

۱۴ ان تمام تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے، الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، النوع الثامن عشر فی جمعہ وترتیبہ

۱۵ مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکورہ سورتوں کو مدنی قرار دیا ہے جب کہ عام طور سے مصاحف میں یہ سورتیں مکی درج ہیں۔

۱۶ عام طور سے علماء نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور مذکورہ چار آیات کو مکی مانا ہے جب کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے اسے مکی قرار دیا ہے اور مذکورہ چار آیات کو مدنی مانا ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کی تفسیریں۔

۱۷ أخرجہ مسلم، بحوالہ الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، ص ۱۳۷

۱۸ أخرجہ البیہقی، بحوالۂ مذکور

۱۹ أخرجہ البیہقی، بحوالۂ مذکور

۲۰ حوالہ مذکور

۲۱ الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فی کم یقرأ القرآن

۲۲ بحوالہ الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، ص ۱۴۱

۲۳ حوالۂ مذکور

۲۴ حوالۂ مذکور

۲۵ الاتقان فی علوم القرآن، الجزء الاول، ص ۱۴۰

۲۶ تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرہ، آیۃ: ۶۰ کی تفسیر

۲۷ ملاحظہ ہو سورۃ النساء، آیات ۱۱، ۱۲

۲۸ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مقالہ ''ونزعنا من کل أمۃ شہیدا'' کی صحیح تاویل، سہ ماہی رسالہ نظام القرآن، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، جلد ۱، شمارہ ۱

۲۹ الامام حمید الدین الفراہی، مفردات القرآن، بحث الآلاء

۳۰۔ یہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کا ہے

۳۱۔ ملاحظہ میرا مقالہ ''تاویل آیات کا فراہی منہاج'' ششماہی علوم القرآن، خصوصی اشاعت، مقالات سمینار قرآنی علوم بیسویں صدی عیسوی میں، ناشر و طابع ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۱۹، ۲۰

۳۲۔ امام حمید الدین فراہی، فاتحہ نظام القرآن، ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ص ۳

۳۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تفسیر تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء، جلد ۱، ص ۱۷

۳۴۔ امام حمید الدین فراہی، اقسام القرآن، ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، طبع دوم، ص ۶، ۷

۳۵۔ ان تمام حقیقتوں کا پتہ لگانے کے لیے علامہ حمید الدین فراہی کی کتاب اُقسام القرآن کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے اور اگر انتہائی اختصار کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا ہو تو میرا مضمون ''قرآنی قسموں کی نوعیت اور حکمت'' ششماہی علوم القرآن، جلد ۱۸، شمارہ ۱، ملاحظہ فرمائیں۔

۳۶۔ علامہ حمید الدین فراہی، حکمت قرآن، ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، دائرۂ حمیدیہ، ص ۱۴ تا ۱۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۶، ۱۷

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۳

نظم قرآن-تاریخی تجزیاتی مطالعہ

نسیم ظہیر اصلاحی

قرآن مجید میں نظم وترتیب کا مسئلہ ہمیشہ موضوع بحث وگفتگو رہا ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک مربوط اور منظّم کتاب ہے، بلکہ اپنے نظم وترتیب کے اعتبار سے ایک معجزانہ کلام ہے۔وہ تمام ادبی محاسن کا جامع اور اس کی ہر آیت علوم ومعارف کا سر بلتا چشمہ ہے۔اس نے عربوں کے مذاق کلام اور اسالیب بیان کی رعایت تو ضرور کی مگر اپنی جدت طرازی، جامعیت معانی اور اثر آفرینی کے ایسے نئے نئے جلوے دکھلائے کہ اہل عرب جنھیں اپنی زبان دانی اور زور بیانی پر بڑا ناز تھا، حیران وششدر ہوکر رہ گئے اور اس سے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکے۔لیکن اس کا یہ کمال بعد والوں کے لیے بے ترتیبی کا شکار نظر آنے لگا۔حالانکہ کلام جب حد درجہ ایجاز واختصار کا حامل ہو اور فصاحت وبلاغت کے منتہائے کمال کو پہنچا ہوا ہو تو اس میں بکثرت محذوفات اور حسن تخلص کے نادر استعمالات ہوں گے، جیسا کہ ہم اشعار میں دیکھتے ہیں۔اس لیے ان محذوفات کو سمجھنے اور کلام کی کڑیوں کو باہم جوڑنے کے لیے غور وتدبر کی ضرورت ہوگی۔اسی لیے قرآن مجید بار بار تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا۔(محمد:۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔

چنانچہ جن علماء نے اس پہلو سے قرآن مجید پر غور وتدبر کیا، انھیں ان روابط کا علم حاصل ہوا جن سے قرآنی آیات وسور کا باہمی ربط وتعلق قائم ہوتا ہے۔اور انھوں نے برملا یہ شہادت دی کہ نہ صرف قرآن مجید کے الفاظ بلکہ اس کی آیتیں اور سورتیں بھی تراشے ہوئے نگینوں کی طرح اپنی اپنی جگہ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی ادھر

ادھر کر دینے سے کلام کا سارا حسن غارت ہو جائے گا۔ان علماء نے اپنی اس دریافت کو ''علم المناسبۃ'' کا نام دیا ہے۔آگے چل کر اسی کو نظم القرآن یا نظام القرآن کے نام سے موسوم کیا گیا۔

نظم،نظام اور مناسبت کا معنی:

عربی زبان میں نظم کے معنی تالیف و ترتیب اور ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانے اور اس میں ضم کرنے کے ہیں مثلاً نظمت اللؤلؤ کا معنی ہوگا ''موتی کو لڑی میں پرو دیا''۔ ''تنظیم'' بھی اسی کا ہم معنی لفظ ہے۔اسی سے ''نظمت الشعر'' (میں نے شعر نظم کیا) بنا ہے۔[1] کلام کی ترتیب و تالیف کے لیے نظم الکلام بولتے ہیں۔کسی اچھی ترتیب کے لیے ہذا نظم حسن کہا جاتا ہے۔[2]

گویا نظم کا مطلب ہے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ملانا اور ترتیب دینا جیسے موتی کے دانے ایک خاص انداز و ترتیب سے دھاگے میں پرو دیے جاتے ہیں کہ ان کا مجموعہ حسن و دلکشی کا پیکر بن جاتا ہے۔جو علماء قرآن مجید میں نظم و ترتیب کے قائل ہیں ان کے نزدیک نظم کا یہی معنی مراد ہوتا ہے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نظم کے بجائے ''نظام'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لفظ نظم جس طرح ''نظم ینظم'' کا ایک مصدر ہے،اسی طرح لفظ نظام بھی اس کا ایک مصدر ہے۔اس کے علاوہ ''نظام'' ایک مستقل لفظ ہے،جسے لغت میں اس شیرازے یا دھاگے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ موتی یا اس جیسی چیزوں کو ترتیب کے ساتھ پرو دیا جاتا ہے۔النظام کل خیط ینظم بہ لؤلؤ و نحوہ۔[3] جب کوئی چیز غیر مرتب اور بے ضابطہ ہو تو اس کے لیے ''لیس لامرہ نظام'' بولتے ہیں۔[4] اس اعتبار سے نظام کا مطلب ہوگا رابطہ کی وہ چیزیں جن سے مختلف چیزوں یا کلام کے مختلف اجزاء میں ایسا ربط و اتصال پیدا ہو جو حسن و رعنائی کا موجب بنے۔چنانچہ علامہ بدر الدین زرکشیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ نے قدیم اصطلاح یعنی ''مناسبت'' کا اصطلاحی مفہوم کچھ ایسا ہی بیان کیا ہے:

المناسبة فی اللغة المشاكلة والمقاربة ومرجعها فی الآيات ونحوها إلى معنى رابط بينها۔[۵]

مناسبت کا لغوی معنی ہم شکل اور باہم قریب ہونے کے ہیں اور آیات قرآنی کے اعتبار سے ربط و تعلق کی وہ چیزیں مراد ہیں جو آیات کے درمیان نظم و ربط پیدا کرتی ہیں۔

علامہ برہان الدین بقاعی ''مناسبت'' کی تعریف یوں کرتے ہیں:

فعلم مناسبات القرآن علم تعرف به علل ترتيب اجزائه۔[۶]

علم مناسبت ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید کے اجزا کی ترتیب کے اسباب و علل معلوم ہوتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی کی اختیار کردہ اصطلاح، سابقہ دونوں اصطلاحات نظم القرآن اور مناسبت فی القرآن کی جامع ہے۔ چنانچہ وہ نظام کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''یہ جان لو کہ نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر سورہ کا ایک خاص تشخص ہو۔ کیونکہ سورہ کے مضامین جب ایک دوسرے سے بالکل مربوط ہوں گے اور وہ تمام مضامین ایک ہی مرکزی نقطے (عمود) کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور کلام میں وحدت کا رنگ نمایاں ہو جائے گا تو اس صورت میں وہ سورہ اپنے مستقل تشخص کے ساتھ سامنے آجائے گی اور جب تم آیات پر اس انداز سے نظر ڈالو گے تو اس وقت ان کا جمال و استحکام اور ان کی آب و تاب تمہارے سامنے آئے گی۔''[۷]

ضرورت و اہمیت:

اس علم کی ضرورت و اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نزولی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام، نبی کریم ﷺ کے پاس جب کوئی آیت یا مجموعہ آیات لے کر آتے تو وہ نبی ﷺ کو یہ بھی بتاتے کہ اسے کس سورہ میں اور کس جگہ رکھنا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی بعض احادیث نقل کرنے کے بعد علامہ خازنؒ لکھتے ہیں:

نثبت بمجموع هذه الاحاديث ان القرآن كان على هذا التاليف والجمع في زمن رسول الله ﷺ۔[8]

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید نبی ﷺ کے عہد میں بھی اسی ترتیب و تالیف کے ساتھ تھا۔

علامہ بغویؒ لکھتے ہیں:

ان الصحابة: رضي الله عنهم جمعوا بين الدفتين القرآن المنزل من غير زيادة ولا نقص ...... كما سمعوه من رسول الله ﷺ من غير ان قدموا شيئا او اخروا وكان رسول الله ﷺ يلقن اصحابه و يعلمهم ما ينزل عليه من القرآن على الترتيب الذى هو الان في مصاحفنا بتوقيف جبرئيل اياه على ذلك واعلامه عند نزول كل آية ان هذه الاية تكتب عقب آية كذا في سورة كذا۔[9]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن مجید کو بین الدفتین بغیر کسی کمی زیادتی کے اسی طرح جمع کیا ہے جیسے نبی ﷺ سے سنا تھا نہ کچھ مقدم کیا نہ کچھ مؤخر۔ نبی ﷺ صحابہ کو اسی ترتیب کے مطابق قرآن لکھنے کی تعلیم و تلقین فرماتے تھے، جو آج ہے۔ اس لیے کہ جبرئیل علیہ السلام ان کو یہی ترتیب بتاتے تھے اور ہر آیت کے نزول کے وقت ان کو بتاتے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد اور فلاں سورہ میں لکھی جائے گی۔

ابو بکر ابن الانباریؒ کہتے ہیں:

انزل الله القرآن كله إلى سماء الدنيا ثم فرق في بضع و عشرين فكانت السورة تنزل لامر يحدث والاية لمستخبر ويقف جبرئيل عليه السلام على موضع السورة والآية فاتساق السور كاتساق الآيات والحروف كله عن النبي ﷺ فمن قدم سورة اواخرها فقد افسد نظم الآيات۔[10]

اللہ تعالیٰ نے مکمل قرآن سمائے دنیا پر نازل فرمایا۔ پھر بیس سال سے زائد عرصہ

میں متفرق طور پر اتارا۔ کوئی بات پیش آنے پر کوئی سورہ نازل ہوتی، کسی سوال کے جواب میں کوئی آیت اترتی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام سورہ اور آیت کا موقع بتاتے کہ اسے کہاں رکھا جائے گا۔ پس سورتوں کا اتصال ایسا ہی ہے جیسے آیات وحروف کا اتصال اور یہ سب نبی ﷺ کے حکم وایماء کے مطابق ہے۔ اس لیے اگر کسی نے کوئی سورہ مقدم یا موخر کردی تو اس نے آیات کا نظم بگاڑ دیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ترتیب نزولی سے الگ دوسری ترتیب کے ساتھ قرآن کا مرتب ہونا حکم خداوندی کی بنا پر ہے اور اس میں معنوی نظم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ حالانکہ نزولی ترتیب حفظ و یادداشت کے اعتبار سے زیادہ مناسب تھی۔ سورتوں کے اول و آخر یا درمیان میں آیات کا اضافہ یا سورتوں کے بیچ میں نئی نئی سورتوں کی شمولیت حافظین و کاتبین قرآن پر کتنی شاق پڑتی رہی ہوگی ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر اس زحمت و مشقت کو صرف اس لیے روا رکھا گیا تاکہ قرآن مجید کی ترتیب اہل زبان کے معیار ذوق و مزاج کے مطابق حسن ترتیب کے بے مثال نمونہ ہو، حکم و معارف کا خزینہ ہو اور فصاحت و بلاغت کے اس منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی ہو جس کا تصور بھی بڑے بڑے شاعر و خطیب اور ماہر ادیب نہ کرسکیں۔ اور اس اعتبار سے وہ معجزہ قرار پائے۔ چنانچہ بہت سے علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس کے نظم میں پوشیدہ ہے۔ امام فخر الدین رازی اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش ہیں۔ سورہ بقرہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

من تأمل فی لطائف نظم هذه السورة وفی بدائع ترتيبها علم ان القرآن كما انه معجز بحسب فصاحة الفاظه وشرف معانيه فهو ايضا معجز بحسب ترتيبه ونظم آياته ولعل الذين قالوا انه معجز باسلوبه ارادوا ذلك۔[1]

جو شخص اس سورہ (بقرہ) کے نظم کے لطائف پر اور اس کی ترتیب کے بدائع پر غور کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ جس طرح قرآن مجید اپنے الفاظ کی فصاحت اور معانی کی بلندی کے سبب معجزہ ہے، اسی طرح اپنی ترتیب اور نظم آیات کی وجہ سے بھی معجزہ ہے۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن اپنے اسلوب کے لحاظ سے معجزہ ہے شاید ان کی مراد بھی یہی ہے۔

آیتوں اور سورتوں کے چھوٹی بڑی ہونے کا راز بھی یہی ہے۔ علامہ بدرالدین زرکشیؒ کہتے ہیں کہ اگر تم کہو کہ کتب سابقہ کو قرآن کی طرح چھوٹی بڑی سورتوں میں کیوں نہیں تقسیم کیا گیا؟ تو میں کہوں گا:

لانها لم تكن معجزات من ناحية النظم و الترتيب۔[۱۲]

یعنی اس لیے کہ وہ نظم وترتیب کے لحاظ سے معجزہ نہیں تھیں۔

نظم کی اسی اہمیت کی بنیاد پر علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

من حق مفسر كتاب الله الباهر و كلامه المعجز ان يتعاهد في مذاهبه بقاء النظم على حسنه۔[۱۳]

اللہ کی روشن کتاب اور اس کے معجزانہ کلام کے مفسر پر لازم ہے کہ وہ اپنے طریقۂ تفسیر میں اس کے حسن نظام کو پوری طرح باقی رکھنے کی لازماً کوشش کرے۔

آغاز وارتقا:

یوں تو اس کا باقاعدہ ظہور تیسری صدی ہجری سے بظاہر نظر آتا ہے مگر بعض آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ وتابعینؒ کے یہاں بھی نظم وتناسب کا تصور پایا جاتا تھا اور وہ فہم قرآن میں اس سے مدد لیتے تھے۔ مشہور تابعی حضرت مسلم بن یسارؒ اپنے والد کا قول نقل کرتے ہیں:

اذا حدثت عن الله حديثا فقف حتى تنظر ما قبله و مابعده۔[۱۴]

جب تم کسی آیت کا مفہوم بیان کرنا چاہو تو ذرا رک کر اس کے ماقبل و مابعد کی آیات پر غور کرلو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

اذا سأل احدكم صاحبه كيف يقرأ آية كذا و كذا ، فليسأله عما قبلها۔[۱۶]

اگر کوئی پوچھے کہ فلاں آیت کس طرح پڑھی جائے تو سائل سے یہ پوچھا جائے کہ اس سے پہلے کونسی آیت ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ ماقبل والی آیت پر غور کیا جائے گا تو دونوں کا باہمی نظم، آیت مسئول عنہا کے انداز قرأت کا پتہ دے گا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ: کچھ لوگ جہنم میں ڈالے جانے کے بعد پھر نکال لیے جائیں گے۔ تو اہل مجلس نے ان کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی:

يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُواْ مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ۔(المائدۃ/۳۷)

وہ جہنم سے نکل جانا چاہیں گے حالانکہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

اس پر ابوسعید خدریؓ نے فرمایا: ذرا اوپر والی آیت پڑھو، جو یہ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُواْ بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔(المائدۃ/۳۶)

اگر کافرین کے پاس وہ سب کچھ ہو جو دنیا میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا اور ہو تاکہ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لیے بطور فدیہ ادا کریں تو ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ چند مثالیں اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ صدر اول میں بھی نظم و تناسب کا تصور موجود تھا اور آیات کا مفہوم و منشا سمجھنے کے لیے ان کے سیاق و سباق اور نظم کلام کو دیکھا جاتا تھا۔

قرآن مجید عربوں کی زبان میں اترا تھا اور انہی کے اسالیب و محاورات اور تشبیہات و استعارات استعمال کرتا تھا، گو اپنی جدت طرازی اور ندرت پسندی سے ان کے مروجہ اسالیب بیان میں ایسی دلکشی، تازگی اور نیا پن پیدا کر دیا، جسے دیکھ کر عرب مبہوت ہو گئے، مگر وہ اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کی لذت و شیرینی سے محظوظ بھی ہوتے تھے۔ کیونکہ قرآن نے ان کے لطیف اور اعلیٰ ذوق و مزاج کی تسکین کا بھرپور سامان فراہم

کرتا تھا۔ زمانۂ نزول کے احوال، مخاطبین کے معاملات اور ان کی مزاجی، اخلاقی اور سماجی کیفیات سے وہ پوری طرح واقف تھے بلکہ وہی اس کے مخاطب اول تھے۔ اس لیے قرآن ہر پہلو سے ان کے لیے آسان اور قابل فہم تھا۔ اس کا اعجاز ان پر پوری طرح عیاں تھا۔ بحیثیت کلام کسی پہلو سے مشکل یا قابل اعتراض نہ تھا۔ نہ اپنے اسلوب والفاظ کے لحاظ سے نہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے اور نہ نظم وترتیب کی جہت سے۔ اس لیے قرآن فہمی کے لیے انھیں کسی خاص اصول اور طریقے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور جب تک یہ قدیم ادبی و لسانی ذوق باقی رہا اور زمانۂ نزول کے احوال و کیفیات ذہنوں میں مستحضر رہیں قرآن فہمی میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

البتہ دوسری صدی ہجری کے وسط سے جب فلسفہ اور علوم طبیعی کی کتابوں کے تراجم سریانی، یونانی اور پہلوی زبانوں سے عربی میں منتقل ہونے لگے تو ان کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے نئے نئے انداز سے اہل عرب متعارف ہونے لگے۔ مختلف عجمی ثقافتوں سے عربی فکر متاثر ہونے لگی، روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا رجحان بڑھنے لگا۔ اب قرآن مجید کا اعجاز زیر بحث آیا۔ ابن مقفع، بشار بن برد، صالح بن عبدالقدوس اور عبدالحمید الکاتب جیسے آزاد خیال ادباء اور نثّار سامنے آئے، جنھوں نے قرآن مجید سے معارضہ کی ٹھانی اور زندیق کہلائے۔ مختلف کلامی اور فقہی مذاہب کی داغ بیل پڑی۔ اسی زمانہ میں معتزلہ کا ظہور ہوا، جن کی طرف سے اعجاز قرآن کی بحث میں ''نظریۂ صرفہ'' پیش کیا گیا۔

اعجاز قرآن کی اس بحث میں سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ محل اعجاز کیا ہے؟ عام خیال تو یہ تھا کہ محل اعجاز اس کا نظم ہے۔ لیکن معتزلہ کو اس کے نظم میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ انھوں نے نظم کے بجائے ''صرفہ'' کا تصور پیش کیا۔ ان کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ فصحائے عرب قرآن مجید سے معارضہ کی استطاعت تو رکھتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بالفعل ایسا کرنے سے روک رکھا تھا۔ اعجاز قرآن کی یہ تعبیر ''صرفہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن معتزلہ کے اس خیال سے کم ہی لوگ متفق ہوئے۔ زیادہ تر علماء نظم ہی کو قرآن کا اعجاز خیال کرتے رہے۔ حاصل یہ کہ پہلے پہل دوسری صدی ہجری کے وسط سے نظم قرآن پر بحث کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

نظم قرآن دوسری تیسری صدی ہجری میں

ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں شیخ قطرب متوفی ۲۰۶ھ کی ایک تصنیف ''کتاب معانی القرآن'' کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۵؎ اس کتاب کے بارے میں احمد امین نے لکھا ہے:

''شیخ نے اس کو بعض آیات قرآنی کے درمیان نظر آنے والے تعارض و تناقض کو دور کرنے کے لیے لکھا تھا مثلاً آیت کریمہ **فلاانساب بینھم یومئذو لا یتسائلون** اور آیت کریمہ **واقبل بعضھم علی بعض یتسائلون** جیسی آیات متعارضہ کے درمیان توافق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' ۱۷؎

یہ کتاب موضوع زیر بحث کی سب سے پہلی کتاب ہے مگر مشہور یہ ہے کہ ابوعبیدہ معمر بن المثنی متوفی ۲۰۹ھ کی ''کتاب المجاز'' سب سے پہلی کتاب ہے جس میں انھوں نے قرآن کی عربیت خالصہ کو کلام عرب کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابوعبیدہ بمجازہ فتح الطریق لدراسات بلاغیة تھدف إلی بیان الاعجاز القرآنی من طریق نظمه وتالیفه۔ ۱۸؎

ابوعبیدہ نے اپنی کتاب ''مجاز'' کے ذریعہ بلاغی مباحث کا دروازہ کھولا جن کا مقصد نظم قرآن اور تالیف قرآنی کے اعتبار سے قرآنی اعجاز کا اثبات و بیان ہے۔

اس دور کے مشہور نحوی عالم فراء دیلمی متوفی ۲۰۷ھ نے بھی ابوعبیدہ کے نہج و انداز کے مطابق وجوہ نظم اور بلاغی مباحث پر مشتمل ایک تفسیر ''معانی القرآن'' لکھی۔ ۱۹؎

ان تینوں ابتدائی تصانیف میں قرآن کا اعجاز اس کے نظم ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ تاہم ان کے مصنفین نے اپنے اس فکر و خیال کو کسی نام سے موسوم نہیں کیا۔ تیسری صدی ہجری کا مشہور معتزلی عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ پہلا شخص ہے جس نے اس فکر کو ''نظم القرآن'' کا نام دیا۔ جاحظ نے اپنے استاذ ابراہیم نظام متوفی ۲۲۳ھ کے نظریۂ اعجاز ''صرفہ'' کی تردید میں اپنی کتاب ''نظم القرآن'' لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کا اعجاز اس

کے نظم میں پوشیدہ ہے۔[19]

زیر بحث موضوع پر لکھی جانے والی مشہور کتاب ابن قتیبہ متوفی ۲۸۶ھ کی تاویل مشکل القرآن ہے۔اس کتاب کے بعد یہ خیال عام اور پختہ ہوا کہ قرآن کا اصل اعجاز اس کے نظم اور بلاغت اسلوب میں پنہاں ہے۔

جاحظ اور ابن قتیبہ کے بعد اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں ''نظم القرآن'' ہی کے نام سے لکھی گئیں۔مگر جاحظ کی نظم القرآن کی طرح یہ بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

مذکورہ علماء نے ''نظم القرآن'' کے عنوان سے یہ جو بحث چھیڑی تو اس کا تعلق آیات وسور کے معنوی ربط وتعلق اور ان کی موضوعی وحدت سے نہ تھا۔ بلکہ ان کا زور الفاظ کے حسن انتخاب، ان کے دروبست، تراکیب کی بندش، جملوں کی سبک خرامی، قوافی کی نغمگی، استعارات وتشبیہات اور امثال ومحاورات کی ندرت ودلکشی پر تھا۔وہ الفاظ وآیات پر الگ الگ محض ادبی و بلاغی نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے تھے۔جملوں کی تالیف اور مفرد مضامین کی لفظی ومعنوی خوبیاں ہی ان کی بحث وگفتگو کا مرکز تھیں۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان میں ایک نئے فن ''فن بلاغت'' کی داغ بیل پڑ گئی جو پانچویں صدی ہجری میں علامہ عبدالقاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ کے یہاں ایک مستقل فن کی شکل میں مدون ہوا۔لیکن ارتباط مضامین اور نظم آیات پر ابھی تک کوئی خاص توجہ نظر نہیں آتی۔

چوتھی صدی ہجری:

چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک قدیم عربی ذوق بہت کچھ بدل چکا تھا۔اب عربی انداز خطاب سے ہٹ کر عجمی طرز تصنیف کے مطابق قرآن مجید پر غور کیا جانے لگا اور بعد زمانی کے سبب زمانۂ نزول کے احوال و واقعات بھی ذہنوں سے محو ہونے لگے۔اس لیے مختلف آیات کے درمیان لطیف ربط وتعلق کا سمجھنا مشکل ہونے لگا۔ چنانچہ آیتوں اور سورتوں کے مابین باہمی نظم وربط کے متعلق سوالات سب سے پہلے اسی صدی میں زیادہ شدت سے اٹھائے گئے۔

اس صدی میں سب سے پہلے ہماری نظر مشہور مفسر قرآن علامہ ابن جریر طبریؒ متوفی ۳۱۰ھ پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں جابجا نظم سے بحث کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا خاص امتیاز سلف کے اقوال و روایات کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع کر دیتا ہے۔ مگر جس طرح وہ الفاظ، اسالیب اور محاورات سے تعرض کرتے ہوئے شعراء جاہلیت سے بکثرت استشہاد کرتے ہیں، اسی طرح اظہار نظم کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور بسا اوقات نظم کلام اور سیاق و سباق سے میل کھانے والے مفہوم ہی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے خلاف پڑنے والے اقوال و روایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ وہ بھی نظم ہی کو قرآن مجید کا اعجاز و امتیاز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ومن اشرف تلک المعانی فضل بها کتابنا سائر الکتب قبله، نظمه العجیب ووضعه الغریب وتالیفه البدیع الذی عجزت عن نظمه مثل اصغر سوره الخطباء۔[۲۱]

ہماری کتاب (قرآن مجید) کو جن اعلیٰ واشرف معانی کی بنا پر اپنے ماقبل تمام کتب سماوی پر فضیلت حاصل ہے، قرآن کا وہ دلچسپ نظم، انوکھی وضع اور نادر تالیف ہے جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کی مثال پیش کرنے سے عرب کے بڑے بڑے خطباء عاجز رہے۔

علامہ بدرالدین زرکشیؒ کے مطابق اس صدی میں شیخ ابوبکر نیشاپوری متوفی ۳۲۶ھ نے سب سے پہلے نظم آیات و سور کے متعلق سوالات اٹھائے اور ایک جدید انداز سے مطالعہ و تدریسِ قرآن کا دروازہ کھولا۔ ان کے سامنے جب کوئی آیت پیش کی جاتی تو پہلے وہ یہ پوچھتے کہ اسے فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھا گیا ہے؟ وہ نظم کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اپنے عہد کے علماء بغداد پر اس لیے طعن کرتے تھے کہ ان کو نظم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔[۲۲] ان کا قول ہے:

ان اعجاز القرآن لم یرجع الا إلی هذه المناسبات الخفية والقوية بین آیاته وسوره حتی کان القرآن کله کالکلمة الواحدة ترتیبا وتماسکا۔[۲۳]

قرآن مجید کے اعجاز کا تعلق آیتوں اور سورتوں کے خفی مگر قوی ربط و مناسبت سے ہی ہے اور یہ ربط و تعلق ایسا ہے کہ گویا پورا قرآن اپنی ترتیب اور اجزا کے باہمی تعلق کے پہلو سے کلمہ واحدہ ہے۔

گویا شیخ نیشاپوری نظم و ترتیب ہی کو قرآن کا اعجاز مانتے ہیں اور اسے اس حد تک مربوط و منظم تسلیم کرتے ہیں کہ گویا وہ کلمہ واحدہ ہے۔

اُس عہد کے ایک اور عالم ابوالفرج احمد بن مقری ہمدانی متوفی ۴۰۰ھ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خاص اسی موضوع پر ایک مستقل کتاب "علم المناسبة" کے نام سے تصنیف کی۔ تاہم لغوی اور ادبی و بلاغی جہت سے بحث و گفتگو کا رجحان اب بھی غالب رہا اور بہت سے علماء نے اس پہلو سے نظم قرآن کو اپنا موضوع بنایا اور کتابیں تصنیف کیں مگر ہم ان کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک عالم کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے ایک معتزلی عالم قاضی ابوالحسن عبدالجبار الاسد آبادی متوفی ۳۱۵ھ ہیں۔ نظم قرآن کے تعلق سے تذکرہ نگار حضرات ان کا نام نہیں لیتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "المغنی فی ابواب التوحید والعدل" میں نظم سے متعلق بڑی اہم بحث کی ہے اور اپنے استاذ ابوہاشم الجبائی جو نظریہ نظم کے منکر ہیں، ان کے خیالات کی مدلل تردید کی ہے۔ قرآن مجید کے نظم و بلاغت اور کلام عرب سے اس کی ہم آہنگی ثابت کرنے کے لیے جو اساسات اور بنیادیں انھوں نے فراہم کی تھیں انہی اساسات پر پانچویں صدی کے جید عالم عبدالقاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ نے اپنی مشہور عالم کتاب "دلائل الاعجاز" تصنیف کی۔ جرجانی کا یہ نظریہ کہ بلاغت کلام کا اصل ماخذ نظم کلام ہے، دراصل اس کے موجد عبدالجبار الاسد آبادی ہیں۔ البتہ اس کی تشریح اور بہت سی تفصیلات و جزئیات کی تکمیل و تہذیب کا شرف بلاشبہ جرجانی کو حاصل ہے۔[۲۴]

نظم قرآن بعد کی صدیوں میں

چھٹی صدی ہجری کے مشہور مفسر قرآن علامہ جاراللہ زمخشری ۵۳۷ھ نے اپنی

تفسیر ''الکشاف'' میں ربط آیات کا بڑا اہتمام کیا اور اس فن کو بہت کچھ وسعت دی، یہاں تک کہ اس کو قرآنی بلاغت کا جزء قرار دیا۔ وہ مفسرین پر لازم قرار دیتے ہیں کہ وہ جو بھی طریقۂ تفسیر اختیار کریں مگر اس امر کو یقینی بنائیں کہ قرآن کا حسن نظام درہم برہم نہ ہونے پائے۔[25] ان کا انداز تفسیر یہ ہے کہ سیاق کلام جس مفہوم پر دلالت کرتا ہے اسے اس جزم کے ساتھ بیان کرتے ہیں جیسے وہاں کوئی دوسرا مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔[26]

ابن عطیہ اندلسی متوفی ۵۴۲ھ نے بھی اپنی تفسیر ''المحرر الوجیز'' میں اعجاز قرآنی پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کے نظم کو نہ صرف اس کا اعجاز اصلی قرار دیا ہے بلکہ اسے قرآن کے کلام اللہ ہونے کے دلائل میں شمار کیا ہے۔ علامہ سیوطی نے ان کے اس خیال کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔[27]

قاضی ابوبکر ابن العربی ۵۴۳ھ کو نظم قرآن سے بڑی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مفسر ہیں جنھوں نے یہ کہا کہ '' آیات قرآنی کے باہمی ربط و تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ مسلسل اور مربوط کلام بن کر کلمہ واحدہ کی طرح ہو جائے۔ معانی میں وسعت پیدا ہو جائے اور کلام مرتب و منظّم شکل میں نظر آئے۔ ایک عظیم علم ہے''[28] حالانکہ شیخ نیشا پوری ۳۲۶ھ کا یہ قول پہلے گذر چکا ہے ''کان القرآن کله كالكلمة الواحدة'' اس لیے اس نظریہ میں شیخ نیشاپوری کو ابن العربی پر تقدم حاصل ہے۔ بہر حال ابن العربی کا مزید بیان ہے:

'' بجز ایک عالم کے کسی نے اس سے (نظم) تعرض نہیں کیا۔ انھوں نے سورہ بقرہ کا نظم پیش کیا۔ پھر اللہ نے مجھ پر اس کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن چونکہ اس کے حاملین اور قدرداں نہیں ملے۔ لوگوں میں اس سے دلچسپی نظر نہیں آئی، اس لیے ہم نے اسے عام کرنے کے بجائے، اس کا معاملہ اپنے اور خدا کے درمیان رہنے دیا اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا''۔[29]

قاضی ابن العربی نے جس عالم کا نظم کے تعلق سے حوالہ دیا ہے، علامہ بقاعیؒ کے مطابق وہ ولی اللہ محمد بن احمد ملوی شافعی ہیں۔[29الف] ان کا قول ہے کہ:

'' قرآن کا کھلا ہوا اعجاز اس کا اسلوب اور حیرت انگیز نظم ہے...... اس لیے ہر آیت کے متعلق سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ وہ ماقبل آیت کا تکملہ ہے یا اپنی جگہ پر مستقل آیت

ہے؟ اگر وہ مستقل آیت ہے تو پہلے والی آیت سے اس کی مناسبت کیا ہے؟ یہ دریافت اپنے اندر علم وافر کا خزانہ رکھتی ہے۔ اسی طرح سورتوں کو بھی دیکھا جائے کہ ماقبل و مابعد کی سورتوں سے اس کے اتصال کی وجہ کیا ہے؟''۔[30]

نظم کی بحث میں سب سے زیادہ پیش رفت ساتویں صدی ہجری میں اس وقت ہوئی جب امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''مفاتیح الغیب'' تصنیف کی۔ اس میں انھوں نے نظم آیات پر خاص توجہ دی۔ ان کا مشہور قول ہے ''اکثر لطائف القرآن مودعة فی الترتیبات والروابط''[31] یعنی قرآنی حکمتوں کا بڑا خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں پوشیدہ ہے۔ یہ ان محققین میں سے ہیں جو قرآن مجید کی ترتیب اور نظم آیات کو الفاظ و معانی کی طرح معجزہ قرار دیتے ہیں ان کی یہ رائے پیچھے گزر چکی ہے۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جو سورہ کے تمام مضامین کو جوڑ کر ان میں حسن و اثر پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا (حم السجدہ/۴۴) کی تفسیر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ہر وہ شخص جس میں انصاف ہوگا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر اس آیت کی یہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے آخر تک ایسے منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر رکھا گیا ہو اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہوگی، جو لوگ بیان کرتے ہیں''۔[32]

آٹھویں صدی کے مشہور عالم الشیخ ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی الاندلسی (۶۲۷-۷۰۸ھ) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس کا نام ''البرھان فی تناسب سور القرآن'' ہے۔ اسے اس موضوع کی سب سے پہلی مکمل کتاب کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب دکتور سعید الفلاح کی تقدیم و تحقیق کے ساتھ جامعہ زیتونیہ تیونس سے ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس میں شیخ نے قرآنی سورتوں کا باہمی ربط و تعلق بہت عمدہ انداز میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے اگرچہ قرآنی سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے، لیکن سورتوں کا باہمی نظم بیان کرتے ہوئے آیات

کا باہمی ربط و تعلق بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ان کی کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ سورتوں کا نظم بیان کرتے وقت پورے قرآن کے مجموعی نظم پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔اسی طرح ہر سورہ کا مقصود و مدعا اور اس کے مضامین کا خلاصہ اس طرح اختصار کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں کہ نہ صرف سورہ کے اندرونی اجزاء کا نظم سمجھ میں آنے لگتا ہے بلکہ اس کے اصل ''موضوع و مقصود'' کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس صدی کے ایک دوسرے عالم الشیخ کمال الدین الزملکانی متوفی ۷۲۷ھ بھی نظم قرآن کے زبردست موید تھے۔ وہ اپنے دروس میں اس پر خصوصی توجہ فرماتے تھے وہ بھی ابن الزبیر الثقفی کی طرح سورتوں اور آیتوں دونوں کے نظم کے قائل ہیں۔وہ بھی قرآن کو کلمہ واحدہ مانتے ہیں۔ان کا قول ہے:''**عند التأمل یظهر ان القرآن کله کالکلمة الواحدة**'' ۳۳؎ یعنی اگر غور و تأمل سے کام لیا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ پورا قرآن ''کلمہ واحدہ'' کی طرح مربوط اور باہم متصل ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ متوفی ۷۴۶ھ نے بھی اپنی تفسیر میں نظم کو قرآن کا اعجاز قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک قرآن کا اعجاز دو جہت سے ہے ایک نفس قرآن کی جہت سے دوسرے صرفہ کے اعتبار سے۔نفس قرآن سے تعلق رکھنے والا اعجاز اس کا نظم ہے۔لفظ اور معنی ان کے نزدیک اعجاز کا سبب نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں وہ عناصر ہیں جن کے ذریعہ ایک ایسا منفرد نظم وجود میں آتا ہے جو قرآن کے ساتھ خاص ہے۔ چنانچہ اپنے اس خیال کی تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو اعجاز،قرآن کے ساتھ خاص ہے وہ ایک مخصوص نظم ہی سے تعلق رکھتا ہے اور نظم کا معجزہ ہونا نظم کلام پر منحصر ہے۔اور اس بات پر منحصر ہے کہ یہ نظم دوسرے کلاموں کے نظم سے مختلف ہو''۔۳۴؎

اُسی صدی کے مشہور عالم و محقق علامہ بدرالدین زرکشی متوفی ۷۹۴ھ نے اپنی مشہور کتاب ''**البرهان فی علوم القرآن**'' میں ''**معرفة المناسبات بین الآیات**'' کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور کہا ہے کہ علم مناسبت ایک شریف علم ہے اس

سے عقل و فہم کا اندازہ ہوتا ہے۔قائل کی قدر و منزلت معلوم ہوتی ہے یہ نہایت مشکل علم ہے اسی لیے مفسرین نے اس طرح بہت کم اعتنا کیا۔وہ ترتیب بین الآیات والسور دونوں کے قائل ہیں اور دونوں کی ترتیب کو توقیفی مانتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ایک سورہ کے خاتمہ اور اس کی بعد والی سورہ کے آغاز میں بھی گہرا ربط ہوتا ہے البتہ یہ ربط کبھی خفی ہوتا ہے اور کبھی جلی۔خود سورہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ میں بھی ربط و تعلق ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی ترتیبی نوعیت بیان کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی کتاب میں نظم کی تاریخ اور اس کی اہمیت بیان کرنے کے بعد ایک طویل بحث میں بعض سورتوں اور آیتوں کے باہمی نظم و ارتباط کو بطور نمونہ ثابت کرکے اپنے دعوی کی صحت پر استدلال کیا ہے۔[۳۵] ان کا قول ہے:

"لیکن محط نظر المفسر مراعاة نظم القرآن الذی سبق له وان خالف اصل الوضع اللغوی لثبوت التجوز"۔[۳۶]

مفسر قرآن کے پیش نظر وہ نظم لازماً رہنا چاہیے جس کے سیاق میں کلام وارد ہوا ہے خواہ اس کے لیے اصل معنی کے بجائے مجازی معنی کیوں نہ مراد لینا پڑے۔

یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نظم ہی کو قرآن کا اعجاز مانتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔

نویں صدی ہجری کے ہندی نژاد عالم علامہ علاء الدین مخدوم علی مہائمی متوفی ۸۳۵ھ نے بھی اس علم کو موضوع بحث بنایا اور ان کی بے نظیر تفسیر "تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان" منصۂ شہود پر آئی۔جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں قرآنی آیات کے مابین نظم و ربط ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔جس کے ذریعہ ایسے علمی نکات و لطائف سے اپنے دامن بھر لیے جو ان سے پہلے کسی کی دسترس میں نہ آسکے تھے۔خود ان کا اپنا بیان ہے:

"یہ نظم ہی کی برکت ہے کہ اس کی روشنی میں اس کتاب کے اندر ایسے نادر نکتے جمع کرسکا جن کو مجھ سے پہلے کسی جن وانس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا"۔[۳۷]

اس موضوع پر اس عہد کی سب سے اہم کتاب علامہ برہان الدین بن عمرو البقاعی م ۸۸۵ھ کی تصنیف "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" ہے جو بیس ضخیم

جلدوں پر مشتمل ہے۔ علامہ بقاعی نظم قرآن کو قرآنی بلاغت کا راز قرار دیتے ہیں اور فہم قرآن میں اسے بے حد معین و مددگار بناتے ہیں اور بار بار اس کے نہایت دقیق اور مشکل ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''علم مناسبت قرآن کا ایک اہم علم ہے جس سے ترتیب کی باریکیاں اور حکمتیں واضح ہوتی ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ ماقبل و مابعد کے ربط و تعلق کی وجہ سے جو چیز جہاں ہونا چاہیے اور وہاں اس کا جو ترتیبی مقام ہے اس سے واقفیتِ حاصل ہوتی ہے پس اس سے اجزائے کلام کی ترتیب کے پیچھے کارفرما اسباب و علل کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس میں مزید حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سورہ کا مقصود و مدعا معلوم ہو۔ مقصد کی معرفت سے تمام جملوں اور آیات کے معنی و مقصود کی معرفت حاصل ہوتی ہے''۔۳۸ الف

بقاعی کے نزدیک نظم قرآن کے کل چار پہلو ہیں:

۱۔ پورا قرآن باہم مربوط اور مسلسل کلام ہے۔

۲۔ تمام آیات کا ایک دوسرے سے گہرا ربط ہے۔

۳۔ تمام سورتیں باہم مربوط ہیں۔

۴۔ ہر سورہ کا کوئی نہ کوئی مقصد یعنی مرکزی موضوع ہے۔

علامہ بقاعی نے خاص سورتوں کے مقاصد یعنی ان کے مرکزی موضوع کے تعلق سے بھی ایک مستقل کتاب **مضاعد النظر للاشراف علی مقاصد السور** کے نام سے تصنیف کی ہے۔

علامہ بقاعیؒ کے نزدیک قرآن مجید ایسا مربوط، مسلسل اور متصل کلام ہے جس میں کہیں وقف یا انقطاع نہیں، یہاں تک کہ آخری سورہ الناس پر بھی نہیں۔ یہ آخری سورہ ہوتے ہوئے بھی سورہ فاتحہ سے جو قرآن کی سب سے پہلی سورہ ہے، اسی طرح مربوط ہے جس طرح اپنے ماقبل کی سورہ الفلق سے مربوط ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۳۹ ب

اسی دور کے نامور عالم اور مورخ علامہ جلال الدین سیوطیؒ م ۹۱۱ھ نے اس موضوع پر اب تک کی پیش رفت کو اپنے انداز سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اپنی کتاب

"الاتقان فی علوم القرآن" میں ایک مستقل طویل باب (النوع الثانی والستون فی مناسبۃ الآیات والسور) قائم کر کے اس موضوع کے تعارف، تاریخ اور ارتباط آیات وسور سے متعلق ایک اہم قیمتی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔[۴۰] اپنے پیش رو علامہ بدرالدین الزرکشی کی کتاب "البرھان فی علوم القرآن" سے اس موضوع پر ان کی پوری بحث بھی تقریباً من وعن نقل کر دی ہے۔ اور خاص اس موضوع پر ایک کتاب "اسرار التنزیل" تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب غالباً دستیاب نہیں ہے۔ الاتقان میں اس کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے۔ پھر اسی کتاب سے تلخیص کر کے صرف سورتوں کے باہمی ربط و تعلق پر مشتمل ایک کتاب "تناسق الدرر فی تناسب السور" مرتب کی[۴۱] جو "اسرار ترتیب القرآن" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ عبدالقادر احمد عطا نے اس کی تحقیق کی ہے۔ اس کے مقدمۂ مصنف میں اسرار التنزیل کی فہرست مضامین بھی شامل ہے۔[۴۲]

دسویں صدی ہجری کے ایک ہندوستانی عالم حسن محمد بن احمد نصیر میانجی گجراتی متوفی ۹۸۲ھ نے بھی ایک مکمل تفسیر "تفسیر احمدی" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں بطور خاص ربط آیات پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے کافی غور وخوض کے بعد اس تفسیر کو لکھا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات کی تفسیر مربوط انداز میں پیش کروں...... کلام اللہ کی تفسیر تو بہت سے لوگوں نے لکھی، لیکن کسی نے بھی تمام آیات کو ایک دوسرے سے متعلق ثابت نہیں کیا ہے"۔[۴۳]

نظم قرآن چودھویں صدی ہجری میں:

اس صدی میں تفسیر قرآن کا منہاج انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوا۔ قدیم انداز تفسیر جو نہایت خشک اور کلامی و منطقی بحثوں سے پر تھا، اب رخصت ہوا۔ معاشرہ اور سماج کو درپیش نت نئے مسائل وحالات کا حل نفس قرآن سے تلاش کرنے کا رواج عام ہوا۔ عصری نظریات اور قرآنی فکر کے مابین مقابلہ وموازنہ اور تطبیق وتنقید کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن اس ہمہ جہت انداز تفسیر کے باوجود نظم کلام کا دامن نہیں چھوڑا گیا۔ پہلے کے بالمقابل اسے اور

زیادہ مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ ہر عالم اور مفسر نے قرآنی حقائق و معانی اور ہدایت و رہنمائی کی تلاش میں نظم کو ایک اہم عامل کے طور پر دیکھا اور پرکھا۔ شیخ محمد عبدہ م ۱۹۰۵ء اس انداز تفسیر کے سرخیل اور ان کے دونوں عظیم شاگرد علامہ رشید رضا م ۱۳۵۴ھ صاحب تفسیر ''المنار'' اور مصطفٰی المراغی متوفی ۱۳۳۵ھ صاحب تفسیر ''المراغی'' ان کے دست راست تھے۔ شیخ نے قرآن سے متعلق جن اہم حقائق کی دریافت کی ان کے مذکورہ دونوں شاگردوں نے اپنی تفسیروں میں بڑی خوبی کے ساتھ اپنایا جس سے تفسیری رجحان میں قابل لحاظ تبدیلی رونما ہوئی۔ سید قطب نے بھی اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں نظم آیات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور تمام قرآنی سورتوں کی موضوعی وحدت ظاہر کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ وہ ہر سورہ کے مرکزی موضوع کے بھی قائل ہیں جس کو وہ ''محور'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس صدی میں نظم کے بجائے ایک نئی اصطلاح ''موضوعی وحدت'' کے نام سے اس وقت سامنے آئی جب جامعہ ازہر مصر کے کلیۃ اصول الدین میں نظم آیات وسور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح تدریس قرآن کا اہتمام کیا گیا کہ قرآن کی تمام سورتیں اور سورتوں کی تمام آیتیں کسی نہ کسی عنوان کے تحت گردش کررہی ہیں اور وہی مرکزی عنوان تمام سورتوں اور آیتوں میں اتحاد و اتصال کا کام کررہا ہے۔ قرآن کے اس منہج تفسیر کو ''موضوعی وحدت'' سے تعبیر کیا گیا۔ اس مناسبت سے ایسی متعدد تفسیری بحثیں سامنے آئیں جن میں آیات قرآنی کے نظم و ارتباط یا موضوعی وحدت سے بطور خاص گفتگو کی گئی ہے۔ الشیخ عبداللہ دراز (م ۱۹۵۸ء) نے اپنی کتاب ''النبأ العظیم'' میں قرآن مجید کے نظم و ترتیب کی نوعیت پر معرکۃ الآراء بحث کرکے قرآن مجید کی موضوعی وحدت کو واضح کیا ہے اور نمونہ کے طور پر سورہ بقرہ کا تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ اس کے اجزاء کا باہمی ارتباط اور ان کی موضوعی وحدت بالکل آشکارا ہو جائے۔

محمود محمد حجازی کی تصنیف ''کتاب الوحدۃ الموضوعیۃ فی القرآن'' خاص اسی موضوع سے متعلق ایک مستقل کتاب ہے۔ قاضی شمس الدین بن شیر محمد نے اپنی کتاب ''انوار البیان فی اسرار القرآن'' میں تمام قرآنی سورتوں کا موضوعی خلاصہ پیش

کیا ہے۔ ''المناسبات بین الآیات والسور'' کے نام سے بعض کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ مسلم نے مباحث فی التفسیر الموضوعی لکھ کر زیر بحث موضوع کو مزید وسعت اور استحکام عطا کیا۔

ادھر برصغیر میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا، بلکہ بعض حیثیتوں سے یہاں انجام پانے والا کام مصر وعرب کی تحقیقات سے زیادہ بھاری اور وزن دار ہے۔

برصغیر میں زیر بحث موضوع کے تعلق سے اس صدی کا سب سے نمایاں نام امام حمید الدین فراہیؒ کا ہے۔ جنھوں نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے مرتب کیا، اس کے اصول ومبادی متعین کیے۔ اس کی مشکلات کو اجاگر کیا۔ تلاش نظم میں معاون چیزوں کی نشان دہی کی اور نہایت متعین اور دوٹوک انداز میں نظم قرآن کا پورا خاکہ پیش کیا اور اس کے اظہار و بیان کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

ان کے نزدیک پورا قرآن کلمہ واحدہ ہے جو بظاہر کل نو گروپ میں منقسم ہے اور ہر گروپ کا ایک مرکزی موضوع ہے جسے وہ عمود سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر سورہ دوسری سورہ سے مربوط ہے۔ کبھی وہ پہلی سورہ کے ضمیمہ یا تکملہ کے طور پر آئی ہے تو کبھی بطور معترضہ اور کبھی قریب کے بجائے دور کی کسی سورہ سے متعلق ہوتی ہے، ہر سورہ کا بھی ایک مرکزی عنوان یعنی عمود ہوتا ہے اور تمام آیات مختلف جہتوں سے اسی عمود کی طرف رجوع کرتی ہیں جس سے سورہ میں وحدت پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر سورہ کے چند اجزائے ترکیبی ہیں جو عمود، تمہید، نفس مضمون اور خاتمہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔

یوں تو مولانا فراہی نے قرآنی سورتوں کو نو حصوں میں تقسیم کیا ہے مگر اسے ظاہری تقسیم قرار دیا ہے اور نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ چند سورتوں کا ایک گروپ کی شکل میں نظر آنا ان کے بنیادی مضامین ومطالب کی بنیاد پر ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر ان کے یہاں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ قرآن مجید کی تمام سورتیں اپنے بنیادی مضامین و مطالب کے اعتبار سے مجموعی طور پر تین حصوں میں منقسم ہیں۔ ان کے مطابق اس تقسیم میں زمانی کیفیات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ پہلے کافر و منکر معاشرہ مخاطب تھا اور اب مسلم سماج اس کے

پیش نظر ہے۔اس لیے پہلے حصہ میں دو سورتیں رکھی گئیں جن میں اسلامی احکام وقوانین بیان ہوئے ہیں کیونکہ جدید اسلامی معاشرہ کو اب اس کی ضرورت تھی۔اور دوسرے حصہ میں وہ سورتین ہیں جو تعلیم وتذکیر، کفر وشرک کی نفی، صلاح وتقوی کی ترغیب اور صبر وثبات کی تلقین پر مشتمل ہیں۔اور تیسرے وآخری حصہ میں وہ سورتیں ہیں جو نزدل کے اعتبار سے سب سے مقدم ہیں جن میں مختلف نوعیّتوں سے توحید خداوندی اور رسالت محمدی کے لیے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ کونظم قرآن سے خاص دلچسپی رہی۔انھوں نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں سورتوں اور آیتوں کے باہمی ارتباط کے اظہار کا بڑا اہتمام کیا ہےاور خاص اس موضوع پر اردو میں ایک کتاب ''سبیل النجاح'' اور ایک کتاب عربی میں ''سبق الغایات فی تنسیق الآیات' تصنیف کی ہیں۔وہ ربط آیات کی طرح ربط سور کے بھی قائل ہیں۔مگر عمود یا مرکزی موضوع کا کوئی تصور ان کے یہاں نظر نہیں آتا۔مولانا عبیداللہ سندھی متوفی ۱۳۶۵ھ نے حکمت شاہ ولی اللہ کی روشنی میں قرآن مجید کے چند مقاصد متعین کر کے ان کی مدد سے ہر سورہ کا ایک مرکزی عنوان مقرر کیا ہے اور اس طرح سورتوں کے مابین ربط داتصال قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔[۴۴]

مولانا سندھی کے شاگرد موسی جار اللہ نے بھی نظم سور سے متعلق ایک کتاب ''ترتیب سور الکریمة فی النزول والمصاحف'' تصنیف کی۔مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں شروع سے آخر تک ارتباط آیات وسور کے اظہار کا اہتمام کیا ہے۔ان دونوں بزرگوں کی تفسیروں کا نام ایک ہی ہے یعنی ''معارف القرآن''۔

مولانا تھانوی اور آخر الذکر دونوں بزرگوں کے یہاں نظم کا کوئی خاص اصول نظر نہیں آتا۔بالعموم انھوں نے رائج تفسیری اقوال پر اعتماد کر کے آیات کے درمیان نظم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔بلکہ یہ بات بہت سے ان متقدمین کے یہاں بھی نظر آتی ہے جو نظم کے کچھ اصول بھی رکھتے ہیں۔حالانکہ رائج تاویل کو بعض دفعہ نظم قبول نہیں کرتا، نیتجتاً تکلف سے کام لینا پڑا، اور کلام ومنطق کے زور سے زبردستی نظم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

اور دور وقریب کا کوئی بھی ربط قبول کرلیا گیا جس سے کلام کا حسن جاتا رہا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں بھی نظم کا اہتمام ملتا ہے۔ وہ نظم کے معاملہ میں مولانا فراہی کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ اگر ان کی تفسیر پر نظر ڈالی جائے تو ان کے یہاں قرآن مجید میں چار طرح کے نظم کا احساس ہوگا:

۱- قرآن مجید کا کلی نظام: یعنی پورا قرآن از اول تا آخر باہم مربوط ہے۔

۲- سورتوں کا باہمی نظم: یعنی سورتیں بھی ایک دوسرے سے متصل اور مربوط ہیں۔

۳- سورتوں کا اندرونی نظم: سورتوں کے اجزاء یعنی آیات کے درمیان گہرا ربط و اتصال پایا جاتا ہے یہاں تک کہ اوائل سور اور خواتم سور میں بھی نظم و ربط ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آخری آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''یہ خاتمہ کلام ہے، اس لیے جس طرح سورہ کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا، اسی طرح سورہ کو ختم کرتے ہوئے بھی ان تمام اصولی امور کو بیان کردیا گیا، جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔ تقابل کے لیے اس سورہ کے پہلے رکوع کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا''۔[45]

۴- ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس سے سورہ کی تمام آیات مربوط ہوتی ہیں۔

پاکستان کے ایک عالم مولانا حسین علی پنجابی نے بھی خاص ربط آیات پر ایک کتاب ''بلغة الحیران فی ربط آیات القرآن'' تصنیف کی ہے۔ جس میں انھوں نے تلاشِ نظم کے لیے سورہ کے مرکزی موضوع و مضمون کی تعیین ضروری قرار دیا ہے۔

فکر فراہی کے شارح وترجمان مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے استاذ کے متعین کردہ اصول ونقوش کی پیروی کرتے ہوئے نو ضخیم جلدوں پر مشتمل تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھی۔ اس میں گرچہ مولانا اصلاحی نے بہت سے مقامات پر اپنے استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ پھر بھی بنیادی طور پر یہ تفسیر فکر فراہی کی عملی تطبیق کی بہترین کوشش ہے۔ اس کی روشنی میں نظم کے تعلق سے مولانا فراہی کے اصولی نظریات کو عملی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے قرآن مجید کا ایسا صدری شکوہ سامنے آتا ہے جس کی مثال ذخیرۂ تفاسیر میں نہیں ملتی۔

نظم قرآن کے آغاز وارتقاء کی یہ تفصیل ادھوری رہ جائے گی اگر اس میدان میں مولانا عنایت اللہ سبحانی کی خدمات کا ذکر نہ کیا جائے۔ مولانا سبحانی نے قرآن مجید میں نظم و ترتیب کے ثبوت اور اس کی اہمیت وفوائد سے متعلق ایک کتاب ''امعان النظر فی تناسب الآی والسور'' لکھ کر نظم قرآن کی لے کو مزید بلند کیا۔ جب کہ ان کی دوسری کتاب ''البرھان فی نظام القرآن''سورہ فاتحہ، بقرہ اور سورہ آل عمران کی تفسیر ہے۔ جس میں مذکورہ سورتوں اور ان کی آیتوں کے باہمی ربط وارتباط کو بڑے پرزور اور مدلل انداز میں ثابت کیا گیا ہے۔ نظم کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے جن آیات کی تفسیر وتاویل میں علماء تفسیر حیران و پریشان تھے، نظم کی مدد سے ان کی ایسی سادہ فطری اور قابل فہم تاویل کردی ہے کہ جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بلاشبہ ان کی یہ کتاب تحقیق وتدبر کا شاہ کار، حیرت انگیز حقائق ومعانی کا خزانہ اور مذکورہ سورتوں اور ان کی آیتوں کے مابین تلاش نظم وربط کا شاندار کارنامہ ہے۔ مولانا سبحانی گو خرمن فراہی کے خوشہ چیں اور اس فکر کے زبردست حامی ومؤید ہیں تاہم وہ مولانا فراہیؒ کے نرے مقلد نہیں ہیں۔ اس میدان میں ان کا اپنا ایک الگ امتیاز ہے۔ اس راہ کے کچھ نشانات انھوں نے از خود متعین کیے ہیں، جن پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

علم نظم وترتیب کے ان ارتقائی مراحل پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو علماء قرآن مجید میں نظم وترتیب کے قائل ہیں، اس کے تعلق سے ان کی کاوشیں حسب ذیل نوعیتوں کی حامل ہیں:

۱- وہ علماء جو اپنی مجلسوں اور دروس میں اس پر روشنی ڈالتے تھے، اس کو واضح کرتے تھے اور اس کی اہمیت وضرورت سمجھاتے تھے۔

۲- وہ علماء جنھوں نے خاص اسی نقطۂ نظر سے کتابیں تصنیف کیں اور یہ دو طرح کے ہیں:

الف: ایک وہ جنھوں نے پورے قرآن کا نظم ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھیں۔

ب: دوسرے وہ جنھوں نے صرف سورتوں کا باہمی ربط وتعلق ظاہر کرنے کے

لیے کتابیں لکھیں۔

۳- وہ علماء جنھوں نے اپنی تفسیروں میں آیات وسور کے باہمی ربط وتعلق کے اظہار و بیان کا کم یا زیادہ اہتمام کیا اور ایسے ہی علماء کی تعداد زیادہ ہے۔

۴- وہ علماء جنھوں نے نظم وتناسب یا موضوعی وحدت کو بحیثیت ایک فن اپنا موضوع بنایا اور اس پر کتابیں لکھیں۔

۵- وہ علماء جنھوں نے کسی مخصوص سورہ کا موضوعی وحدت کے تناظر میں اپنا مطالعہ کتابی شکل میں پیش کیا۔

۶- وہ علماء جنھوں نے علوم القرآن پر مشتمل اپنی کتابوں میں اس کے لیے کوئی باب خاص کیا اور اس پر روشنی ڈالی۔

نظم وترتیب کی نوعیت:

گذشتہ تاریخی تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں نظم کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہر جملہ کے لفظ ومعنی کا اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے انفرادی نظم۔ دوسرے ہر جملہ یا آیت کا دوسرے جملہ یا آیت کے ساتھ مضمون ومعنی کے اعتبار سے نظم وربط۔ علامہ بقاعی کے مطابق پہلا نظم آسان اور قریب الفہم ہے۔ [۷۶] جب کہ دوسرا انتہائی مشکل اور محتاج غور وتأمل ہے۔ اسی لیے علماء نے اس کی طرف توجہ کم کی۔ [۷۷] بہرحال جن علماء نے ادھر توجہ کی اور قرآن مجید کے نظم وارتباط کو سمجھنے کی کوشش کی، ان کے جو متفرق آراء واقوال پیچھے نقل کیے گئے ان سب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو قرآن میں چار طرح کا نظم معلوم ہوتا ہے اور نظم کے یہ چاروں پہلو مل کر قرآن مجید کا ایسا صدری جلوہ پیش کرتے ہیں کہ زبان بے اختیار پکار اٹھتی ہے کہ یقیناً یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چار پہلو یہ ہیں:

۱- پورا قرآن کلمہ واحدہ ہے اس کی سورتوں اور آیتوں کو ایک مضبوط شیرازے نے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ کوئی سورہ یا آیت تو کجا اس کے ایک لفظ کو بھی اپنی جگہ

سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔

۲- ایک سورہ میں چاہے جتنے بھی مسائل و امور کا بیان ہوا ہو، بہر حال وہ ایک ہی کلام ہے اور تمام آیتیں باہم دگر متصل اور مربوط ہیں۔

۳- آیات کی طرح تمام سورتیں بھی باہم متصل اور مربوط ہیں۔یعنی ہر سورہ اپنے ماقبل سورہ کے اجمال کی تفصیل، اس کی شرح یا تتمہ وتکملہ ہے۔

۴- ہر سورہ کا کوئی نہ کوئی مقصد، عمود، محور یا مرکزی مضمون وموضوع ہوتا ہے۔سورہ کی تمام آیات اسی کے گرد گھومتی ہیں اور اسی سے اس کا اندرونی نظم سامنے آتا ہے۔

۱- قرآن مجید کا کلی نظم

یہ تصور کہ قرآن مجید کلمۂ واحدہ ہے، اس کا ذکر ابوبکر نیشاپوری، ابن العربی، زملکانی، ابن الزبیر ثقفی، زرکشی، بقاعی اور سیوطی سب کے یہاں ملتا ہے۔اس کی صراحت تو کسی نہ کسی شکل میں ان سب کے یہاں موجود ہے۔مگر اس کی کوئی ایسی توضیح نظر سے نہیں گزری جس سے یہ تصور بہت واضح ہو کر سامنے آئے۔تاہم ان کی عبارتوں میں بعض ایسی چیزیں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں جن سے اس تصور کی قدرے توضیح ہوتی ہے۔مثلاً بعض علماء کا یہ قول کہ پورا قرآن، سورہ فاتحہ کے اجمال کی تفصیل ہے۔[۴۸] یا یہ کہا جاتا ہے کہ سورہ فاتحہ بندے کی دعاء ہے کہ خدایا میری رہنمائی کر۔اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ رہنمائی جس کا تو طالب ہے۔[۴۹] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بیان شدہ تمام چیزیں خواہ ان کا تعلق اقوام سے ہو یا افراد سے، مقامات سے ہو یا واقعات سے، احکام سے ہو یا عبادات سے سب ہدایت اور رہنمائی کی چیزیں ہیں۔اس سے قرآن مجید کا مجموعی نظام اور اس کا کلمہ واحدہ ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے۔مولانا مودودیؒ نے اس کے کلمہ واحدہ ہونے کی توضیح اس طرح کی ہے:

''یہ کتاب اپنے موضوع اور اپنے مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹتی۔اول سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس

طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر، ہار کے رشتے میں مربوط اور منسلک ہیں...... یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لیے ضروری ہے۔ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسوئی کے ساتھ دعوت کے محور پر گھومتا رہتا ہے"۔[۵۰]

علامہ بقاعیؒ کا یہ بیان پیچھے گزر چکا ہے کہ قرآن میں کہیں انقطاع نہیں ہے یہاں تک کہ سورہ ناس پر بھی نہیں۔ وہ سورہ فاتحہ سے اسی طرح مربوط ہے جس طرح سورہ علق سے مربوط ہے۔

۲- نظم بین الآیات

آیات قرآنی کے باہم مربوط ہونے کا قدرے واضح تصور اور خاکہ ان علماء کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً اکثر لوگوں نے لکھا ہے کہ رابط کبھی عام ہوتا ہے کبھی خاص، کبھی عقلی، کبھی خیالی اور کبھی تلازم ذہنی کا ہوتا ہے جیسے سبب اور مسبب، علت اور معلول، نظیرین یا ضدین وغیرہ۔[۵۱] ان علماء کی تصریح کے مطابق نظم کبھی ظاہر ہوتا ہے کبھی مخفی۔

اگر بعد کی آیت پہلی آیت کی شرح وتفسیر یا بدل وتاکید یا کسی سوال مقدر کا جواب یا جملہ معترضہ یا سابقہ بیان کا تکملہ وتتمہ ہو جس کے بغیر بات مکمل نہ ہوسکتی ہو تو ان تمام صورتوں میں نظم بالکل ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ادراک کے لیے کسی خاص محنت وتدبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دونوں آیات بجائے خود مستقل ہوں اور دوسری آیت پہلی آیت کے اس مضمون سے مختلف ہو جس سے کلام کی ابتدا ہوئی تھی تو اس صورت میں نظم مخفی ہوتا ہے اور بعض دفعہ انتہائی مشکل۔ اس صورت حال میں دیکھنا یہ ہوگا کہ دوسری آیت کا پہلی آیت پر کسی ایسے حرف کے ذریعہ عطف ہے، جو حکم میں شرکت ظاہر کرتا ہے یا عطف نہیں ہے؟ اگر عطف ہے تو مذکورہ بالا روابط یعنی سبب مسبب، علت معلوم یا نظیرین وضدین وغیرہ میں سے کسی نوع کا ربط ہوگا مثلاً آیت:

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا۔ (حدید/۴)

وہ جانتا ہے جو زمین کے اندر جاتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔

میں ولوج (داخل ہونے) خروج (نکلنے) یا نزول (اترنے) عروج (چڑھنے) کے مابین علاقۂ تضاد پایا جاتا ہے۔ جہاں عذاب کے بعد ثواب، رحمت کے بعد غضب، ترہیب کے بعد ترغیب کا ساتھ ساتھ ذکرو بیان ہے وہاں رابط علاقۂ تضاد ہی ہوتا ہے۔

قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ احکام و فرامین کے بعد بالعموم وعید کا تذکرہ کرتا ہے تا کہ ان احکام پر عمل آوری کا جذبہ پیدا ہو، پھر توصیف و تنزیہ کی آیتیں لاتا ہے تا کہ حکم دینے والے یعنی ذات باری تعالیٰ کی عظمت و جلال کا علم و احساس ابھرے۔ سورہ بقرہ، مائدہ اور نساء وغیرہ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

لیکن اگر پہلی آیت پر دوسری کا عطف نہ ہو تو وہاں کسی مخفی و معنوی قرینے کی شکل میں کوئی قوی وجہ اتصال ہوگی۔ جسے غور و تدبر کے ذریعہ ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مخفی و معنوی قرینے کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱- تنظیر، یعنی ایک نظیر کو دوسری نظیر سے ملحق کرنا۔

۲- مضادہ، یعنی ایک چیز کے بیان کے بعد اس کی ضد بیان کرنا (یہ دونوں نوعیتیں جیسا کہ پہلے گزرا عطف کی شکل میں بھی پائی جاتی ہیں)

۳- استطراد، اس کا دو مفہوم ہے۔ ایک یہ کہ کوئی بات اس طرح بیان کی جائے کہ اس سے کوئی دوسری بات لازم آئے۔

دوسرے یہ کہ ایک بات کے ذیل میں اس سے مناسبت اور تعلق رکھنے والی بعض دوسری باتیں ضمناً بیان کر کے پہلی اور اصل بات کی طرف پھر لوٹ آیا جائے۔

۴- حسن تخلص، یعنی ایک بات یا مضمون مکمل کرنے کے بعد دوسرے مضمون کی طرف اس خوبی کے ساتھ منتقل ہو جانا کہ سامع کو اس کا احساس بھی نہ ہونے

پائے کہ اب دوسری بات بیان ہو رہی ہے۔

مناسب ہوگا کہ نظم آیات کی ان نوعیّتوں کی ایک ایک مثال بھی پیش کر دی جائے تا کہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تنظیر:

اس کی مثال سورہ انفال کی آیت کریمہ: كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِن بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقاً مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ (۵) ہے جو الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ. أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً الی آخر الآیۃ (۴) کے بعد واقع ہے۔

بادی النظر میں كما اخرجك ربك کا پہلے والی آیت یا آیات سے کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ پچھلے سلسلۂ کلام سے پوری طرح مربوط ہے۔ بات یوں ہے کہ غزوۂ بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں نبی ﷺ کے طرز عمل پر بعض بیجا سوالات اٹھائے گئے یسألونك عن الانفال ۔لوگوں کے اس رویہ پر اظہار نکیر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ تقویٰ اور ایمان کے منافی رویہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی بے چون و چرا اطاعت ہی اہل ایمان کا شیوہ ہونا چاہیے۔ ایسے ہی لوگ سچے مومن کہلانے کے حق دار ہیں اولئك هم المؤمنون حقا ۔اس اظہار نکیر اور سچے مومن کی صحیح تصویر پیش کرنے کے بعد مناسب ہوا کہ ان لوگوں کی ایک اور کمزوری کی طرف بھی توجہ دلا دی جائے۔ جو اس سے کچھ ہی پہلے اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب اس جنگ کے لیے نبی ﷺ نے مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ گویا علامہ زرکشیؒ کے الفاظ میں ان کراهتهم لما فعلته من الغنائم ككراهتهم للخروج معك ۔۵۲ یعنی تقسیم غنائم کے تعلق سے آپ کے فیصلہ کو ان کا برا ماننا ویسا ہی ہے جیسا کہ جنگ کے لیے گھر سے نکلتے وقت وہ برا مان رہے تھے۔

مضادہ:

اس کی مثال سورہ بقرہ کی چھٹی آیت إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ الخ ہے۔ اس سے پہلے ان اوصاف سے متصف لوگوں کا تذکرہ ہے جن سے متصف ہوئے بغیر قرآن سے ہدایت ورہنمائی نہیں مل سکتی۔ پس جب ان مومنین کا ذکر مکمل ہوگیا تو ان کافرین کا ذکر چھیڑا گیا جو قرآن سے ہدایت یاب ہونے والے نہیں تھے۔ علامہ زرکشیؒ کہتے ہیں کہ ان دونوں تذکروں میں ایک وہمی جامع موجود ہے اور اسی کو تضاد کہا جاتا ہے۔ اس کی حکمت پہلے کلام کے لیے شوق ورغبت دلانا اور اس پر قائم رہنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ بضدها تتبين الاشياء۔ ۵۳

استطراد

اس کی مثال پہلے مفہوم کے اعتبار سے سورۂ اعراف کی آیت ۲۶ ہے يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِيْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِيْشاً ...... الخ۔ علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت آدم وحوا علیہما السلام کے لباس اتر جانے اور پتوں سے جسم ڈھانکنے کے ذکر کے بعد بطور استطراد وارد ہوئی ہے۔ جس کا مقصد اللہ کے اس احسان کا اظہار ہے جو لباس پیدا کر کے اس نے اپنے بندوں پر کیا ہے اور برہنگی وبے پردگی کی ذلت ورسوائی کا بیان ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بتانا مقصود ہے کہ ستر پوشی تقوی کا ایک اہم باب ہے۔ ۵۴

دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اس کی مثال سورہ اعراف میں وارد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے درمیان آنے والی آیت الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ الخ (۱۵۷) ہے۔ جس میں نبی ﷺ اور ان کی ذات گرامی سے متعلق کچھ باتیں ضمناً آ گئی ہیں پھر وَمِنْ قَوْمِ مُوْسَى أُمَّةٌ...... (۱۵۹) کے ذریعہ واقعہ موسیٰ کی طرف عود ہوگیا ہے۔

حسن تخلص

اس کی ایک عمدہ مثال سورۃ الشعراء کی آیت وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيْمَ ...... الخ

(۶۹) سے شروع ہونے والی سرگزشت ابراہیم کے آخر میں ہے۔ اس سرگزشت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے خودساختہ معبودوں کی بے بضاعتی اور بے حقیقتی ظاہر کر کے اپنی قوم سے اعلان براءت کرتے ہوئے فرمایا فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ (۷۷) یہاں استثنا کے ذریعہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ نے بات کا رخ ان کے معبودان باطل سے اپنے رب حقیقی کی طرف پھیر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف گنائے جن کی بنا پر وہ عبودیت کا حق دار اور اس بات کا سزاوار ہے کہ اسی سے لو لگائی جائے اور اسی سے استعانت کا طلب گار رہا جائے۔

اس کی دوسری مثال اسی سلسلۂ کلام کا آخری حصہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بات، اپنے لیے جنت، اپنے باپ کے لیے مغفرت اور آخرت کے دن اپنی رسوائی سے حفاظت کی دعا پر ختم فرمائی وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ. وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (۸۶-۸۷) جب بعث بعد الممات کا ذکر آ گیا تو فوراً اس دن کے احوال و واقعات کا ذکر چھیڑ دیا گیا اور فرمایا گیا يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ...... الخ (۸۸ تا ۱۰۴)۔ اگر اس آخری مجموعہ آیات کو حسن تخلص نہ مانا جائے تو کم از کم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا تکملہ یا توضیح تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ویسے بعض لوگوں نے واقعہ ابراہیمؑ سے شروع ہونے والے پورے سلسلۂ کلام کو استطراد کہا ہے کیونکہ سابقہ امتوں اور رسولوں کا ذکر جو پہلے سے چلا آ رہا تھا اس کے بعد پھر شروع ہو گیا ہے۔[۵۵]

سورتوں کے اندرونی نظم کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ سورتوں کے آغاز کا ان کے خاتمہ سے گہرا معنوی تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے مثلاً سورہ مومنون کا آغاز قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ سے ہوا اور خاتمہ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ پر۔ اسی طرح سورہ ص کا آغاز ذکر سے ہوا ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ اور اختتام إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ پر ہوا۔ اور کبھی کبھی جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے ٹھیک اسی مضمون پر خاتمہ بھی ہوتا ہے جیسے سورہ ممتحنہ کا آغاز واختتام یا سورہ حشر کی ابتداء وانتہا۔ اسے اصطلاح میں عود الی البدء کہتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب "مراصد المطالع فی تناسب

المقاطع والمطالع " تصنیف کی ہے۔

۳- سورتوں کا باہمی نظم

سورتوں کے باہمی نظم و تعلق کی بھی کئی شکلیں بیان کی جاتی ہیں:

۱- ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک سورہ اپنے ماقبل سورہ کا کبھی تکملہ ہوتی ہے تو کبھی توضیح وتشریح۔ یا پہلی سورہ کا جو مقصد یا عمود ہوتا ہے، اس سے متعلق کسی اہم پہلو کو جس کی تفصیل یا زیادہ وضاحت کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی ، بعد والی سورہ اس کو اجاگر کرتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں "ہر سورہ زوج زوج ہے یعنی اپنا ایک جوڑ اور مثنی رکھتی ہے"۔ ۵۶ سیوطی کہتے ہیں:

ان كل سورة تفصيل لاجمال ما قبلها وشرح له واطناب لايجازه۔ ۵۷

ہر سورہ اپنی پہلی والی سورہ کے اجمال کی تفصیل اور اس کی شرح اور اس کے ایجاز کی وضاحت ہے۔

مثلاً سورہ رعد، سورہ یوسف کے خاتمہ کی آیات وَكَأَيِّن مِّن آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ...... الخ (۱۰۵،۱۰۸) کے اجمال کی تفصیل ہے۔ ۵۸

یا سورہ بنی اسرائیل، سورہ نحل کی آیت إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ...... الخ (۱۲۴) کی تفسیر ہے۔ جس میں اہل سبت کی شریعت کا بیان اور ان کے فساد و عصیان اور نبی ﷺ کے خلاف ان کے بغض و عناد کی تفصیل ہے۔ ۵۹

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو متصل سورتیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، مگر غور کرنے پر ان میں بڑا منطقی ربط نظر آتا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ بندے کی اپنے رب سے دعاء ہے کہ پروردگار میری رہنمائی فرما اور سورہ بقرہ اس کا جواب ہے کہ اگر تمھیں ہدایت مطلوب ہے تو اس کتاب اور اس رسول پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب اتری ہے۔ گویا سورہ بقرہ دین مطلوب کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے جس پر چل کر آدمی منعم علیہ بن سکتا ہے بصورت دگر مغضوب

علیہ ہوگا۔اس کے بعد آل عمران کی حیثیت سورہ بقرہ کے تکملہ وتتمہ کی ہے جو سورہ بقرہ کے مقصود ومطلوب کی تکمیل کرتی ہے اوراس پر مخالف کے شبہات واعتراضات کا جواب فراہم کرتی ہے۔ ۶۰ الف

۲- کبھی کبھی بعض سورتیں درمیان میں بطور جملہ معترضہ آجاتی ہیں جیسے بعض آیات کبھی کبھی بطور جملہ معترضہ آجاتی ہیں۔اس صورت میں اس کے بعد والی سورہ کا تعلق اپنی اس متصل سورہ سے نہ ہوکراس سے اوپر والی سورت سے ہوتا ہے۔۶۱

۳- نظم سورہ کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک سورہ جس مضمون پر ختم ہوتی ہے بعد والی سورہ اسی مضمون سے یا اس سے تعلق رکھنے والے کسی مضمون سے شروع ہوتی ہے۔اسی کو "مناسبة فاتحة السور لخاتمة ماقبلها" کہتے ہیں۶۲ علامہ زرکشی کہتے ہیں:

واذا اعتبرت افتتاح كل سورة وجدته فى غاية المناسبة لما ختم به السورة قبلها، ثم هو يخفى تارة وبظهر اخرى۔۶۳

جب تم ہر سورہ کے افتتاحیہ پر غور کروگے تو اس کو اس سورہ کے اختتامیہ سے غایت درجہ مناسبت رکھنے والا اور مربوط پاؤگے جو سورہ اس سے پہلے ہے۔پھر یہ ربط و مناسبت کبھی مخفی ہوتی ہے اور کبھی ظاہر۔

مثلاً سورۂ واقعہ کا اختتام تسبیح کے حکم سے ہوتا ہے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ۔ (۹۶) تو اس کے بعد سورہ حدید کا آغاز تسبیح کے بیان سے ہوتا ہے سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۱) سورہ طور کا اختتام وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ پر ہوا تو اس کے بعد سورہ نجم کا آغاز وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى سے کیا گیا۔

۴- سورتوں کے باہمی ربط وتعلق کی ایک نوعیت علامہ بقاعی اور سیوطی وغیرہ نے "مناسبة اسماء السور لمقاصدها" بتائی ہے۔یعنی سورتوں کے ناموں کی مناسبت ان کے مقاصد یا مرکزی خیال کے ساتھ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض وہ سورتیں جن کے نام سورتوں کے مقاصد سے تعلق اور مناسبت رکھتے ہیں، ان

سورتوں کے مابین بھی ایک طرح کا رشتہ و تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً سات سورتوں کا ایک ہی مشترک نام "حم" رکھا گیا ہے، اس لیے ان سورتوں کے مابین ایک مخصوص قسم کی مشابہت و مشاکلت پائی جاتی ہے۔ جیسے یہ بات کہ حوامیم میں ہر سورہ کا آغاز کتاب یا کتاب کی کسی صفت سے ہوا ہے۔ تعداد میں بھی تقریباً یکسانیت ہے اور آیات کا باہمی نظام بھی ملتا جلتا ہے۔ وتشاکل الكلام فی النظام۔۶۴
لیکن یہ ایک مشکل امر ہے تمام سورتوں کے نام ایسے نہیں ہیں کہ جن سے ان کے مقاصد کی ترجمانی ہوتی ہو۔ علامہ بقاعیؒ نے اس مشکل کا یہ حل پیش کیا ہے کہ سورتوں کے کئی کئی نام ہوتے ہیں اس لیے سورہ کے کسی نام سے مقصد کی مناسبت ظاہر ہوسکتی ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ مشہور نام سے ہی مقصد کی مناسبت ظاہر ہو۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔۶۵ الف

۴- سورہ کا مقصد عمود یا مرکزی مضمون

عمود، نظم کا ایک اہم ستون ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع اور عنوان ہوتا ہے۔ جس کے گرد سورہ کے تمام مضامین و مطالب گردش کرتے رہتے ہیں۔ اسی سے سورہ کے تمام اجزا میں نظم قائم ہوتا یا موضوعی وحدت پیدا ہوتی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ سورتوں کے عمود یا مرکزی مضمون کا یہ تصور سب سے پہلے مولانا حمید الدین فراہیؒ نے پیش کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ متقدمین کے یہاں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ ابن زبیر ثقفیؒ جن کو نظم کے میدان میں تصنیفی اعتبار سے تقدم حاصل ہے ان کے یہاں بھی اس کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ حالانکہ انھوں نے جس دور میں اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ علم نظم کا تقریباً ابتدائی دور تھا۔ بہت کم لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنی کتاب البرهان فی تناسب سور القرآن میں "بہت اختصار و ایجاز کے ساتھ ہر سورہ کا "مقصود و مدعا" اور اس کے مضامین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے خود سورہ کے اندرونی نظم اور اس کے "اصل موضوع" کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے"۔۶۶ ب

امام رازیؒ کا یہ قول پیچھے گزر چکا ہے کہ ''سورہ حم السجدہ، شروع سے آخر تک ایک منظم کلام کی صورت میں ڈھلی ہوئی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر ہے''۔ ۶۷

علامہ بقاعی کے شیخ ابوعبداللہ محمد بن ابوالقاسم محمد المشد الی المالکی نے اس پر بہت مختصر مگر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ بقاعی نے ان کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''الامر الكلي المفيد لعرفان مناسبات الآيات في جميع القرآن هو انك تنظر الغرض الذي سبقت له السورة وتنظر ما يحتاج اليه ذلك الغرض من المقدمات وتنظر إلى مراتب تلك المقدمات في القرب والبعد وتنظر عند انجرار الكلام في المقدمات إلى ما يستتبعه من استشراف نفس السامع إلى الاحكام واللوازم التابعه التي تقتضي البلاغة .... هذا هو الامر الكلي المهيمن على حكم الربط بين جميع اجزاء القرآن واذا فعلته تبين ذلك انشاء الله وجه النظم مفصلا بين كل آية وآية في كل سورة سورة''۔ ۶۸

''پورے قرآن میں مناسبات آیات کی معرفت کے لیے امر کلی یہ ہے کہ تم اس ''غرض/مقصد'' پر غور کرو جس کے لیے وہ سورہ آئی ہے۔ اور اس غرض کے لیے جن مقدمات کی ضرورت ہے ان پر غور کرو اور غرض ومقصد سے قرب وبعد کے لحاظ سے ان مقدمات کے مراتب پر غور کرو اور ان مقدمات پر کلام کے ضمن میں سامع کے دل میں اٹھنے والے مسائل واحکام اور ان کے تابع ولازم امور پر بھی نظر رکھو جو بلاغت کا تقاضا ہوتے ہیں .... یہ وہ اصولی اور فیصلہ کن چیز ہے جس کے ذریعہ قرآن کے تمام اجزاء کے درمیان ربط وتعلق کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ جب تم ایسا کرو گے تو انشاء اللہ ہر ہر سورہ کے اندر آیت اور آیت کے مابین وجہ نظم بالکل کھل کر تمہارے سامنے آجائے گی''۔

ابوالحسن علی بن احمد الحسن الحرالی جن کی تفسیر ''**مفتاح الباب المقفل لفهم القرآن المنزل**'' سے علامہ بقاعی نے اپنی تفسیر نظم الدرر میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ ''ہر سورہ کا ایک جامع عنوان ہوتا ہے جو اس سورہ کی تمام آیات کا احاطہ کرتا ہے''۔ ۶۹

علامہ بقاعیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں سورتوں کے مقاصد بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ سورہ بقرہ کے عمود کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا مقصد کتاب اللہ کے ہدایت نامہ ہونے پر دلیل قائم کرتا ہے۔ آل عمران کا مقصد وحدانیت کا اثبات ہے۔ سورہ مائدہ کا مقصد اس چیز کو پورا کرنا ہے جس کی ہدایت کتاب الٰہی نے دی ہے۰ے الف وہ کہتے ہیں کہ ہر سورہ کا مقصد اس کے نظم وتناسب کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہر سورہ کا مقصود ذکر کرنا چاہیے۔اےب

علامہ سیوطیؒ کے یہاں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ بقاعیؒ نے اپنے مذکورہ شیخ کے جس قول کا حوالہ دیا ہے، جسے ابھی نقل کیا گیا سیوطی نے بھی اسے قال بعض المتاخرین کہہ کر نقل کیا ہے۔۲ے

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے گذرا سورتوں کے باہمی نظم کی ایک شکل سیوطی نے مناسبة اسماء السور لمقاصدھا بتائی ہے۔ان کی نایاب کتاب ''اسرار التنزیل'' جو کل تیرہ انواع پر مشتمل ہے اس کی چھٹی نوع کا عنوان ہے ''مناسبة مطلع السور للمقصد الذی سبقت له''۔۳ے

ان دونوں عناوین سے بھی سیوطی کے یہاں عمود کے تصور کا پتہ چلتا ہے۔امام شاطبیؒ نے اپنی کتاب الموافقات فی اصول الشریعة میں موضوعی وحدت کے بعض اصول وقواعد بیان کیے ہیں ابن قیم نے بھی اپنی متعدد کتابوں میں بعض آیات اور سورتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ضمناً موضوعی وحدت کا ذکر کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان متقدمین علماء کے یہاں بھی ہر سورہ کا ایک مقصد، یا مرکزی عنوان ہوتا ہے، جسے سورہ کے اندرونی نظم کی معرفت میں کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اس کی تعیین یا دریافت کے بعد پوری سورہ کا اندرونی نظم روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے۔ بلکہ سورتوں کا باہمی ربط وتعلق بھی واضح ہوجاتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ تلاش نظم کے بالکل ابتدائی دور سے ہی اس کا تصور پایا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے عام مفسرین کرام کی تفسیریں اس اصول کے استعمال سے خالی ہیں۔ متقدمین میں جن لوگوں نے یہ تصور پیش کیا ہے ان کی بھی تفسیروں میں اس کی کارفرمائی بہت کم نظر آتی ہے۔صرف

اشارے ملتے ہیں مثلاً امام رازیؒ نے حم السجدہ کے بارے میں اشارہ کیا ہے۔ شاطبیؒ سورہ بقرہ کے بارے میں کہتے ہیں:

''سورۃ البقرہ نظم کے اعتبار سے کلام واحد ہے۔ وہ کئی نوع کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں اصل مطلوب سے متعلق بعض چیزیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر ہیں بعض کی حیثیت تاکیدی اور تکمیلی باتوں کی ہے۔ بعض مباحث مقصد نزول سے متعلق ہیں۔ اور یہ ہے احکام کی توضیح وتکمیل، ابواب کی تفصیل کے مطابق اور بعض ایسے خاتمے ہیں جو تاکید وثبوت وغیرہ کے لیے ماقبل مذکور کلام کی طرف لوٹتے ہیں''۔۴ے

ابن القیم نے سورۃ العنکبوت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''اس سورہ کا مضمون خلق وامر کا راز ہے۔ یہ امتحان وابتلا کی سورہ ہے اور اس میں دنیا و آخرت کی فکر میں مبتلا لوگوں کی حالت کا بیان ہے۔ جو شخص اس کی ابتدا، درمیان اور خاتمہ پر غور کرے گا وہ پائے گا کہ اول امر میں ابتلاء وامتحان ہوتا ہے۔ درمیان میں صبر وتوکل اور آخر میں ہدایت ومدد''۔۵ے

اس کے برعکس چودھویں صدی ہجری کے برصغیر اور مصر وعرب میں سورہ کے مرکزی موضوع کے لحاظ سے اس کی تفسیر وتوضیح اور اس نظریہ کی عملی تطبیق کا کام بہت کامیابی کے ساتھ عمل میں آیا۔ مولانا فراہیؒ مولانا اصلاحیؒ الشیخ عبداللہ درازؒ اور بعض دوسرے اہل علم کی کاوشیں بڑی سائنٹفک اور عقل وفہم کو اپیل کرنے والی ہیں۔ خصوصیت سے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کا فلسفۂ نظم پورے قرآن کا احاطہ کرتا ہے۔ سورتوں اور آیتوں کے نظم کے ساتھ ساتھ قرآن کے کلی اور مجموعی نظم کو واضح کرتے ہوئے اسے واقعی کلمہ واحدہ بنا دیتا ہے۔ اور اس پوری تنظیم وتشکیل میں سارا انحصار کسی عمود یا مرکزی موضوع پر ہوتا ہے۔

تفسیر موضوعی کی ایک مثال

مثال کے طور پر سورہ نساء کی موضوعی وحدت یا معنوی نظم کا خلاصہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر ''تدبر قرآن'' سے ملاحظہ فرمائیں:

مولانا کے نزدیک سورہ نساء کا عمود یا مرکزی موضوع ''مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اوران کا جماعتی اتحاد واتصال'' ہے۔مولانا کہتے ہیں کہ پچھلی سورہ کا اختتام یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ پر ہوا،جس میں ثابت قدمی کی تعلیم دی گئی ہے۔اب اس سورہ (نساء) میں ثابت قدمی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس لیے کہ ثابت قدمی بالخصوص اجتماعی ثابت قدمی بغیر مضبوط جماعتی اتصال کے ممکن نہیں۔ چنانچہ موضوع کے تقاضے کے مطابق ان ساری چیزوں کو اس سورہ میں بیان کیا گیا جو اسلامی معاشرہ اور اس کے فطری نتیجہ ''اسلامی حکومت'' کو مستحکم رکھنے اور اس کو انتشار سے بچانے کے لیے ضروری ہیں۔

مولانا کے نزدیک یہ سورہ تمہید،نفس مضمون اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

تمہید

اس کی پہلی آیت بطور تمہید ہے جو اس طرح ہے ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔الخ

اس آیت میں تخلیق کا حوالہ دے کر اپنے خالق سے ڈرنے اور آپسی رشتوں کو مضبوط رکھنے،صلہ رحمی کرنے اور قطع رحمی سے ڈرنے کی ہدایت ہے۔اس لیے کہ اسلامی معاشرہ کی عمارت انہی دونوں بنیادوں یعنی خوف خدا اور باہمی رشتہ وتعلق کی استواری پر قائم ہوگی۔مولانا فرماتے ہیں: زیر بحث آیت ایک جامع تمہید ہے ان تمام احکام وہدایات کے لیے جو انسانی معاشرتی تنظیم کے لیے اللہ نے اتارے ہیں اور جو آگے (اس سورہ میں) آرہے ہیں۔٦٧

نفس مضمون:

تمہید کے بعد اصل مضمون بیان ہوا ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ معاشرتی اصلاح واستحکام کی تعلیم وہدایات پر مشتمل ہے اور آیت ۴۳ تک محیط ہے۔جب کہ دوسرے حصہ میں مخالفین پر تبصرہ اور مسلمانوں کو تسلی اور ان کی حوصلہ افزائی کے مضامین ہیں۔

جو آیات ۴۴ تا ۱۲۶ پر مشتمل ہیں۔ اس دوسرے حصہ کا تعارف مولانا اس طرح کراتے ہیں:

''آیت ۴۳ پر جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں اصلاح معاشرہ سے متعلق احکام کا باب ختم ہوا۔ آگے اس ردعمل کا بیان آرہا ہے جو ان اصلاحات کے مخالفین کی طرف سے ظاہر ہوا اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک مملکت کی بشارت سنائی جا رہی ہے جو معاشرہ کے بلوغ و کمال کا نتیجہ ہے۔ مخالفین میں سب سے پہلے یہود کو لیا ہے اس لیے کہ حامل کتاب ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ انہی لوگوں کو اصلاحات کا حامی ہونا چاہیے تھا، لیکن بد قسمتی سے سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوئی''۔ ۷۷

خاتمہ

اس میں مسلمانوں کے لیے بعض ضروری نصیحتیں ہیں اور مخالفین و منافقین کو تنبیہ و تہدید۔ یہ اختتامیہ آیت ۱۲۷ سے آخر سورہ تک محیط ہے۔ اس کو متعارف کراتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''اسلامی معاشرہ کی تأسیس، تنظیم اور تطہیر سے متعلق جو باتیں اصولی تھیں وہ اوپر کی آیات پر تمام ہوئیں۔ اب آگے کا حصہ سورہ کے آخر تک خاتمہ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پہلے بعض سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں جو اسی سورہ کی آیات ۲ تا ۴ میں بیان کردہ احکام کے متعلق بعد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد آخر سورہ تک مسلمانوں کو، منافقین کو اور اہل کتاب کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کی نوعیت کی نصیحتیں فرمائیں۔ یہ سوالات بعد میں پیدا ہوئے اس کی وجہ سے ان کے جواب سورہ کے آخری باب کے ساتھ رکھے گئے تاکہ واضح ہو سکے کہ یہ بعد میں نازل ہوئی ہیں''۔ ۷۸

سورہ نساء قرآن کی طویل ترین سورتوں میں سے ہے جس میں گوناگوں مسائل و مطالب کا بیان ہے۔ اسلوب، مخاطب اور مطالب میں بار بار تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے اس میں نظم کی مشکلات بھی بہت پیش آتی ہیں۔ مگر مولانا اصلاحی نے جماعتی اتحاد و اتصال اور معاشرتی اصلاح و استحکام سے متعلق تمام مسائل و ہدایات کی اس خوبی سے توضیح و

تبیین کی ہے کہ یہ حصہ از اول تا آخر نہایت مربوط اور اپنے مرکزی موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

اس کے بعد والا حصہ جو مخالفین پر نقد و تبصرہ اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی پر مشتمل ہے اور بظاہر پہلے حصہ سے الگ دکھائی پڑتا ہے، وہ بھی پہلے سے پوری طرح مربوط ہو گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ان اصلاحات و ہدایات کا ذکر ہے جو ایک مستحکم اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں، اور دوسرے حصہ میں ان اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اور منافقین کی منافقت کی پردہ دری کر کے ان سے ہوشیار رہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور ان کی اصلاح مخالف سرگرمیوں سے محفوظ رہنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ انتشار سے محفوظ اور مستحکم و مضبوط رہے۔

جب کہ خاتمہ کی آیات میں پچھلے مباحث کو سمیٹتے ہوئے ان میں مذکور بعض مسائل مثلاً حقوق یتامیٰ اور مسئلۂ وراثت کلالہ وغیرہ سے متعلق پیدا ہونے والے بعض اشکالات و اعتراضات کو صاف کیا گیا ہے۔ پھر نہایت خوبی کے ساتھ کلام کا رخ نبی اور اصحاب نبی کی تسلی و تسکین کی طرف پھیر دیا گیا تاکہ ان کے اندر دلجمعی پیدا ہو اور آخر میں مخالفین کی خبر لی گئی ہے اور ان کو نہایت سخت اسلوب و انداز میں دھمکی دی گئی ہے۔

اس مختصر تجزیہ سے سورہ نساء کے تمام اجزاء میں شروع سے آخر تک ایک منطقی ربط صاف ظاہر ہوتا ہے اور اس کا اندرونی نظام اس کے عمود یا مرکزی موضوع سے پوری طرح وابستہ نظر آتا ہے۔

معرفت نظم کے بعض اصول:

ہر کلام کے نظم کو جاننے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس لیے کلام الٰہی کے نظم کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بھی لازماً کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ علماء تفسیر نے انھیں دریافت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر وہ ان کی تحریروں میں متفرق بکھرے پڑے ہیں۔ ہماری گزشتہ بحث سے اس کے کچھ اصول سامنے آتے ہیں جو مختصراً یہ ہیں:

۱- سب سے پہلے اس مقصد یا غرض پر غور کیا جائے جس کے لیے سورہ نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس مقصد کے لیے ضروری مقدمات اور مقصد سے ان مقدمات کے قرب و بعد کے مراتب پر غور کیا جائے اور ان مقدمات پر کلام کے ضمن میں سامع کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر بھی نظر رکھی جائے۔

۲- یکے بعد دیگرے آنے والی آیات کے مابین ربط و تعلق کئی طرح کا ہوتا ہے کبھی عام کبھی خاص، کبھی حسی، کبھی عقلی اور خیالی ہوتا ہے یا کبھی سبب مسبب اور علت و معلول کا ربط ہوتا ہے تو کبھی نظیرین یا ضدین کا تعلق ہوتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کو ملحوظ رکھنے سے نظم کا علم حاصل ہوتا ہے۔

۳- بعد والی آیت پہلی آیت سے حرف عطف کے ذریعہ جڑی ہوگی یا بغیر حرف عطف کے۔ پہلی صورت میں سبب مسبب، علت معلول یا نظیرین وضدین کا تعلق ہوگا اور دوسری صورت میں نظیرین وضدین کے علاوہ استطرادیا حسن تخلص کا تعلق ہوگا۔

۴- ہر سورہ کا اپنی ماقبل سورہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے ایک سورہ کی آیات پر غور کرتے وقت پچھلی سورہ کے مضامین پر بھی نظر ہونی چاہیے۔

۵- سیوطی و بقاعی کے نزدیک ہر سورہ کا نام اپنے اصل مقصود کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے سورہ کے نام اور اس کے مقصد کے درمیان تطبیق پیدا کرنے سے آیات کا ربط واضح ہوگا۔

۶- ہر سورہ کی ایک تمہید، نفسِ مضمون اور خاتمہ ہوتا ہے۔ تلاش نظم میں سورہ کے ان اجزائے ترکیبی کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔[۹۷]

۷- سورہ کا آغاز اور اس کا خاتمہ اسی طرح ایک سورہ کا خاتمہ اور اس کے بعد والی سورہ کا افتتاحیہ بھی نظم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

نظم کی جستجو کیوں ضروری ہے؟

قرآن حکیم کا ہر اسلوب عربوں کے اسلوب کے بالمقابل جہاں اپنے اندر جدت وندرت اور انفرادیت لیے ہوئے ہے وہیں حد سے زیادہ جامعیت، وسعت اور گہرائی و گیرائی بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس طرح عرب بہت سرعت کے ساتھ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ ٹھیک وہی طریقہ قرآن نے بھی اختیار کیا ہے۔ مگر اس میں ایسی مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا کہ عرب بھی باوجود اپنی زبان آوری کے دنگ ہو کر رہ گئے۔ لیکن بعد کے ادوار میں اپنے اسی حسن وکمال کی وجہ سے وہ بے ربطی کا شکار محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے عرب ہی اس کے خلاف آواز اٹھاتے۔ کیونکہ عرب غیر مربوط کلام پسند نہیں کرتے تھے۔[۸۰]

چونکہ قرآن مجید اپنے اس مخصوص اور منفرد اسلوب کے ذریعہ دین وشریعت اور حکمت وموعظت کی باتیں بیان کرتا ہے۔ خدا کے احکام وفرامین سناتا ہے اور بندگی کے اصول بتاتا ہے وہ خود اپنی صفت تبیانا لکل شیٔ بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس پر غور وتدبر کرتے وقت سب سے پہلے اس کے نظم کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ حکمت وہدایت کے جو موتی اس کی تہ میں خدا نے چھپا رکھے ہیں، حاصل کیے جا سکیں۔ امام رازیؒ کا یہ قول پیچھے گزر چکا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا خزانہ اس کے نظم وترتیب میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جن علماء نے اس جہان معانی کا کچھ مشاہدہ کیا ہے، ان پر بڑے عجیب وغریب اور اہم انکشافات ہوئے ہیں اور انھوں نے اس کے بڑے فوائد بتائے ہیں۔ مثلاً

۱- اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ادراک ہوتا ہے اور یہ راز کھلتا ہے کہ فصاحت الفاظ اور بلندی معانی کے پہلو سے قرآن کے معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ترتیب اور آیات وسور کے نظم وارتباط کے پہلو سے بھی معجزہ ہے۔[۸۱]

۲- اس سے دل میں ایمان راسخ ہوتا ہے اور قرآن مجید کی ترتیبی نوعیت واضح ہوتی ہے۔[۸۲]

۳- اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ پورا قرآن از اول تا آخر مربوط ہو جاتا ہے۔کلام کی قوت بڑھ جاتی ہے۔اور تالیف کلام کا حال اس عمارت کی طرح ہو جاتا ہے جو نہایت محکم اور متناسب اجزا والی ہو۔۸۳

۴- اس سے کلام اللہ کی مراد سمجھ میں آتی ہے اور مضمون کلام پوری طرح واضح اور متعین ہو جاتا ہے۔۸۴

۵- متعدد احتمالات والی ان آیات کے حقیقی معانی واضح ہو جاتے ہیں جن میں مفسرین کرام نظم کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے حیران و پریشان ہیں۔۸۵

۶- اس سے یہ راز کھلتا ہے کہ قرآن مجید میں واقعات وقصص کی تکرار کیوں ہوتی ہے؟۸۶

۷- اس سے مکرر آنے والی آیات کا راز اور اس کی حکمت واضح ہوتی ہے۔

۸- اس سے صحیح احادیث کا قرآن مجید سے ماخوذ و مستنبط ہونا معلوم ہوتا ہے۔

۹- اس سے روایتوں کی حقیقت سے واقفیت اور ان میں صحیح وضعیف کی تمیز حاصل ہوتی ہے۔

۱۰- اس سے نئے نئے احکام و مسائل اور معانی وحقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

۱۱- نظم قرآن سے قرآن مجید کی مسحور کن فصاحت و بلاغت آشکارا ہوتی ہے۔

۱۲- اس سے صحیح شان نزول کی شناخت ہوتی ہے۔۸۷

۱۳- اس سے غور وفکر کی راہیں کھلتی ہیں اور اللہ کے اس حکم پر عمل کی سعادت حاصل ہوتی ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد/۲۴)۸۸

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد علماء نظم نے متفرق طور پر بیان کیے ہیں۔یہ چند محض نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ضرورت تو تھی کہ ان سب کی مثالوں سے وضاحت کی جائے۔مگر مقالے کی طوالت مانع ہے۔

مصادر و مراجع

(۱) ابن منظور، لسان العرب، مادہ ن ظ م، دار صادر بیروت، الزبیدی، تاج العروس، المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ

(۲) زمخشری، اساس البلاغہ، مادہ نظم، دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء

(۳) فیروز آبادی، القاموس المحیط، نول کشور لکھنؤ، مادہ نظم؛ لسان العرب، مادہ نظم

(۴) اساس البلاغہ، حوالہ سابق

(۵) بدالدین الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، ج ا، ص ۳۶، دار التراث قاہرہ؛ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ص ۶۹۵، تحقیق فواز احمد زمرلی، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء

(۶) برہان الدین البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ج ا، ص ۶، طبع اول، دائرہ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء

(۷) حمید الدین فراہی، دلائل النظام، ص ۷۵، طبع اول، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

(۸) علاء الدین محمد بن ابراہیم الخازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ا، ص ۷، المطبعۃ العامرہ، مصر ۱۳۲۸ھ

(۹) خازن، ج ا، ص ۷، ۸؛ زرکشی، ج ا، ص ۲۳۶؛ الاتقان، ۱۶۳-۱۶۴

(۱۰) برہان، زرکشی، ج ا، ص ۲۶۰؛ اتقان ۱۶۵

(۱۱) الاتقان، ۶۹۴؛ احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی، البرہان فی تناسب سور القرآن، ص ۶۳، تحقیق وتقدیم د: سعید الفلاح، جامع زیتونیہ، تیونس ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء

(۱۲) البرہان، زرکشی، ج ا، ص ۲۶۵

(۱۳) مصدر سابق، ص ۳۱۱

(۱۴) ابوعبیدہ، کتاب الفضائل، ج ۲، ص ۲۶۱، نمبر ۶۹۵

(١٥)

(١٦) ابن ندیم، الفہرست، ص ٨٧، دار المعرفہ بیروت، بدون سنہ و مطبع

(١٧) احمد امین، ضحیٰ الاسلام، ج ٢، ص ١٤٦، طبع عاشر، بیروت، بدون سنہ و مطبع

(١٨) ڈاکٹر فتحی احمد عامر، فکرۃ النظم بین وجوہ الاعجاز فی القرآن، ص ٥٣، قاہرہ، ١٣٩٥ھ/١٩٧٥ء

(١٩) ابن ندیم، الفہرست، ص ٩٩

(٢٠) فکرۃ النظم، ص ٥٣١

(٢١) نعیم الحمصی، فکرۃ اعجاز القرآن، ص ٦١، طبع ثانی، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ١٤٠٠ھ/١٩٨٠ء

(٢٢) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣٦؛ الاتقان، ص ٦٩٤

(٢٣) سامی عطا، المناسبات بین الآیات والسور، ص ١٥، جامعہ آل بیت

(٢٤) فکرۃ النظم، ص ٦٨

(٢٥) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣١١

(٢٦) مصدر سابق، ج ١، ص ٣١٧

(٢٧) فکرۃ اعجاز القرآن، ص ٩٤، ٩٥؛ الاتقان، ص ١٣٧

(٢٨) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣٦

(٢٩) مصدر سابق

(٣٠) نظم الدرر، ج ١، ص ٨

(٣١) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣٩؛ الاتقان

(٣٢) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣٦؛ الاتقان، ص ٦٩٤

(٣٣) امام فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر، ج ٢٧، ص ١٣٤

(٣٤) برہان، زرکشی، ج ١، ص ٣٩؛ الاتقان

(٣٥) الاتقان، ص ١٥٧

(۳٦) برہان، زرکشی، ج ا، ص ۳۵-۵۲

(۳۷) مصدر سابق، ص ۳۱۷

(۳۸) الشیخ مخدوم علی المہائمی، تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان، ج ا، ص ۳، مطبع بولاق مصر، بدون سنہ

(۳۹) نظم الدرر، ج ا، ص ۵، ٦

(۴۰) حوالہ سابق، ص ۱۵

(۴۱) الاتقان، ص ٦۹۳

(۴۲) مصدر سابق

(۴۳) جلال الدین سیوطی، اسرار ترتیب القرآن، ص ٦۵-٦٦، تحقیق عبدالقادر احمد عطا، دارالاعتصام، طبع ثانی ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء

(۴۴) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، ص ۵۰، طبع اول، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۷۳ء

(۴۵) مولانا عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۹٦

(۴٦) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ا، ص ۲۴۲، مکتبہ اسلامی، دہلی

(۴۷) نظم الدرر، ج ا، ص ۱۱

(۴۸) برہان، زرکشی، ج ا، ص ۳٦

(۴۹) اسرار التنزیل، ص ۷۵

(۵۰) البرہان فی تناسب سور القرآن، ثقفی، ص ۷۸

(۵۱) تفہیم القرآن، ج ا، ص ۲۰

(۵۲) برہان، زرکشی، ج ا، ص ۳٦؛ الاتقان، ص ٦۹۵؛ البرہان فی تناسب سور القرآن، ثقفی، ص ٦۵

(۵۳) برہان، زرکشی، ج ا، ص ۴۷

(۵۴) مصدر سابق، ص ۴۹

(۵۵) مصدر سابق، ص ۴۹

(۵۶) الاتقان، ص ۶۹۷

(۵۷) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۱، ص ۲۶، تاج کمپنی، دہلی، بار اول ۱۹۸۹ء

(۵۸) اسرار ترتیب القرآن، ص ۷۸

(۵۹) البرہان للثقفی، ص ۱۱۵

(۶۰) اسرار التنزیل، ص ۱۱۳

(۶۱) الف اسرار ترتیب القرآن، ص ۷۶؛ الاتقان، ص ۷۰۱

(۶۲) ب دلائل النظام، ص ۷۴، ۷۵

(۶۳) الاتقان، ص ۷۰۰

(۶۴) برہان، زرکشی، ج ۱، ص ۳۸؛ الاتقان، ص ۷۰۰

(۶۵) الاتقان، ص ۷۰۴

(۶۶) الف نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۹۔ علامہ سیوطی نے اس کے لیے النوع السابع عشر کا حوالہ دیا، ج ۱، ص ۷۰۴

(۶۷) ب دیکھیے ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی کا مضمون - ابن الزبیر الثقفی اور نظم قرآن - مشمولہ سہ ماہی نظام القرآن، ج ۲، شمارہ ۲، جولائی - ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۶۳

(۶۸) تفسیر کبیر، ج ۲۷، ص ۱۳۴

(۶۹) نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۸

(۷۰) مصدر سابق، ص ۱۳۷

(۷۱) مصدر سابق

(۷۲) مصدر سابق، ص ۱۹

(۷۳) الاتقان، ص ۶۹۷

(۷۴) اسرار ترتیب القرآن، ص ۶۶

(۷۵) شاطبی، الموافقات فی اصول الشریعۃ، ج ۳، ص ۴۱۵

(۷۶) ابن قیم، بدائع التفسیر، ۳/۳۷۰

(۷۷) تدبر قرآن، ج ۲، ص ۲۴۶

(۷۸) مصدر سابق، ص ۳۰۴

(۷۹) مصدر سابق، ص ۳۹۳

(۸۰) برہان، زرکشی، ج ۱، ص ۲۶۴؛ الاتقان، ص ۱۴۰۔ تفسیر قرآن کے اصول للفراہی، مرتبہ خالد مسعود، ص ۱۲۹، کتاب وسنت اکیڈمی، دہلی، طبع اول ۲۰۰۲ء

(۸۱) تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا عنایت اللہ سبحانی کی کتاب امعان النظر فی نظام الآی والسور، ص ۷۶ تا ۹۳، طبع اول ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء

(۸۲) البرہان فی ترتیب سور القرآن، ص ۶۷

(۸۳) نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۳

(۸۴) الاتقان، ص ۶۹۵

(۸۵) امعان النظر، ص ۹۶؛ البرہان، ثقفی؛ نظم الدرر، ج ۱، ص ۵، ۶

(۸۶) نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۳؛ امعان النظر، ص ۹۶

(۸۷) نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۴؛ امعان النظر، ص ۹۶

(۸۸) یہ اور اوپر کے پانچ فوائد اور ان کے علاوہ بعض دوسرے فوائد کے لیے دیکھیے مولانا عنایت اللہ سبحانی کی کتاب امعان النظر فی نظام الآی والسور

(۸۹) نظم الدرر، ج ۱، ص ۱۳-۱۴

نظم قرآن

(اہمیت، افادیت، ماخذ، اصول وتقاضے اور بنیادی قسمیں)

ایاز احمد اصلاحی

مفہوم اور تعریف:

عربی میں نظم کے معنی جوڑنے اور پرونے کے آتے ہیں لغات میں اس کا مفہوم کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ النظم (نظما ونظاما): التالیف، نظمت اللؤلؤ ای جمعته فی السلک والتنظیم مثله ونظم الامر علی انمل علی المثل وکل شیٔ قرنته بآخر او ضممت بعضه الی البعض فقد نظمته۔[1]

یعنی نظم کا معنی جوڑنا ہے، میں نے موتی میں نظم پیدا کیا مطلب ہوگا میں نے اسے ایک دھاگے میں پرو دیا۔ نظم بھی اسی معنی میں ہے، کسی معاملے میں نظم وترتیب پیدا کرنا بھی یہی ہے، ہر وہ چیز جسے آپ ایک دوسرے سے ملاتے اور مربوط کرتے ہیں، یا ایک دوسرے میں شامل کرتے ہیں تو گویا آپ اسے منظّم کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مختلف چیزوں کو آپس میں جوڑنا ملانا، منظّم ومربوط کرنا، اشیاء کو نظم وترتیب سے رکھنا، موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا، مختلف امور ومسائل میں نظم وترتیب قائم کرنا، منتشر چیزوں کو جمع کر دینا، افراد کی تنظیم کرنا، یہ سب نظم کے معنی میں داخل ہے، یہیں سے یہ لفظ کلام یا شعر کو منظوم شکل دینے کے لیے بھی استعمال ہونے لگا، اس لیے کہ اس کے الفاظ وکلمات ایک مخصوص ترتیب و وزن کے ساتھ ایک دوسرے سے بالکل مربوط کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔[2]

اسی سے لفظ نظام نکلا ہے، جو نظم کا مصدر ہے۔ اس کا مفہوم ہے ہر وہ چیز جس کی بنیاد پر بعض اشیاء کو جوڑا جائے، منضبط کیا جائے اور متحد وقائم رکھا جائے۔ نظام، طریقہ اور

راستہ کو بھی کہتے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے مازال علی نظام واحد یعنی وہ برابر ایک ہی طرز وطریق پر گامزن ہے۔ اپنے اسی معنی کے لحاظ سے وہ دھاگے یا اس قسم کی دیگر اشیاء کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں موتی یا اس طرح کی دیگر چیزیں پروئی جاتی ہیں، چڑیوں یا جانوروں کی صف یا قطار بھی اسی معنی میں شامل ہے "نظام الامر" یعنی امور و مسائل کا نظم اور ان کی تنظیم وانصرام کا طریقہ۔ "نظام الحیاۃ" یعنی اجتماعی وانفرادی زندگی کا دستور وطریقہ۔ غرض کی ہر وہ امر جس میں شیرازہ بندی وشعبہ بندی کا عمل ہو یا جس کام میں ترتیب، تنظیم اور توازن کا اہتمام ہو اس پر لفظ نظم اور نظام کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ کسی کام یا کسی شعبۂ زندگی میں نظم وترتیب کا فقدان اس میں موجود نقص واختلال پر دلالت کرتا ہے۔ جس طرح ہم اردو میں بولتے ہیں کہ اس کے کام میں کوئی نظم نہیں ہے تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ اس کے کام کرنے کا انداز صحیح نہیں ہے، اسی طرح عربی میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ "اس کے عمل میں کوئی نظام نہیں ہے"[۳] تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کا طریقۂ کار مناسب نہیں ہے۔ نظم اور نظام کے انھیں مفاہیم کو سامنے رکھ کر عربی زبان وادب کے ماہرین اسے نظم کلام کے لیے استعمال کرنے لگے۔ شعر کے لیے اس کا استعمال اس کے الفاظ وکلمات کی ظاہری تنظیم وترکیب اور اس میں قوافی واوزان کی رعایت کی وجہ سے ہے۔

ماہرین بلاغت جب نثری کلام کے لیے اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کے نزدیک اس کی ظاہری ومعنوی نظم وترتیب مراد ہوتی ہے۔ اصحاب بلاغت و ماہرین اعجاز القرآن جب کلام کی فصاحت و بلاغت کے ذیل میں نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو بالعموم اس سے ان کے نزدیک کلام کا ظاہری حسن اور اس کا بلاغی پہلو مراد ہوتا ہے تاہم اعجاز القرآن کے مصنفین میں سے بعض نے اسے کلام کے معنوی حسن اور اعجاز بیانی تک وسعت دی ہے، ان کے نزدیک کلام کو نظم و بلاغت کے معیار پر پرکھنے کے لیے اس کی ظاہری و معنوی دونوں خوبیوں کو ایک ساتھ دیکھنا ضروری ہے۔[۴]

جہاں تک قرآن کی تفسیر وتاویل کے بحث میں اس کے استعمال کا معاملہ ہے تو مفسرین قرآن اور علماء اس کا استعمال اس کے تمام تر مفہوم ومعنی کے ساتھ کلام الٰہی کے،

مختلف اجزاء کے درمیان پائے جانے والے معنوی ربط و تعلق کے لیے کرتے ہیں۔ اور ''نظم قرآن'' جو ابتداء میں بالعموم قرآن کے اعجاز، اس کی بے نظیر بلاغت، اس کے الفاظ وکلمات کی موزونیت، اس کے اسالیب بیان کی ندرت، کلام کی مجموعی تاثیر اور اس میں موجود ادبی ولسانی نزاکتوں اور نحوی و بیانی لطافتوں نیز صنائع و بدائع سے تعلق رکھنے والے دیگر امور و مسائل کے لیے بولا اور لکھا جاتا تھا، بعد میں اس کا استعمال قرآن کریم کی مختلف آیات وسور کے معنوی نظم وترتیب کے لیے مخصوص ہوتا چلا گیا۔ اور پھر قرآن کے مختلف اجزاء کے آپسی ربط و تعلق، سیاق وسباق کے لحاظ سے معنی و مقصودِ آیت یا مقصود سورہ کو سمجھنے اور اسی نہج پر آیات وسور کی تاویل وتوجیہ کرنے کے لیے اس لفظ (نظم) کا استعمال ایک مخصوص علم کے طور سے کیا جانے لگا۔

نظم کے علاوہ جو دوسرے الفاظ اس معنی میں مفسرین عام طور پر استعمال کرتے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں ربط، علاقہ، ارتباط، تعلق، تناسق، ترتیب، موافقہ، تناسب، مناسبہ، اتصال، تلائم والتحام وغیرہ۔ جدید محققین اس کے لیے بالعموم ''الوحدۃ الموضوعیۃ'' (معنوی وحدت) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، لیکن جس طرح قرآن کی طرف سے منکرین قرآن کو قرآن جیسا کلام پیش کرنے کے چیلنج یا دعوت مبارزت کے لیے علماء قدیم و جدید اعجاز القرآن کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اس سے قرآن کا ایک مخصوص علم مراد ہوتا ہے، اسی طرح علم المناسبۃ اور نظام القرآن کی اصطلاحات بھی قرآن کے ایک مخصوص اور اہم علم کی طرف دلالت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور کلام الٰہی کے باہمی ربط و تعلق کے لیے **علم المناسبۃ و نظام القرآن** کی اصطلاح پر ہی انحصار کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ کسی مخصوص علم کے لیے مخصوص اصطلاح کا استعمال ذہن کو مقصود حقیقی کی طرف متوجہ کرنے میں زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے۔ شاید اس علم کے لیے مولانا فراہیؒ کا نظام القرآن کے لفظ پر اصرار اور ان کا مستقل طور سے اسی لفظ پر انحصار کرنے کا مقصد یہی تھا تاکہ ''اعجاز القرآن'' کی طرح ''نظام القرآن'' کی بھی علوم قرآنی کے ایک اہم علم کے طور سے اپنی مستقل شناخت ہو۔ اور نظام القرآن سے ہمیشہ نظام القرآن ہی سمجھا جائے اور اسے سمجھنے یا

سمجھانے کے لیے بار بار غیر ضروری وضاحتوں کا سہارا نہ لینا پڑے۔

علماء کی کتابوں میں اس کے لیے جو لفظ ایک مستقل قرآنی علم کی نمائندگی کرنے والی اصطلاح کے طور سے سب سے زیادہ مستعمل ہے وہ ہے تناسب اور مناسبہ۔[۵]

علم المناسبہ- سے ان کے نزدیک قرآن کا وہی علم مراد ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر لفظ نظم کے تحت کی ہے، لیکن قرآنی آیات وسور کے ربط وتعلق کے لیے بعض علماء نے لفظ نظم یا نظام کو بھی اظہار مدعا کے لیے استعمال کیا ہے۔[٦] بقاعی نے تو اپنی کتاب کا عنوان ہی ''نظم الدرر'' رکھا ہے اور دور جدید کے مصنفین میں اس لفظ کا استعمال سب سے زیادہ امام فراہیؒ نے کیا ہے، انھوں نے اپنی تفسیر کا نام ''تفسیر نظام القرآن'' رکھنا پسند کیا۔[۷] لغت میں مناسبۃ کے معنی مقاربہ اور مشاکلہ، کے الفاظ میں دیے گئے ہیں، جو نسب اور تنسبہ سے نکلا ہے جس کا مفہوم ہے کسی سے کسی بنیاد پر قربت وتعلق رکھنا، یا اس سے قریب اور ہم آغوش ہونا، اسی سے ''نسیب'' یا ''مناسب'' ہے یعنی قربت رکھنے والا۔[۸] اسی مفہوم کی بنیاد پر وہ قیاس کے باب میں زیر بحث آنے والی علت کے لیے استعمال ہونے لگا یعنی وہاں ''مناسبۃ العلۃ'' کے ذریعہ قیاس کے حق میں پیش کی گئی علت کی مطابقت ومعقولیت پر بحث کی جاتی ہے اور یہاں قرآنی آیات وسور کے ذیل میں اس کا مطلب ہوگا مفہوم ومعنی کے لحاظ سے اجزاء کے درمیان پایا جانے والا ربط وتعلق اور اس کی وجوہات کی تحقیق۔[۹]

بلا شبہ قرآن میں نظم وربط کی بحث آج اہم ترین علوم قرآنی میں شمار ہوتی ہے اور یہ قرآن ہی نہیں بلکہ کسی بھی عمدہ ومؤثر کلام کی ایک اہم خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ از اول تا آخر منظّم ومربوط ہو۔ خود کسی منظوم کلام میں پیش کی گئی باتوں میں اگر باہم کوئی ربط نہ ہو تو وہ کلام منظوم ہونے کے باوجود کلام منتشر بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کی زبان زندہ زبان نہیں کہی جائے گی۔[۱۰]

دوسرے لفظوں میں کوئی کلام، کلام موثر کہے جانے کے لائق اسی وقت ہوگا جب اس کے اجزاء میں ظاہری و باطنی دونوں لحاظ سے نظم وربط موجود ہو، کلام کے اجزاء میں معنوی ربط وہم آہنگی نہ ہو تو اسے اس کا ایک بہت ہی بنیادی نقص سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر

اس میں ربط ہو تو سہی مگر وہ ہم سے انتہائی تدبر و تعمق کا طالب ہو، اور عام لوگوں پر وہ واضح نہ ہو تو اس صورت میں اگر کسی کو اپنی علمی بے مائیگی کی وجہ سے وہ نظر نہ آئے تو ہم اسے نظر کا قصور سمجھیں گے نہ کہ کلام کا۔ اسی لیے ماہرین زبان وادب کے نزدیک نظم کلام، کلام کا ہی ایک حصہ اور اس کا جزو لاینفک ہوا کرتا ہے اور اس میں شامل ہو کر اس کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔[۱۱] وہ سامنے نہ ہو یا اسے اس کے نظم سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو خود کلام اپنی تصویر کے ہر زاویے کے ساتھ ہمارے سامنے نمودار نہیں ہو سکتا۔[۱۲] اس سے ثابت ہوا کہ نظام القرآن کی مدد حاصل نہ ہو تو کلام کے بند کواڑ کھولنے میں ہم کامیاب نہیں ہو سکتے اور جب تک نظم کلام کی رسی ہاتھ میں نہ ہو تو اس کی مشکل پہاڑیاں چڑھنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ نظم چاہے وہ قرآن کے نظم کا معاملہ ہو یا اس کے علاوہ کسی اور کلام کے داخلی روابط کا، وہ اپنے آپ میں بہت اہم اور ناگزیر ہے اور اسی سے "نظم و ترتیب کی علتوں کا اندازہ ہوتا ہے"۔[۱۳]

تعریف:

نظم کے مذکورہ بالا مفہوم کو سامنے رکھ کر ارباب بصیرت نے اپنے اپنے لحاظ سے اس کی تعریف کی ہے ان میں سے بعض جامع تعریفات کو ہم نیچے پیش کر رہے ہیں، علم نظم کی ایک عمدہ تعریف یہ ہے:

علم المناسبات الاهم من مناسبات القرآن وغيره تعرف منه علل الترتيب وموضوعه اجزاء الشيء المطلوب علم مناسبته من حيث الترتيب، وثمرته الاطلاع على الرتبه التي يستحقها للجزء بسبب ماله بما ورائه وما امامه من الارتباط والتعلق الذى هو كلمة النسب"۔[۱۴]

(قرآن یا اس کے علاوہ کسی قسم کے کلام کے داخلی نظم و ربط کے سلسلے میں علم مناسبت کی بہت اہمیت ہے جس سے ترتیب کی حقیقی علتوں کا اندازہ ہوتا ہے، اس کا موضوع شیٔ مطلوب کے مختلف اجزاء اور اس کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے اس کے نظم سے واقفیت

حاصل کرنا ہے، اس کا حاصل کسی مخصوص جزوِکلام کے حقیقی موقع و مقام سے آگاہ ہونا ہے، جس کا وہ اپنے پیش و عقب اور گرد و نواح سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر تقاضا کرتا ہے۔)

خاص نظم قرآن کے سلسلے میں صاحب ''نظم الدرر'' فرماتے ہیں:

''نظم قرآن کا علم ایک ایسا علم ہے جس سے اس کے اجزاء کے مابین ترتیب و تعلق کے اصل اسباب و مصالح کا اندازہ ہوتا ہے یہ قرآنی بلاغت کا بڑا اہم راز ہے کیوں کہ اسی کی مدد سے حسب اقتضائے حال قرآنی مفاہیم کی باہمی مطابقت ہم پر منکشف ہوتی ہے''۔۱۵

وہ اس کی افادیت و اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس کی افادیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں سورہ کے مقصد کی طرف رہنمائی ملتی ہے، جو اس میں پیش نظر ہو، اور اس کے علاوہ ہمیں اس کے ذریعہ جملوں (آیات) کے اصل مقصود و مراد کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ علم غایت درجہ حسن و عمدگی کا حامل ہے، اور علم تفسیر میں اس کی وہی حیثیت ہے جو علم بیان میں نحو کو حاصل ہے''۔۱۶

امام زرکشیؒ فرماتے ہیں:

علم نظم ایک ایسا علم ہے، جس سے عقلیں بیدار ہوتی ہیں اور اس سے متکلم کے منشا و مفہوم سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے''۔۱۷

وہ اس کی اہمیت یہ کہہ کر بیان کرتے ہیں کہ ''اس اہم علم کے دقیق اور مشکل ہونے کے سبب مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی''۱۸ پھر اس کے بعد وہ اس کے حق میں بعض ممتاز علماء کے اقوال نقل کرنے سے پہلے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ علم نظم سے سورہ کی ابتدائی و اختتامی آیات اور کلام کے تمام اجزاء کے درمیان معنوی ربط و تعلق کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان موجود ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے۔۱۹ وہ لکھتے ہیں:

''فائدته جعل اجزاء الكلام بعضها آخذا باعناق بعض فيقوى بذلك الارتباط، ويصير التاليف حاله حال البناء المحكم المتلائم الاجزاء''۔۲۰

(اس کا فائدہ یہ ہے کہ کلام کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے درمیان ربط وتعلق کی بنیادیں مضبوط ہوئی ہیں اور پورا کلام ایک مستحکم عمارت کے مثل بن جاتا ہے جس کے تمام حصے آپس میں پیوست رہتے ہیں۔)

امام سیوطیؒ اس بات کا ماتم کرنے کے بعد، کہ اس اہم ترین قرآنی علم پر علماء و اصحابِ فکر نے بہت کم توجہ دی ہے اور محض چند علماء ومفسرین نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اس کی تعریف کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"مرجع هذه المناسبة في الآيات والسور الى معنى رابط بينهما عام او خاص او عقلي او حسي او خيالي او غير ذلک من أنواع العلاقات والتلازم الذهني كالسبب والمسبب والعلة والمعلول..."۔۲۱

(نظم ومناسبت کا سرچشمہ آیات اور مختلف سورتوں کے درمیان ربط پیدا کرنے والے مفہوم ومعنی کے اندر ہوتا ہے۔ان کے مابین معنوی ربط کی یہ بنیاد یا تو عام ہوگی یا خاص یا یہ عقلی یا حسی اور فکری وخیالی ہوگی یا وہ کسی اور قسم کے ربط وتعلق اور تلازم ذہنی کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسے سبب ومسبب،علت ومعلول،نظریں اور ضدین کے درمیان ہوتا ہے۔)

امام بقاعیؒ اور امام سیوطیؒ نے ابن عربی کے درج ذیل جامع قول کی مدد سے نظم قرآن کی حقیقت بیان کی ہے جو ان کی کتاب "سراج المریدین" میں مذکور ہے:

"قرآنی آیات کے آپسی تعلق پر اس طرح نگاہ رکھنا کہ وہ سب ایک دوسرے میں پیوست اور محکم ومنظّم کلام کی شکل میں دکھائی دیں ایک عظیم الشان علم ہے، اس کی طرف سوائے ایک عالم کے کسی اور نے توجہ نہیں کی، اس اصول پر اس نے پوری سورہ بقرہ کا مطالعہ کیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم پر اس کا دروازہ کھولا،لیکن جب ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کی قدر نہیں پائی اور دیکھا کہ خلق خدا ہیں کاہلی ودون ہمتی عام ہے تو ہم نے بھی اسے مہر بند کر دیا اور ہم نے اسے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا ایک معاملہ سمجھا اور اسے اسی کی طرف لوٹا دیا"۔۲۲

اس قول میں نہ صرف نظم قرآن کی تعریف موجود ہے بلکہ اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بعض قدیم علماء کے نزدیک اس کی کس قدر اہمیت تھی۔ اس کے علاوہ ولی الدین ملویؒ، امام رازیؒ، امام فراہیؒ اور ابن الزبیر الثقفیؒ وغیرہ نے بھی اپنے لحاظ سے اس کی تعریفیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے سبھی نے علم نظم کو انتہائی اہم اور عظیم قرار دیتے ہوئے اس بات پر خاص شکوہ کیا ہے کہ اس کی اس قدر اہمیت وعظمت کے باوجود اہل بصیرت نے اس کے مشکل ہونے کی وجہ سے اس کی طرف بہت کم توجہ صرف کی ہے۔[۲۳] امام رازی کا یہ قول تو علوم القرآن پر مشتمل کتابوں کے بیش تر مصنفین نے نقل کیا ہے کہ قرآن کے ''بیشتر لطائف اور اس کا اعجاز اس کے نظم وترتیب میں مضمر ہے''[۲۴]۔ ابو جعفر نحاس نے اس کی اہمیت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے (تالیف القرآن من اعجازہ)۔[۲۵] (یعنی قرآن کا نظم وارتباط اس کی اعجاز بیانی کی ایک اہم قسم ہے)۔ آخر میں ہم دو اور اقوال نقل کرنا چاہتے ہیں جن سے نظم قرآن کے اصل مقام ومرتبہ پر روشنی پڑتی ہے، ایک تو وہ ہے جو امام زرکشی نے ابو بکر نیشاپوری کی بات اپنی کتاب میں نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''شیخ ابوالحسن الشہر ابانی کا کہنا ہے کہ پہلے شخص جنھوں نے علم مناسبت کو بغداد میں واضح کیا وہ شیخ ابو بکر نیشاپوری ہیں، جو علم شریعت اور ادب میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے لیے کرسی کا اہتمام ہوتا جس پر بیٹھ کر وہ اس وقت جب ان کے سامنے آیات کی تلاوت ہوتی، یہ فرماتے کہ یہ آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی ہے اور فلاں سورہ کو فلاں سورہ کے پہلو میں رکھنے کی کیا مصلحت ہے اور وہ علمائے بغداد پر تنقید کرتے کہ وہ اس علم نظم سے بالکل ناواقف ہیں''۔[۲۶]

اس آخری عبارت کو ہم نے بطور خاص یہ دکھانے کے لیے نقل کیا ہے کہ اس میں نہ صرف علم نظم کی تاریخ اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فی الواقع ہے کیا چیز اور وہ کلام کے کس پہلو سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا قول امام فراہیؒ کا ہے جس سے نظم کا اصل مقام ظاہر ہوتا ہے۔

''نظم کلام میں کچھ خاص حقیقتیں پوشیدہ ہیں، جو اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب ایک ایک

بات پر اس نظم کی روشنی میں غور کیا جائے۔ اگر نظم کا اہتمام ترک کر دیا جائے تو وہ باتیں لازماً نظر انداز ہو جاتی ہیں جو خاص طور سے نظم سے ہی نکلتی ہیں اور نظم ہی کی رعایت سے سمجھ میں آسکتی ہیں، ہم نظم کلام سے بے پرواہی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے''۔[۲۷]

مولانا فراہیؒ کی اس عبارت سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ نظم قرآن فہم قرآن کی شاہ کلید ہے، تاویل وتفسیر کے سلسلے میں اس کے بغیر تیر کا نشانے پر لگنا مشکل ہے۔

نظم قرآن کی اس اہمیت کی وجہ سے امام رازیؒ اور علامہ ملویؒ وغیرہ نے بعض علمائے سلف کی اس رائے کو سختی سے رد کر دیا ہے کہ قرآن میں نظم و ربط ڈھونڈنا کارعبث ہے کہ اس لحاظ سے نہ تو نازل کیا گیا ہے اور نہ مرتب۔[۲۸]

اگر سطور بالا میں پیش کی گئی نظم قرآن کی تعریفات اور علماء کے اقوال کا بغور تجزیہ کیا جائے تو تین پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئیں گے۔ جو یہ ہیں:

(۱) نظم قرآن کا مفہوم:

قرآنی سورتوں اور اس کی آیات کے باہمی ربط و تعلق کا نام علم نظم یا علم مناسبہ ہے۔ اس میں آیات کے اصل مفہوم و مدعا سے آگاہی اور سورتوں کے اغراض و مقاصد کے تعین کی کوشش اس طور سے ہوتی ہے کہ اس کے مختلف اجزاء کے گوناگوں تعلقات اور ان میں اٹھائے گئے موضوعات کے آپسی رشتوں نیز ہر جز کے موقع و محل کا احاطہ کیا جاتا ہے تاکہ سلسلۂ بیان کو سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہو۔ اور ہر آیت اور ہر سورہ کا وہی مفہوم متعین کیا جائے جو اس کے سیاق وسباق سے نکلتا ہو۔

(۲) نظم قرآن کی حد درجہ اہمیت وافادیت:

قرآنی علوم میں نظم قرآن کو سب سے نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اسی پر فہم قرآن کا دارومدار ہے، وہ مشکل ہے تاہم اس کی عظمت واہمیت محققین قرآن کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ اس لیے کہ کسی آیت کے مدعا یا سورہ کے مقصود تک ہماری رسائی

نظم قرآن کی مدد کے بغیر ممکن نہیں اور مشکلات قرآن کے گرہ کشائی ہمارے لیے اسی وقت ممکن ہوگی جب خدا کی توفیق و تائید کے ساتھ ساتھ یہ کنجی بھی ہمارے ہاتھ میں ہو بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو (جیسا کہ آپ آگے دیکھیں گے) نظام قرآن اور نظام شریعت میں ایک گہرا تعلق ہے اور امور شریعت و احکام دین کی تفہیم و تشریح میں بھی نظم قرآنی کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۳) نظم قرآن کا علم بہت آسان نہیں ہے:

نظم قرآن کا علم ایک مشکل اور لطیف علم ہے۔ نظم قرآن کی گرہیں کھولنے کے لیے حد درجہ انہماک و تعمق اور محنت و جاں فشانی کی ضرورت ہوتی ہے شاید اس کے انھیں تقاضوں کو دیکھتے ہوئے علماء و مفسرین کی توجہ اس کی طرف بہت کم مبذول ہوسکی۔ اس کے لیے اسی تدبر کی ضرورت ہے جس کا قرآن خود ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔

(۴) نظم قرآن کوئی اضافی علم نہیں ہے:

نظم قرآن نہ ہی کوئی اضافی و معمولی بحث ہے اور نہ ہی یہ کوئی ایسا علم ہے جسے ہم نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کے زمرے میں ڈال دیں بلکہ اسے قرآن کی تاویل و تفسیر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہی صراط مستقیم ہے جس پر چل کر ہم قرآن کے مقصد و مدعا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہ بدیہی امر ہے کہ جس چیز کا تعلق مقصود و مراد سے ہوا ہے ہم ایک اضافی یا جزوی علم کہہ کر آگے نہیں بڑھ سکتے؟ جیسا کہ ہم آگے کی بحثوں میں متعدد مثالوں کی روشنی میں دیکھیں گے کہ قرآنی آیات اور سورتوں کا اصل مقصد نظم قرآن کے ذریعہ ہی منکشف ہوتا ہے بلکہ کلام کے بہت سے وہ پہلو جو ظاہرا عیب و نقص دکھائی دیتے ہیں، جیسے تضاد، انتقال معنی اور تکرار وغیرہ، نظم کلام کی مدد سے ان پر غور کیا جائے تو وہ تاثیر و بلاغت کا مظہر بن جاتے ہیں اور کلام الٰہی ہر لحاظ سے ایک بلیغ اور عظیم کلام کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی وجہ سے امام رازیؒ جیسے مفسر قرآن کی اعجاز بیانی کا جلوہ اس کی ظاہری خوبیوں کی بجائے اصلاً اس کی باطنی خوبیوں اور کیفیات میں دیکھتے ہیں اور وہ ان کے نزدیک ایک کلام

معجز اسی بنا پر ہے کہ وہ ایک اعلیٰ ترین نظم و ترتیب کا حامل ہے اور اس کی آیات اور سورتیں باہم دگر اس طرح مربوط ہیں کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ جیسا کہ خود قرآن نے فرمایا:
"كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ"۔

خلاصہ یہ کہ نظم قرآن وہ علم ہے یا قرآن کی وہ اہم خصوصیت ہے جس پر اس کے بیشتر خصائص و امتیازات کا انحصار ہے، یہ کسی آیت کسی ایک سورہ یا کسی ایک جزء نہیں بلکہ تمام اجزائے قرآن پر محیط ہے اور اس کی بنا پر سیکڑوں آیات اور سورتوں پر مشتمل کتاب الٰہی اپنے اوپر تدبر و تفکر کی نگاہ ڈالنے والوں کو کلمہ واحدہ کی شکل میں نظر آنے لگتی ہے۔[29]

اور قرآن کریم کا ظاہری طور سے مطالعہ کرنے والے اور اس کی فصاحت و بلاغت کو اپنا موضوع تحقیق بنانے والے بھی اس نظریے پر یقین کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم صرف ظاہری و لفظی ہی نہیں بلکہ باطنی اور معنوی لحاظ سے بھی نظم و ترتیب اور باہمی ارتباط و ائتلاف کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اور ان کا اس بات پر بھی کم و بیش اتفاق ہے کہ اس کتاب کا نہ تو کوئی نقطہ و کلمہ زائد ہے، اور نہ کوئی بات خارج از موضوع، بلکہ ان کے نزدیک اس کے تمام الفاظ و کلمات باہم مربوط و منظّم ہیں، اس کا اسلوب اچھوتا، اس کا نظم بے مثال اور اس کی ترتیب بے حد حکیمانہ ہے، اس کے الفاظ اپنے اندر معانی و مطالب کا سمندر لیے ہوئے ہیں۔ اور اس کے اسلوب کی ندرت اور اجزاء کا باہمی تناسب و توافق اس کلام کو ایک ایسے کلام معجز میں ڈھال دیتا ہے کہ وہ عام انسانی معیار سے بالاتر ہو جاتا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے ایک معجزہ بن جاتا ہے[30]۔ یہاں تک کہ اسے دیکھ کر اپنے وقت کے عظیم ترین ادباء و شعراء کی عقلیں حیران رہ جاتی ہیں، اور ان کے لیے اس کا جواب تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ عربی زبان کے عام الفاظ و کلمات سے بنا ہوا یہ کلام آخر دوسرے کلاموں سے اتنا ممتاز کیوں ہے؟ اس کے اندر اس قدر تاثیر کہاں سے بھر دی گئی ہے کہ اس کے حسن بلاغت کی شعاعیں اپنے سامنے کسی کو ٹھہرنے نہیں دیتیں؟ اور ہر کوئی جو اسے سنتا ہے مبہوت و مسحور ہو کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے وقت کا عظیم شاعر لبید اس سے مرعوب و متاثر ہو کر اپنی شاعری کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

نظم قرآن کا ماخذ

(۱) قرآن کریم:

نظم قرآن کا اولین ماخذ قرآن کریم ہے، ثانیاً نبی کریم ﷺ اور ثالثاً صحابہ کرامؓ اور اسلاف کا اس جانب توجہ دینا اور چوتھے قرآن میں بعض ایسی علامات کا ملنا جس سے نظم قرآن پر دلالت ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کی یاد دہانی ہم ایک بار پھر کرلیں کہ قرآن کریم کا نظم نہ تو کوئی خارجی چیز ہے جو باہر سے لاکر بہ تکلف اس پر تھوپی جائے اور نہ ہی کوئی اضافی شئ ہے بلکہ یہ کلام الٰہی کا ہی ایک جزء ہے اور پوری کتاب میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اپنے اوپر غور کرنے والوں کو بتاتا جاتا ہے کہ فلاں آیت کو فلاں آیت کے پہلو میں یا فلاں جز کو فلاں جز کے قریب کیوں رکھا گیا ہے، اور اس کے قرب و بعد کی کیا وجوہات ہیں، بعض آیات کا بعض آیات کے ساتھ اور بعض سورتوں کا بعض سورتوں کے ساتھ کیا ربط ہے۔ اور داخلی طور سے ان کے مربوط و متعلق ہونے یا نہ ہونے سے مفہوم و معنی میں کیا فرق پڑتا ہے؟ غرض کہ کلام الٰہی کا حقیقی منشاء و مدعا اسی نظم کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے جو کہیں اور نہیں بلکہ انھیں آیات یا اجزائے کلام میں مضمر ہوتا ہے۔ زیادہ واضح، سادہ اور مختصر لفظوں میں اس بات کو ہم یوں بھی بیان کرسکتے ہیں کہ نظم کلام دراصل کلام ہی ہوتا ہے، اور نظم قرآن قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ امام فراہیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ: ''نظم کلام کلام کا ہی ایک جزء ہوا کرتا ہے۔ اسے چھوڑ دیجیے تو خود کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہوجاتا ہے''۔ تو فی الواقع وہ ہمیں یہی بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ نظم قرآن قرآن سے الگ کوئی شئ ہے اور نہ روح قرآن سے الگ کوئی پرتکلف نظریہ، بلکہ یہ عین کلام ہے کیوں کہ ہر کلام کا دارومدار نظم پر ہی ہوتا ہے اور نظم و ترتیب کے معیار سے کلام کا معیار متعین ہوتا ہے وہ جس مرتبے کا ہوگا کلام بھی اسی مرتبے کا ہوگا۔ اسی سے کلام کا مقصد بھی متعین ہوتا ہے۔ اور اسی مقصد تک پہنچانے کے لیے قرآن ہم سے بار بار غور و تدبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے نہ اسے خارجی شئ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی

اضافی، جزوی یا غیر ضروری علمی لطائف کی تلاش کا حصہ۔ ایسا کہنا قرآن سے متعلق ایک عظیم حقیقت سے غفلت یا اس کے انکار کے مترادف ہوگا۔''[۳۱]

نظم قرآن کے ایک معروف محقق اس حقیقت سے ہمیں درج ذیل الفاظ میں بڑی خوبی سے آگاہ کرتے ہیں:

''معرفت نظام سے مقصود دراصل تدبر قرآن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیوں کہ تدبر ہی قرآن فہمی کی کلید ہے، اس کے علاوہ وہ ہدایت وتقویٰ کا وسیلہ بھی ہے جو کہ اصل ہیں، ہدایت سے نفس کو نور وبصیرت اور تقویٰ سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ ایمان اپنے تمام علمی شعبوں کے ساتھ ہدایت میں داخل ہے اور تمام احکام وشرائع اور اخلاق وکوائف جز وتقویٰ ہیں۔ اللہ نے قرآن، تورات، انجیل میں اس کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ پھر نظام قرآن کی طرف رہنمائی اوائل تدبر میں ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد نظام کی معرفت وجستجو کے لیے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ قرآن کا چھوٹا سا جملہ بھی غور وتدبر کا طالب ہے اور وہ درجہ بدرجہ اعلیٰ سے اعلیٰ تر اور خوب سے خوب تر (نتائج) کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نظام مکمل طریقے سے کھل کر سامنے آجاتا ہے تو سورتوں کے محاسن اور وہ حکمت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ جو علم وتقویٰ کی بنیاد ہیں[۳۲]

نظم کی اسی اہمیت کی وجہ سے کسی ایک آیت کو نظم سے خالی سمجھنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔[۳۳]

اس سے ظاہر ہوا کہ معرفت نظم کا مطلب صرف دو آیتوں کے درمیان ربط وتعلق کو جان لینا یا ان دو سورتوں میں کسی بھی قسم کے ربط ونظم کو ثابت کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد امور دینیہ، اسرار شریعت اور رموز حکمت کی جستجو ہے۔ اسی سے نور ہدایت اور تجلیات تقویٰ کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اور اسی سے مقصود کلام کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ وہ علم نظم ومناسبت (علم المناسبۃ) جو کبھی ربط آیات تک محدود تھا اسے کس طرح سطور بالا میں قرآن کی تفسیر وتاویل کے ایک اہم وسیلہ کے طور سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظم کی تمام تجلیات ناخن تدبر کی کسی ایک جنبش سے

ہمارے سامنے روشن نہیں ہوجاتیں بلکہ اس سفر میں بالتدریج منزل کی طرف بڑھا جاتا ہے اور ایک لمبی تحقیق وجستجو کے بعد ہی دین وشریعت کے اسرار وحکم کی تہہ میں اترنے کا موقع ملتا ہے جو کہ قرآن کا اصل مقصد ہے۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ دین کسی ایک حکم کا نام نہیں ہے بلکہ وہ مختلف ومتنوع تعلیمات وہدایات کا مجموعہ ہے۔ اگر ان احکام وہدایات میں باہم کوئی ربط نہ ہوتو وہ ہماری شخصیت کو تضادات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنا کر رکھ دیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب دین ایک اور کتاب شریعت ایک ہے تو وہ مقصد بھی ایک ہی ہونا چاہیے جس کی طرف وہ انسانوں کو دعوت دیتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حقیقی نظام قرآن وہ ہے جو قرآن میں پیش کیے گئے احکام وشرائع کے داخلی نظام کو ہم پر پوری طرح اجاگر کردے۔ لیکن نظم کی اس آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اور اس کا یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ جس طرح حقائق نظم ہم پر درجہ بدرجہ منکشف ہوتے ہیں اسی طرح اس علم کی جستجو میں بھی علماء نے بالتدریج کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ جن پر آئندہ سطور میں اشارات موجود ہیں۔

یہاں جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ کہ اہل علم کا نظام القرآن کے علم اور اس اہمیت سے بے توجہی برتنا یا اس کی تحقیق میں زندگیاں لگانے والوں کی عظیم خدمات کو غیر ضروری دقیقہ رسی وعلمی مشغلہ کا نام دے کر اس علم کی اہمیت کم کرنا حد درجہ نامناسب ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ غلط فہمی ہے کہ یہ ایک ایسا اضافی علم ہے جس کا مقاصد قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایسے تمام لوگوں کو پہلے مرحلے میں ہی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نظم قرآن، دراصل قرآن ہی ہے، فہم قرآن کے لیے فہم نظم ایسا ہی ضروری ہے، جیسے بحر ناپیدا کنار میں جہاز رانی کے لیے قطب نما کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر جہاز کے ڈوب جانے اور منزل سے بھٹک جانے کا پورا اندیشہ رہتا ہے۔ نظم قرآن کی اس اہمیت کے دلائل بھی اہمیت قرآن ہی سے ملتے ہیں۔ اور اس علم کا سب سے پہلا ماخذ بھی وہی ہے۔ ہم اس پہلو پر قرآن کی روشنی میں اب قدرے تفصیل سے غور کریں گے۔

☆ سب سے پہلے ان آیات کو دیکھیے جو براہ راست قرآن کو ایک منظّم ومربوط کلام

ہونے کی شہادت دیتی ہے۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ۔(ہود/۱)۳۴

(یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی تفصیل ہوئی۔

محکم کرنے کا مطلب ہے پختہ کرنا یعنی کسی چیز کی بنیاد مضبوط کرنا اور اسے ہر لحاظ سے مضبوط و مستحکم کرنا ظاہر ہے جب اسے کسی کلام کے لیے بولا جائے گا تو اس کا یہی مفہوم ہوگا کہ اس میں کوئی سقم یا جھول نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی بے ربطی و بے ترتیبی ہے کہ ہر جگہ بات اکھڑی اکھڑی نظر آئے بلکہ وہ انتہائی گٹھا ہوا اور مربوط کلام ہے۔

دوسری آیت ملاحظہ فرمائیں:

أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلاَفاً كَثِيراً۔(النساء:۸۲)

(اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

یہ آیت دراصل منافقین کی روش پر تبصرہ کے ذیل میں آئی ہے جس میں ان کے اس منافقانہ طرز عمل کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے کہ وہ رسول ﷺ کے سامنے تو اطاعت کا دم بھرتے ہیں لیکن جب اپنی جماعت میں ہوتے ہیں تو رسول ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں۔۳۵ قرآن نے ان کی اس خاص ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان پر یہ واضح کیا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا اختلاف اور تضاد بیانی نہیں ہے جس کی حقانیت کو وہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں، بلکہ اس مرض کا شکار تو وہ خود ہیں کہ وہ ایسی روشن کتاب پر بھی دل سے ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں جو اپنے آپ میں ایک محکم و مربوط کتاب ہے۔اگر وہ اس پر غور کریں تو ان کی بہت سی الجھنیں خود بخود درفع ہو جائیں۔ یہاں گویا انھیں اپنے طرز عمل کی اصلاح کے لیے قرآن پر غور وخوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ غور کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی تمام تفصیلات اور

جس کے بیان کردہ تمام امور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اور وہ جن احکام و تعلیمات کو بیان کرتی ہے ان میں بھی ایک توازن و ہم آہنگی قائم ہے، اس کے تمام اجزاء اور اس کے ذریعہ پیش کیے گئے نظام حیات میں بھی ربط و توازن پایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ ایک خدائے علیم و حکیم کا کلام ہے، اس میں کسی قسم کی نہ تو آمیزش ہے اور نہ کوئی اختلاف، اس طرح یہ آیت اگرچہ ظاہر نظم قرآن کی تائید کے بجائے منافقین کی روش پر ایک تبصرہ ہے لیکن اپنے وسیع تناظر میں یہ بلاشبہ مذکورہ معنی و مفہوم کا احاطہ کرتی ہے کیوں کہ جب کسی کتاب کے مقاصد اور اس کی تعلیمات میں تضاد نہیں ہے تو پھر ان تعلیمات کو بیان کرنے والی اس کی آیات و عبارات میں تضاد اور بے ربطی کا امکان کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے تو ازاول تا آخر ایک مربوط و متصل کلام ہونا چاہیے۔[۳۶]

اس تبصرے میں منافقین و منکرین حق کی مخالفانہ و معاندانہ روش کے اصل سبب کی نشان دہی کی گئی ہے کہ ان کے اعراض و اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی کی باتوں اور اس کے دلائل پر غور نہیں کرتے، اگر وہ ایسا کریں تو وہ قرآن جو ہر قسم کے تناقض و تضادات سے پاک ہے اس کے منطقی طرز استدلال اس کے مطالب میں موجود مقصدی یکسانیت، اس کے مختلف اجزا کی معنوی وحدت اور آیات و سور کے باہمی اتحاد میں انہیں اپنے تمام سوالات و شبہات کا جواب مل جائے۔ مزید برآں یہاں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ زیر مطالعہ آیت میں لفظ اختلاف عمومی معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے اسے ظاہری و لفظی عدم یکسانیت و تضاد بیانی تک محدود کرنا کسی طور سے صحیح نہ ہوگا بلکہ لفظی و اسلوبیاتی اتحاد و یگانگت کے ساتھ فکری و معنوی اور مقصدی و نظریاتی ان دونوں پہلوؤں کلام الٰہی میں موجود عدم اختلاف کی خصوصیت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ اللہ واحد کا حق و عدل پر مبنی ایسا کلام واحد ہے جس کے تمام اجزاء نہ صرف باہم متحد و یک رنگ ہیں بلکہ اس کی بنیادی تعلیمات اور گزشتہ کتب سماوی کی بیشتر ہدایات و تعلیمات کے درمیان بھی توافق و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں ہی پہلوؤں سے یہ آیت اس بات کی شاہد ہے کہ کلام الٰہی کے مطالب میں پایا جانے والا منطقی ربط و نظم اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ خدائے واحد کا کلام ہے۔[۳۷]

اس کے علاوہ درجہ ذیل آیات بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے قرآن کریم کے ایک مربوط و منظّم کلام ہونے پر دلیل ہیں۔ اختصار و سہولت کی غرض سے پانچ مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے ان سے استدلال کیا گیا ہے۔

۱- وَإِنَّهُ فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ. (زخرف:۴) ۳۸

ذٰلِکَ نَتْلُوهُ عَلَيْکَ مِنَ الآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ۔

يٰسٓ. وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ (یٰسٓ:۱،۲)

تِلْکَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ (لقمان:۳۱)

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۳۹ (القمر)

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِيْ أَنزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا (الکہف:۱)

كَذٰلِکَ أَوْحَيْنَا إِلَيْکَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِيْ بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّکَ لَتَهْدِيْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الشوریٰ:۵۲)

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ:۱۵)

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِيْ لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِيْنٌ. لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيّاً وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (یٰسٓ:۶۹،۷۰)

تِلْکَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ (یوسف:۱)

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِن رَّبِّکَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ. (الرعد:۱۹)

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد:۲۴)

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْکَ مُبَارَکٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ. (ص:۲۹) أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْکَ مِن رَّبِّکَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ. (الرعد:۱۹)

شاید ہے یہ واضح کتاب، ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا تا کہ تم سمجھو اور بے شک یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے نہایت اعلیٰ و پر حکمت۔

ہم نے قرآن کو مناسب و موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا۔

اسی طرح ہم نے تم پر وحی کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کی شکل میں، تم نہ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے یہ تو ایک یاد دہانی ہے اور قرآن مبین تا کہ وہ زندہ دل لوگوں کو ڈرانے اور کافروں پر اتمام حجت ہو۔

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل چڑھے ہیں۔

ہم نے تم پر ایک بابرکت کتاب اتاری ہے تا کہ وہ اس کی آیت پر غور کریں۔

اب ہم بالترتیب مذکورہ آیات کے ان پہلوؤں کی طرف انتہائی ایجاز کے ساتھ اشارہ کریں گے جن سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ خود قرآن میں بہت سی ایسی آیات ہیں جو قرآن میں نظم و ربط کے ہونے پر دور یا قریب سے دلالت کرتی ہیں۔

(۱) پہلے گروپ کی آیات میں قرآن اور اس کی آیت کو حکیم کہا گیا ہے یعنی وہ آیات جو حکمت و بصیرت کے نکات سے بھری ہوئی ہیں، پہلی آیت میں قرآن کو بلند مرتبہ و اعلیٰ کلام سے اسی بنا پر تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے رفیع الشان ہونے کا راز اس کی حکیمانہ شان میں مضمر ہے۔[۱۴۱] اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی اسے ایک حکمت و بصیرت پر مبنی کلام کہا گیا ہے، اس سے دو باتوں کا ثبوت ملتا ہے (الف) جو کلام حکمت و دانائی سے بھرا ہوا ہو وہ ایک اعلیٰ اور عمیق کلام ہونے کے ساتھ ایک مربوط و منظّم کلام بھی ہوتا ہے (یا اسے ہونا چاہیے) کبھی غیر مربوط باتوں کے مجموعہ کو کتاب حکیم نہیں کہا جا سکتا اور (ب) حکمت کی صفت سے متصف کلام اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ ساتھ گہرا اور مشکل بھی ہوتا ہے، اس کی باتیں جامع اور کثیر الجہات ہوتی ہیں نیز باریک اشارات پر مبنی

ہوتی ہیں، ایسے کلام کو سمجھنے کے لیے تدبر و تعمق کی ضرورت ہوتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن خود اپنے اوپر تدبر و تفکر کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، قرآن کا ایک حصہ وہ ہے جس کا نظم بالکل ظاہر و واضح ہے لیکن بیشتر مقامات پر غور کرنے کے بعد ہی یہ واضح ہوتا ہے کہ کہاں کیا بات کس سیاق کلام میں فرمائی گئی ہے یا فلاں آیت کا فلاں آیت سے کس نوعیت کا تعلق ہے، آگے کی آیات سے اس کا کیا ربط ہے اور پیچھے کے اجزاء سے وہ کس طور پر مربوط ہے، ظاہر ہے یہ تمام امور غور و فکر کرنے کے بعد ہی واضح ہوتے ہیں اور قرآن چونکہ ایک اعلیٰ و عظیم کلام ہے، وہ خود ''حکیم'' ہے اور حکیم و علیم ذات کی طرف منسوب ہے اس لیے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کا نظم غور و فکر کے بغیر ہی کسی پر عیاں ہو جائے گا تو یہ اس کی غلط فہمی ہے بلکہ جس طرح ہر اعلیٰ کلام تدبر کا تقاضا کرتا ہے اور ایک خاص محنت و جستجو کے بعد ہی اس کا مقصود اور اس کی ہر بات کا موقع و محل سمجھ میں آتا ہے وہی حال قرآن کریم کا ہے وہ حکیم ہے اسی لیے وہ ایک غیر مربوط کلام نہیں ہوسکتا اور اس کی تمام حکمت اس کے اجزاء کے باہمی نظم و ربط کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں جس تک پہنچنے کے لیے غور و تدبر کی منزل سے گذرنا اور کلام کے باہمی روابط کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔[۴۲]

سورۂ زخرف آیت نمبر۲ میں قرآن کو علیم و حکیم کہنے سے پہلے ''مبین'' کہا گیا ہے اس لفظ کو بھی کتاب اللہ کی ایک صفت کے طور سے بار بار بیان کیا گیا ہے۔ یہاں نحوی و بلاغتی لحاظ سے غور کرنے کا پہلو یہ ہے کہ قرآن کے ''کتاب مبین'' ہونے کو جواب قسم کی جائے قسم بنایا گیا ہے۔ اور قرآن کا ''قرآن عربی'' ہونا اور اس کا ایک اعلیٰ و ارفع اور حکیمانہ کلام ہونا جواب قسم کے طور سے بیان ہوا ہے، گویا قرآن کا مبین ہونا ایک ایسی مسلم حقیقت ہے کہ خود منکرین وحی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ایسی منھ بولتی حقیقت تھی[۴۳] کہ اسے خود شاہد بنایا گیا ہے اور اس سے انکار کا مطلب تھا دن کی روشنی میں سورج کا انکار۔ قرآن کا ''مبین'' یا ''عربی مبین'' کی خصوصیت سے آراستہ ہونا ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اعجاز ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے مطالب کو کس طرح ترتیب دیا گیا ہے اور اس کے تمام اجزاء اور کلمات کو کس طرح باہم مربوط کیا گیا ہے کہ اس کے سامنے ہر عقل

ششدر اور ہر ادب حیران ہو جاتا ہے؟ کوئی دوسرا روز مرہ کے مستعمل ان عربی الفاظ و کلمات کا سہارا لے کر اس جیسا ''کلام مبین'' پیش کرنے سے کیوں عاجز ہے؟ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ الفاظ و کلمات تو یقیناً دستیاب ہوں گے لیکن اس کے اندر وہ نظم و ترتیب کہاں سے آئے گی جو کلام الٰہی کا خاصہ ہے؟۔ دراصل انہی سوالات کا جواب ہمیں نظام القرآن کی غیر معمولی اہمیت و افادیت کے اعتراف اور پھر اس کی تحقیق کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس کے ذریعہ شک کا ازالہ بھی ممکن ہے جو کلام اللہ کے منزل من اللہ ہونے کے تعلق سے منکرین قرآن کے اندر پایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے اس کے کلام مبین ہونے کو شاہد بنا کر انھیں غور کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے (**لعلکم تعقلون**) تاکہ وہ نظم و ترتیب کے لحاظ سے ایک واضح (مبین) اور مبرہن کلام پر غور کر کے خود اس حقیقت کو پالیں کہ یہ کسی انسان کا نہیں بلکہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے۔ امام فراہیؒ اس آیت کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''**فبین أن المقصود أن تعقلون فلذلک جعلناه عربیا و کتابا واضحاً**''[۴۴] ثابت ہوا کہ قرآن کو کلام واضح بنانے والے اس کے ظاہری و باطنی نظم پر جتنا زیادہ غور کیا جائے گا اس کے کلام الٰہی ہونے کے دلیل ہم پر اتنی زیادہ واضح ہوگی۔

(۲) دوسرے گروپ کی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی یاد دہانی کے لیے کافی اہتمام کے ساتھ اتارا ہے اور اسے سازگار و موزوں بنایا ہے اور یہ بھی فرمادیا کہ اس نے اپنے کلام میں کوئی ٹیڑھ یا غموض نہیں رکھا کہ پڑھنے والوں کو اس کی باتیں بالکل بے سر و پا اور عقل و خرد سے یکسر ماوراء نظر آئیں نیز انہیں (غور و فکر کے بعد بھی) اس میں کوئی معقولیت نہ دکھائی دے، (**ولم یجعل له عوجا**) ان آیات سے یہ مفہوم نکالنا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک منظّم، مربوط اور متوازن کلام قرار دیا ہے شاید کسی لحاظ سے بے جا اور بے محل نہ ہوگا کیوں کہ جس کلام میں کوئی ٹیڑھ نہ ہو اور جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے سازگار و موزوں بنایا گیا ہو اسے معنوی لحاظ سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ منظّم و مرتب کلام ہونا چاہیے اور بلاشبہ قرآن ایسا ہی ہے جس کے

استدلالات کی منطقی ترتیب اور مطالب کے باہمی نظم سے اس کے اندر ایسی تاثیر پیدا ہوئی ہے جو کسی اور کلام میں ہمیں نظر نہیں آتی اور اس پر غور کرنے والوں کو اس کی کوئی بات چیستاں یا عقدۂ لاینحل محسوس نہیں ہوتی۔

(۳) تیسرے گروپ کی آیات میں قرآن کو "روحامن امرنا" کہا گیا ہے یعنی قرآن ایک ایسی چیز ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے خصوصی اہتمام کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ کتاب ان کے لیے ایک مصدر حیات کا درجہ رکھتی ہے۔

"روحا من امرنا" کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب کشافؒ نے بڑی جامع بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یرید ما أوحی إلیه لأن الخلق یحیون به فی دینهم کما یحیی الجسد بالروح۔[۴۵]

اس سے آپؐ پر نازل کی جانے والی وحی مراد ہے کہ خلق خدا اسی کے سہارے دین حق پر زندہ رہتی ہے جس طرح جسم روح کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔

جس کلام کو ایک عظیم ہستی کی طرف سے خصوصی اہتمام کے ساتھ مکمل کیا گیا ہو اس میں نظم و ترتیب کی کمیاں رہ جائیں یہ ناقابل فہم ہے۔ پھر وہ "مبین" بھی ہے یعنی بالکل واضح و مبرہن، روشن اور رواں کلام،[۴۶] اور وہ "نور" بھی ہے (**نور نهدی به من نشاء**) یعنی جو [illegible] اپنے آپ میں ایک روشنی ہے بلکہ دو[illegible] کو بھی روشنی دکھانے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآن کی یہ دونوں صفات بھی [illegible] ایک منظّم کلام ثابت کرتی ہے اس لیے کہ روشنی کا کام ہے لوگوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھنا اور اس کی طرف ان کی برابر رہنمائی کرنا نہ یہ کہ انھیں ٹیڑھی ٹیڑھی لیکروں پر بھٹکتا چھوڑ دینا، اسی لیے جب قرآن کو "نور" کہا گیا تو اس کے فوراً بعد اس کا مقصد بھی واضح کر دیا "**نهدی به من نشاء من عبادنا**" مطلب یہ ہے کہ وہ عام انسانی کلام کی طرح ایک کلام نہیں بلکہ ایک نور ہے اور اس کا نور ہونا خود اس کے کتاب مبین ہونے پر دال ہے۔ یعنی ایک واضح و موزوں اور مسلسل و مرتب کتاب، (نہ کہ غیر واضح اور غیر مرتب کتاب) "تم لوگوں کو روشنی اور ایک واضح کتاب دی

گئی ہے۔" (سورہ مائدہ/۱۵) سورۂ مائدہ آیات ۱۳-۱۶ کے مجموعے کے نظم پر غور کیجیے تو قرآن کے نورِ ہدایت ہونے کی معنویت اور زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے جس میں سب سے پہلے کلام الٰہی میں اہل کتاب کی تحریفات کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں خدا نے انھیں باہمی منافرت و عداوت اور بغض و اختلاف کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ جب کہ اس کے بالمقابل قرآن کو نور، کتاب مبین، تاریکیوں سے نکالنے والا، امن وسلامتی (سبل السلٰم)، روشنی اور راہ راست (صراط مستقیم) کی طرف لے جانے والا ہے۔ کیا اس میں اس بات کی طرف نظم کلام کا واضح اشارہ نہیں ہے کہ اہل کتاب نے (یہود و نصاری) تحریف کلمات کے ذریعہ کلام الٰہی کے نظم و ترتیب میں خلل ڈال کر نہ صرف مقاصدِ کتاب کے ایک بڑے حصے سے خود کو محروم کر لیا (فنسو حظا مما ذکروا به) بلکہ اس کے نتیجے میں جدال و قتال اور اختلاف و عداوت کا بھی شکار ہو گئے۔ لیکن قرآن کا نظم پوری طرح محفوظ ہے اس لیے وہ قیامت تک خلق خدا کے لیے نور ہدایت اور اب صرف وہی صراط مستقیم کی ضمانت ہے۔

(۴) چوتھے گروپ کی آیات میں بھی اوپر ہی کی بات ثابت کی گی ہے اور اس میں اس واضح کتاب کا یہ مقصد بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ زندہ و بیدار روحوں کے لیے ایک تنبیہ، منکرین و کفار پر حجت قاطع کا درجہ رکھتی ہے ظاہر ہے کوئی کلام یا کوئی بات کسی پر حجت اسی وقت بن سکتی ہے جب وہ اپنے موقع و محل کے لحاظ سے ان کے لیے قابل فہم ہو، اس میں کوئی بات غیر واضح اور بے جوڑ نہ نظر آئے۔ اور نہ کوئی استدلال یا مثال سیاق کلام کے برعکس ہو۔ "القرآن یهدی للتی هی اقوم" میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۵) پانچویں گروپ کی آیات میں خاص طور سے لوگوں کو قرآن پر غور خوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ سورہ ص میں تو اس کے انزال کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ لوگ اس کے اوپر غور کریں اور اس پر تدبر و تفکر کی نگاہ ڈالیں اور دوسری آیات میں کفار و منکرین کے تعلق سے سوال کر کے کہ کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے" اس کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا گیا۔ شاید قرآن دنیا کی وہ پہلی کتاب ہے جو اس شدت

کے ساتھ اپنے مخاطبین کو اپنے اوپر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب پانے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ قرآن ہی نہیں بلکہ ہر کلام کا لازمہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا ہے اور کچھ مشکل و مخفی، پہلا حصہ اگر آدمی کے اندر کسی قسم کی کجی یا ناپختگی نہ ہو تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن دوسرا حصہ تدبر و تعمق چاہتا ہے اور لاریب یہ تدبر سیاق کلام، لفظ و معنی کی مناسبت اور مختلف و متنوع امور یا اجزاء کے باہمی نظم و ارتباط سے زیادہ اور کسی پہلو پر نہیں ہو سکتا، انھیں پہلوؤں پر غور کرنے سے وہ پیغام ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے جو متکلم ہم تک پہنچانا چاہتا ہے، اسی لیے جو لوگ قرآن کا مقصد و مفہوم نہیں سمجھ پاتے یا نہیں سمجھنا چاہتے اور اس سے کچھ اور مطلب نکالتے ہیں قرآن انھیں اندھا اور بے عقل جیسے الفاظ سے یاد کرتا ہے (ھو اعمی) اور ان کے مقابلے میں جو لوگ قرآن سے حکمت و بصیرت حاصل کرتے ہیں اور اس پر غور کر کے نور ہدایت پا لیتے ہیں وہ انہیں ارباب عقل و بصیرت کا لقب دیتا ہے (وما یتذکر الا اولوا الالباب) علامہ ابن الزبیر ثقفی تدبر کی دعوت دینے والی قرآن کریم کی ان آیات کے حوالے سے کان رکھنے کے باوجود اس کی صدائے جرس نہ سن پانے والوں کو اندھوں اور بہروں کی صف میں کھڑا کرتے ہیں اور دونوں کو عقل و بصیرت سے بے بہرہ قرار دیتے ہیں۔[۴۷]

اور عبدالحمید فراہیؒ بھی "نظام الکلام و روابط معانی الآیات" کی بحث کا اصل مقصد قرآن کے معنی و مفہوم پر (اس کے تقاضے کے مطابق) غور و فکر کرنا ہی قرار دیتے ہیں۔[۴۸]

ترتیب و توضیح کا خدائی وعدہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں رسول اکرم ﷺ اور امت مسلمہ سے قرآن کریم کی جمع و تدوین اور اس کی ترتیب و انضباط کا جو وعدہ کیا ہے اس میں بھی نظم القرآن کی طرف صاف اشارہ ہے، اس طرح کی آیات میں مجموعی لحاظ سے آپ ﷺ کے لیے تسلی و تسکین کا

پہلو غالب ہے۔ اور آپؐ سے صریح لفظوں میں یہ وعدہ ہے کہ قرآن کے باب میں آپ کو کسی خوف واندیشہ میں مبتلا ہونے یا کسی قسم کی جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کتاب کی حفاظت اور اس کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کی جمع وترتیب کی ذمہ داری اللہ رب العزت پر ہے جو اس کا نازل کرنے والا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حسب وعدہ آخر میں انتہائی مکمل ومرتب شکل میں حضرت جبرئیل کے ذریعہ رسول خاتم علیہ صلی اللہ کو سونپ دی گئی یہاں تک کہ اس میں نظم وترتیب تو دور کی بات ہے کسی حرف اور نقطے وغیرہ کی بھی کوئی کمی بیشی باقی نہیں رکھی گئی۔ درجہ ذیل آیت اپنے اس مفہوم میں بہت واضح ہے۔

''اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دے کہ تاکہ تو اسے جلد حاصل کرلے، ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا پس ہم جب اس کو سنادیں تو اسی کی اس طرح تو پیروی کر جس طرح وہ پیش کیا جائے، ہمارے ذمہ ہے اس کی تفصیل وتوضیح''۔ ۴۹؎

اسی مفہوم کی دیگر آیات سورہ اعلیٰ (آیات: ۶-۱۰) سورہ حم سجدہ (آیات: ۴۰-۴۲) سو حجر (آیت ۹) اور سورہ طہٰ (آیات: ۱۱۴-۱۱۵) میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ آغاز رسالت میں قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا جاتا تھا اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ کسی چیز کو یکبارگی پورا کردینا یا تمام چیزوں کو کسی کے حوالے کردینا قرین مصلحت نہیں ہے بلکہ اسے ضرورت اور عین تقاضے کے مطابق وقفہ وقفہ سے تھوڑا تھوڑا پورا کرنا یا کسی کے حوالے کرنا تعلیم وتربیت کے پہلو سے انتہائی مفید ہے۔ نزول قرآن میں بھی تدریج کا یہی اصول کارفرما تھا، شروع میں قرآن اور رسولؐ کے خلاف مخالفتوں کا زور بھی زیادہ تھا اور فراہیؒ کے بقول کلام الٰہی کے سننے کے لیے ان کی صلاحیتیں بھی خام تھیں اور دلوں میں کوئی آمادگی نہیں تھی۔ اس حالت میں حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن کو بالتدریج نازل کیا جائے لیکن یہی امر آپؐ کے موجب تشویش بن جاتا اور مختلف وجوہات سے آپ چاہتے کہ قرآن آپ پر جلدی جلدی نازل کیا جائے تاکہ لوگوں تک خدا کا پورا پورا پیغام پہنچا دیا جائے، اور اس کے ذریعہ معترضین کو ساکت کردیا جائے۔ بعض اوقات آپکی یہ طلب اور آرزو اتنی بے تاب ہو جاتی کہ نزول وحی کے وقت آپ آیات

کو اپنی زبان سے دہرانے لگتے کہ کہیں کوئی چیز یاد ہونے سے نہ رہ جائے اسی کو کہا گیا ہے" لاتحرک به لسانک لتعجل به" آپ کی اس کیفیت پر لسان غیب سے ٹوکا گیا اور ٹوکنے کے ساتھ اسے محفوظ کرنے کا ہی نہیں بلکہ اسے مرتب و مربوط شکل میں محفوظ کر دینے کا آپ سے وعدہ کیا گیا۔ مرتب و محفوظ کرنے کا یہ وعدہ مذکورہ آیات میں واضح طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ۵۰

اسی طرح سورہ فرقان میں بھی قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت و مصلحت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کفار قریش کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ آخر حضرت محمد ﷺ پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں نازل کر دیا جاتا۔ آیات ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا. وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا۔ (الفرقان/۳۲-۳۳)

(ان کافروں نے کہا اس کے اوپر پورا قرآن ایک ہی بار کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ یہ ایسا ہی ہے تاکہ اس سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کے نزول میں تدریج واہتمام برتا ہے اور وہ جو شوسہ بھی ہمارے سامنے اٹھائیں گے ہم اس کے جواب میں حق بات اور بہترین تفسیر و تاویل سے تمھیں نوازیں گے۔)

وہاں خاص طور سے اس کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو رسول کے لیے تثبیت قلب (اطمینان قلب) اور دوسرے کلام منزل کی بہترین تاویل و تفسیر، دوسرے لفظوں میں ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نزول وحی میں تدریج و ترتیل کے اصول پر عمل کرنے کی حکمت و مصلحت تو بیان ہی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ سے بہترین تفسیر و تاویل کا وعدہ فرمایا ہے، یہ وہی پہلو ہے جسے اوپر والی آیت میں "ان علینا بیانہ" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا بہترین تاویل و تفسیر کسی ایسے کلام کی بھی ممکن ہے جس کے اجزاء باہم مربوط و منظّم نہ ہوں، بلکہ تفسیر فی الواقع نظم کلام کی اساس کی تعمیر و تشکیل کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہاں ظاہری تالیف و ترکیب بلکہ کلام کی معنوی

ربط و ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے تاکہ اس کے اجزا کی باہمی ترتیب سے وہی معنی مراد لیا جائے جس پر وہ دلالت کرتے ہیں۔ یہ حسن تفسیر کلام کے داخلی نظام کو اتنا مستحکم کر دیتا ہے کہ اس کے خلاف ہر قسم کے اعتراضات اور موشگافیاں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کیوں کہ حسن تفسیر میں جب کہ صاحب کشاف نے بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے، اعتراضات کا صحیح جواب بھی ہوتا ہے اور مقصود کلام کی بہتر توضیح بھی۔ ۵۱ اس سے جہاں نبی خاتم ﷺ کو اطمینان قلب ہوا وہیں معترضین پر یہ واضح ہو گیا کہ نظم و تالیف کی ٹھوس بنیاد کی وجہ سے اس کلام پر انگلی اٹھانا آسان نہیں ہے۔ اس طرح ان کے ہر اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا اپنے کلام کو بہترین تفسیر و توضیح سے آراستہ کرنا فی الواقع نظام القرآن کی اساس کو مضبوط تر کرنے کی وہی خدائی تدبیر اور وعدہ الٰہی کی تکمیل کا حسن اہتمام ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ (انِ علینا جمعه وقرآنه ...... ثم ان علینا بیانه) میں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم کے تدریجی نزول کے دو بنیادی مقاصد تھے (۱) نبیؐ کے دل کو مضبوط و مطمئن کرنا (لنثبت به فؤادک)۔ (۲) (القرآن یفسر بعضه بعضا) کے بطور اس کے مطالب کی ایسی تفسیر و تاویل جس میں ہر طرح کے اعتراضات و شبہات کا مسکت جواب ہو (جئناک بالحق واحسن تفسیرا) اس دوسری مصلحت میں نظم قرآن کی حکمت بھی پنہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نے جو پورے قرآن میں بار بار یہ فرمایا ہے کہ ''ہم اسی طرح اپنی آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں'' یا یہ کہ قرآن میں مختلف باتوں کو بار بار بیان کیا گیا ہے، (کتابا متشابها مثانی) تو اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ عالم الغیب نے صرف نزول قرآن کا ہی نہیں بلکہ تفسیر قرآن کا بھی اہتمام فرمایا۔ اور اسی غرض سے اس نے تدریج کا اصول برتا، تاکہ تفسیر و تفہیم میں آسانی ہو، اس کی ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے، اور اسی طرح ایک سورہ کا مضمون کسی دوسری سورہ کے مضمون کی توضیح و تاویل کرتا ہے یا ایک مقام کا کلام دوسرے مقام کے کلام کے فہم و مطالعہ میں ہماری مدد کرتا ہے، ہمیں پورے قرآن میں یہی طرز بیان ملتا ہے اور اس کی اس حیثیت کو تسلیم کیے بغیر اس سے کما حقہ استفادہ ممکن نہیں۔ اگر اسی بات کو منطقی طور سے واضح کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ (نزول

قرآن میں) تدریج کا ایک مقصد تفسیر ہے۔۵۲ اور کسی کلام کی بہترین تفسیر اس کے مختلف حصوں میں نظم قائم کیے بغیر ممکن نہیں اس لیے قرآن کی نظم و ترتیب بھی تدریج کی مصالح و اسباب میں داخل ہے۔

وہ مصنفین جو ترتیب قرآن کو توقیفی مانتے ہیں یعنی یہ کہ قرآن کریم اللہ کی ہدایت کے مطابق رسولؐ کی نگرانی میں ہی اپنی موجودہ شکل میں مرتب کر دیا گیا تھا، وہ اس آیت کو اپنی رائے کے حق میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے جب موجودہ قرآن اللہ کی ہدایات کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے تو اس کے ترتیب و شیرازہ بندی کے تمام فطری تقاضوں کو یقیناً ملحوظ رکھا گیا ہوگا اس لیے کہ جب صورتِ حال یہ ہے کہ متکلم نے خود اپنے کلام کو ایک خاص نہج پر مرتب کیا ہے اور اس میں نزولی ترتیب کی کوئی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ سیاق و کلام اور مضامین کے اقتضا کو سامنے رکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ترتیب سور کے بارے میں ایک دو مقامات پر بعض جزوی اختلاف کے باوجود علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہے۔۵۳

جو سورتیں پہلے نازل ہوئی تھیں وہ ترتیب میں عموماً موخر ہیں (جیسے مکی سورتیں) اور جو بعد میں نازل ہوئیں وہ پہلے رکھی گئی ہیں۔ (جیسے مدنی سورتیں) تو پھر اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے اجزاء میں مضامین و معانی کے لحاظ سے نظم و ربط کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔ اس وجہ سے قائلین نظم، نظم اور ترتیب دونوں لحاظ سے اسے ایک کلام معجز مانتے ہیں، کیوں کہ نظم کی اہمیت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پوری طرح توقیفی ہے، نظم مقصود نہ ہوتا تو اس الٹ پھیر کی ضرورت کیا تھی؟۵۴

قرآن کی توقیفی ترتیب ان اہم محرکات میں شامل ہیں جن کی وجہ سے امام فراہیؒ علم نظام القرآن کی طرف متوجہ ہوئے۔۵۵

یہ ایک فطری بات ہے کہ جب تک ہم یہ نہ تسلیم کریں کہ اسے معنوی لحاظ سے مخصوص حالات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس میں معنوی نظم و ربط تلاش کرنا کارِ عبث ہوگا، اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ وہ معانی و مطالب کے لحاظ سے اللہ اور اس کے

رسول کی ہدایات کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے، اسے منظم ومربوط کتاب نہ ماننا اس کی ترتیب کے تقاضوں کونظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ہم خورشید کے وجود کوتو تسلیم کریں لیکن اس سے پھوٹنے والی شعاعوں کے بارے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوں کہ اس کا تعلق خورشید مبین سے ہی ہے۔

الغرض مذکورہ آیات اور اس قسم کی دیگر آیات جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو محفوظ کرنے اور بہتر طریقے پر اس کی جمع وترتیب کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اس بات کی شاہد ہیں کہ قرآن میں نظم وترتیب کا غایت درجہ خیال رکھا گیا ہے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ ان آیات (آیتِ تحرک) میں جہاں اللہ نے جمع وترتیب کا وعدہ کیا ہے وہیں رسول کریم ﷺ کو بھی یہ تاکید کی ہے کہ جب ہم اسے سنادیں تو اس کی پیروی اس کے سنانے کے طریقے پر کرو(**فاذا قراناه فاتبع قرآنه**) اس کا مطلب ہے کہ آپؐ امت کو اسی ترتیب سے قرآن سنائیں جس ترتیب سے یہ آپ کو اپنی آخری شکل میں سنایا جائے، یہ بات تھوڑے سے غور کے بعد بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر قرآن میں نظم وترتیب کی اہمیت نہ ہوتی تو اس خصوصی ہدایت کی کیا ضرورت تھی۔[۵۶] اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ ''اتباع'' نہ صرف انحراف بلکہ ہر قسم کے تغیر وتحریف اور اجتہاد کی ضد ہے۔ پھر اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جمع و ترتیب کے بعد بہت سی ایسی باتوں کی توضیح وتفصیل بھی کردی گئی جن کا کلام کسی وجہ سے تقاضا کرتا ہے[۵۷]۔(**ثم ان علينا بيانه**) اگر کلام الٰہی میں نظم وترتیب کی کوئی رعایت نہ رکھی جاتی تو پھر اس توضیحی آیت کی کیا ضرورت تھی؟

قرآن کے علاوہ احادیث سے بھی یہی ثابت ہے کہ نزول وحی مکمل ہوجانے کے بعد حسب وعدہ اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ مرتب کرواکر اسے آں حضرت ﷺ کو سونپ دیا، چنانچہ روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت جبرئیل نے کئی بار آپ کے سامنے پورا قرآن دہرایا ہے اور رمضان میں تو اس کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔[۵۹]

ترتیب قرآن کے تعلق سے قرآن کی اس توضیح سے نظم قرآن کے ایک معروف نکتہ داں کے نزدیک ''نظام قرآن کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوجاتی ہیں''[۶۰]

اس حکمت ترتیب وبیان پر شیخ ولی الدین ملویؒ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لیے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف وقتوں میں متفرق واقعات کے تحت نازل ہوئی ہیں وہ غلط کہتے ہیں، حق یہ ہے کہ وہ نزولی طور پر تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے نقطۂ نظر سے وہ بالکل مطابق حکمت ہیں''۔۶۱

نظم کی بعض علامات:

قرآنی آیات اور پوری کتاب پر غور کرنے سے بعض ایسی علامتیں بھی ہم کو نظر آتی ہیں جن سے نظم قرآن کا سراغ ملتا ہے۔ یہ علامتیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ذہن خود بخود اس مفید علم اور اہم حقیقت کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔

(۱) ان میں سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی خاص موضوع پر اپنا کلام مکمل کر لیتا ہے یا اس کا بیشتر حصہ نبیؐ پر وحی کیا جا چکا ہوتا ہے یا اس میں اس کی طرف سے بعد میں کوئی اضافہ و توضیح ہوتی ہے تو اس کے آس پاس وہ اس طرف اشارہ بھی کر دیتا ہے۔اس کے اس پہلو کی طرف خود ''سورہ قیامہ میں ''ان علینا بیانہ'' کی شکل میں اشارہ کیا گیا ہے۔اس قسم کی توضیحی و تشریحی آیات کے بعد قرآن عموماً ''کذلک یبین اللہ آیاته للناس'' ۶۲۔ جیسے الفاظ کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیات کو خاص موقع و محل کو سامنے رکھ کر از راہ توضیح بعد میں بیان کیا ہے۶۳، چنانچہ احادیث وسنت کی کتابوں میں یہ تفصیل موجود ہے کہ جب بھی توضیحی آیات نازل ہوتیں تو یا تو آپ انھیں پہلے سے نازل ہونے والی ان آیات کے ساتھ مربوط کر دیتے جن سے وہ معنوی طور سے ہم آہنگ ہوتیں، یا ان کی توضیح و تشریح کر رہی ہوتیں یا پھر انھیں کسی سورہ کے آخر میں مرتب کروا دیتے ۶۴، ظاہر ہے آیات کا نزول اور ان کی ترتیب و توضیح کا یہ اہتمام

بلاوجہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے نظم کلام کی بنیادی مصلحت کارفرما تھی۔

(۲) قرآن میں تصریف آیات کا اسلوب بھی اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ قرآن کو بامقصد طریقے سے مرتب و منظّم کیا گیا ہے۔ تصریف آیات سے ہماری مراد ہے قرآن میں تکرار کا وہ مخصوص اسلوب جس کی وجہ سے ایک ہی بات یا واقعے کو مختلف مقامات پر مختلف انداز میں مختلف مقاصد کے لیے بیان کیا جاتا ہے۔ ''کذلک نصرف الآیات للناس''۔ ایک جگہ ایک بات بہت تفصیل سے ہوتی ہے تو دوسری جگہ اس کا ذکر کسی دوسری بات کے ذیل محض اشارتاً ہوتا ہے، کبھی وہ بات مقدم ہو جاتی ہے اور کبھی موخر، کبھی وہ ایک جگہ بالکل مخفی و مبہم نکتے کی شکل میں ہوتی ہے، تو دوسری جگہ اسے بالکل بے نقاب کر دیا جاتا ہے، یہ اسلوب اسی وقت اپنایا جاتا ہے جب کلام میں ایک خاص ترتیب اور معنوی نظم ملحوظ ہو، ان امور واقعات کو جو بار بار بیان ہوتے ہیں، اگر سیاق کلام اور نظم کی روشنی میں نہ سمجھا جائے تو وہ ہمارے لیے تکرار محض بن کر رہ جائیں [۶۵]، لیکن ایسا نہیں ہے اگر مختلف مسائل کے تکرار واعادہ کے پیچھے کوئی معقول وجہ نہ ہوتی تو پھر قرآن اپنی اس خوبی کا اعلان خود ڈنکے کی چوٹ پر کیوں کرتا ''اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے یعنی ایک ایسی کتاب جس کے اجزاء باہم دگر مشابہ و مماثل ہیں اور بار بار کثرت سے بیان کی گئی ہے''۔ قرآن میں جا بجا بعض مطالب واقعات اور موضوعات کی تکرار اس کے غیر منطقی ربط کا مظہر نہیں بلکہ اس کے داخلی نظام کی ایک علامت ہے لیکن اگر ہم قرآنی اجزائے کلام کے باہمی نظم و ربط کو نظر انداز کر کے مواقع تکرار کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جیسا کہ مستشرقین کا رویہ ہے، قرآن کا منطقی ربط ہماری ظاہر بین نظروں کو ''غیر منطقی'' دکھائی دے گا اور اس کا ایک بڑا امتیاز ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے علماء و شارحین نظم قرآن نے تکرار کے ان مقامات پر ہمیں انتہائی سنجیدگی سے اور نظم کلام کی روشنی میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ [۶۶] اس طرح قرآن میں

''تصریف آیات'' کے طرز بیان میں نظم کلام کی طرف ایک مخفی اشارہ موجود ہے۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ قرآن میں بہت سی ایسی منفرد آیات ہیں کہ انہیں دوسری آیات سے الگ کر کے سمجھنا تو دور کی بات ہے خود ان کے اندر اتنا غموض وخفاء ہوتا ہے کہ انھیں آیات وسور کے آپسی نظم کے بغیر سمجھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، اسی کو طب کی اصطلاح میں علاج بالمثل (Like Cures Like) کہتے ہیں یعنی ظاہراً وہ چیز جسے ہم بعض علامتوں کی بنیاد پر مرض کا حقیقی سبب متعین کرتے ہیں اسی میں اس مخصوص مرض کا علاج بھی مضمر ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ باتیں جو ہمیں نظم کی ضد دکھائی دیتی ہیں انھیں علامتوں کی مدد سے نظم قرآن کا اثبات ہوتا ہے، کیوں کہ قرآن میں اس قسم کی آیات بہت ہیں جو ظاہراً معنوی لحاظ سے سلسلہ کلام سے منقطع دکھائی دیتی ہیں، لیکن اس سے متعلق سابقہ ولاحقہ آیات پر غور کرنے سے اس کا فطری نظم غور وفکر کرنے والوں پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ اور علماء ومفسرین نے ان کا نظم بڑی عمدگی سے واضح کر دیا ہے۔ نظم آیت اور دیگر اقسام نظم مباحث میں ہم نے اس قسم کی بہت سی مثالیں جمع کی ہیں، تاہم یہاں بعض آیات کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کیا ان کا مفہوم قریبی آیات کے مجموعی نظم کی رعایت کے بغیر متعین کرنا ممکن ہے؟

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَٰنُ فِي أُمْنِيَّتِهِ۔ ٦٧

اس آیت کو سیاق وسباق کی رو سے نہ دیکھا جائے تو اس کا جو لفظی معنی سامنے آئے گا وہ یہی کہ تمام انبیاء کی آرزوں میں (نعوذ باللہ) شیطانی آرزوں کی آمیزش تھی جو ظاہر ہے بالکل لغویات ہوگی۔ ٦٨

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَٰثَ وَرُبَٰعَ ۔(سورہ نساء/۳)

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کرسکو گے تو عورتوں میں سے جو تمھیں بھائیں دو دو، تین تین، چار چار۔ ان سے نکاح کرلو۔

اگر کوئی حافظ قرآن کھڑا ہوکر کسی جگہ اس آیت کی تلاوت کردے تو سیاق کلام سے نابلد لوگ شاید یہ سمجھ لیں کہ اس میں یتیم سے متعلق کسی مسئلے میں الجھے ہوئے کسی فرد کے لیے ٹینشن دور کرنے کا قرآنی نسخہ تجویز ہوا ہے یا پھر زیادہ جری لوگ کلام الٰہی پر بے ربطی کا الزام لگادیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں یتیموں کی ماؤں سے شادی کرکے مسلمانوں کو ان کی سماجی و معاشی دستگیری پر ابھارا گیا ہے۔

يَـا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ۔ (المائدہ/۱)

ایمان والو اپنے عہد و پیمان پورے کرو، تمہارے لیے جانوروں کی قسم کے تمام چوپائے حلال قرار دیے گئے ہیں سوائے ان کے جن کے بابت تمھیں بتایا جارہا ہے۔

آخر ایفائے عہد اور خدا کے ساتھ کیے گئے وعدوں کی تکمیل کی یاد دہانی اور جانوروں کی حلت وحرمت کی تفصیل میں کیا جوڑ ہے؟ اس قسم کی آیات اس بات کی علامت ہیں کہ قرآن کو اس کے کلام کے داخلی نظم کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔

(۴) چوتھی علامت یہ ہے کہ قرآن کو چھوٹی بڑی مختلف سورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے، سورہ کا لفظ خود قرآن نے استعمال کیا ہے اور سورہ کے آغاز میں عموماً کچھ ایسے الفاظ ہوتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سے کسی نئی فصل کا آغاز ہورہا ہے۔ جیسے ”ذلک الکتاب، تلک آیات، تنزیل الکتاب من اللہ، تلک الآیات الکتاب الحکیم، کتاب انزل الیک“ وغیرہ۔ کبھی کبھی سورہ کی ابتدا بطور یاددہانی خود قرآن یا سورہ کے لفظ سے ہوتی ہے [۶۹]۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی نظم وترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو پھر اس تقسیم کی کیا ضرورت تھی؟ اور بقول فراہیؒ ”سارے قرآن کو ایک سورہ بنادیا جاتا“ [۷۰] اور سورتیں بھی یکساں مقدار کی نہیں ہیں بلکہ کچھ چھوٹی ہیں اور کچھ بڑی، یہ بھی اس

بات کی علامت ہے کہ کلام اللہ کی ترتیب میں مختلف تقاضے اور مصلحتیں پیش نظر ہیں جو ہم سے تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتی ہیں، جس طرح ہر آیت کا سیاق وسباق کے لحاظ سے ایک خاص مقصد و مطلب ہے اسی طرح ہر سورہ کا ایک اندرونی نظام ہے اور اس کا ایک مخصوص موضوع و مقصد ہوتا ہے، جس کے گرد پوری سورہ گردش کرتی ہے، اور اِس مقصد کا فہم اس سورہ کے پورے نظام کے فہم پر منحصر ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین سلف نے سورہ کی معنوی وحدت کی وجہ سے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ ''سورہ کی حد قرآن کی اتنی تعداد ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو، اور جس میں تمہید و خاتمہ ہو اور اس کی کم سے کم تعداد تین آیت ہے''[۱]۔ چنانچہ علامہ زرکشیؒ نے قرآن کی ہر سورہ میں موجود نظمی وحدت کو نظم قرآن کے حق میں ایک بڑی دلیل کے طور سے پیش کیا ہے[۲]۔ (وفی ذالک حجة لمن تتبع الآیات بالمناسبات)

اس طرح قرآن میں تقسیم سور کا نظام نظم قرآن کی بہت بڑی شہادت ہے۔

(۵) قرآن میں فواصل کی رعایت بھی اس کے اندرونی نظم کی طرف ایک اشارہ ہے جیسا کہ آپ اکثر طویل سورتوں میں دیکھتے ہیں۔

(۶) اس کی ایک علامت آیات ترجیع بھی ہیں۔ یعنی وہ آیات جنھیں بعض سورتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے، جیسے سورہ رحمٰن کی آیت ''آلاء'' اور سورہ مرسلات کی آیت ''ویل'' اور سورہ قمر کی آیت ''یسرنا'' وغیرہ۔ کسی بھی طویل کلام میں کسی ایک بات کا بار بار اعادہ اس بات کی واضح شہادت ہوتا ہے کہ اس کے اجزاء از اول تا آخر ایک دوسرے سے مربوط و متعلق ہیں، وہ سب ایک ہی مقصد کی تکمیل کرتے ہیں، جس کی یاد دہانی کے لیے کسی مخصوص جملہ کو بار بار مخاطب کے سامنے دہرایا جاتا ہے[۳]۔ قرآن میں بھی ترجیع و اعادہ کا یہی مقصد ہے۔

(۷) اس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ قرآن میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن کا نظم دو، دو چار کی طرح ظاہر ہے[۴]۔ وہ عموماً حروف عاطفہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے متصل ہوتی ہیں، یا پھر کسی اور ذریعہ سے ان کا اتصال ظاہر ہوتا ہے جیسے بعض

سماجی امور سے متعلق اس کا مسلسل کلام یا قصص انبیاء اور اقوام ماضی کے احوال کے بارے میں اس کی تفصیلات جو بغیر کسی انفصال و انقطاع کے مسلسل بیان ہوتی چلی جاتی ہیں، اس طرح قرآن کے بعض حصوں کا ظاہری نظم اسکے مخفی نظم کی تحقیق ودریافت کی ہمیں دعوت دیتا ہے، یا پھر وہ تحقیق وجستجو کی ایک بڑی وجہ بنتا ہے۔غور کیا جائے تو اس راہ میں ہمارا سب سے بڑا مددگار خود قرآن ہے۔ اس لیے کہ وہ نظم کا اولین اور سب سے بڑا ماخذ صرف اسی لحاظ سے نہیں ہے کہ اس میں نظم کے حق میں براہ راست یا بالواسطہ طور سے بہت سے دلائل و براہین اور علامتیں (یا نشان ہائے راہ) موجود ہیں، بلکہ وہ اس اعتبار سے بھی نظم قرآن کا سب سے بڑا ماخذ ہے کہ قرآن اپنی تفسیر وتاویل میں خارجی ذرائع کا بہت زیادہ محتاج نہیں ہے بلکہ وہ اس امر میں بڑی حد تک خود کفیل ہے، وہ اپنے منطوق و مدلول کی خود ہی وضاحت کرتا ہے اور اس کے بعض حصے بعض کی تاویل کرتے ہیں، اسی کو مفسرین ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کہتے ہیں۔بیشتر علماء نے بغیر کسی دلیل و برہان کے اور بلالحاظ مقتضائے کلام مجرد ذاتی رائے کی بنیاد پر تفسیر قرآن کو ممنوع قرار دیا ہے[۵]، لیکن اس استثناء کے ساتھ کہ ایسا اسی وقت ہوگا جب وہ مجرد رائے کی بنیاد پر ہو، اور اگر اس میں قرآن وسنت کے مدلولات ومقتضایات کو ملحوظ رکھا گیا ہو تو وہ جائز ہے، بلکہ بعض علماءِ تفسیر وشارحین نظمِ قرآن کے نزدیک تو تفسیر بالرأی اگر تفسیر القرآن بالقرآن پر مبنی ہو تو وہ مستحسن ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک تفسیر کی یہ قسم سب سے بہتر ہے۔ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''فان قال قائل فی أحسن طرق التفسیر فالجواب : ان اصح الطرق فی ذلک ان یفسر القرآن بالقرآن، فما اجمل فی مکان فانه قد فسر فی موضع آخر واختصر فی مکان فقد بسط فی موضع آخر۔''[۶]

(اگر کوئی یہ پوچھے کہ تفسیر کا طریقہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس میں سب سے زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کے ذریعہ کی جائے۔پس اس میں جو

چیز مجمل ہے، اس کی دوسری جگہ تفسیر وتوضیح کردی گئی ہے اور جو بات ایک جگہ مختصر ہے اسے دوسری جگہ تفصیل سے بیان کردیا گیا ہے۔)

علامہ زرکشیؒ نے اس کے حق میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں ابن عباسؓ کے حق میں آں حضورﷺ نے فہم قرآن اور تاویل قرآن کی خصوصی دعا فرمائی ہے۔ ۷۷

ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظم قرآن کا سب سے بڑا اور اولین ماخذ خود قرآن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن کا حق ادا کرنے کے لیے کلام کے مواقع و مدلولات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو تفسیر بالرائی کی اجازت دینے والوں کے نزدیک اس کی اولین شرائط میں سے ہے۔ اور یہ ایک منطقی و بدیہی بات ہے کہ ان مدلولات کا استدراک کسی کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ کلام کے سیاق وسباق، اس کے اسالیب، بنیادی موضوعات، ان کے باطنی تعلق اور مقصود خطاب سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ اور یہ تمام باتیں نظم کلام کا ہی حصہ ہیں۔ مختصر یہ کہ نظم قرآن کی رعایت کے بغیر تفسیر القرآن بالقرآن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔☆

(۲) رسولﷺ کا عمل

مذکورہ بالا تفصیلات اس مآخذ سے متعلق تھیں جو کسی نہ کسی شکل میں خود قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے نزدیک نظم قرآن کا سب سے بڑا اور سب سے مستند ماخذ یہی ہے اس لیے کہ یہ خود اسی کلام سے ماخوذ ہے، جس کے نظم پر ہم بحث کررہے ہیں۔ اس کے بعد اس ذات کا طرز عمل ہمارے لیے دلیل راہ ہے جن کے اوپر یہ عظیم کتاب نازل کی گئی۔ متفق علیہ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ جب کوئی آیت یا آیات نازل ہوتیں تو حضرت محمدﷺ کاتبین وحی کو حکم دیتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں مرتب کی جائے یا فلاں آیت کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھا جائے ۸ے۔ اسی طرح رمضان میں خاص طور سے حضرت جبریلؑ آپ کو پورا قرآن سناتے اور آخری رمضان میں تو، جیسا کہ روایت سے

ثابت ہے، آپ کو پورا قرآن دوبارہ سنایا گیا۔ روایات میں یہ بھی ہے کہ جب کوئی سورہ مکمل ہوجاتی تو حضرت جبریلؑ آپ کو ازسرنو پوری سورہ سنادیتے تاکہ وہ قطعی شکل میں آپ کے سامنے آجائے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبریلؑ آپؐ کے پاس آکر فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں کے پہلو میں رکھ دیں۔ ۹ ؎

یہ روایات جس طرح اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن کریم آں حضرت ﷺ کی زندگی میں اور خاص طور سے آپ کی نگرانی میں مرتب ہوا ہے، اسی طرح یہ اس بات کی بھی واضح شہادت ہیں کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک مسلسل اور مربوط کلام ہے، اور اس کی ہر آیت اور ہر سورہ کی ترتیب حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ چنانچہ جو لوگ قرآن کو "احسن الترتیب" کہتے ہیں وہ گویا اسے خواہی نہ خواہی "احسن النظام" بھی مانتے ہیں اس لیے کہ بہترین ربط کے بغیر بہترین ترتیب ممکن نہیں۔

روایات سے ثابت ہے کہ خود آں حضرت ﷺ بعض سورتوں کو ایک دوسرے سے ملا کر نماز میں تلاوت کرتے تھے اور ان کے اقوال میں بھی سورتوں کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ ملتا ہے جیسے سورہ بقرہ و سورہ آل عمران کے تعلق سے یہ کہنا کہ یہ سورتیں قیامت کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی یا انھیں دو رکعتوں میں ایک دوسرے کے بعد پڑھنے کا التزام کرنا یا پھر جمعہ کے روز سورۃ الجمعہ اور منافقون کو دونوں رکعتوں میں ترتیب سے پڑھنے کا اہتمام کرنا، تاکہ پہلی سے مسلمانوں کو تشفی ہو اور دوسری سے اہل نفاق کو تنبیہ۔ ۱۰ ؎ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن آپ کو ایک مربوط کتاب کی حیثیت سے سونپا گیا تھا، اور آپ نے اسے مرتب بھی اسی لحاظ سے کروایا تھا۔

(۳) صحابہ کرام و اسلاف کا عمل:

نظم کا ایک بڑا ماخذ صحابہ کرام اور تابعین سے منقول وہ آثار ہیں جنھیں ایک جگہ جمع کیا جائے تو بقول ایک نکتہ داں کے کم و بیش پورے قرآن کی ایک مبسوط تفسیر تیار ہوجائے۔ اہل کفر پر تو قرآن نے یہ الزام لگایا ہے کہ ان دلوں پر قفل چڑھے ہوئے ہیں،

اس لیے وہ قرآن پر غور وفکر نہیں کرتے (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا) (محمد/۲۴)۔ لیکن کتب تاریخ وحدیث میں اس بات پر بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ صحابہ کرام قرآن پر برابر غور وفکر کرتے تھے، جس سے ان کے ایمان کو تازگی ملتی تھی اور وہ اہل کفر کی چالوں کے خلاف صحیح حکمت عملی اپنانے کی تربیت بھی اسی سے حاصل کرتے تھے۔ ان کے یہاں درس قرآن اور تدبر قرآن کے باقاعدہ حلقے قائم تھے، وہ ایک دوسرے سے قرآن کے معانی ومفاہیم بے تکلف دریافت کرتے، جہاں کسی کو جو چیز کھٹکتی وہ اپنے سے زیادہ جاننے والے سے اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگاتا ۸۱۔ بعض صحابہ تو قرآن میں تدبر و تفکر کے سلسلے میں بہت معروف تھے جیسے عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ۔ ان سے فہم قرآن سے تعلق رکھنے والی روایات کثرت سے منقول ہیں، اور تفاسیر کی کتابیں ان کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں ۸۲۔ یہ وہ شخصیات ہیں جنھیں قرآنی آیات کے فہم وتدبر کے میدان میں مرجع کی حیثیت حاصل تھی، خود حضرت عمرؓ کے تعلق سے احادیث وآثار کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ان صحابہ کی ازحد ہمت افزائی کرتے تھے جو قرآن کو اپنے غور وفکر کا موضوع بناتے تھے، آپؓ نے خاص طور سے عبداللہ بن عباسؓ کی حوصلہ افزائی جس انداز سے فرمائی ہے اس میں قرآن کے طالب علموں کے لیے بڑی کشش ہے۔ ۸۳

جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں غور وفکر کرتے تھے اور ایک دوسرے کے علم وفہم سے استفادہ کرتے تھے، اسی طرح جب انھیں قرآن کے معنی ومطلب کی گرہ کشائی میں کوئی دقت پیش آتی تو فوراً آں حضرت ﷺ سے رجوع فرماتے۔ اور بلاشبہ ''رسول کریم ﷺ قرآن کے اولین شارح وترجمان تھے'' ۸۴۔ آپ نے صرف الفاظ وحی نہیں بلکہ ان کے معانی بھی بیان کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ ۸۵

قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا تھا، یہ انھیں لوگوں کی زبان تھی جو اس کے اولین مخاطب تھے۔ اس کے باوجود بعض صحابہ کا اس میں مہارت حاصل کرنا، مطالب قرآن کو ایک دوسرے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرنا اور آں حضور ﷺ سے مختلف آیات کا موقع و

محل اور سیاق وسباق معلوم کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن ایک مرتب ومربوط کلام ہے، اور نظم وارتباط اس کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔ کہیں وہ ظاہر ہے اور کہیں بعض وجوہ سے مخفی، اس مخفی نظم کو سمجھ کر آیات وسور کے حقیقی مقاصد ومطالب کی معرفت حاصل کرنے کے لیے تدبر وتفکر کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس تدبر وتفکر کی ضرورت سے صحابہ کرام بھی غافل نہیں تھے، جن کی زبان میں اور جن کے زمانے میں اس کتاب کی ایک ایک آیت کا نزول ہوا اور جن کے درمیان خود رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس موجود تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ کلام اللہ ایک گہرا سمندر ہے جس میں متعدد و متنوع امور سموئے ہوئے ہیں اور انھیں نظم کلام اور سیاق کلام کی مدد سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ نیچے دی گئی بعض مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بظاہر سادہ وعام فہم نظر آنے والی آیات کے مفہوم اور اس کے نظم پر بھی کس انہماک ودلچسپی سے غور کرتے تھے۔

تاریخ وحدیث کی کتابوں میں تفصیل ہے کہ جب درجہ ذیل آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو اس میں لفظ ''ظلم'' کے سمجھنے میں الجھن پیش آئی اور انھوں نے رسول ﷺ سے اس کا معنی دریافت کیا۔

''الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ''۔ (الانعام/۸۲)

(جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا ان کے لیے امن وعافیت ہے۔)

صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ بھلا کون ایسا شخص ہے جو اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا تو آپ نے اس کا جواب دیا کہ یہاں ظلم سے شرک مراد ہے۔ اور اس پر ''ان الشرک لظلم عظیم'' (لقمان/۱۳) (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) سے استدلال کیا[۸۷]۔ اگر صحابہ کرام میں نظم کلام کے لحاظ سے قرآن پر غور کرنے کی عادت نہ ہوتی تو پھر بظاہر یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان خادمین قرآن کی فہم وعقل سے ماورا ہو، لیکن کسی بھی کلام کا داخلی نظم ایسی چیز ہے جو کبھی کبھی بڑے سے بڑے سخن فہموں کو بھی الجھن میں ڈال دیتا ہے،

لیکن غور کرنے پر جب پردہ ہٹتا ہے تو وہی چیز بالکل سامنے کی منہ بولتی حقیقت بن جاتی ہے، آپ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ مذکورہ آیت میں ظلم کا اصل مفہوم ایک تو رسول کریم ﷺ نے صحابہ کو اس آیت کی مدد سے سمجھایا جو اوپر مذکور ہے، اور دوسرے نظم کلام بھی اس مفہوم کا تقاضا کرتا ہے، یہ آیت دراصل اس مجموعۂ آیات کا حصہ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کو اپنی قوم کے ساتھ اثبات توحید ونفیِ شرک کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ٹھیک اس سے پہلے کی دو آیات میں حضرت ابراہیمؑ شرک کا ابطال کرتے ہیں، اور ان پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ جب خدا کے ساتھ شرک کرتے ہوئے تم لوگ اس جبار وقہار ذات سے نہیں ڈرتے تو پھر میں تم سے یا تمہارے جھوٹے معبودوں سے کیوں ڈرنے لگا۔ وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ تم خود فیصلہ کرو کہ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے امن وراحت کا حق دار کون ہے اور خوف کسے لاحق ہونا چاہیے؟ ۸۸ اور پھر مذکورہ آیت میں اس بات کا وہ مثبت طریقے سے جواب دیتے ہیں کہ امن کے حق دار تو وہ اہل ایمان ہیں جن کا ایمان شرک کی گندگی سے داغدار نہ ہو، نہ کہ اہل شرک جو شب وروز غضب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح آپؐ نے "لم یلبسوا ایمانھم بظلم" کا جو مفہوم صحابہ کرام کو بتایا وہ نظم کلام کے عین مطابق ہے۔ ۸۹

اسی قسم کا وہ واقعہ بھی ہے جو عدی بن حاتمؓ کے ساتھ پیش آیا کہ ان کو سیاق کلام سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے "خیط ابیض" اور "خیط اسود" (**حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر**) کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوئی، ہوا کہ یہ انھوں نے اسے صبح کی علامت سمجھنے کی بجائے اصلی دھاگا سمجھ لیا تھا جب آں حضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے انھیں آیت کے اصل مفہوم سے واقف کیا۔ ۹۰

عبداللہ بن مسعودؓ سے بہت سی تفسیری روایات منقول ہیں انھوں نے سورہ فاتحہ کی آیت "**اھدنا الصراط المستقیم**" میں "**الصراط المستقیم**" کا معنی قرآن بتایا ۹۱۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسی کتاب ہدایت کے تعلق سے دعا ہے جس کا تعارف سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت "**ذلک الکتاب لاریب فیه**" سے کرایا گیا ہے۔ ۹۲ عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ سورہ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، کو "عتاق اول" کہتے تھے ۹۳،

بقول زرکشیؒ اس میں سورتوں کی توقیفی ترتیب کے ساتھ ساتھ ان کے معنوی ربط کی طرف بھی اشارہ ہے ۹۴۔ ابن عباسؓ حوامیم کو 'لباب القرآن' اور ابن مسعودؓ سے آل حم (یعنی وہ سورتیں جن کا آغاز ان حروف مقطعات سے ہوا ہے) کو دیباچہ قرآن (دیباج القرآن) کہا کرتے تھے ۹۵۔ اس کی ایک مثال ترجمان القرآن عبداللہ بن عباسؓ سے منقولہ ....وہ روایت بھی ہے جس میں حضرت عثمانؓ سے آپ کے اس استفسار کی تفصیل ہے کہ انھوں نے خلیفہ ثالث سے پوچھا کہ آخر سورہ انفال اور سورہ براۃ کے درمیان (سورہ توبہ پر) بسم اللہ کا کلمہ کیوں نہیں لکھا گیا حضرت عثمانؓ نے اس کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ کا دستور تھا کہ جب آپ پر کلام اللہ کا کچھ حصہ نازل ہوتا تو کاتبین وحی کو طلب کر کے انھیں مخصوص سورتوں میں اور مخصوص مقامات پر لکھنے کی ہدایت کرتے، انفال ان مدنی سورتوں میں سے ہے جو شروع میں نازل ہوئیں اور سورۃ التوبہ اواخر تنزیل میں سے ہے، اس کے نازل ہونے کے بعد ہم لوگ اسے لکھ نہیں سکے تھے کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ چونکہ اس کا مضمون سورہ انفال سے ملتا جلتا ہے، اس لیے اس کے پہلو میں اسے مرتب کر دیا گیا، اور ان کے درمیان بسم اللہ کے ذریعہ فصل نہیں رکھا گیا ۹۶۔ ناقدین حدیث نے اس حدیث پر مختلف پہلوؤں سے سوال اٹھایا ہے، ایک یہ کہ اس کے راوی یزید الفارسی کو انھوں نے ضعیف قرار دیا ہے اور اسے ضعیف روایات میں شمار کیا ہے، اور دوسرے یہ کہ ایک دوسری روایت اس سے متناقض ہے جس میں ابن عباسؓ کا یہ قول بھی جڑا ہوا ہے کہ یہ دونوں سورتیں عہد رسالت سے ہی آپس میں متصل ہیں ۹۷۔ بہر حال اس حدیث کے استناد پر بحث فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمیں جس پہلو پر زور دینا ہے وہ یہ کہ صحابہ کرام قرآن کی ایک ایک آیت اور اس کے ایک ایک لفظ پر ٹھہر کر غور کرتے تھے اور آیات کو اس کے نظم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس طرح کی بے شمار روایات ہیں جو اس بات پر شاہد ہیں کہ صحابہ کرام قرآن کریم کے نظم اور فحوائے کلام پر برابر غور کرتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے علم سے دوسروں کو بھی مستفید کرتے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یقیناً ان تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں تھی، جو فہم

قرآن کے تعلق سے وہ ظاہر کرتے تھے۔ان کی ان تمام مساعیٔ جمیلہ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو ایک مربوط و منظّم کتاب تصور کر کے اس پر مسلسل غور وفکر کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ خاص صحابہ کرام خصوصاً اہل قریش پر قرآن کے تمام کلمات معنی و مطلب کے لحاظ سے واضح تھے جیسا کہ امام فراہیؒ کا خیال ہے،لیکن کلمات و نظم کلمات میں فرق ہے۔ اور صحابہ کرام کلمات کی بجائے نظام کلام پر غور کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے کے علاوہ خود آں حضورﷺ سے بھی رہنمائی حاصل کرتے تھے اس لیے کہ کتاب وحکمت تعلیم آپ کے فرائض میں داخل تھی۔

ان بنیادی مآخذ کے علاوہ نظم قرآن کا ایک بڑا ماخذ تفسیر وعلوم قرآنی پر مشتمل اسلاف کی وہ بے مثال کوششیں ہیں جو اس راہ کے ہر مسافر کی رہنمائی کرتی ہیں اور اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ اس میدان کے بعض ممتاز علماء و محققین کی خدمات اور کارناموں کا مطالعہ کرنے والوں نے ان کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔انھیں دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس سلسلے میں ان کی خدمات بے مثال اور ان کی کوششیں ہر لحاظ سے تحسین کی مستحق ہیں۔

نظم قرآن کے اصول اور تقاضے

دیگر علوم کی طرح علم نظم کے بھی کچھ اصول اور تقاضے ہیں جن کی پابندی کے بغیر تحقیق و تجزیہ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ اس کے اصول وضوابط بالکل مرتب شکل میں ہنوز ہمارے سامنے نہیں آسکے،تاہم اس پر متعلقہ تصنیفات و تفاسیر میں جو مواد دستیاب ہیں ان کی بنیاد پر نظم قرآن کے بعض بنیادی اصول اور تقاضوں کو ہم یہاں مختصراً پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

نظم قرآن کی طرح اصول نظم کی بھی بڑی اہمیت ہے،جس طرح قرآن کی آیات وسور کے حقیقی مقصود سے آگاہ ہونے کے لیے اس کے داخلی نظم پر غور کرنا ضروری ہے، اسی طرح تحقیق نظم کا اصل مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ اصول اور طریقوں کو ملحوظ رکھنا

ضروری ہے، اس کے بغیر نظم کلام کی تلاش وتحقیق میں ہم نہ تو پوری طرح کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ ہی قرآن کی تاویل وتفسیر میں اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہمارے لیے ممکن رہے گا۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح نظم کلام، کلام کا ایک حصہ ہوتا ہے اسی طرح اصول نظم بھی نظم کا ناگزیر حصہ ہیں اور نظام کلام کو صحیح خطوط پر قائم رکھنے کے لیے ان اصولوں کو برتنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس کا بہت اندیشہ ہے کہ خود ''نظم'' میں بے نظمی پیدا ہو جائے۔

نظم قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک نظم کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک آیت کے مختلف اجزاء یا دو آیات یا آیتوں کے مختلف مجموعوں کے درمیان ربط کی نوعیت کیا ہے ان اجزاء کے بیچ ربط پیدا کرنے والا جو مفہوم ہے وہ عام و خاص کا ہے یا اجمال وتفصیل کا، یا پھر ان کے درمیان سبب ومسبب کا تعلق ہے یا ابہام وایضاح کا، نیز ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کلام کا نتیجہ ہے یا تمہید، اسی طرح ان کے درمیان نظم کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ہم پر ظاہر نہ ہو، ایسی شکل میں دیکھنا ہوگا کہ اجزاء کے درمیان تعلق کی بنیاد کیا ہے، یعنی وہاں تضاد، تقابل، انتقال معنی یا اعتراض اور العود علی البدء وغیرہ کا کوئی اسلوب تو نہیں مضمر ہے، مزید ہم اس پر بھی نظر رکھیں کہ اجزا کے درمیان جزوی نوعیت کا تعلق ہے یا کلی طور سے۔[۹۸]

نظم کی تلاش میں تدریج وترتیب کا لحاظ

اگر قرآن ایک کلمۂ واحدہ اور ایک کتاب منظّم ہے تو پھر اس کے نظام پر غور کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم سب سے پہلے کلام عرب اور خود قرآن (نظائر) کی روشنی میں اس کے معنی کا تعین اس لحاظ سے کریں کہ وہ سیاق کلام سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اس لیے کہ انھیں الفاظ کے باہمی ارتباط سے کلمات اور جملے ڈھلتے ہیں، نظم قرآن پر غور کرنے کا سب سے پہلا اور بنیادی مرحلہ یہی ہے کہ اگر ہم یہاں ذرا بھی چوکے تو ''تا ثریا میرود دیوار کج'' کی نوبت پیدا ہو سکتی ہے، اسی لیے شارحین نظم اس سلسلے میں الفاظ کی تحقیق کو از حد اہمیت دیتے ہیں۔[۹۸]

مختلف حروف سے بنے الفاظ پر غور کرنے کے بعد ان کلمات کو دیکھنا پڑتا ہے جن سے چھوٹے بڑے جملے بنتے ہیں پھر ان جملوں پر غور کرنے کی باری آتی ہے، جن سے آیات اور آیات کے مختلف مجموعے ترتیب پاتے ہیں پھر سورہ کے مقدمات کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ سورہ کے مقصد اور اس کے درمیانی واختتامی حصوں سے کس طرح کا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح سورہ میں بیان کیے گئے کلام کے مختلف اجزاء یا آیت کے مختلف مجموعوں اور ان میں بیان کیے گئے بنیادی احکام وہدیات پر ان کے تمام تر داخلی رشتوں کے ساتھ تدبر وتحقیق کی نظر ڈالی جاتی ہے، اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ سورہ کے مقصد سے ان کا تعلق بنیادی ہے، یا فروعی، اس ترتیب و تدریج کے ساتھ غور کرنے پر پوری سورہ اپنے تمام ظاہری اور مخفی پہلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ کسی سورہ کے اندرونی نظام کو سمجھ لینے کے بعد یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ سورہ کا ربط اس کے قریبی (سابق ولاحق) سورتوں کے ساتھ کن بنیادوں پر استوار ہے اور آخر میں سورتوں کے مختلف مجموعوں پر از اول تا آخر گہرائی کے ساتھ نظر ڈالنی پڑتی ہے، جن سے پوری کتاب الٰہی صورت پذیر ہوتی ہے۔ نظم قرآن کے مجموعی نظم پر غور کرنے کا یہی فطری طریقہ ہے جسے اختیار کر کے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں ورنہ یہ عین ممکن ہے کہ ہم بھاری بھرکم دعووں کے باوجود اس سلسلے میں علمی نکتہ سنجیوں سے آگے نہ بڑھ پائیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نے نظم پر غور کرنے کا وہی طریقہ اپنایا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔99

امام ملویؒ اصول نظم کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

''آیتوں کے درمیان نظم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ وہ آیتیں ماقبل کی تکملہ تو نہیں ہیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے آپ میں مفہوم ومعنی کے لحاظ سے مستقل تو نہیں ہیں، پھر اگر وہ مستقل ہیں تو یہ دیکھنا ہوگا کہ ماقبل سے ان کا کس قسم کا تعلق ہے، یہ ایک عظیم علم ہے۔ یہی طریقہ سورتوں درمیان ربط ومناسبت تلاش کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جائے گا''۔100

امام بقاعیؒ اپنے شیخ ابوالقاسم محمد مشدالی مغربی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تمام

قرآن میں آیتوں کی مناسبت جاننے کے لیے مفید و جامع ضابطہ یہ ہے کہ تم اس مقصد کو دیکھو جس کے لیے سورہ لائی گئی ہے، اور یہ بھی دیکھو کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کن مقدمات کی ضرورت ہے اور اس پر بھی نگاہ رکھو کہ مطلوب کے ساتھ قرب و بعد میں ان مقدمات کی حیثیت کیا ہے نیز یہ بھی دیکھو کہ ان مقدمات کو بیان کرنے کے بعد سامع کے ذہن کو ان مفاہیم و ارشادات سے قریب لانے میں کہاں تک مدد ملتی ہے جن کا فحوائے کلام تقاضا کرتا ہے''۔۱۰۱

ان کا مزید کہنا ہے کہ یہی اہم ترین قاعدہ کلیہ ہے، جس کا اطلاق تمام اجزائے قرآنی کے نظم پر ہوتا ہے، اگر تم اسے اختیار کرو گے تو تمہارے سامنے پورے قرآن کا، یعنی ہر آیت کا دوسری آیت سے اور ہر سورہ کا دوسری سورہ سے نظم وربط واضح و مبرہن ہوتا چلا جائے گا۔۱۰۲

نظم قرآن کے میدان میں امام فراہیؒ کو دیگر امتیازات کی طرح یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار اپنی مختلف کتابوں، خصوصاً اپنی کتاب دلائل النظام اور تفسیر نظام القرآن میں اس علم کے اصول و شرائط اور اس کے رموز و غوامض کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے جس سے اس کی اہمیت و افادیت مزید اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے، وہ اپنی کتاب دلائل النظام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''یہ فطری امر ہے کہ انتفاع بالقرآن فہم قرآن پر موقوف ہے، اور کسی کلام کو سمجھنا ناممکن ہے جب تک کہ ہم اس کے اجزاء کی باہمی ترکیب و مناسبت کو نہ سمجھ لیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ محض اجزاء کے ظاہری معانی سے واقف ہونا بھی کافی نہیں جب تک کہ ہم اس کے ہمہ پہلو ربط و ترکیب سے آگاہ نہ ہوں، اور یہ سب اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ پہلے بالا جمال کلام کے اندرونی روابط اور اس کے مختلف گوشوں شے واقفیت حاصل کریں اور دوسرے مرحلے میں ربط کے مواقع سے آشنا ہوں اور پھر تیسرے مرحلے میں ان کے استعمالات کے مواقع سے واقفیت حاصل کر کے ربط و نظم کے مختلف وجوہ کو جانیں اور سمجھیں''۔۱...... ربط کے ان اصولوں کی اہمیت ان کے نزدیک کس قدر ہے اس کا اندازہ ان کے درج الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے: 'جو ربط کے ان پہلوؤں اور وجوہ کو سمجھنے میں ناکام رہا وہ کلام اللہ میں پوشیدہ علم و حکمت کے جواہر پاروں سے بہرہ ور نہیں ہو پاتا''۔۱۰۳

بعض اہم اصول

امام فراہیؒ نے اپنی کتاب دلائل النظام میں مختلف مقامات پر اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ قرآن میں موجود حقیقت نظم کی نقاب کشائی کے لیے کن اصول وضوابط کو اختیار کرنا پڑتا ہے، اور کس راستے پر چل کر اس تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو اہم معلومات وتحقیقات فراہم کی ہیں ان پر تفصیلی جائزے کا مقام تو ان سے متعلق بحث ہے تاہم موضوع کی مناسبت سے بعض پہلوؤں کا ذکر یہاں مفید رہے گا۔

ان کے خیال میں قرآن کا معاملہ کائنات کی دیگر اشیاء اور مختلف علوم کی طرح ہے جن کے تمام رموز وفوائد اچانک ہی نوع انسانی پر ظاہر نہیں ہو جاتے، بلکہ یہ دولت گراں بہا بہت سے مشکل مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ قرآن کی تمام آیات اپنے آپ میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں کیوں کہ وہ ایک نور مبین ہے لیکن وہیں وہ تدبر وتفکر کا بھی طالب ہے۔ ان کے نزدیک ہر علم کے کچھ پہلو معلوم ہوتے ہیں اور کچھ مجہول، بایں طور مقصد ومدعا تک پہونچنے کے لیے تدریج کے ساتھ معلوم سے مجہول گوشوں کی طرف بڑھنا پڑتا ہے۔ قرآن کا ظاہر اس کے باطن کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس طرح ہم غور وتدبر کے نتیجے میں دھیرے دھیرے اس کے اصل معنی ومفہوم تک پہنچ جاتے ہیں، اس عمل میں نہ تو کلمات کو ان کے محل سے ہٹانے کی ضرورت پیش آتی اور نہ ہی کتاب الٰہی کے ظاہری معنی ومفہوم کے خلاف تاویل کرنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ بلکہ اس پورے عمل میں نظم قرآن کے اصول ایک کلیہ کا کام کرتے ہیں جو ہمیں ظاہر سے باطن کی منزل تک خود بخود پہنچا دیتے ہیں۔[۱۰۵]

ان کے نزدیک جس طرح کلام الٰہی کے ظاہری وباطنی پہلو ہیں اسی طرح نظم یا نظام کے بھی ''ظواہر وبواطن'' ہوتے ہیں، یوں اس کے ظواہر سے اس کے مخفی وباطنی پہلوؤں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور ''سب سے پہلی چیز جو ہمیں جستجوئے نظم کی طرف...... کرتی ہے وہ ہے قرآن میں صفات الٰہی کا بیان جن میں نظم کے بے شمار اصول مضمر ہیں،

جیسے تعلیل، استدلال اور استدراک وغیرہ جو اس ذیل میں بطور خاص قابل ذکر ہیں"۔۱۰۶

ان کے نزدیک اصول نظم کی نشان دہی کے لیے اسالیب کلام، جیسے حذف، مجاز، بدل، اعتراض والتفات وغیرہ۔ اور کلام کے اجزائے ترکیبی جیسے عمود، تمہید، منہج اور خاتمہ وغیرہ کا بھی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ انھیں اجزاء کے باہمی ارتباط سے ایک مؤثر ودلکش کلام ابھر کر سامنے آتا ہے اور ہر سورہ ایک وحدت کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔۱۰۷

اسی طرح وہ نظم کلام کی حقیقت جاننے کے لیے "عمود"۱۰۸ یعنی مقصود کلام کی معرفت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں، کیوں کہ نظم کلام کی اصل بنیاد وہی ہوتا ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ازحد غور وتدبر، نظم کلام پر گرفت، اجزائے کلام کا شعور اور کلام کے مختلف حصوں کے مطالب کے احاطہ کی ضرورت پیش آتی ہے جسے پورا کیے بغیر نہ تو آیات وسور کا مفہوم متعین ہوگا اور نہ ہی اصل موضوع کلام تک رسائی ممکن ہوگی۔

مولانا فراہیؒ اس تصویر پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"اسے خوب سمجھ لیجیے کہ نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر سورہ کی اپنی ایک مخصوص شناخت ہو، بے شک جب سورہ کے مضامین ومطالب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں گے اور وہ سب ایک عمود کی طرف رواں دواں ہوں، یہاں تک کہ پورا کلام مجموعی لحاظ سے ایک وحدت میں ڈھل جائے تو اس وقت وہ یقیناً ہمیں ایک متعین تشخص کے ساتھ نظر آئے گی، جب آپ کلام الٰہی کا اس پہلو سے مطالعہ کریں گے تو اس میں ایک خاص قسم کا حسن، استحکام اور صریح البیانی نظر آئے گی"۔۱۰۹

اصول نظم میں سب سے بڑا درجہ نظائر کو حاصل ہے جس طرح سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ کلام الٰہی کا بعض حصہ بعض کی تاویل کرتا ہے اسی طرح قرآن کے مختلف اجزاء میں موجود ربط ونظم کو جاننے کے لیے مختلف نظائر اور مثالوں کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے، نیز دیکھنا پڑتا ہے کہ ایک امر ایک جگہ کس طرح بیان ہوا ہے اور اسے دوسری جگہ پیش کرنے کا اصل مقصد کیا ہے، اس نہج پر غور کرنے سے ربط کلام کی شکلیں خود بخود سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔

بسا اوقات آیتوں کے مابین ربط کی کیفیت معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا مگر طویل

غور وخوض اور آیتوں اور سورتوں کے معانی ومطالب کا جائزہ لینے سے ربط کا حسین چہرہ ہویدا ہوجاتا ہے۔ مضامین قرآن میں کہیں تقدیم ہے کہیں تاخیر کہیں ایجاز ہے کہیں اطناب، کسی چیز کا بیان ایک بار ہوتا ہے اور کسی کا تکرار کے ساتھ، امثال وقصص بھی حسب موقع کبھی اجمال کے ساتھ اور کبھی تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں، ان سب کی الگ الگ وجہیں ہیں اور ہر اسلوب کے پیچھے بے شمار اسرار ورموز ہیں جو نظم کلام کی مدد سے ہم پر منکشف ہوسکتے ہیں۔۱۱۰ ان تمام مواقع کی معنویت وبلاغت آیات وسور کے باہمی ربط پر غور کرنے سے ہی ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح قرآن میں قسم و جواب قسم سوال اور اس کے جواب، ترغیب وترہیب کے مواقع بیان، تمثیل اور تمثیل بہ کے درمیان پائے جانے والے ربط وتعلق کی باریکیوں پر غور کرنے سے بھی نظم کی حکمتیں سامنے آتی ہیں۔۱۱۱

اس سے قطع نظر کہ معاملہ ایک آیت کے الفاظ وکلمات کے درمیان ربط کا ہے، یا آیات کے باہمی ربط کا، یا ایک سورہ کے مختلف حصوں کے باہمی ربط کا، جس سے پوری سورہ متحد ویک رنگ نظر آتی ہے، یا پھر ایک سورہ کا دوسری سے، یا بعض کا بعض سے نظم کا معاملہ ہو، ہر جگہ یہی اصول اور ضابطے اختیار کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کے مجموعی نظم تک پہنچ جائیں جس سے پورے قرآن کی معنوی وحدت اس طرح عیاں ہوجائے کہ وہ تدبر کرنے والوں کو کلمۂ واحدہ نظر آنے لگے۔ آگے کی سطروں میں مختصراً نظم کے اسی پہلو کا ذکر ہے کہ نظام القرآن کی حتمی منزل یہی ہے۔

لیکن نظم کی حتمی واعلیٰ ترین قسموں (۱) سور قرآنی کا مجموعی نظم (مجموعہ ہائے سور میں) اور (۲) قرآنی احکام وشرائع میں نظم پر گفتگو سے پہلے ہم نظم کی مختلف قسموں کا ہم یہاں موقع کی مناسبت سے ایک سرسری تذکرہ کرنا پسند کریں گے۔

پچھلے مباحث اور علمائے نظم کی افادات سے نظم کا مفہوم ومعنی اور نظم کی مختلف شکلیں ہم پر واضح ہوتی ہیں۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات وسور میں نظم کی نوعیت کیا ہے، اس کے ماننے یا نہ ماننے سے فہم قرآن میں کیا فرق آتا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی علم ہوتا ہے ہر سورہ کا اپنا ایک تشخص اور مرکزی موضوع ہوتا ہے جس کی طرف سورہ

کے تمام مضامین مربوط و متحد شکل میں رواں دواں رہتے ہیں اور جس کی بنا پر سورہ کی معنوی وحدت قائم رہتی ہے، نیز مضامین و مطالب میں تنوع کے باوجود پوری سورہ از اول تا آخر اپنے مرکزی موضوع کی تابع رہتی ہے، ان سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر سورہ کا اپنی قریبی سورہ سے کسی نہ کسی قسم کا ربط و تعلق ہوتا ہے اور ان کے درمیان وجہ اتصال سمجھنے سے ہی ان کے بنیادی و مرکزی موضوعات اور مقاصدِ کلام کا سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔[۱۱۲] ہر دو سورتوں کا باہمی ربط سے ایک ایسا خط زریں وجود میں آتا ہے جس پر چل کر تمام سورتیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے جڑتی چلی جاتی ہیں۔ دونوں کلی یا جزوی طور سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں اور مفہوم و معنی کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو متحد المعنی سورتوں کے درمیان ایک یا ایک سے زائد سورتیں جملۂ معترضہ کے طور سے وارد ہو جاتی ہیں، اس صورت حال میں دو متصل سورتوں کا نظم تلاش کرنے کے لیے دور و نزدیک کی دوسری سورتوں پر غور کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ متعلقہ سورہ موضوع کے لحاظ سے کس سورہ سے ربط رکھتی ہے۔[۱۱۳] اس کے بعد نظم قرآن یہ منزلیں طے کرتا ہوا جب آگے بڑھتا ہے دو عظیم سنگہائے میل اس کا انتظار کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے یہ بھی جانا کہ نظم کا تقاضا قریبی آیات یا قریبی سورتوں کا نظم پا لینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے مجموعی نظام اور اس کی موضوعاتی وحدت کی منزل ہماری نگاہوں میں ہو۔ اس کے لیے سور قرآن کے مختلف گروپوں میں نظم، اس میں بیان کردہ احکام و شرائع میں نظم (جیسے نماز و قربانی یا نماز روزکاۃ کے درمیان نظم) اور صفات الٰہی (جیسے عزیز و حکیم یا سمیع و بصیر وغیرہ) میں نظم کس جستجو کا حق ادا کیا جائے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں مجموعی طور سے نظم کی درج ذیل قسمیں سامنے آتی ہیں:

پہلی قسم: لفظ و معنی میں ہم آہنگی، نظم قرآن کے ادا شناسوں کا بالاتفاق یہ نظریہ ہے کہ قرآن کے تمام الفاظ و کلمات کی ترتیب موقع و محل کے عین مطابق ہے اور ''قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہٹا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لایا جا سکے، اس بات کا ادراک ان خالص اور فصیح عربوں نے بھی کر لیا تھا جن کے درمیان قرآن نازل ہوا تھا''۔[۱۱۴] یہاں

تک کہ مسلم علماء اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن میں ایک ہی بات کے لیے ہم معنیٰ و مترادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو الفاظ ظاہرا یکساں ومترادف لگتے ہیں وہ معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔۱۱۵ بہر حال لفظ ومعنی میں ہم آہنگی ہر عمدہ وزندہ کلام کی خاصیت ہوتی ہے اور اس ذیل میں ہم لفظ ومعنی میں موجود ربط ومناسبت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

دوسری قسم: نظم آیت- اس کا مطلب قرآن کی چھوٹی بڑی آیت کے اجزاو کلمات کا باہمی ربط ونظم اور نظم کے لحاظ سے اس کے مفہوم کا تعین۔

تیسری قسم: نظم آیات- اس سے دو متصل آیات یا مختلف مجموعہ ہائے آیات کا نظم مراد لیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی آیت کے معنی کے تعین میں سابقہ ولاحقہ آیات کے روابط کے اثر کو ہم نظم آیات کہہ سکتے ہیں۔

چوتھی قسم: نظم سورہ- ہر سورہ کا اپنا اندرونی نظم ہوتا ہے اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا اس کی تمام آیات یا مختلف مضامین اس کے مرکزی موضوع کے تابع ہوتی ہیں۔ انھی آیات کے مختصر یا طویل مجموعوں کے باہمی ربط کی بنا پر پوری سورہ پہلی آیت سے لے کر آخری آیت تک ایک وحدت کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے، آیات کے مخصوص مجموعوں کو ایک مستقل وعلیٰحدہ سورہ میں ترتیب پانا خود اس بات کی بین شہادت ہے کہ ہر سورہ کو کسی مخصوص بات یا مضمون کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو مختلف سورتوں میں ابواب کتاب کی طرح کیوں تقسیم کیا جاتا؟

پانچویں قسم: نظم سور- متصل اور قریبی سورتوں کے باہمی نظم کو نظم سور یا نظم السورتین کہا جاسکتا ہے۔

چھٹی قسم: مجموعہ ہائے سور میں نظم: ذکر آگے آرہا ہے (سورتوں کے مختلف گروپوں کا باہمی نظم)

ساتویں قسم: احکام وشرائع میں نظم- قرآن میں مذکور مختلف احکام وشرائع کا باہمی نظم (ذکر آگے رہا ہے)۔

اب مختصراً آیئے ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کا مجموعی نظام کیا ہے اور فہم قرآن پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں:

قرآن کے مجموعی نظام کی بحث کے بنیادی طور سے دو اہم حصے ہیں: (۱) سورتوں کے مختلف مجموعوں میں نظم (۲) قرآن میں بیان کردہ احکام وشرائع میں ربط ونظم۔ چونکہ نظم کی ان دونوں قسموں کا انکشاف فی الواقع علامہ حمیدالدین فراہیؒ کی تحقیقات کا نتیجہ یا خالصتاً انہی کی دریافت ہے[۱۱۶] اس لیے ان پہلوؤں پر ہماری بحث بنیادی طور سے انہی کے افکار و خیالات کا خلاصہ ہوگی۔

الف: یہ ہم شروع میں واضح کر چکے ہیں کہ نظم قرآن کے نکتہ شناسوں میں ایک گروہ وہ ہے جس کا یہ نظریہ ہے کہ چونکہ پورا قرآن ایک مربوط ومنظّم کتاب ہے اس لیے نہ صرف اس کی قریبی سورتیں بلکہ چھوٹی بڑی تمام سورتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان کے نظم پر غور کیا جائے تو وہ سب ایک خوبصورت ہار کی طرح نظر آئیں گی جس کے دونوں-ابتدائی و آخری-سرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور اس کے تمام موتی آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ رہ کر ہار کی دلکشی ورعنائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ قرآن کی ہر سورہ اس ہار کا موتی ہے اور پورے قرآن کا داخلی ومعنوی ارتباط وہ لڑی ہے جس میں تمام سور قرآنی ہار کے موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں۔[۱۱۷] اس طرح قرآن کے تمام اجزاء اس کے مجموعی نظام کے تابع ہیں اور اس کی وجہ سے نہ صرف دو قریبی سورتوں میں ربط ونظم پایا جاتا ہے بلکہ اس کی تمام سورتیں نظم کے لحاظ سے مختلف گروپوں میں تقسیم ہیں اور تمام گروپ آپس میں مربوط متحد ہیں، جس طرح ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے اسی طرح سور قرآنی کے ہر گروپ کا اپنا ایک عمود یا موضوع ہے، گروپ کے حقیقی مقصد کو یہ تمام سورتیں مل کر پورا کرتی ہیں اور اس کا کوئی نہ کوئی جزء اس گروپ کی ہر سورہ میں بطور خاص مذکور ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہمیں ظاہراً ان کے مطالب اور مضامین میں اختلاف وتنوع نظر آئے گا لیکن اس تنوع کے باوجود ان گروپوں کے باہمی ربط کی وجہ سے پورا قرآن اول تا آخر متحد المطالب ہے اور اپنے مجموعی نظام اور وحدت معنی کی رو سے وہ ایک کلمۂ واحدہ کی طرح ہے۔[۱۱۸]

تمام سور قرآنی ایک مجموعی نظام کے ساتھ وابستہ ہیں، اس کی ایک دلیل مکی و مدنی سورتوں کی موجودہ تقسیم وترتیب ہے۔ اس ترکیب پر ایک نظر ڈالنے سے صاف نظر آئے گا کہ قرآن مکی و مدنی سورتوں کے ملے جلے گروپوں پر مبنی ہے، حالانکہ مکی سورتیں زمانہ کے لحاظ سے پہلے نازل ہوئیں ہیں جب کہ مدنی سورتیں بعد میں، تاہم اس کے باوجود مصحف کی موجودہ ترتیب میں مکی سورتیں بالعموم آخر میں مرتب ہوئی ہیں اور مدنی سورتیں پہلے۔ قرآن کا اپنی نزولی ترتیب کے بالکل برعکس مرتب کیا جانا بلاوجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے نظم کی مصلحتیں کارفرما ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نازل تو ہوا ہے متفرق حالات وواقعات کے تحت لیکن اس کی سورتوں کو مرتب کیا گیا ہے مضمون ومعنی کے مطابق۔[۱۱۹] اس لیے قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی اس ترتیب اور مجموعی نظام کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اپنی اس بات کو فراہیؒ نے مکی و مدنی سورتوں کو سات الگ الگ مجموعوں میں عملاً تقسیم کر کے ثابت کیا ہے اور اپنی کتاب ''دلائل النظام'' کے علاوہ اپنے غیر مطبوعہ تفسیری حواشی میں بھی اس کی طرف حسب موقع اشارہ کیا ہے۔ سورتوں کی مکی و مدنی ترتیب کی بنیاد پر جس طرح سات گروپوں (جیسا کہ امام فراہی نے کیا ہے[۳]) یا نو گروپوں (جیسا کہ امین احسن اصلاحی نے کیا ہے) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اسی طرح اسے موضوعات ومطالب کی بنیاد پر تین گروپوں تک محدود کیا جاسکتا ہے اور تین بنیادی موضوعات کے تحت تمام سور قرآنی کے مطالب کا خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔[۱۲۰]

سورتوں کے گروپ میں ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ہر گروپ مکی سورتوں سے شروع ہوا ہے اور مدنی سورتوں پر ان کا اختتام ہوا ہے۔ مکی سورتیں کلام الٰہی کی اصل واساس کی حیثیت سے ہیں جب کہ بیشتر مدنی سورتیں ان کی فرع ہیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مکی سورتوں کے ہر گروپ کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں بطور ضمیمہ کے ان کے ساتھ منسلک ہیں۔[۱۲۱]

جب ہم قرآن کو معنوی طور سے مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے ان کے مفہوم ومعنی کا احاطہ کریں گے تو ہمیں ایک بات یہ محسوس ہوگی کہ یہ مختلف گروپ اصلاً حضرت محمد ﷺ

کی دعوت و رسالت کے مختلف مرحلوں کی عکاسی کرتی ہے اور ان میں ہر گروپ ایک خاص مرحلہ کا ترجمان ہے۔ رسول کی دعوت اسلام کا پہلا مرحلہ ابتدائے نبوت سے وسط نبوی تک محیط ہے، دوسرا مرحلہ وسط نبوت سے ہجرت تک پھیلا ہوا ہے اور تیسرا مرحلہ ہجرت کے بعد سے فتح و غلبہ تک کے حالات و کوائف پر مشتمل ہے۔

جب قرآن اپنی نزولی ترتیب کے برخلاف نظم اور سیاق کلام کے مطابق ترتیب دیا گیا تو نئی ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے امور و مسائل کو بیان کرنے کی ترتیب بھی بدل گئی۔ نزول کے وقت قرآن کے اصل اور اولین مخاطب عرب کے کفار و مشرکین کے مختلف گروہ تھے جب کہ اس کی موجودہ ترتیب، جو کہ خدا اور رسول کی واجب کردہ ہے، میں اولین مخاطب اہل ایمان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآن اپنی حتمی اور اصلی شکل میں وفات رسول سے قبل رسول ﷺ کو سونپا گیا تو اس وقت تک حالات میں انقلابی تبدیلی آ چکی تھی اور مخاطب طرز خطاب، ترجیحات اور حالات و ضروریات میں نمایاں فرق آ چکا تھا۔ وہی مخاطب جو نزول قرآن کے آغاز میں کافر و مشرک تھے اور جو اللہ و رسول اور مومنوں کے خلاف برسر پیکار تھے، ختم نزول یا اتمام دین و تکمیل شریعت کے وقت ان کی اکثریت ایمان لا چکی تھی اور وہ مسلم و مومن کی شکل میں قرآن کے سامنے سرنگوں تھے۔ اس نئی صورت حال میں قرآن کے انداز خطاب اور روئے خطاب دونوں میں تبدیلی آنا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ جب مخاطب بدلے تو قرآنی مضامین کی ترتیب اور ترجیحات میں بھی یکسر تبدیلی آئی، مکی سورتیں جو پہلے نازل ہوئی تھیں وہ اواخر کتاب بن گئیں اور مدنی سورتیں جو بعد میں نازل ہوئی تھیں، وہ اوائل کتاب بن گئیں۔ اصول دین کی باتیں جو آغاز نبوت میں اہل مکہ کو بتائی گئی تھیں انھیں آخر میں رکھ دیا گیا اور وہ اسلامی احکام و شرائع اور معاشرتی ہدایات جنھیں آخری مرحلہ میں امت مسلمہ کے لیے نازل کیا گیا انھیں بالکل شروع میں رکھا گیا۔[۱۲۲] یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآنی اجزاء کی ترتیب میں نظم و ربط کا لحاظ رکھا گیا نہ کہ واقعات کی زمانی ترتیب کا۔ اگر نظم مقصود نہ ہوتا تو پھر قرآن کو پہلی ہی حالت، یعنی نزولی ترتیب پر ہی باقی رہنے دیا گیا ہوتا اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا ہوتا تو نہ تو اس کا مجموعی نظام ہم پر منکشف ہوتا اور نہ ہی

اس کا پیغام مخاطب کی نفسیات اور حالات و واقعات کے تقاضوں پر پورا اترتا۔ لیکن خدائے حکیم نے اسے بہترین ترتیب کے ساتھ ایک منظّم اور مربوط کتاب کی شکل میں انسانوں کو سونپ کر ان پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے اور اس کا مقصد ہے قرآن کو ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ سہل الفہم اور ترسیلِ معنی کے لحاظ سے بیش از بیش مؤثر بنانا۔ درج ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی احسان یا دوسرے لفظوں میں قرآن کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

''كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ''۔

(یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے اس کی توضیح وتشریح کی گئی۔)

جب قرآن کا مطالعہ آپ اس پہلو سے کریں گے تو پورا قرآن آپ کو اپنے موضوعات ومضامین کے لحاظ سے چند بنیادی حصوں میں منقسم نظر آئے گا۔ امام فراہیؒ کے اپنے تجربہ کے مطابق موضوعات کے لحاظ سے قرآنی مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلا مجموعہ ان کے نزدیک سورۂ فاتحہ سے سورۂ توبہ تک کی سور قرآنی پر مبنی ہے، دوسرے حصے میں سورۂ یونس سے سورۂ نوح (۱۰-۲۴) تک کی سورتیں شامل ہیں اور تیسرا حصہ سورۂ فرقان سے سورۂ ناس (۲۵-۱۱۴) تک کی سورتوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں احکام وشرائع اور قوانینِ اسلامی کی تفصیل بنیادی موضوع کی حیثیت سے ہے، دوسرے حصے میں، دعوتِ حق مومنین کے لیے بشارت اور کفار کے خلاف تحدید کا مضمون غالب ہے۔ اور تیسرا اور آخری حصہ دین کے بنیادی اصول وعقائد کی دعوت پر مشتمل ہے۔ آخری حصہ میں دعوتِ دین کے ابتدائی مرحلے کا اسلوب و انداز صاف جھلکتا ہے۔ آغاز دعوت کے معاملے میں رسول خاتم ﷺ کو جس رہنمائی اور تسلی ودل جوئی کی ضرورت تھی اس کا جگہ جگہ ذکر ہے اور آپ کو مختلف مقامات پر کفار کی اذیتوں اور مظالم کے مقابلے میں صبر وضبط کی تلقین کی گئی ہے، جب کہ پہلے حصے میں شریعت واحکام شریعت کی تشریح اور آخری شریعت کے علم بردار امت کو اس کے فریضۂ منصبی اور خدا کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کی یاد دہانی کا مضمون غالب ہے۔[۱۲۳]

مذکورہ فصل میں نظم کے ان تمام پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی گئی اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اس ترتیب میں قانون شریعت پر مشتمل مجموعہ کو دوسرے مجموعوں پر کیوں مقدم رکھا گیا ہے اور تذکیری و تنبیہی نوعیت کی ابتدائی سورتوں یا منذرات کو آخر میں رکھا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے شریعت ان کے لیے غایت ومقصود کی حیثیت سے ہے اسی لیے اسے سب پر مقدم کیا گیا تا کہ اہل ایمان کی نظر، جنھیں قرآن نے ہر حال میں احکام الٰہی کا پابند رہنے کی ہدایت کی ہے، جب اس مجموعہ پر پڑے تو انھیں خدا کے ساتھ کیا گیا عہد و پیمان یاد آجائے جس کے وہ بحیثیت امت تا قیامت مکلّف ہیں نیز وہ یہ جان لیں کہ انھیں کون سی راہ اختیار کرنی ہے اور کس پر چلنے سے اجتناب کرنا ہے۔

سور قرآنی کے ان گروپوں کی موجودہ ترتیب اور ان کے باہمی ربط و تعلق کی حکمتوں کو ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''بیشتر سورتیں جو پہلے نازل ہوئی تھیں انھیں آخر قرآن میں رکھا گیا ہے یہاں تک کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب اپنی نزولی ترتیب سے بالکل مختلف ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ قرآن درس ومطالعہ کے لیے ہے، نزول مکمل ہو جانے کے بعد جن کو اس کی تلاوت کرنی تھی وہ صورت حال کے لحاظ سے اوائل قرآن سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے۔ اگر وہ اسے نزولی ترتیب سے پڑھتے تو اپنے گردوپیش کے احوال سے دور ہو جاتے۔......اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی آدمی زینہ طے کرتا ہوا اس کے آخری سرے پر پہنچ جائے پھر جب وہ اس جگہ واپس ہونا چاہے جہاں سے چڑھا تھا تو وہ نیچے کے پہلے زینے سے ابتدا نہیں کرے گا بلکہ سب سے پہلے وہ اس کے بالائی زینے پر قدم رکھے گا''۔[۱۲۴]

(ب) نظم قرآن کا ایک اہم پہلو قرآن کریم میں بیان کیے گئے مختلف احکام واصول دین کے درمیان پایا جانے والا ربط و تعلق ہے۔ یہ بھی اصلاً مولانا فراہیؒ کی ہی ایک دریافت ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نظم کی اس اہم قسم کو منکشف کیا اور اس سلسلے میں ہمارے لیے بہت سے قیمتی اشارات چھوڑے ہیں۔ احکام وشرائع میں نظم کا مطلب ہے قرآن میں جب بھی ایک حکم دوسرے حکم کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یا ایک قانون شریعت کے ساتھ

دوسرے قانون شریعت کا ذکر ہوتا ہے یا اللہ کی ایک صفت کے ساتھ دوسری صفت مذکور ہوتی ہے تو اس میں قرآن کے داخلی نظام کی بہت ساری مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔انھیں بلا کسی معقول وجہ اور بغیر کسی مقصد کے یوں ہی ایک ساتھ نہیں بیان کیا جاتا ہے، بلکہ ان کے درمیان گہری نسبتیں قائم ہیں، اس لیے کہ ایک شئ کا دوسری شئ کے ساتھ ہونا کبھی مصلحت سے خالی نہیں ہوسکتا۔۱۲۵ عمر اور زید کا ایک ساتھ نظر آنا کسی نہ کسی سبب سے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح جب قرآن میں صبر کا شکر کے ساتھ نماز کا روزہ کے ساتھ، یا نماز کا حج کے ساتھ، حج کا جہاد کے ساتھ یا جہاد کا نماز کے ساتھ انفاق کا سود کے ساتھ یا محرمات کا طیبات کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، یا خدا کی مختلف صفات ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر بیان کی جاتی ہیں، جیسے عزیز کے ساتھ حکیم یا عزیز کے ساتھ رحیم یا غفور کے ساتھ رحیم یا عزیز کے ساتھ جبار وغیرہ، تو اس میں ان کی داخلی نسبتیں ملحوظ ہوتی ہیں اور ہر حکم کا دوسرے حکم کے ساتھ اور ہر صفت کا دوسری صفت کے ساتھ ایک خاص ربط ہوتا ہے۔

''ہر دین وشریعت کا اپنا مخصوص نظام اور اصول ہوتا ہے جو تمھیں اس کی فطرت، عدل اور اس کی عام برکات کے حوالے سے اس کے اصل مقام سے آگاہ کرتے ہیں۔تو جو اس پہلو سے احکام وشرائع اور قوانین پر غور وفکر کرتا ہے وہی صحیح معنوں میں حکمت تشریع اور حق وباطل کے درمیان فرق سے واقف ہوتا ہے ہر قوم وملت کے کچھ اپنے اصول وآداب ہوتے ہیں جن پر وہ چلتے ہیں اس لیے ان کے طبائع اور ان کے ملنے والے اصول وآداب زندگی کے مابین مناسبت کا پایا جانا ضروری ہے''۔۱۲۶

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس کے کسی ایک تصور کو بھی اس کے مجموعی نظام سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، نہ تو اس کے تصور معاش کو تصور سیاست سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ تصور معاشرت کو تصور دین سے۔ بلکہ اگر وہ کامل وکافی ضابطۂ حیات ہے تو اس کے مختلف ارکان دین اور مختلف احکام وشرائع میں ایک خاص قسم کا ربط ونظم موجود ہونا چاہیے۔ یہ بات بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ خدا نے اپنے دین کو بعض منتشر احکام و ہدایات کا مجموعہ بنا کر چھوڑ دیا ہو جن میں باہم کوئی ربط وتعلق نہ ہو، بلکہ عقل تو یہ کہتی ہے کہ

جس طرح قرآن ایک منظّم و مربوط کتاب ہے، اسی طرح اس میں بیان کیے گئے احکام و امور کو باہم مربوط ہونا چاہیے۔ علامہ فراہیؒ نظم قرآن کے اس مخصوص پہلو کو متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت اعلیٰ حکمت مدنظر رکھی ہے۔ تو جب تم ایک شئ کو دوسری شئ کے ساتھ دیکھو گے تو ضرور ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرو گے۔ یہ تلاش ایسے مخفی دقائق حکمت تک تمہاری رہبری کرے گی جن دقائق تک وہ شخص کبھی نہیں پہونچ سکتا جو تدبر کا عادی نہیں ہے۔ ایک ہی شئ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں مثلاً دیکھو نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں، دونوں ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں، دونوں بدنی عبادتیں ہیں، دونوں بیت اللہ سے تعلق رکھتی ہیں، نیز نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے...... نماز میں اتنی مناسبتیں تو حج کے ساتھ تھیں۔ اب روزہ کے ساتھ نماز کی مناسبتوں پر غور کرو۔ دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں، دونوں کی بنیاد صبر پر ہے، یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شرائط میں شامل تھا، اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے''۔[۱۲۷]

یہ ہیں نظم کے دو ایسے پہلو جن کی وجہ سے قرآن کا مجموعی نظام پوری آب و تاب سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے ذریعہ سور قرآنی کی موجودہ ترتیب اور ان کے نظام پر غور کرنے سے مختلف مجموعہ ہائے سور کے باہمی تعلق سے بھی ہم آگاہ ہوتے ہیں اور قرآن میں ایک ساتھ بیان کیے گئے بعض احکام و شرائع کی تفصیل پر مشتمل آیات پر نظر ڈالنے سے احکام دین اور شرائع اسلام کے داخلی رشتے بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔

سفر ہنوز جاری ہے

اس طرح علم النظم والمناسبۃ انھیں ابتدائی منزل سے نظام القرآن کی اعلیٰ و ارفع منزل تک پہنچ گیا، اعتراف حقیقت یا تحدیث نعمت کے بطور ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ فراہیؒ کو اس میدان میں فلسفۂ نظام القرآن کے معلم اول کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم اس کا

مطلب یہ نہیں کہ نظم قرآن پر تحقیق وتدبر کا کام ختم ہوگیا اور اب اس میں کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سفر ہنوز جاری ہے اور جاری رہے گا اس لیے کہ یہ اس کا کلام ہے جس کی ذات اول وآخر کے انسانی پیمانوں سے ماوراء اور ابتداء وانتہا کی ظاہری لکیروں سے بلند وبالا ہے۔ جب حال یہ ہے تو اس کے کلمے کی تعبیر وتفسیر کے عمل کی تکمیل (جیسا کہ اس نے خود کہا ہے..........) دنیا کے تمام بحر وبر اور شجر وحجر کی مدد سے بھی ممکن نہیں تو بہتر اور ضروری ہے کہ نظام القرآن کی درخشاں منزل کی طرف نوع انسانی کا سفر برابر جاری رہے۔ اور قرآن وسنت واسلاف کی رہنمائی میں ہم کچھ نئی منزلیں طے کریں، کچھ نئی دریافتوں سے اپنے ایمان کو مضبوط کریں اور ارباب علم ودانش کو دعوتِ فکر دیں کہ یہ وہ سفر ہے جس کا آغاز تو ہے لیکن اختتام ممکن نہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ دیکھئے لسان العرب، نظم، صحاح (جوہری) نظم

۲۔ نفس مصدر

۳۔ نفس مصدر، (لیس لأمره نظام ای لا تستقیم طریقه)

۴۔ مثال کے طور سے دیکھئے ابوعثمان عمرو الجاحظ، البیان والتبیین: ۱/۲۰-۲۱، ۱۱۵-۱۱۶، ۲۲۸-۲۲۹

۵۔ دیکھئے علامہ زرکشیؒ وعلامہ سیوطیؒ کی کتاب البرہان فی علوم القرآن، الاتقان فی علوم القرآن کی متعلقہ فصلیں (علم مناسبۃ الآیات)، ابن الزبیر الثقفی کی کتاب کا نام اور اس میں لفظ مناسبہ وتناسب کا استعمال۔

۶۔ متقدمین میں لفظ نظم کو آیات وسور کے باہمی ربط وتعلق کے معنی میں استعمال کرنے والوں میں برہان الدین بقاعیؒ اور بدرالدین زرکشیؒ شامل ہیں، دیکھئے نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور: ۱/۱۱، ۴۲، ۴۳۔ البرہان فی علوم القرآن:

۱/۴۲،۴۳،۴۲وغیرہ:۴۳

ے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلیؒ نے مولانا فراہیؒ کو نظام کی جگہ نظم قرآن یا اس جیسے کسی لفظ کے استعمال کا مشورہ دیا تھا لیکن مولانا فراہیؒ نے اسے تسلیم نہیں کیا اور قرآنی آیات وسور کے باہمی ربط کے لیے نظام القرآن کی اصطلاح کے استعمال کو ہی پسند کیا۔ (دیکھیے مکاتیب شبلی:۲/۱۳)

۸ لسان العرب،نسب

۹ البرہان زرکشی:۱/۳۵،الاتقان،۲/ ۳۹،القاموس المحیط :۱/ ۱۳۱

۱۰ اعجاز ونظم کے مسلم ماہرین کی طرح اس مسئلے میں ٹی، ایس ایلیٹ بھی یہی رائے رکھتا ہے۔دیکھیے on paetry and paets, by T.S. Iliot, London, 1969

۱۱ فراہیؒ اس تعلق سے ایک جگہ لکھتے ہیں:" کلام دراصل اس کے نظام سے ہی عبارت ہے (انما الکلام بنظامہ) رسائل الامام الفراہی، الدائرۃ الحمیدیۃ ،اعظم گڑھ،۱۹۹۱ء

۱۲ تفسیر نظام القرآن،۳۱، دلائل النظام ،فراہی،۳۱

۱۳ نظم الدرر:۱/ ۵

۱۴ نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور،امام بقاعی،۱/ ۵

۱۵ نفس مصدر،۱/ ۶

۱۶ نفس مصدر،۱/ ۶

۱۷ البرہان فی علوم القرآن، دارالجیل ، بیروت،۱۹۸۸ء،۱/ ۳۵

۱۸ نفس مصدر،۱/ ۳۶

۱۹ نفس مصدر،۳۵-۳۶

۲۰ نفس مصدر،۱/ ۳۶

۲۱ الاتقان،۲/ ۱۵۲

۲۲ دیکھیے الاتقان،۲/ ۱۵۲،نظم الدرر،۱/ ۶-۷،البرہان،۱/ ۳۶

۲۳ دیکھیے رازی: مفاتیح الغیب،۲/ ۳۹۴،۷/ ۱۳۸،البرہان، زرکشی ابن الزبیر،۲/ ۷

۲۴۔ مفاتیح الغیب، ۷/ ۱۳۸، البرہان، ۱/ ۳۶، نظم الدرر، ۱/ ۶

۲۵۔ البرہان ابن الزبیر، ۷۲، الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس، ۱۵۹

۲۶۔ البرہان، زرکشی، ۱/ ۳۶، الاتقان، ۲/ ۱۵۲

۲۷۔ تفسیر نظام القرآن، ۶۰

۲۸۔ اس کی تفصیل تاریخ نظم قرآن سے متعلق ہماری بحث میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان میں سرفہرست امام عزالدین عبدالسلامؒ (۵۷۷-۶۶۰ = طبقات الشافعیہ: ۵/ ۸۰) اور علامہ شوکانی (صاحب تفسیر فتح القدیر) کے نام آتے ہیں۔ دیکھئے البرہان زرکشی، ۱/ ۳۷، نظم الدرر، بقاعی، ۱/ ۷، البرہان فی تناسب سور القرآن، ۷۰

۲۹۔ نظم الدرر، ۱/ ۷۔ البرہان زرکشی، ۱/ ۳۶ (ابن عربی کا قول) ۳۹ (کمال الدین محمد بن عبدالواحد الذملکانی کا قول)

۳۰۔ اس نقطہ نظر کی توثیق و تصدیق کے لیے ملاحظہ فرمایئے اعجاز القرآن خطابی، ۲۴-۲۵، قاضی عبدالجبار المغنی، ۱۶/ ۱۹۹-۲۱۲۔ البیان والتبیین، جاحظ، ۱/ ۲۵۰، عبدالقادر جرجانی، رسالۃ الشافیہ، ۷، ۱۴۱، ۱۹۸، دلائل الاعجاز، ۲۸-۳۳، ۳۸، ۵۵، ۲۹۶۔ اور دیگر متعلقہ صفحات ابوالحسن الرمانی النکت فی اعجاز القرآن، ۹۷۔ مصطفیٰ صادق رافعی، اعجاز القرآن، ۱۷۵، ۲۴۱-۲۵۰

۳۱۔ تفسیر نظام القرین، دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱

۳۲۔ رسائل الامام الفراہی (دلائل النظام)، ص ۲۱

۳۳۔ دیکھئے رسائل الفراہی، ۴۰

۳۴۔ دیکھئے فراہی دلائل، ۳۹-۴۰

۳۵۔ ھود: ۱۔ اسے امام زرکشیؒ نے بھی اپنی کتاب میں نظم قرآن کے حق میں نقل کیا ہے، دیکھئے البرہان، ۱/ ۳۷، النساء، ۸۲

۳۶۔ سورہ نساء، آیت: ۸۱

۳۷۔ دیکھئے حواشی قرآن: ۸۰-۸۱، تدبر: ۲/ ۴۷

۳۸۔ زخرف:۳-۴ (اس آیت کو مولانا فراہی نے بھی نظم کی تائید میں نقل کیا ہے)

۳۹۔ سورہ قمر (چار مرتبہ یہ جملہ دہرایا گیا ہے)

۴۰۔ سورہ الشوری،۵۲ (ترجمہ صرف ہر گروہ کی پہلی آیت کا کیا گیا ہے)

۴۱۔ یہ وہی حکیمانہ شان ہے جس کا سرا ابتداءً علماء نے قرآن کی اعجاز بیان میں اور پھر اس کے انوکھے نظم اور معنوی وحدت میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دیکھئے الکشاف،۳/۴۱۱،فراہی دلائل النظام:۴۵،تعلیقات،۲/۲۲۰

۴۲۔ حکمت اور نظم میں کیا تعلق ہے اس کے لیے دیکھئے فراہیؒ سے متعلق علاحدہ فصل

۴۳۔ آیت کے اس پہلو پر مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے الامعان فی اقسام القرآن، فراہی، دارالقلم، دمشق،۱۹۹۴ء،ص ۹۶،امام زمخشری نے قسم و مقسم علیہ میں فطری ربط و مناسبت کی وجہ سے اسے قسم کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ دیکھئے الکشاف، دارالمعرفۃ، بیروت،۳/۴۱۰-۴۱۱

۴۴۔ مفردات القرآن،فراہی،دارالغرب الاسلامی،بیروت،۲۰۰۲ء،ص ۱۱۱،الدائرۃ الحمیدیۃ،الہند،۲۰۰۴ء،ص ۱۱۱،التعلیقات،۲/۲۱۹

۴۵۔ الکشاف،۳/۴۰۹

۴۶۔ تعلیقات،۲/۲۲۰

۴۷۔ دیکھئے البرہان فی تناسب سور القرآن،۷۱

۴۸۔ دلائل،۲۹

۴۹۔ سورہ قیامہ،۱۶-۱۹

۵۰۔ دیکھئے تفسیر نظام القرآن،۲۰۶

۵۱۔ سورہ فرقان،۱۳۲-۱۳۳ (اور کفار نے کہا آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا،اسی طرح (ہم نے) قرآن کو بالتدریج نازل کیا ہے تاکہ ہم تمہارے دل کو مطمئن کردیں اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے،اور اس طرح کی کوئی بات تمہارے پاس وہ نہیں لائیں گے مگر ہم تم تک حق پہنچائیں گے اور اس کی عمدہ تفسیر بھی۔

۵۲۔ قرآن میں تدریجی نزول کی مصالح پر علماء نے سیر حاصل بحث کی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے سورہ فرقان کی مذکورہ بالا آیت کے آخری جز "احسن تفسیرا" کو سامنے رکھ کر اس پہلو پر بحث نہیں کی ورنہ ہوسکتا ہے تدریج کی مصلحت میں نظم قرآن کو بھی بیان کرتے۔ دیکھیے البرہان ، ۱/۲۳۰-۲۳۲، ۲۵۶؛ الاتقان :۱/ ۶۹-۷۳؛ الکشاف ،زمخشری ،۳/ ۹۶-۹۷

۵۳۔ دیکھیے البرہان، ۱/ ۲۵۶

۵۴۔ دیکھیے البرہان فی تناسب سور القرآن، ابن الزبیر الثقفی، ادارۃ الثقافیۃ والنشر ، جامعۃ الامام محمد بن سعود ، ۱۹۸۸ء، ص۷۳-۷۴؛ البرہان فی علوم القرآن، زرکشی، ۱/ ۳۷؛ نظم الدرر بقاعی، ۱/ ۴۳؛ تفسیر نظام القرآن، فراہی، ص ۳۲

۵۵۔ نفس مصدر، ص ۳۲

۵۶۔ الکشاف، ۳/ ۹۷

۵۷۔ دیکھیے البرہان، ۱/ ۲۵۶

۵۸۔ قرآن کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے اور یہ چیز اس کے ایک منظّم و مرتب کتاب ہونے پر دلیل ہے، اس پہلو پر ہماری ایک مستقل بحث "نظم قرآن اور ترتیب قرآن" میں تفصیلات موجود ہیں۔

۵۹۔ بخاری، کتاب الصوم، مسلم، کتاب الصوم

۶۰۔ تفسیر نظام القرآن، ۲۱۳

۶۱۔ نظم الدرر، ۱/ ۸

۶۲۔ بقرہ: ۱۸۷، نیز دیکھیے بقرہ: ۲۱۹، آل عمران: ۱۰۳، مائدہ: ۸۹

۶۳۔ دیکھیے نظام القرآن، ۳۲-۳۳، ۲۱۳

۶۴۔ سنن ابی داؤد، بخاری فضائل القرآن

۶۵۔ قرآن میں تصریف آیات (یا تکرار) کی نوعیت اور اہمیت و افادیت پر بعض دوسرے مقامات پر تفصیلات موجود ہیں۔

٦٦ تفصیل کے لیے دیکھیے: الکشاف، ۴/۴۶، رسائل الامام الفراہی، ۴۰، ۴۴-۶۴، ۱۹۰-۱۹۱، تاویل مشکل القرآن، ابن قتیبہ، ۱۸۳، جواہر القرآن، امام غزالی، ۴۰-۴۲، نظم الدرر، بقاعی، ۲/ ۱۸۸، البرہان، زرکشی، ۳/ ۱۱-۲۱

٦٧ منی یمنی منیاً، یہ لفظ جو مذکورہ آیت میں استعمال ہوا ہے عربی میں اس کا معنی ہے کسی چیز کا ارادہ کرنا، آرزو کرنا، خواہش کرنا، اظہار تمنا کی کوشش کرنا پھر یہیں سے لفظ شیٔ مطلوب کی طلب کو بیان کرنے (الدلائل علی هذا الطلب) کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا (دیکھیے لسان العرب اور اقرب الموارد: منی) علماء سلف نے عموماً اس کا ظاہری معنی یہ لیا ہے کہ اس کا مطلب اللہ کا کلام پڑھنا، یا تلاوت کرنا ہے، اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا جب کوئی نبی و رسول ﷺ ایسا کرتا ہے تو شیطان لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کچھ اس قسم کا ماحول بناتا ہے اور اس دوران وہ اور اس کے حواریین اس طرح شور مچاتے ہیں کہ اس کی آواز صاف سنائی نہ دے، کہا کچھ جائے اور سنائی کچھ دے۔ اس طرح بعض لوگ ایک روایت کی بنیاد پر اس کا یہ مفہوم متعین کرتے ہیں کہ شیطان کے زور و اثر سے رسول ﷺ کے ذریعہ ادا کیے گئے کلمات کبھی کبھی گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور اس میں کفار کے مطلب کی کچھ بات آ جاتی ہے جیسا کہ رسول خاتم کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ لیکن مولانا فراہیؒ اس کا مفہوم لغت اور نظم کلام کی مدد سے، یہ بتاتے ہیں کہ یہ دراصل رسول ﷺ کی دعوت حق کے خلاف شیاطین جن و انس کی مخالفت و محاذ آرائی کی طرف اشارہ ہے جو ہمیشہ کا معمول رہا ہے (تفصیل نظم قرآن اور مولانا فراہیؒ کی فصل میں ملاحظہ فرمائیں)۔

٦٨ تعلیقات، ۱/۱۳۳۔ اس آیت کے نظم پر مزید تفصیل کے لیے دیکھئے میرا مقالہ ''مولانا امین احسن اصلاحی کا تصور نظم قرآن اور امام فراہیؒ، ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، خاص نمبر ''قرآنی علوم بیسویں صدی میں''، ص ۱۱۴-۱۷۹

٦٩ سورہ نور کی پہلی آیت ہے ''سورة انزلناها'' (یہ سورہ ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے)، اسی طرح سورہ طٰہٰ کا آغاز ''قرآن'' کے ذکر سے ہوا ہے۔

۷۰ تفسیر نظام القرآن، ۵۱

۷۱ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ۵۳ (بحوالہ اتقان، سیوطی)

۷۲ البرہان، ۱/۲۶۳-۲۶۴

۷۳ نظم قرآن اور تکرار کی بحث میں تفصیل موجود ہے۔

۷۴ بطور مثال ملاحظہ فرمایئے سورہ نساء کی آیات میراث، یا پھر سورہ توبہ کی وہ آیت جو اہل نفاق سے متعلق ہیں (آیت ۶۷ اور اس کے آگے کی آیات)، یا وہ آیت جو اہل ایمان کی توصیف میں ہیں (۷۱-۷۲)

۷۵ ابن تیمیہ ان علماء میں سے جو محض ذاتی رجحان وارمی کی بنیاد پر تفسیر کو بالکل حرام قرار دیتے ہیں، وہ ''مقدمہ'' میں ''**من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار**'' اور دیگر احادیث وآثار واہم علماء کی آراء کی بنیاد پر یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ ''مجرد رائے کی بنیاد پر تفسیر قرآن حرام ہے'' (دیکھئے مقدمہ تفسیر، ۱۰۵-۱۱۵، نیز دیکھئے تفسیر طبری، ۱/۷۷-۸۰، تفسیر قرطبی، ۱/۳۳، نیز دیکھئے صبحی صالح، ۴۱۵-۴۱۶)۔

۷۶ مقدمہ: ۹۳، نیز اس رائے کی تائید کے لیے دیکھئے فراہیؒ تفسیر نظام القرآن، ۳۵-۳۶، زرکشی، البرہان، ۲/۱۵۶-۱۶۱

۷۷ نفس مصدر

۷۸ مثال کے لیے دیکھئے بخاری، کتاب تفسیر القرآن (تفسیر سورہ ۲)، الاتقان، سیوطی، ۱/۱۰۴

۷۹ سیوطی، ۱/۱۰۴

۸۰ ☆ دیکھئے دلائل النظام (رسائل الامام الفراہی) ص ۲۱۴، ۲۲۵، ۲۶۸، ۲۹-۳۰، تفسیر نظام القرآن، فراہی، ص ۷، ۲۰، ۴۰، ۶۰

۸۱ مثال کے لیے دیکھئے بخاری، فضائل القرآن اور تفسیر سے متعلق ابواب نیز مقالے کی فصل ''نظم قرآن اور ترتیب قرآن''

۸۲ قرآن کریم کے مفاہیم و مدلولات سے آگاہی حاصل کرنے کے سلسلے میں صحابہ

کرام کی دلچسپی وانہماک کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ تفسیر طبری، ۱/ ۸۷-۹۰، فتح الباری، ۷/ ۸۰-۸۱، ابن تیمیہ، مقدمہ فی اصول التفسیر، ۹۵-۹۸

۸۳ مثالوں کے لیے دیکھئے بخاری، فضائل القرآن اور باب التفسیر عبداللہ بن عباسؓ قرآن کی تفسیر وتاویل کے میدان میں صحابہ کرام کے درمیان خصوصی امتیاز رکھتے تھے، انھیں علم کا سمندر کہا جاتا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فہم قرآن کے تعلق سے ان کے لیے خصوصی دعا کی تھی، حضرت علیؓ نے تو ان کے تعلق سے یہاں تک کہہ دیا کہ ''لگتا ہے وہ علوم وحقائق کو ایک باریک پردے کی آڑ سے دیکھ رہے ہیں'' اسی طرح عبداللہ بن مسعود جنھیں خود مبدا فیض سے علم قرآن کی دولت بڑی فراخی سے ملی تھی، انھیں ''ترجمان القرآن'' کہتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباسؓ سے تفسیری روایات پر مبنی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ دیکھیے زرکشی، البرہان، ۱/ ۲۶۱-۲۶۲، الاتقان، سیوطی، ۲/ ۳۱۸-۳۲۲، فتح الباری، ۷/ ۸۰، ابن تیمیہ، مقدمہ فی اصول التفسیر، ۹۶-۹۷، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ابن عباسؓ

۸۴ صبحی صالح، علوم القرآن، ۴۱۳

۸۵ اس بات کی اہمیت کی وجہ سے ابن تیمیہ نے اپنی اہم کتاب مقدمہ فی اصول التفسیر کا آغاز ہی اسی مسئلے سے کیا ہے (**فی ان النبی بین لاصحابه معانی القرآن**) دیکھئے صفحات: ۳۵-۳۶

۸۶ البرہان، زرکشی ۱۴/۱-۱۵

۸۷ الظلم کا معنی لغت میں یہ ہے کہ کسی مسئلے میں کمی وزیادتی کرنا یا کسی چیز کو اس کی حقیقی حالت میں نہ رکھنا (**وضع الشئ فی غیر موضعه**)، دیکھیے لسان العرب، ظلم، یہاں پر ظلم کا مفہوم ابن قتیبہ بھی اسی سیاق میں واضح کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں ''**قد یسیر الظلم بمعنی الشرک، لان من جعل الله شریکا فقد وضع الربوبیة غیر موضعها، یقول الله سبحانه (ان الشرک لظلم عظیم) وقال (ولم یلبسوا ایمانهم بظلم) ای**

بشرک"۔دیکھئے تاویل مشکل القرآن:۲۱۳-۲۷۶

۸۸۔ دیکھئے مسلم، کتاب الصوم، نیز البرہان، زرکشی، ۱/۱۵

۸۹۔ نفس مصدر، ۱/۷

۹۰۔ بخاری، فضائل القرآن (۶/۴۵=تفسیر)، ابن الزبیر، البرہان، ۷۶

۹۱۔ زرکشی ۱۴-۱۵

۹۲۔ زرکشی، ۱/۲۵۸

۹۳۔ نفس مصدر، ۱/۲۴۸

۹۴۔ مسند احمد، ۷/۵۷، ترمذی، باب التفسیر

۹۵۔ تفصیل کے لیے دیکھئے مباحث فی علوم القرآن، صبحی صالح، ۷۱، البرہان، ابن الزبیر، ۴۶، ابوجعفر نحاس، الناسخ والمنسوخ، مسند احمد، ۱/۳۲۹ وغیرہ

۹۶۔ دیکھئے مفردات القرآن، ۱۱۰-۱۱۱

۹۷۔ دیکھئے الاتقان، ۱/۱۵۲، البرہان، ۱/۳۵، رسائل الامام الفراہی (دلائل النظام)، ۲۸-۲۹

۹۸۔ فراہیؒ، الفاظ وکلمات کی اسی اہمیت کی وجہ سے اپنی تفسیر میں الفاظ کی تحقیق کا اہتمام کرتے ہیں۔کسی لفظ کے صحیح معنی کا تعین پورے جز وکلام کے سمجھنے میں کتنا معاون بنتا ہے، اس کے لیے دیکھئے، تاویل مشکل القرآن، ابن قتیبہ (مقدمہ)، مفردات القرآن، راغب اصفہانی

۹۹۔ یہ نکات الاتقان، البرہان، اور رسائل الفراہی سے استفادہ ہیں۔

۱۰۰۔ البرہان، ۱/۳۷، نظم الدرر، ۱/۸

۱۰۱۔ نظم الدرر، ۱/۱۸

۱۰۲۔ نفس مصدر، ۱/۱۸

۱۰۳۔ دیکھئے دلائل النظام (رسائل)، ۵۵-۵۶

۱۰۴۔ نفس مصدر، ۵۶ (افادات حواشی)

۱۰۵۔ نفس مصدر، ۵۳، ۵۴

۱۰۶۔ رسائل الامام الفراہی (دلائل)، ۲۸

۱۰۷۔ نفس مصدر، ۲۸

۱۰۸۔ نفس مصدر، ۸۴-۸۵= مولانا فراہیؒ کے تصور نظم میں عمود کی کیا حیثیت ہے اس پر تفصیلی بحث کے لیے متعلقہ فصل ملاحظہ فرمائیں، رسائل، ۳۸، ۸۷-۸۸

۱۰۹۔ رسائل الفراہی، ۸۷

۱۱۰۔ رسائل الفراہی (دلائل النظام)، ۵۳، ۸۴

۱۱۱۔ زرکشی، البرہان، ۱۱-۱۷، الاعجاز البیانی، ۳۰۰

۱۱۲۔ دو قریبی سورتوں کے مابین نظم و ربط کی اہمیت کے لیے دیکھیے، البرہان فی تناسب سور القرآن، ابن الزبیر الثقفی، ۵۷، رسائل الامام الفراہی، ۸۷، ۹۶۔ تفسیر نظام القرآن، سورۃ البقرہ، الدائرۃ الحمیدیہ، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹-۳۵

۱۱۳۔ رسائل، ۸۶-۸۷

۱۱۴۔ دیکھیے رسائل الفراہی، ۸۷

۱۱۵۔ نفس مصدر، ۸۶-۸۷

۱۱۶۔ نفس مصدر، ۱۰۳-۱۰۵

۱۱۷۔ نفس مصدر، ۱۰۵-۱۰۹

۱۱۸۔ نفس مصدر، ۱۰۳

۱۱۹۔ ان نکات کے لیے دیکھیے رسائل الفراہی، ۹۵-۱۰۳

۱۲۰۔ رسائل الفراہی، ۱۰۵-۱۰۹

۱۲۱۔ رسائل الفراہی، ۹۶۔ (مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کی مثال بنیاد اور اس پر تعمیر ہونے والی عمارت سے دی ہے۔ دیکھیے مقدمہ تدبر قرآن، جلد اول)

۱۲۲۔ تفسیر نظام القرآن، ۵۰

انگریزی تراجمِ قرآن مجید-استفادے کا طریقہ

عبدالرحیم قدوائی

سب سے پہلا مکمل انگریزی ترجمۂ قرآن مجید ۱۶۴۹ء میں منظر عام پر آیا، گویا یہ علمی روایت تقریباً چار سو سال پرانی ہے اور محض قدیم ہی نہیں تعداد کی کثرت اور مختلف بلکہ متضاد نقطہ ہائے نظر کی حامل بھی۔ کثرت کے لحاظ سے مکمل انگریزی تراجم اور ان کے ایڈیشنوں کی تعداد خالصۃً مسلمانوں کی زبانوں فارسی اور ترکی میں دستیاب تراجم سے کہیں زائد! نقطہ ہائے نظر کے اعتبار سے ان تراجم میں البتہ بوقلمونی سے زیادہ احساس بوالعجبی کا ہوتا ہے کہ بعض تراجم میں خود قرآن مجید کی تضعیف، تنقیص بلکہ کھلی ہوئی تردید تک موجود! براایں عقل و دانش بباید گریست

لہٰذا انگریزی تراجم سے استفادے کی اولین بلکہ لازمی شرط یہ ہے کہ زیر مطالعہ ترجمے کے مصنف کی ذہنی، نظریاتی اور فکری پس منظر کے بارے میں کچھ تحقیق ضرور کر لی جائے ورنہ استفادہ اور ہدایت درکنار گمراہی کا خطرہ اور خدشہ ہے کیونکہ منظّم طور پر بعض تراجم صرف اسی ناپاک مقصد سے شائع کئے گئے ہیں کہ ناواقفِ حال قارئین کو قرآن مجید سے، اس کے پیغام سے اور اس کے بنیادی عقائد سے بدظن بلکہ متنفر کیا جائے، علوم القرآن کی متعدد جہتوں پر بلاشبہ گزشتہ صدیوں میں اور بحمد اللہ آج بھی گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے لیکن شومئ قسمت سے قرآنیات کا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے کہ تراجم پر نقد و نظر ہو، ان کے معیار کو پرکھا جائے، مترجمین کے ذہنی سانچے کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے امتیازات، تفردات اور تسامحات کو منظر عام پر لایا جائے اس ذیل میں بالخصوص غیر مسلم اہل قلم کے تراجم کے علمی تعاقب کی فوری ضرورت ہے تاکہ بے خبر قارئین فتنے سے محفوظ اور مامون رہیں۔

زیر نظر مقالے کی ابتداء میں اس چار سو سالہ قدیم روایت کے نمایاں پہلوؤں اور

تازہ ترین رجحانات کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے بعد قابل ذکر انگریزی تراجم کو یکے بعد دیگرے نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ عیسائیت/مغرب اور اسلام/مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان دو مذاہب عالم کا تعارف ایک دوسرے سے عین میدان جنگ میں بہ طور حریف ہوا۔تقریباً دوسو سال کے طویل عرصے اور پورے یوروپ اور عالم اسلام کو محیط جغرافیائی علاقے میں برپا صلیبی جنگوں (۱۰۹۹ء سے ۱۲۷۱ء تک) نے اس مذہبی منافرت کی آگ کو اور ہوا دی۔ اس کے بعد کی تاریخ بھی پے در پے تصادموں اور محاربوں سے داغ داغ ہے۔ فتح اور سقوطِ اندلس، فتح قسطنطنیہ،صدیوں تک دراز استعماریت کا تاریک دور،خلافت عثمانیہ کے خاتمے سے ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کے قابل نفریں حملے تک۔اس باہمی جنگ وجدال کے تاریک سائے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید جیسے بظاہر خالصتاً علمی میدان پر نظر آتے ہیں۔ روز اول ہی سے کلیسا (Church) کے زیر اہتمام اسلام کے خلاف دشمنی کی جو فضاء بنائی گئی اس میں قرآن مجید کا معروضی، دیانت دارانہ مطالعہ مغرب میں گویا خارج از امکان رہا۔کلیسا نے اسلام کو بہ طور آسمانی مذہب اور قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم ہی نہیں کیا۔ نتیجتاً مغرب میں مطالعۂ اسلام کا مقصود صرف یہ رہا کہ اسلام کو ہر ممکن عیب اور سقم سے متہم کیا جائے، اسے عقل اور اخلاق سے عاری اور متشدد بلکہ جنگجو یانہ طرز حیات سے تعبیر کیا جائے تا کہ اہل مغرب کے لیے اسلام/قرآن مجید/سیرت طیبہ کے پیغام میں مطلق کوئی کشش نہ رہے اور ان کے مائل بہ اسلام ہونے کا کوئی امکان نہ رہے۔اس کا جیتا جاگتا ثبوت اولین انگریزی ترجمۂ قرآن از ALEXANDER ROSS (۱۶۴۹ء) کے سرورق کی یہ عبارت ہے:

The Alcoran of Mahomet, Translated out of Arabic for the satisfaction of all that desire to looking into the Turkish vanities. [۲]

ترجمہ: ''محمد القرآن، عربی سے ترجمہ-ان افراد کے لیے جو ترکوں کے بے اصل مذہب کے بارے میں اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں''۔

راس (Ross) کی اس تحقیق کے مطابق نہ صرف قرآن مجید (معاذ اللہ) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے بلکہ اسلام صرف ترکوں کا مذہب ہے۔ اس انگریز مترجم کی جہالت کا ایک اور ثبوت خود اس کے ہم مشرب غیر مسلم مستشرقین نے فراہم کیا ہے کہ یہ عربی سے قطعاً نابلد تھا اور اس کا انگریزی ترجمہ دراصل فرانسیسی مترجم قرآن Du Ryer کے ترجمے کا انگریزی چربہ ہے۔[۳]

جارج سیل (George Sale) نے ۱۷۳۴ء میں اگلا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ ان کو لندن کی انجمن فروغ عیسائیت (Society for the Promotion of Christian Knowledge) نے بائبل کے عربی ترجمے کی ذمہ داری تفویض کی تھی تاکہ ''گمراہ'' عرب آغوشِ عیسائیت میں اپنی نجات کا سامان پائیں اس مقدس فریضے سے فارغ ہونے کے بعد موصوف نے یہ بیڑا اٹھایا کہ اپنے ترجمے کے ذریعے وہ بنی نوع آدم کو قرآن مجید کے ''جعل وفریب'' سے خبردار کریں۔ ان کو یقین کامل تھا کہ ''فضل ربانی سے پروٹسٹنٹ عیسائی اسلام کی بیخ کنی میں ضرور کامیاب ہوں گے''۔[۴] قرآن مجید کے آفاقی پیغام سے قارئین کو دور رکھنے کے لیے متن قرآن مجید کو موصوف نے کس حد تک مسخ کیا ہے اس کا کچھ اندازہ ان دو مثالوں سے ہوتا ہے:

۱- قرآن مجید میں مستعمل لفظ ''عبد'' پر حاشیہ یہ چڑھایا ہے کہ چونکہ صرف غلاموں ہی نے اسلام قبول کیا تھا اس لیے قرآن مجید میں خطاب کا یہ صیغہ استعمال ہوا ہے۔

۲- ''یا ایھا الناس'' کا ترجمہ انتہائی بدطینتی کے ساتھ O Makkans کیا ہے تاکہ قارئین پر تاثر یہ قائم رہے کہ اسلام اور قرآن مجید محض اہل مکہ یا عربوں کے لیے ہی تھے۔

اگلے انگریزی مترجم جے- ایم- راڈویل (J.M.Rodwell) نے براہ راست متنِ قرآن مجید کو درہم برہم کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔[۵] انھوں نے بزعم خود قرآنی سورتوں کو تاریخی اور نزولی اعتبار سے ازسرنو مرتب کیا۔ اس کے بعد کے مترجم

ای-ایچ-پالمر (E.H.Palmer) ہوئے ہیں۔ان کے ہمہ صفت موصوف ہونے کا کچھ اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جاسوسی کی پاداش میں انہیں قاہرہ میں قتل کیا گیا۔ان کا ترجمہ غلطیوں کا پشتارہ ہے اور ان اغلاط کی نشان دہی خود اہل فرنگ نے کی ہے۔٦ اگلے مترجم رچرڈ بیل (Richard Bell) نے اپنے پیش رو مترجم راڈویل کا تتبع کرتے ہوئے متنِ قرآنی کو اپنے مزعومات کے مطابق ترتیب دیا اس جارت کا اعلان ان کی تصنیف کے عنوان میں ملتا ہے۔٧ متن قرآنی میں ان کی مداخلت بے جا اس حد تک شدید ہے کہ جابجا انھوں نے یہ انکشافات کیے ہیں کہ فلاں آیت مصحف میں غلط مقام پر شامل ہوگئی ہے اور فلاں آیت درحقیقت شمولیت کے غرض سے تھی ہی نہیں اس کی حیثیت محض یادداشت کے نوٹ کی تھی جو مصحف میں در آئی ہے۔اس کے بعد کا انگریزی ترجمہ برطانوی جامعات میں عربی اور فارسی کے استاد اے-جے-آربیری (A.J.Arberry) کا ہے۔ ہرچند کہ یہ اسلام کے خلاف بغض وعناد سے مملو نہیں البتہ اغلاط سے یہ بھی خالی نہیں۔٨ قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے مطالعے میں شدید احتیاط کی ضرورت کی ایک ایک روشن مثال این-جے-داؤد (N.J.Dawood) کا انگریزی ترجمہ ہے۔ان کے نام سے گمان ان کے مسلمان ہونے کا ہوتا ہے لیکن درحقیقت موصوف عراقی نژاد یہودی ہیں۔ چونکہ یہ ترجمہ مغرب کے معروف اشاعتی ادارے پنگوئن (Penguin) کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے اس لیے ہر مغربی تعلیمی جامعہ اور کتب خانہ میں باریاب ہے۔اپنے پیش لفظ میں مترجم نے اسلام کی تصویر کشی قتل اور غارت گری کے حوالے سے کی ہے اور عہد نبوی میں حجاز میں مقیم یہودیوں پر مفروضہ ظلم اور ستم پر نوحہ گری کی ہے۔٩ ١٩٥٥ء کے بعد کسی مستشرق کا نیا انگریزی ترجمہ منظر عام پر نہیں آیا تھا خیال یہ تھا کہ مسلمانان عالم میں انگریزی سے براہ راست واقفیت اور ان کے روز افزوں تعلیمی بیداری کے پیش نظر یہ فتنہ اپنی موت آپ مرجائے گا چونکہ مغرب میں اب ہر طرف غلغلہ معروضی مطالعے، علمی دیانت داری، بین المذہبی افہام اور تفہیم اور تکثیری معاشرے کا ہے اس لیے بھی یہ خدشہ نہ تھا کہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے کسی نئے انگریزی ترجمے میں قرونِ وسطیٰ کے تعصبات جلوہ گر ہوں

گے لیکن ۲۰۰۷ء میں شائع شدہ اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے گزشتہ ۴۰ سال سے بحیثیت استاد وابستہ ایلن جونز (Alan Jones) کا تازہ ترین انگریزی ترجمہ اسلام دشمنی سے مملو ہے۔ مترجم کی دانست میں قرآن مجید کلیتاً بائبل اور دیگر مآخذ سے مستعار ہے اور محض مجادلے اور مناظرے پر مشتمل اور نظم وترتیب سے یکسر خالی۔

غرضیکہ مستشرقین کے یہ تراجم قارئین میں قرآن مجید سے نفور پیدا کرتے ہیں ان کے مطالعے میں از حد احتیاط لازم ہے۔

قرآن مجید کے خلاف مستشرقین کے اس فتنے کے سدّباب کی سعادت اوائل بیسویں صدی میں برصغیر ہندوپاک کے مسلمان علماء اور فضلاء کے حصے میں آئی۔ ہرچند کہ ابوالفضل (م ۱۹۵۶ء) حیرت دہلوی (م ۱۹۲۹ء) اور غلام سرور (پ ۱۸۷۳ء) اب بالکل ہی غیر معروف اور گمنام ہو چکے ہیں یہ وہ اولین مسلمان مترجمین قرآن مجید تھے جنھوں نے مستشرقین کے الزامات کی تردید اور قرآن مجید کی حقانیت کو منظر عام پر لانے کا لائق تحسین فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد کے مسلم مترجمین نے خدمت قرآن کی اور راہیں بھی تلاش کیں، جس کی تفصیل ذیل میں ہے، اہم نکتہ یہ ہے کہ اوائل بیسویں صدی میں مسلمان مترجمین نے اس میدان میں قدم رکھے اور اب اس علمی روایت کے گویا امین اور علم بردار ہیں کہ ۱۹۸۰ء کے بعد سے ان کے تراجم اور ایڈیشنوں کی تعداد مستشرقین کے تراجم سے کہیں زائد ہے، ذیل میں صرف ممتاز مسلم مترجمین کا تنقیدی محاکمہ پیش ہے کہ ان کی تصانیف سے قرآن مجید سے استفادے کے کون سے نئے باب وا ہوئے ہیں اور قارئین کو ان سے کیا ذہنی، فکری اور علمی رہنمائی ملتی ہے۔

عبداللہ یوسف علی کے ترجمے (۱۹۳۴-۱۹۳۷ء) کی زبان اب بڑی حد تک متروک اور نوجوان نسل کے لیے گویا ناقابل فہم ہو چکی ہے۔ البتہ اپنے مفصل اور جامع حواشی کے لحاظ سے اس تصنیف کی افادیت ہنوز باقی ہے، چونکہ عبداللہ یوسف علی تاریخ، صنمیات، الٰہیات، ادب اور علوم جدیدہ کے شناور تھے ان کے حواشی میں یہ علم وفضل پوری طرح جلوہ گر ہے، البتہ عقائد کی تشریح اور تفسیر کے باب میں ان کے حواشی معذرت خواہانہ طرز فکر،

تجدد زدہ ذہن اور متصوفانہ نقطۂ نظر کی چغلی کھاتے ہیں۔قرآن مجید میں تذکرہ خواہ معجزات کا ہو، امورِ غیب کا ہو، جنت کے لذائذ اور دوزخ کے شدائد کا ہو، ملائکہ،حور اور جن کا ہو یا یوم آخرت کی تفصیلات کا عبداللہ یوسف علی ان سب کی تاویل بطور علامت، استعارہ اور مجاز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عذاب اور ثواب ان کی دانست میں محض روحانی کیفیات ہیں۔ اس تلبیس کو رفع کرنے کے لیے سعودی عرب کی وزارت برائے مذہبی امور نے اس ترجمے پر جامع نظر ثانی کی اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن بڑی حد تک مذکورہ معائب سے پاک ہے، بہر کیف اس انگریزی ترجمے کے مطالعے اور استفادے میں ایک حد تک احتیاط لازم ہے۔

اس کے برعکس عبدالماجد دریابادی کا انگریزی ترجمہ (۱۹۵۷ء) اور اس کے حواشی عقائد کی تعبیر وتشریح کے لحاظ سے اہل السنّت والجماعت کے نمائندہ ہیں۔دریابادی کا انگریزی ترجمہ متنِ قرآنی کے بڑی حد تک تابع ہے انھوں نے اس ضمن میں التزام اس حد تک کیا ہے کہ اپنے انگریزی ترجمے کے جملوں کی ساخت اور نحوی ترتیب تک کو اصل عربی متن کے مطابق رکھا ہے۔ترجمۂ قرآن مجید کے باب میں یہ احتیاط فی نفسہٖ محمود ہے البتہ اس سے ترجمے کا حسن، بے ساختگی، روانی اور محاورۂ بیان متاثر ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر ترجمے کی زبان سرتاسر لفظی، مصنوعی اور نامانوس محسوس ہوتی ہے۔مزید برآں عبداللہ یوسف علی کی مانند دریابادی کی بھی انگریزی زبان اب متروک کے درجے میں داخل ہے۔البتہ اس کے حواشی جدید تعلیم یافتہ طبقے اور نومسلموں کے حق میں اکسیر ہیں کیونکہ دریابادی مغربی فلسفے اور ذہن سے براہ راست واقف تھے۔وہ اوائل بیسویں صدی کے فلسفے کے گریجویٹ تھے اور اپنے دورِ نوجوانی میں ایک عشرے تک تشکیک اور الحاد کی وادی میں بھی سرگرداں رہے تھے اس لیے وہ مذہب اور بالخصوص اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے تحفظات کا درک رکھتے تھے اپنے تفسیری حواشی میں انھوں نے ایسے قارئین کی رعایت رکھی ہے اور وہ اسلام کی حقانیت کو ان کے ذہنی سانچے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اجاگر کرنے میں بڑے کامیاب رہے ہیں۔علوم جدیدہ پر عبور کے باعث ان کے تفسیری حواشی میں مذاہبِ عالم، اثریات، تاریخ اور جغرافیہ کا بڑا موثر استعمال اسلام کی دل نشیں تشریح کے لیے ہوا ہے۔

انھوں نے مستشرقین کے الزامات اوراعتراضات کا بھی مدلل جواب دیا ہے اور پورے اعتماد اورایقان کے ساتھ معجزات اور دیگر امورِ غیب کا اثبات کیا ہے۔ان کے حواشی قدیم اور جدید کا متوازن امتزاج پیش کرتے ہیں کہ وہ کلاسیکی تفسیری سرمایے کے خوشہ چین بھی ہیں۔اس ترجمۂ قرآن مجید سے بلاشبہ رجوع الی القرآن کے مقصد کے حصول میں کامیابی مل سکتی ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن اصلاً اردو میں ہے جو ۱۹۷۲ء میں ۶ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی اس کا مکمل انگریزی ترجمہ Meaning of the Quran پاکستان سے ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۸۸ء سے برطانیہ کے موقر علمی ادارے اسلامک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تفہیم کا نیا ، معیاری انگریزی ترجمہ Towards Understanding the Quran کے عنوان سے زیر اشاعت ہے اب تک اس کی ۹ جلدیں سورہ الصافات تک شائع ہوچکی ہیں۔تفسیر کے میدان میں سید مودودی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عام قارئین کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے پیغام الٰہی کی مؤثر، جامع اور منضبط ترجمانی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کی ترجمانی اولین ترجیح ہے۔ان کے حواشی مفصل بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی کہ ان کے مطالعے سے اسلام کی تصویر بطور ایک مکمل نظام حیات کے نمایاں ہوتی ہے اور قارئین کے ایمان اورایقان میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔سید مودودیؒ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے علمی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں۔وہ ان کی فکری تربیت کا اہم لیکن انتہائی نازک فریضہ انجام دینے میں بڑے کامیاب ہوئے ہیں اس میں کچھ دخل ان کے استدلالی اور پرزور اسلوب اور نثر کا بھی ہے۔قرآن فہمی کے باب میں اس تصنیف کے مفید بلکہ گراں قدر ہونے میں کوئی شبہ نہیں البتہ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سیاست میں جماعت اسلامی کی طالع آزمائی کے باعث سید مودودی اور ان کی تصانیف ان کے مخالفین کے لیے بالکل ہی ناقابل اعتنا ہیں اور ان سے استفادہ صرف جماعت اسلامی کے حلقے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مراکشی عالم دین محمد تقی الدین ہلالی اور محمد محسن خاں کی مشترکہ تصنیف The Noble Quran (۱۹۷۷ء) اہل السنّت والجماعت کے عقائد اور افکار کی ترسیل کی ایک

کامیاب اور وقیع کاوش ہے۔ اس ترجمۂ قرآن کی مدد سے عام قارئین کی رسائی کلاسیکی مفسرین مثلاً طبری، قرطبی اور ابن کثیر کی آراء سے ہو جاتی ہے۔ متن کا انگریزی ترجمہ بڑی حد تک اصل کے قریب ہے اور وضاحتی عبارتیں بالالتزام قوسین میں درج ہیں جو کہ مترجمین کے تقوی اور احساسِ فرض شناسی پر دال ہے۔ اس سے بھی اہم تر نکتہ یہ ہے کہ یہ وضاحت تمام تر مستند احادیث اور روایات سے ماخوذ ہے۔ یہی رنگ قرآنی تصورات اور اصطلاحات کی تشریح میں بھی ملتا ہے۔ رجوع الی القرآن کے ضمن میں کلاسیکی تفسیری سرمایے سے قارئین کو روشناس کرنے میں اس تصنیف کا مقام نہایت اعلیٰ ہے اور اسی میں اس کی اصل افادیت مضمر ہے۔

کلاسیکی تفسیری روایت سے قارئین کو واقف کرنے کا خوشگوار فریضہ مصری نژاد محمد خطیب نے بھی اپنے انگریزی ترجمے The Bounteous Quran (۱۹۸۶ء) کے ذریعے انجام دیا ہے۔ ابن کثیر اور قرطبی جیسے اساطین کے علاوہ ان کے مآخذ میں زمخشری، رازی، سیوطی اور نسفی کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ گو کہ ہلالی اور محسن خاں کی بہ نسبت ان کے حواشی مختصر بھی ہیں اور تعداد میں بھی کم لیکن یہ انگریزی داں قارئین کو تفسیر بالماثور سے استفادے کا ذریعہ ہیں۔ چونکہ اس ترجمے کا ناشر ایک معروف مغربی اشاعتی ادارہ Mac.Millan ہے اس کا فیضان غیر مسلم قارئین اور دیارِ مغرب میں مقیم مسلم نوجوان نسلوں کو بھی پہنچنے کی توقع ہے۔

دیارِ مغرب میں برصغیر ہند و پاک کے لاکھوں مسلمانوں کے مقیم ہونے اور وہاں نئی مسلمان نسلوں کے پروان چڑھنے کے نتیجے میں یہ رجحان گزشتہ دو تین عشروں سے وہاں خاصا قوی ہے کہ برصغیر کے علماء کی اردو تفاسیر کو انگریزی جامہ پہنا کر ان سے ان نوجوان نسلوں کی فکری اور دینی تربیت کی جائے۔ اوائل بیسویں صدی کی ان تصانیف میں نہ آج کے بدلے ہوئے حالات اور ظروف کی کوئی رعایت ہے نہ موجودہ نسل کی ذہنی ضروریات کا کوئی اندازہ اور نہ آج کے درپیش مسائل کے اسلامی حل تلاش کرنے کی کوئی سعی۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس تنقید کا اطلاق ہرگز کلاسیکی تفسیری سرمایے پر نہیں کہ اس کی

حیثیت اہم ماخذ کی ہے اور اس کی تاریخی اہمیت اور افادیت بھی ہے۔ اس کا ہدف اوائل بیسویں صدی کی وہ اردو تفاسیر ہیں جو تقریباً ایک صدی قبل کی مخصوص ذہنی اور نظریاتی فضاء میں اور اس دور کے قارئین کے لیے تصنیف کی گئی تھیں اور اپنے دور میں بلاشبہ بڑی کامیاب بھی رہی تھیں البتہ اب ان کا من وعن انگریزی ترجمہ پیش کرنا محض تبرک کے حصول کی کوشش سے زیادہ اور کچھ نہیں کیونکہ یہ آج کے قارئین کی رہنمائی سے قاصر ہیں۔

اسی رجحان کا نمائندہ محمود الحسن کے ترجمۂ قرآن مجید اور شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی کا انگریزی ترجمہ The Noble Quran (۱۹۹۱ء) ہے۔ یقیناً یہ ایک مستند تفسیر ہے اور اس کے حواشی قرآنی تعلیمات اور احکام کی ایسی دل نشیں وضاحت کرتے ہیں کہ قارئین کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہوتا ہے البتہ اس کا اسلوب، دلائل اور منہج قدیم رنگ کے ہیں لہٰذا آج کے قارئین کے لیے ان کی افادیت محدود ہے۔ اس کے انگریزی مترجم پاکستان نژاد اشفاق احمد ہیں۔ انھوں نے گُل یہ کھلایا ہے کہ علامہ عثمانی کے حواشی کے پہلو بہ پہلو اپنے حواشی بھی شامل کردیے ہیں۔ مترجم کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ زیر ترجمہ تصنیف میں ایسے اضافے کرے جن کا اصل تصنیف یا صاحب تصنیف سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ علامہ عثمانی کی وفات (۱۹۴۹ء) میں ہوئی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں پاکستان میں نظام مصطفیٰ تحریک کے پرچم تلے جو کچھ ہوا اس کا قرآن مجید اور تفسیر عثمانی سے کوئی براہ راست تعلق نہیں لیکن مترجم نے اس تحریک کی تفصیلات بھی ٹانک دی ہیں اور جابجا حواشی بھی اپنے دور کی پاکستانی سیاست کے بارے میں بھی۔ اس سے اس تصنیف کا وقار مجروح ہوا ہے۔ مزید برآں، ان مترجم کو انگریزی زبان و بیان سے مطلق مس نہیں، غیر معیاری بلکہ صریحاً غلط انگریزی میں تصنیف قارئین کو قرآن مجید کی جانب راغب کرنے نہیں بلکہ اس سے بُعد کا باعث بنتی ہے۔

The Majestic Quran (۲۰۰۰ء) جو کہ جدید جامعات سے وابستہ چار ترک علماء وفضلاء کی مشترکہ کوشش کا ثمر ہے۔ رجوع الی القرآن میں خاصا مفید ہے۔ اولاً ترکی جیسے اسلام کے عین گڑھ سے شعائر اسلامی کی بیخ کنی کا جو ناپاک منصوبہ کمال اتاترک نے بنایا تھا اور جس پر گزشتہ ۹۰ سالوں سے ترکی فوج اپنے پورے قہر کے ساتھ عمل پیرا رہی

ہے اس کی تردید اور شکست کی تابناک مثال یہ انگریزی ترجمۂ قرآن مجید ہے۔ اس کے مقدمے اور حواشی میں پورے شرح اور انبساط کے ساتھ ان ترک فضلاء نے آج کے دور میں اسلام کی آفاقیت اور قرآن مجید کی حقانیت کو اُجاگر کیا ہے اور حالیہ برسوں میں مغرب میں قبول اسلام کے روز افزوں رجحان کو قرآن مجید کے اعجاز اور اسلام کے دینِ فطرت ہونے سے منسوب کیا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ترجمے اور حواشی کی عبارتیں بڑی حد تک عبداللہ یوسف علی اور محمد مارماڈیوک پکتھال کے پیش رو تراجم سے مستعار ہیں لیکن ترک مصنفین کی یہ کاوش ترکی، مغرب اور عالم اسلام میں رجوع الی القرآن کی بیّن مثال ہے۔

ترکی ہی میں رجوع الی القرآن کی اس سے بھی زیادہ وقیع اور کامیاب مثال علی انال کا انگریزی ترجمہ The Quran with Annotated Interpretation (۲۰۰۶ء) ہے۔ علی قدیم تفسیری روایت سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے ہاں جابجا حوالے طبری، ابن کثیر اور دیگر کلاسیکی مفسرین کرام کے ملتے ہیں۔ البتہ دور حاضر میں اسلام کے معنی اور پیغام کو آشکار کرنے کے لیے فاضل مصنف نے ان کے پہلو بہ پہلو احیائے اسلام کے معاصر علم برداروں مثلاً بدیع الزماں سعید نورسی، سوات یلدرم، فتح اللہ گلین اور سید مودودی کے صالح اور ایمان افروز افکار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ تصنیف قدیم اور جدید کا ایک حسین سنگم نظر آتی ہے۔ مترجم کا مفصل مقدمہ اور حواشی تفسیر بالماثور کی روایت کا تسلسل ہیں بعض مقامات پر زیر مطالعہ قرآنی آیت کی توضیح اور تشریح دیگر متعدد ہم معنی قرآنی آیات کے حوالے سے کی گئی ہے۔ کچھ کیفیت قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید ہی کے زریں اصول پر عمل درآمد کی۔ بائبل سے موازنے کے پس پشت بھی مصنف کا مقصود قرآن مجید کی حقانیت کو منظر عام پر لانا ہے۔ حواشی کے علاوہ مصنف نے دس ضمیموں میں قرآنی تصورات، اصطلاحات اور تلمیحات کی وضاحت کی ہے جو کہ مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ غرضیکہ رجوع الی القرآن کے نقطۂ نظر سے یہ تصنیف اہم بھی ہے اور کارگر بھی۔

اب تک شائع ۶۵ سے زائد مکمل انگریزی تراجم قرآن میں رجوع الی القرآن کے مقصد کے حصول کے لیے سب سے کارآمد تصنیف ڈاکٹر ذکی حمادکی The Gracious Quran

(۲۰۰۷ء) ہے۔ مصر نژاد اور جامعہ ازہر اور شکاگو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور عرصۂ دراز سے امریکہ میں مقیم اور تحریک اسلامی کی سرگرمیوں میں فعّال حمّاد کو جدید اور مغربی تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی ساخت کا بخوبی ادراک ہے اسی کا فیضان ہے کہ ان کی تصنیف بڑی حکمت اور خوش اسلوبی سے اس طبقے کی فکری رہنمائی فراہم کرنے میں کامیاب ہے۔ قرآن مجید سے نا آشنا انگریزی خواں قارئین کو قرآنی اسلوب سے مانوس کرنے کے لیے ان کے طباع اور رسا ذہن نے کئی نئے تجربے کیے ہیں مثلاً سورتوں کی فہرست میں ہر سورہ کے عنوان کے لفظی ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کے بنیادی موضوعات کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ مثلاً سورہ الکافرون کے عنوان کا ترجمہ Unbelievers اس اضافے کے ساتھ ہے: ''وہ سورہ جس میں حضور اکرم ﷺ کو مطلع کیا گیا ہے کہ کفار کے باطل معبودوں اور خدائے واحد کی عبادت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں''۔ اسی طرح لفظی ترجمے کے بجائے حمّاد نے قرآنی مفہوم کی ترسیل کی مخلصانہ اور بھرپور سعی کی ہے۔ محض لفظی ترجمہ، قرآن مجید کے اسلوب اور عربی محاورۂ بیان سے نا آشنا قارئین کے لیے بعض مقامات پر ان کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مثلاً سورہ القارعہ، آیت:۹ ''فامه هاویه'' کا حد درجے لفظی ترجمہ نومسلم مترجم قرآن مجید عائشہ اور عبدالحق بیوجی نے یہ کیا ہے: "His motherland is Hawiya" دوسرے نومسلم مترجم ٹی-بی- اروِنگ (الحاج تعلیم علی) کی عبارت یہ ہے: "He will have a pit to mother him"۔ یہ ترجمہ کیا کچھ چیستاں کی کیفیت نظر آتی ہے اور قارئین کی قطعاً کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔ حمّاد نے ایسے مقامات کی تشریح میں مفہوم کی قابل فہم ترجمانی کو لفظی ترجمے پر مقدم رکھا ہے۔ البتہ پیغام قرآنی کی ترجمانی کا فریضہ بڑا نازک ہے۔ مترجم کے لیے لازم ہے کہ وہ متن کی ترجمانی کی آڑ میں اپنی ذاتی آراء، اختراعات، فکری اور نظریاتی مرغوبات کو عین متن کے معنی اور مفہوم کے طور پر نہ پیش کرے۔ ضال اور مضل فرقوں اور مستشرقین نے اپنے مزعومات کو متن قرآنی سے خلط ملط کر کے قارئین کو گمراہ کرتے رہے ہیں اور فتنے بپا کرتے آئے ہیں۔ اسی خدشے کے باعث علماء کا یہ اصرار رہا ہے کہ ترجمے کی عبارت میں حتی الامکان زائد از متن کوئی عبارت شامل ہی نہ کی جائے۔

توضیحی اضافوں کو قوسین میں درج کیا جائے تاکہ کلام الٰہی اور بشری اضافوں کے مابین خطِ امتیاز قائم رہے اور قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ حمّاد نے بڑی حد تک ترجمانی کو ترجمے سے ممیّز رکھا ہے گو یہ احتیاط بعض مقامات پر مفقود ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس تصنیف کے مطالعے سے قرآن مجید سے استفادہ ممکن بھی ہے اور آسان بھی۔

طریف خالدی کا The Quran: A New Translation (۲۰۰۸ء)

ہمارے دور کے انگریزی داں قارئین کے لیے رجوع الی القرآن کے مقصد میں بڑی حد تک ممد اور معین ہے۔ اس کے مصنف فلسطین نژاد پروفیسر طریف خالدی مغرب کی جامعات میں اسلامیات کے ماہر کے طور پر معروف ہیں۔ یہ ترجمہ مشہور مغربی ناشر پینگوئن نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے لہٰذا یہ بآسانی غیر مسلم حضرات اور اہل مغرب کی دسترس میں رہے گا۔ اپنے دیباچے میں خالدی نے شرح وبسط کے ساتھ اسلام کی ابدی صداقت اور معنویت، اسلام میں قرآن مجید کی کلیدی حیثیت، ملتِ اسلامیہ کے قرآن مجید سے شغف اور قرآنی تصورات اور تعلیمات کو واضح کیا ہے۔ یہ تعارف اہل مغرب کے اسلام کے خلاف مسموم اذہان اور قلوب کے لیے اس اعتبار سے تریاق ہے کہ خالدی نے ان کی ذہنی سطح اور ان ہی کے محاورۂ بیان کے مطابق قرآن مجید کی عظمت جاگزیں کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر پورے وثوق کے ساتھ ان کا یہ ایمان افروز جملہ: ''قرآن کے پیغام کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے مخاطب مرد اور عورت دونوں ہی ہیں۔ تمام کتب سماوی میں صرف قرآن نے مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو ملحوظ رکھا ہے''۔ اسی طرح آج کے پر آشوب دور میں جب کہ اسلام اور تشدد بلکہ دہشت گردی لازم اور ملزوم متصور کیے جاتے ہیں خالدی نے مدلل انداز میں یہ موقف پیش کیا ہے کہ اسلام امن اور آشتی اور مذاہب عالم میں باہمی تعلقات اور یگانگت کا علم بردار ہے۔ رجوع الی القرآن کے نقطۂ نظر سے اس ترجمے کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ ترجمے میں حتی الامکان باہمی مکالمے کے انداز کو اختیار کیا گیا ہے اور حال کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ قارئین اپنے آپ کو قرآن مجید کا براہ راست مخاطب سمجھیں۔ بعض مقامات پر خالدی مغربی فکر و فلسفے اور مستشرقین کی آراء سے قدرے

مرعوب بلکہ مغلوب نظر آتے ہیں لیکن بحیثیت کلی یہ تصنیف قرآن فہمی میں معین ہے۔

انگریزی تراجم کے ضمن میں یہ ایک افسوس ناک بلکہ شرم ناک حقیقت ہے کہ مستشرقین ہی پر موقوف نہیں، قادیانی، مسلکی عصبیت میں مبتلا اور تجدد زدہ افراد نے بھی ترجمۂ قرآن مجید کی آڑ میں پیغام قرآنی کو مسخ کرنے اور قارئین کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آزادیٔ اظہارِ رائے ہر فرد کا حق ہے، لیکن قرآن مجید کی تفہیم اور تشریح کے نام پر صریح نصوص قرآنی کا انکار اسلام کے بنیادی عقائد سے انحراف، اسلام کے بنیادی ماخذ مثلاً سیرت نبوی، حدیث اور صحابۂ کرام کا استخفاف علمی خیانت کے ذیل میں داخل ہیں۔ کلامِ الٰہی کی ترجمانی کے مدّعی حضرات کے قلم سے کلام الٰہی کی معنوی تحریف بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ متعدد مترجمین نے رجوع الی القرآن تو درکنار، قرآن فہمی کے باب میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کیے ہیں بلکہ فتنے برپا کیے ہیں۔ عبرت کے نقطۂ نظر سے صرف چند مثالیں پیش ہیں۔

معجزات کا انکار اور تاویل ایک حد تک عبداللہ یوسف علی کے ترجمے میں ہے لیکن اس کی لَے نومسلم مترجم محمد اسد Message of the Quran (۱۹۸۰ء) اور پاکستان نژاد احمد علی کے Al-Quran: A Contemporary Translation (۱۹۸۴ء) کے ہاں اور تند اور شدید ہے۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر محمد اسد کی تصانیف بلاشبہ قابل قدر ہیں وہ دور جدید کے فکری رجحانات کے شناور ہیں البتہ اپنے ترجمۂ قرآن مجید کے بعض حواشی کی روشنی میں وہ تجدّد دار و معذرت خواہانہ طرز فکر اور نام نہاد عقلیت پرستی کے نقیب اور منّاد نظر آتے ہیں۔ اسی رنگ میں احمد علی کے حواشی بھی رنگے ہوئے ہیں۔ پیغام الٰہی کو اپنی ذاتی آراء کے تابع بناتے ہوئے انھوں نے عورتوں کی شہادت، جنگی قیدیوں، تعدد ازدواج، مطلق صنفی مساوات، معجزات اور امور غیب کی گمراہ کن تعبیر اور تشریح کی ہے۔ اس قماش کے مترجمین میں تازہ ترین اضافہ ایران نژاد خاتون لیلی بختیار کا ہوا ہے۔ ان کی تصنیف The Sublime Quran (۲۰۰۷ء) میں ان کی اصل وفاداری قرآن مجید اور سنت کے بجائے تجدد زدگی اور تحریکِ آزادی نسواں سے نظر آتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ

گمراہ کن ترجمۂ قرآن مجید The Quran: A Reformist Translation (۲۰۰۷ء) ہے۔ ہر چند کہ اس کے تینوں مترجمین کے نام مسلمانوں کے سے ہیں: ادیب یوکسل، الشیبان اور شُلٹے نافع لیکن اپنے مندرجات کے لحاظ سے اس کا مقصد اسلام، اس کے مآخذ، اس کی تعلیمات اور اس کے عقائد کو منہدم کرنا ہے۔ ان کی دانست میں کل ذخیرۂ حدیث، صحابہ کرام کا اسوہ اور سارا تفسیری اور فقہی سرمایہ نا قابل اعتبار بلکہ لائق سوختنی ہے۔ ان کی تفسیر بالرائے کی چند عبرت ناک مثالیں یہ ہیں:

(۱) سورہ سبا آیت: ۱۳ کی رو سے سلیمانؑ مجسمہ سازی کے سرپرست تھے لیکن علماء اور فقہاء مجسمہ سازی کی مخالفت کو عین اسلام قرار دیتے ہیں جب کہ یہی علماء خود حجر اسود کی پرستش کے عادی مجرم ہیں۔

(۲) سورہ الصافات میں مذکور واقعے کی روشنی میں ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کی قربانی کر کے اقدام قتل کا ارتکاب کیا۔

(۳) سورہ محمد آیت: ۴ کے معنی اور مفہوم سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ مسلم دہشت گرد پیدا ہوں گے۔'' العیاذ باللہ۔

قادیانی اہل قلم انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کے میدان میں بڑے فعّال رہے ہیں اپنے غیر اسلامی مزعومات کو قرآن مجید سے ثابت کرنا ان تراجم کا اصل مقصود رہا ہے۔ مختلف مسالک کے نمائندہ تراجم میں بھی اپنے مخصوص نظریات اور عقائد کو قرآن مجید کی رو سے جائز بلکہ راجح قرار دینے کی بھرپور کوشش ملتی ہے۔ اس مقالے میں اس کی تاریخ، تفصیل اور مثالیں بیان کرنے کی گنجائش نہیں کہ یہ ایک علیٰحدہ مقالے اور علیٰحدہ مذاکرے کا موضوع ہے البتہ اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ تفسیر بالرائے کے آئینہ دار تراجم رجوع الی القرآن کے مقصد میں مفید ہونا تو درکنار قرآن فہمی میں بھی مانع اور مزاحم ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں گمراہی کی ہر شکل سے محفوظ و مامون رکھے اور صراط مستقیم پر چلنے اور قائم رہنے اور رجوع الی القرآن کی توفیق بخشے۔ (آمین)

حوالے وحواشی

ل تفصیل کے لیے دیکھیے:

World Bibliography of Translations of the Meanings of the Holy Quran: 1515-1980. Istanbul, OIC IRCICA, 1986.

ع اس ترجمے کا اولین نادر ایڈیشن شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

ع تفصیل کے لیے دیکھیے:

Abdur Raheem Kidwai, Translating the Untranslatable: ACritical Guide to 60 English Translations of the Quran. Delhi, Sarup and Sons, 2011, pp.237-240.

ع Translating the Untranslatable, pp.241-244

ھ Translating the Untranslatable, pp.245-248

ل Translating the Untranslatable, pp.249-257

ے The Quran: Translated with a Critical Rearrangement of the Surahs

ھ Translating the Untranslatable, pp.258-270

ع Translating the Untranslatable, pp.271-275

قرآن مجید کے بعض مقامات اور ہمارے مفسرین

نعیم الدین اصلاحی

اللہ کی سب سے بڑی نعمت جس پر باقی تمام نعمتوں کے نعمت ہونے کا دار و مدار ہے، اس کی مرضیات کا وہ علم ہے جو اس نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں کو عطا فرمایا ہے، اس نعمت کی تکمیل اور اس کا اتمام امت مسلمہ پر قرآن پاک کے ذریعہ ہوا، جو اللہ کے دین کو مکمل اور دائمی شکل میں پیش کرتا ہے۔

اس کتاب کی یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی آخری اور کامل کتاب ہے، بلکہ یہ وہ واحد کتاب ہے جس کے ذریعہ اللہ کی مرضیات کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں ہے کہ دنیا کے مختلف اقوام کے پاس اللہ کی جو کتابیں آئی تھیں ان کو انھوں نے ضائع کر دیا ہے یا ان کو محرف کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے اور ان پر تحریفات و توہمات کے دبیز پردے ڈال دئے ہیں، کہ ان کی حقیقی تعلیمات کا جاننا سخت دشوار اور اصل ہدایت اور بعد کے الحاقات میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے، یہ قرآن ہی ہے جو گذشتہ انبیاء کی تعلیمات اور آئندہ قیامت تک کے لیے اللہ کی مرضی معلوم کرنے کا واحد معتمد ذریعہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: (وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً......) (المائدہ:۴۸) قرآن پاک کی ان بنیادی خصوصیات کو سامنے رکھا جائے تو انسان اس بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والی ایک ہی کتاب ہے جو اس میں ہے حق ہے، جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ یہ واحد کتاب ہے جو نوع انسانی کے لیے حیات ہے جو اس سے منسلک ہوا وہ حقیقی زندگی سے ہمکنار ہوا۔ یہ کتاب ہدایت و ضلالت کے درمیان فیصلہ کرنے آئی ہے، جس نے اس کا دامن پکڑا اور اسے اپنایا، اس نے ہدایت پائی اور جس نے اسے چھوڑا وہ گمراہی کی نذر ہوا۔

یہ اللہ کی بخشی ہوئی وہ روشنی ہے جس کے ذریعہ ہر انسان اپنا سفر زندگی طے کر کے کامرانی سے ہم کنار ہوسکتا ہے اور جس سے محروم ہوکر تاریک وادیوں میں بھٹکنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوسکتا۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب دنیا کو وہ سیدھا راستہ دکھاتی ہے جو کامیابی اور کامرانی کا ضامن ہے، اور جس سے زیادہ سیدھا راستہ کوئی اور نہیں ہے۔(ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم......)(الاسراء/۹) یہ ہے اللہ کی سب سے بڑی نعمت جو ہمیں ملی ہے، یہ نعمت بھی ہے رحمت بھی، نور بھی ہے ہدایت بھی، حیات بھی ہے نصرت بھی، عدل وحق کی میزان بھی ہے اور خیر و برکت کا سرچشمہ بھی۔

مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امتدادِ زمانہ سے قرآن حکیم کے بہت سارے صحیح معانی ومطالب پردۂ خفا میں چلے گئے ہیں اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ایک ایک لفظ ایک ایک آیت کے مفہوم کے لیے بے شمار تاویلات پیش کردی گئی ہیں جس کا سلسلہ آج تک دراز ہے، ہمارے نزدیک صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ "القرآن لا یحتمل الا تاویلاً واحداً فقط" یعنی قرآن صرف ایک تاویل کا متحمل ہے۔

قرآن حکیم کی انقلاب انگیز تعلیمات کے سانچے میں اپنے فکر وعمل کو ڈھالنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ ایک ایک اسلوب اور ایک ایک آیت کے اندر فکر وتصور کی جو برقی رو بند ہے اسے کھول کر ہم اپنے فہم و تدبر کی رگوں میں دوڑا دیں۔ ذیل میں ہم قرآن کے ترجمہ وتفسیر کی کچھ مثالیں پیش کریں گے جس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ہم کہاں ہیں اور قرآن کہاں ہے، مثال کے طور پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج تاویلاتِ قرآنی کی صورت ایک ایسی عمارت جیسی ہے جس کے در ودیوار اکھڑے ہوئے ہیں چھتیں ٹپک رہی ہیں، روشندان بند ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس قرآنی عمارت کی اصلاح و مرمت کی جائے تاکہ اس کے اندر رہائش پذیر لوگوں کو فکر وتصور کی راحت ملے۔

قرآن کے بعض ترجمے اور تفسیریں

اس میں شک نہیں کہ یہ ملت اس پہلو سے بڑی خوش قسمت ہے کہ دنیا کی ہر زندہ زبان میں اس کی تفسیریں اور تراجم موجود ہیں اور امت ان سے بھرپور استفادہ بھی کر رہی ہے اور خود اردو زبان بھی اس نعمت سے بہرہ ور ہے اور مختلف تراجم اور تفسیریں عالم وجود میں آچکی ہیں اور اردو دنیا اس سے مستفید ہو رہی ہے جس میں چند تفاسیر تو نہایت ہی اہم ہیں: تفہیم القرآن-مولانا مودودیؒ، تدبر قرآن-مولانا امین احسن اصلاحیؒ، احسن البیان-مولانا جونا گڑھیؒ تفسیر مولانا صلاح الدین یوسفؒ، معارف القرآن-مولانا مفتی شفیع صاحبؒ۔ مذکورہ تفاسیر اردو دنیا کی معروف و متداول تفسیریں ہیں اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں نہایت ہی مقبول بھی ہیں۔اللہ تعالیٰ ان مفسرین کو جزائے خیر سے نوازے۔

اس سب کے باوجود یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا کوئی بھی ترجمہ خواہ کتنی ہی احتیاط اور باریک بینی سے کیا گیا ہو ان عظیم معانی کو کما حقہ ادا کرنے سے قاصر رہے گا جو قرآن کے معجزانہ متن میں پوشیدہ ہیں۔جس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو قرآن مجید کی درس وتدریس سے وابستہ ہے اور جس کو اوروں کے مقابلے میں قرآن مجید پر زیادہ غور وفکر کا موقع ملتا ہے۔اس مختصر سے مقالے میں کچھ مثالوں کے ذریعہ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کلام اللہ کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان وادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے ذریعہ معانی کی تفتیش کی جائے۔

''واؤ'' کا استعمال

علماءِ نحو ولغت اس کے معانی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ واو کبھی کبھی زائدہ بھی ہوتا ہے اور اس کی مثال میں: سورہ یوسف فلما ذھبوا به واجمعوا ان یجعلوه فی غیابة الجب واوحینا الیه(۱۵)سورہ صافات آیت ''فلما اسلما وتله للجبین ''(۱۰۳)اور سورہ زمر''حتی اذا جاء وھا وفتحت ابوابھا(۷۳) ''کو پیش کیا ہے۔واو زائدہ ہوتا ہے اس کے قائل کوفی علماءِ نحو ہیں جیسا کہ امام شوکانی نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔(۱)

عام طور پر بصری علماء کے اتباع میں عربی زبان و ادب کے ماہر مفسرین عظام نے ان آیات کی تفسیر میں 'لما' اور 'اذا' کے جواب کو محذوف مانا ہے۔(۲)

اسی طرح امام شوکانی نے بھی ان کے جواب کو محذوف مانا ہے۔ ''جواب لما محذوف''(۳)

اردو اور فارسی مترجمین میں حضرت شیخ سعدیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے ترجموں سے پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک واؤ نہ تو زائد ہے اور نہ ہی 'لما' اور 'اذا' کا جواب محذوف ہے۔

البتہ مولانا تھانویؒ نے سورہ یوسف میں 'لما' کے جواب کو محذوف بنایا ہے اور بریکٹ کے ذریعہ اس محذوف کو اس طرح کھولا ہے (تو جو کچھ تجویز کیا تھا عمل درآمد کیا) اسی طرح سورہ صافات میں بھی اس کو محذوف ہی بنایا ہے۔ چنانچہ سورہ صافات کی آیت فلما اسلما...... کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں ''جوابہ مقدر ای کان ما کان''(۴)

مگر سورہ زمر کی آیت کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے ''یہاں تک کہ جب اس جنت کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہی ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے اور نیز اہل کرم کے لیے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مہمان کے لیے عادت ہے کہ پہلے سے دروازہ کھول دیا جاتا ہے کما قال تعالیٰ مفتحة لهم الابواب۔(۵)

ان مترجمین کے برعکس مولانا مودودیؒ نے ان تینوں مقامات پر الگ الگ ترجمہ کیا ہے، سورہ یوسف آیت ۱۵ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''اس طرح اصرار کر کے جب اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف کو وحی کی''(٦)

یہاں مولانا نے واوحینا ھی کو 'لما' کا جواب بنایا ہے اور واو کو زائد مانا ہے۔ سورہ صافات: ۱۰۴-۱۰۳ کا ترجمہ کیا ہے۔ ''آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی یہاں پر 'ونادینٰہ' میں واو کا ترجمہ 'اور' کیا ہے اور زائد نہیں مانا ہے۔

سورہ زمر آیت ۷۳ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''یہاں تک جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو ان کے منتظمین ان سے کہیں گے۔' یہاں بھی 'وفتحت' میں 'واؤ' کا ترجمہ 'اور' سے کیا ہے۔ البتہ عام مترجمین ومفسرین کے برعکس وقال لھم خزنتھا میں واو کو زائد مان کر ترجمہ کیا ہے اور لگتا ہے کہ اسی کو 'اذا' کا جواب بنایا ہے۔(۷)

مولانا محمد جونا گڑھی کے صافات کے ترجمے سے پتہ چلتا ہے کہ سورہ یوسف آیت ۱۵ اور سورہ صافات آیت ۴-۱۰۳ میں واو زائدہ ہے مگر سورہ زمر آیت ۷۳ کا ترجمہ کیا ہے:''یہاں تک کہ جب اس کے پاس آجائیں گے اور دروازے کھول دئے جائیں گے'' یہاں پر واؤ کو زائد نہیں بنایا گیا ہے، البتہ آیت میں 'اذا' کا جواب کہاں ہے؟ ترجمہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

خلاصہ بحث یہ کہ ان تینوں آیتوں میں مترجمین ومفسرین کے درمیان 'اذا' کے جواب کے سلسلہ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ بعض مترجمین کے نزدیک واو زائد ہے جیسا کہ کوفی علماء کا خیال ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک 'اذا' اور 'لما' کا جواب محذوف ہے جیسا کہ علمائے بصرہ کی رائے ہے۔ دور جدید کے مفسرین میں مولانا فراہی کا جو مقام ہے اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے، مولانا فراہی سورہ یوسف آیت ۱۵ کی متعلق ارشاد فرماتے ہیں''ھھنا قولان للمفسرین منھم من قال ان جواب 'لما' محذوف وھو فجعلوہ فیھا و منھم من قال ان جوابھا واوحینا الیہ والواو زائدۃ ویمکن واللہ اعلم ان یکون جواب 'ولما' قولہ تعالیٰ ''قالوا یا ابانا اناذھبنا الخ ای لما فعلوا ھذہ الامور قالوا ھکذا ''(۸)

اس کی توضیح میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ بعض کے نزدیک لما کا جواب محذوف ہے اور وہ'' فجعلوہ فیھا '' ہے، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ لما کا جواب ''واوحینا الیہ'' ہے اور درمیان میں واو زائد ہے حالانکہ آگے آرہی آیت ''قالو یا ابانا ان ذھبنا '' بھی لما کا جواب بن سکتی ہے۔ یعنی ان تمام امور کی انجام دہی کے بعد انہوں نے اس طرح کہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے سورہ یوسف ۱۵ کی تاویل میں یہی رائے ظاہر فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''ان آیات میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے 'لما' کا جواب قالوا یا ابانا ہے بات کو سمیٹنے کے لیے بیچ کی کئی باتوں کو لما کے ذریعہ ادا کر دیا ہے۔'(۹)

سورہ صافات میں 'لما' کے جواب کے سلسلے میں کہتے ہیں ''فلما اسلما سے جو بات شروع ہوتی ہے وہ یہاں تک چلی آئی ہے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ 'لما' کا جواب کیا ہے؟ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ بعض اوقات 'لما'، 'اذا' اور اس نوع کے دوسرے شرطیہ جملوں میں جواب حذف ہوتا ہے اور متکلم کا زور کلام اس محذوف کا قائم مقام بن جاتا ہے، یہ طریقہ خصوصیت کے ساتھ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جواب کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہوتے ہیں۔(۱۰)

اور سورہ زمر میں لکھتے ہیں ''بعض اوقات جواب شرط کی نوعیت ایسی ہوتی ہے الفاظ کی تعبیر سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے مواقع میں اس کو حذف کر دیتے ہیں کہ ؎

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید (۱۱)

مولانا فراہی کے دوسرے نامور شاگرد اور مولانا امین احسن اصلاحی کے کے رفیق درس اور مولانا جلیل احسن ندوی کے تفسیر قرآن کے خصوصی استاد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کا خیال ہے کہ ان تینوں مقامات پر واؤ اتصال زمانی کے لیے ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی انھوں نے کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کیا ویسے ہی ہم نے یوسف کو غیبی طور سے بتایا۔ ایسا ہی ترجمہ سورہ صافات اور سورہ زمر کی آیات کا بھی ہونا چاہیے۔

مجلّہ علوم القرآن علی گڑھ کی خصوصی اشاعت مولانا امین احسن اصلاحی نمبر میں یہ لکھا گیا تھا ''ان تینوں آیات میں مذکورہ واؤ کے سلسلے میں مولانا اختر احسن اصلاحی کے اس خیال کو میں نے مولانا صدر الدین اصلاحی کے سامنے پیش کیا۔ مولانا نے اس خیال کی تحسین فرمائی مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی کہ (کلام عرب میں) اس کی نظیر تلاش کی جائے لیکن تلاش بسیار کے باوجود اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکی۔''(۱۲)

ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ مذکورہ تحریر دیکھ کر مولانا صدرالدین اصلاحی کے منجھلے فرزند محترم ڈاکٹر رضوان فلاحی صاحب (لندن) نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ بزم معلقہ کے نامور شاعر لبید کے اس شعر۔

حتی اذا یئس الرماة و ارسلوا

غضفا دواجن قافلا أعصامها

(حتی کہ جب تیر انداز شکاری وحشی گایوں کے شکار سے مایوس ہو گئے اور جونہی ان کو احساس ہوا کہ شکار ان کے تیروں کی پہنچ سے دور نکل گئے تو فوراً ان پر اپنے ان شکاری کتوں کو چھوڑ دیا جن کے کان لٹکے ہوئے اور ان کے گلے میں خشک پٹے پڑے ہوئے تھے یعنی نہایت پھرتیلے تھے۔)

کو ان آیات کی تفسیر کرتے وقت بطور نظیر پیش فرماتے تھے۔(۱۳)

وجہ استدلال

اس شعر میں 'اذا' کا جواب وارسلوا کو بنایا گیا ہے اور اس میں 'وا' اتصال زمانی کے لیے لیا گیا ہے۔

'او' کا استعمال

اسی طرح 'او' کے سلسلے میں ہمارے مترجمین غالباً غلط فہمی کے شکار لگتے ہیں، عموماً 'یا' کا ترجمہ کرتے ہیں۔ حالانکہ 'او' جس طرح 'یا' کے معنی میں آتا ہے اسی طرح 'اور' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ 'او' قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے اور عام طور پر ہمارے مترجمین اس کا ترجمہ ''یا'' سے کرتے ہیں یہاں پہ ہم پارہ عم سے صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سورہ عبس میں ہے [**وما یدریک لعله یزکی او یذکر**] اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب اس طرح کرتے ہیں ''اور کس چیز نے معلوم کرادیا تجھ کو شاید کہ پاک ہوجاتا یا نصیحت سنتا۔''

شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: ''اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید وہ سنورتا یا سوچتا۔''

اسی طرح ترجمہ مولانا محمود حسنؒ صاحب، مولانا تھانویؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور محمد جونا گڑھیؒ وغیرہ نے بھی کیا ہے۔

(۲) اسی طرح سورہ 'بلد' آیت وما ادراک ما العقبة فک رقبة او اطعام فی یوم ذی مسغبة یتیما ذا مقربة او مسکینا ذا متربة (۱۲تا۱۶) کیا گھاٹی جھکا دینا گردن کا یا کھانا کھلانا دن بھوک والے کے یتیم قرابت والے کو یا فقیر خاک افتادہ۔ (شاہ رفیع الدین صاحب)

اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: ''کیا ہے وہ گھاٹی چھڑانا گردن کا یا کھلانا بھوک کے دن میں، بن باپ کے لڑکے کو جو ناتے دار ہے یا محتاج کو جو خاک میں دلت ہے''

اسی طرح کا ترجمہ تقریباً تمام ہی مذکورہ اردو مفسرین ومترجمین کا بھی ہے اس ترجمہ سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ یہاں 'او' کا معنی تخییر کا لیا جاتا ہے اور 'تخییر' میں جمع نہیں ہے جیسے جاء زید وعمرو میں زید اور عمرو میں سے کوئی ایک ہی آیا، دونوں نہیں۔ آیات میں تزکیہ اور تذکر میں دونوں نہیں بلکہ ایک مطلوب ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ تزکیہ بھی مطلوب ہے اور نصیحت بھی مقصود ہے۔

اسی طرح سورہ 'بلد' میں گردن چھڑانا بھی مطلوب اور بھوک مری اور قحط سالی کے زمانہ میں قرابت دار کو بھی کھلانا مطلوب ومقصود اور اسی طرح کسی خاک آلود مسکین جس کا کوئی تعلق نسبی اور خاندانی نہ ہو اس کو بھی ان دنوں میں کھلانا واجب اور ضروری ہے۔ عام مترجمین ومفسرین کے برعکس لغویین اور نحاۃ اس 'او' کو جمع کے معنی میں لیتے ہیں۔ (۱۴)

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ عام طور پر اردو مترجمین 'او' کو 'یا' ہی کے معنی میں لیتے ہیں، اگر اردو مترجمین میں میرے علم کی حد تک کوئی استثناء ہے اور وہ بھی سورہ بلد کی حد تک تو وہ ہیں، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ہم سبق اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کے تلمیذ رشید علامہ عزیز الحق کوثر ندویؒ۔ موصوف نے پارہ عم کی تفسیر ''جواہر البیان فی تفسیر القرآن'' کے نام سے نہایت ضخیم اور مبسوط' تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل لکھی ہے۔ علامہ نے سورہ عبس میں عام لوگوں کی طرح 'او' کا ترجمہ 'یا' سے کیا ہے لیکن سورہ بلد میں 'او' کا ترجمہ اور سے کیا ہے۔ (۱۵)

"تم نے سمجھا؟ کہ اس گھاٹی سے کیا مراد ہے؟ (اس سے مراد ہے کسی کی) گردن چھڑانا اور فاقہ کے دن کھانا کھلانا (خصوصاً) رشتہ دار یتیم کو اور خاک نشیں مسکین کو)" ان آیات میں دو مقامات پر 'او' استعمال ہوا اور دونوں کا ترجمہ مولانا نے 'اور' سے کیا ہے اور میرے علم کی حد تک غالباً یہی معنی صحیح بھی ہے۔

عموماً 'او' بمعنی 'اور' کو علمائے نحو ولغت مطلق جمع کے معنی میں لیتے ہیں جیسا کہ مغنی اللبیب اور اقرب الموارد وغیرہ کتب میں پایا جاتا ہے۔(۱۶)

لیکن علامہ عزیز الحق کوثر ندویؒ نے 'او' برائے 'تنویع' لیا ہے اور تنویع کا ترجمہ اردو میں 'اور' سے ہوتا ہے۔ جواہر البیان کے حاشیہ میں لکھا ہے: "اَو برائے تنویع کا ترجمہ 'اور' سے ہوتا ہے۔(۱۷)

'خفافاً' کا مفہوم

عموماً ہمارے مترجمین **انفروا خفافاً و ثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون** (سورہ توبہ:۴۱) کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں:

فارسی ترجمے:

شیخ سعدیؒ: "بیروں روید سبک ساران و گراں باران و جہاد کنید بمالہائے خود و ذاتہائے خود" (ص ۲۵۷)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ: "بیروں آئید سبک رو گراں بار و جہاد کنید بمال خود و جان خود" (ایضاً)

اردو ترجمے:

حضرت شاہ رفیع الدینؒ صاحب: "نکلو ہلکے اور بھاری اور جہاد کرو ساتھ مالوں اپنے کے اور جانوں اپنی کی"۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ: "نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال اور جان سے۔"

مولانا تھانویؒ: "نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (ہو) اور (خواہ) زیادہ

سامان سے (ہو) اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔" (۱۸)

مولانا فتح محمد خان صاحب: "تم سبک سار رہو یا گراں بار (یعنی مال واسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت گھروں سے) نکل آؤ اور خدا کے رستے میں مال اور جان سے لڑو۔" (۱۹)

شیخ الہندؒ: "نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اور اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں: "یعنی پیادہ اور سوار، فقیر اور غنی، جوان اور بوڑھے جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں۔" (۲۰)

مولانا مودودی صاحب: "نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل" اور تفسیر میں فرماتے ہیں "ہلکے اور بوجھل کے الفاظ بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے تو بہر حال تم کو نکلنا چاہیے خواہ برضا ورغبت خواہ بکراہت، خواہ خوشحالی میں، خواہ تنگ دستی میں، خواہ ساز وسامان کی کثرت کے ساتھ، خواہ بے سروسامانی کے ساتھ، خواہ موافق حالات، خواہ ناموافق حالات میں، خواہ جوان وتندرست، خواہ ضعیف وکمزور۔ (۲۱)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ: "اٹھو معمولی سامان کے ساتھ بھی اور بھاری سامان کے ساتھ بھی اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔" تفسیر میں فرماتے ہیں "خفاف خفیف کی اور ثقال ثقیل کی جمع ہے، یہاں خفیف کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جس کے پاس عسرت کے سبب سے زیادہ سروسامان جنگ اور زادِ سفر نہ ہو۔ ثقیل جس کا حال اس کے برعکس ہو یعنی وہ سروسامان سے بھرپور اور اسلحہ سے لیس ہو۔ (۲۲)

مولانا محمد جونا گڑھی صاحب: "نکل کھڑے ہو جاؤ ہلکے پھلکے ہو تو بھی اور بھاری بھرکم ہو تو بھی۔" (ص۲۲+۵۲۱، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلکس) اور تفسیر میں مولانا صلاح الدین یوسف تحریر کرتے ہیں: "اس کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں مثلاً انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر، خوشی سے یا ناخوشی سے، غریب ہو یا امیر، جوان ہو یا بوڑھا، پیادہ ہو یا سوار، عیال دار ہو یا اہل وعیال کے بغیر، وہ پیش قدمی کرنے والوں میں سے ہو یا پیچھے لشکر میں شامل"۔ (۲۳)

ان ترجموں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا فتح محمد خانؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہو کہ تبوک کے لیے نکلو چاہے تمہارے پاس سامان جنگ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

مولانا مودودی صاحب نے اس آیت کو وسیع معنوں میں لیا ہے، جس میں بے سروسامانی بھی شامل ہے۔

مولانا صلاح الدین صاحب اس آیت کی تاویل انفرادی، اجتماعی، خوشی ناخوشی امیر وغریب وغیرہ سے کی ہے۔

ممکن ہے ہمارے ان مفسرین نے جو معانی بیان کیے ہیں وہ صحیح ہوں لیکن زبان و ادب کے لحاظ سے اس آیت کریمہ پر غور کرتے ہیں تو آیت کے یہ مفاہیم کچھ زیادہ واضح اور روشن نہیں دکھائی دیتے۔

کتب لغات میں اس لفظ کے معانی یہ ہیں:

المصباح المنیر : خف الی العدو اسرع (ص ۱۷۵) مادہ خ ف ف، (۲۴)، اقرب الموارد فلان الی العدو مخوفاً اسرع ص ۲۸۸، (۲۵)، القاموس المحیط خف خفاً القوم وارتحلوا مسرعین فصل الخاء باب الفاء، (۲۶)۔لسان العرب میں ہے: وخف القوم عن منزلتهم خفوفاً ارتحلوا اسرعین، مادہ خ ف ف (۲۷)۔المعجم الوسیط :خف والیہ خف خفۃ خفوفاً اسرع ونشط وعن المکان ارتحل فھو خف وخفیف ص ۲۴۷ مادہ خ ف ف (۲۸)۔اس لفظ کے معانی کے اندر تیز گامی اور برق رفتاری کا معنی پایا جاتا ہے۔اس لیے اس کی لغوی تحقیق کے بعد اس کا مناسب ترجمہ یہ بنتا ہے، واللہ اعلم بالصواب:

''اپنے گھروں سے نکلو اس حال میں کہ تم تیز رفتار ہو اور ہتھیار سے لیس'' کیونکہ ایک زبردست قوت کے مقابل میں بغیر ہتھیار کے نکل پڑنا نیکی نہیں کہی جا سکتی جبکہ خود اس سورہ کے اندر ایسے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو ہتھیار اور سواری نہ پاتے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے اگر

پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں، ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے، جنھوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔

قصہ مختصر یہ کہ مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ قرآن حکیم کی اور بہت ساری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح ہمارے مترجمین ومفسرین راہ صواب سے ہٹ گئے۔ تاویل قرآن کے باب میں ہمارا جو موقف ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم وہ ساری مثالیں اپنے فہم کی حد تک پیش کریں اور اس مقالہ کو وسعت دے دیں تا کہ قارئین کو شرح صدر حاصل ہو جائے اور آگے ہم جو تجویز صورت حال کی اصلاح کے لیے پیش کرنے جا رہے ہیں اس سے وہ پوری طرح متفق ہو سکیں۔

یہ بھی ایک نا قابل انکار واقعہ ہے کہ آج تک قرآن حکیم کے جو ترجمے و تفسیریں منصۂ شہود پر آئی ہیں وہ سب ایک ایک شخص کی اکیلی کوششوں کا نتیجہ ہیں اور لن یجتمع امتی علی الضلالة کے پیش نظر ہمارا امت کو یہ مشورہ ہے کہ عالمی سطح پر نہ سہی مقامی طور پر ایسے فضلاء یکجا ہو کر اپنا ورک شاپ بنائیں جو عربی نحو وصرف، زبان وادب اور بلاغت ومعانی پر عبور رکھتے ہوں اور کچھ اہل خیر حضرات ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کریں۔ یہ فضلاء کرام کسی ایسی جگہ جمع ہوں جہاں مراجع و مآخذ کی کثرت ہو پھر وہ اپنی علمی قابلیت اور سلف صالحین کی مساعی جمیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے متفق الفکر اور متفق النظام ہو کر بحث وتمحیص کے ذریعہ ایک اک لفظ، ایک ایک اسلوب اور ایک ایک آیت کے مفہوم ومدعا کی حتمی شکل دے دیں۔ اس طرح ان کی یہ کوشش دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ قرار پائے گی۔ وباللہ التوفیق

حواشی

(۱) فتح القدیر ج۴ص ۴۷۸ ،مطبوعہ دار الفکر

(۲) ملاحظہ ہو تفسیر کشاف ص ۲۴۵ا الجزء الثانی ، لبنان۔ الجزء الثالث ص ۳۰۷،
ص ۳۵۸،الجزء الثالث دار المعرفہ،بیروت لبنان

(۳) فتح القدیر الجامع الروایۃ والندایۃ کیا لتفسیر تالیف محمد بن علی بن محمد الشوکانی الجزء
الثانی مطبوعہ دار الفکر

(۴) بیان القرآن ص ۱۲۷ ج ۹ پارہ ۲۳ مطبع علیمی اندرون لوہاری دروازہ پوسٹ بکس
نمبر ۲۸۸،لاہور

(۵) سورہ زمر ۳۹ص ۳۲ ج ۱۰

(۶) سورہ یوسف:۱۵

(۷) تفہیم القرآن ج۴ص ۳۸۴

(۸) تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم الجزء الاول،ص ۳۰۲،للامام عبدالحمید الفراہی،
اعداد الدکتور عبید اللہ الفراہی،مراجعۃ الشیخ امانۃ اللہ

(۹) تدبر قرآن ج۴ص ۱۹،مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور پاکستان

(۱۰) تدبر قرآن ج۶ص ۸۹-۲۸۸

(۱۱) تدبر قرآن ج۶ص ۶۱۴

(۱۲) ص ۱۲۸،مجلّہ علوم القرآن خصوصی اشاعت مولانا امین احسن اصلاحی نمبر،ادارہ
علوم القرآن پوسٹ بکس نمبر ۹۹ سر سید نگر

(۱۳) شرح المعلقات السبع للامام بن عبداللہ الحسین بن احمد بن الحسین الزوزنی،
ص ۹۲،دار الکتب العلمیۃ،بیروت لبنان

(۱۴) اس لفظ کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں 'تدبر قرآن' میں ،ترجمہ وتفسیر سے متعلق بعض مباحث مجلّہ علوم القرآن علی گڑھ کی خصوصی اشاعت ''مولانا امین احسن اصلاحی'' ص۱۵۴-۱۵۷

(۱۵) سورہ بلد آیت ۱۲ تا ۱۶ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

(۱۶) مطبوعہ دارالفکر،

(۱۷) ص ۱۷۴، جواہر لبیان فی تفسیر القرآن ج ۱، علامہ عزیز الحق کوثر ندوی، مطبع متل آفسیٹ پریس بنارس۔ اس لفظ کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: مجلّہ علوم القرآن علی گڑھ خصوصی اشاعت ''مولانا اصلاحی نمبر'' ص۱۵۴-۱۵۷

(۱۸) ترجمہ مولانا تھانوی تاج کمپنی قرآن منزل لاہور ص ۲۳۴ آیت ۱۴۱ سورہ توبہ

(۱۹) ص ۳۱۷، ترجمہ فتح محمد خان صاحب، مطبوعہ دارالاشاعت قرآن مجید الہ آباد

(۲۰) ص ۲۵۷ حاشیہ، مجمع خادم الحرمین شریفین الملک فہد

(۲۱) تفہیم القرآن ص ۱۹۶ حاشیہ ۴۳ ج ۲ سورہ توبہ آیت ۱۴۱، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

(۲۲) تدبر قرآن ج ۳ ص ۵۵۷ سورہ توبہ: ۱۴۱، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور، پاکستان

(۲۳) تفسیر جوناگڑھی، ص ۵۲۲ حاشیہ ۱

(۲۴) المصباح المنیر ص ۱۷۵، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان الجزء الاول

(۲۵) اقرب الموارد، ص ۲۸۸، الجزء الاول

(۲۶) القاموس المحیط، باب الفاء، الجزء الثالث، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۹۸۳ء/۱۴۰۳ھ

(۲۷) لسان العرب، دارالمعارف

(۲۸) المعجم الوسیط، ص ۲۴۷، کتب خانہ حسینیہ، دیوبند

قرآن کا نظامِ تقسیمِ دولت

عبدالعظیم اصلاحی

پیداوار اور تقسیمِ دولت معاشیات کے دو سب سے بنیادی مسئلے ہیں، ماہرینِ معاشیات کے درمیان اس بات پر اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سب سے اہم کون سا مسئلہ ہے، بعض حضرات پیداوار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں[1] تو بعض کے نزدیک تقسیم زیادہ اہمیت کی حامل ہے[2]۔ اسلامی تعلیمات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی تقسیم کے عمل کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ہمیں قرآن میں جتنی تفصیلات اور جس طرح کی تعلیمات تقسیم سے متعلق ملتی ہیں، اتنی پیداوار کے بارے میں نہیں ملتیں، وجہ اس کی یہ ہوسکتی ہے کہ جن امور کو انسان فطری طور پر اور اپنے تجربہ کی روشنی میں انجام دیتا ہے، ان کے متعلق ہمیں قرآن میں کم معلومات دی گئی ہیں اور جن کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوسکتی ہے یا جن میں انحراف کا اندیشہ ہو تو ان کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اشیاء کی پیداوار انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے لیے وہ کوشش لامحالہ کرے گا۔ وہ کیا پیدا کرے اور کیسے پیدا کرے یا پیداوار کے لیے بہترین وسیلہ کیا ہو کہ جہاں لاگت کم آئے اور پیداوار زیادہ ہو، یہ سب سوالات انسان کی اپنی سمجھ پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ البتہ اپنی کمائی کو صرف اپنے لیے رکھے یا اس میں سے کچھ حصہ دوسروں کو بھی دینا ہے؟ یہ دوسرے کن کن کو دینا ہے اور کتنا دینا ہے؟ یہ سوالات ایسے ہیں جنھیں وہ شاید نظر انداز کردے، اس لیے کہ تقسیم کا عمل صاحب ثروت کے لیے عموماً خوش گوار ہونے کے بجائے ناگوار ہوتا ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے کہ اپنی کمائی میں سے ان کو کیوں کھلائے جنھیں اللہ میاں نے بھوکا رہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ''مَن لَّوْ يَشَآءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ'' (سورہ یٰس/۴۷)۔ اس کی دولت و ثروت اس کے اپنے علم و حکمت کا ثمرہ ہے۔ اس میں سے وہ دوسروں کو کیوں حصہ دے؟ جیسا کہ قارون نے کہا تھا ''إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِيٓ'' (سورۃ القصص/۷۸)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم

نے جتنی توجہ تقسیمِ دولت کے مسئلہ کو دی ہے، اتنی توجہ کسی اور معاشی مسئلہ کو نہیں دی ہے۔

تقسیم کے دو مرحلے:

یہاں شروع میں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم کا عمل دو مرحلے پر انجام پاتا ہے۔ ایک تو پیداوار کے بعد ان عوامل کے درمیان تقسیم جو عمل پیداوار میں شریک رہے ہیں یعنی زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم فراہم کرنے والوں کے درمیان پیداوار کی تقسیم۔ اسلام نے اس تقسیم کو شرکاءِ پیداوار کے باہمی اتفاق اور رضامندی پر چھوڑ دیا ہے، البتہ اس میں عدل وانصاف سے کام لینے اور فضل واحسان اپنانے پر زور دیا ہے اور ظلم واستحصال سے منع کیا ہے۔ تقسیم کا یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ اکثر اس تقسیم کے نتیجہ میں قوی تر شرکاءِ پیداوار کو زیادہ حصہ مل جاتا ہے اور کمزوروں کو کم۔ اس طرح ان کے درمیان فرق اور ناہمواری بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ معاشرہ کے بہت سے افراد جو پیداواری کے عمل میں کسی وجہ سے شریک ہونے سے معذور رہتے ہیں۔ وہ اس تقسیم میں بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس تقسیم کا اعادہ ہو۔ تاکہ امیر وغریب کے درمیان فرق کم کیا جا سکے اور جو بالکل محروم ہیں، ان کو بھی زیست کا سامان فراہم ہو سکے۔ کیونکہ مالداروں کی دولت میں رب سبحانہ تعالیٰ نے ان کے حصے بھی طے کر رکھے ہیں۔ ''وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ'' (الذاریات/۱۹)۔ یہ تقسیم کا دوسرا مرحلہ ہے، جس کو معاشیات کی اصطلاح میں اعادۂ تقسیم یا Redistribution کہتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات زیادہ تر اسی سے متعلق ہیں۔

قرآنی نظامِ تقسیم کا بنیادی اصول:

یہ بات کہ قرآن اعادۂ تقسیمِ دولت پر زور دیتا ہے، قرآن کی آیت ''كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ'' (الحشر/۷) سے مأخوذ ہے اور اس کو ہم قرآنی نظامِ تقسیم کے بنیادی اصول کا نام دے سکتے ہیں۔ تقسیمِ دولت سے متعلق سارے قرآنی احکام اسی اصول پر مبنی ہیں۔

قرآنی نظام تقسیم کے اغراض و مقاصد:

قرآنی نظام تقسیم کے مذکورہ بالا بنیادی اصول اور اس سے متعلق تفصیلی تعلیمات پر غور کرنے سے قرآنی نظامِ تقسیم کے درج ذیل اغراض و مقاصد سمجھ میں آتے ہیں:

۱- غریبی کا ازالہ اور امیر و غریب کے درمیان فرق کو کم کرنا۔

۲- تقسیم کے نظام کو بہتر بنانا۔ اور اس سلسلہ میں موجود خرابیوں کو دور کرنا۔

۳- بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کو یقینی بنانا۔

۴- ہمدردی، اخوت اور غم گساری کا ماحول پیدا کرنا۔

۵- دلوں کی کدورت کو دور کرنا اور تزکیۂ نفس کو پروان چڑھانا۔

۶- فاضل دولت کو سرمایہ کے محتاج افراد کی طرف منتقل کر کے اس کو پیداواری کام میں لگانے کے مواقع فراہم کرنا۔

۷- ایسا معاشرہ تشکیل دینا جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہو اور حقیقی فلاح اور خوش حالی سے بہرہ ور ہو۔ اور

۸- جس کے اندر طبقاتی کشمکش کے بجائے، مالدار ناداروں کو اپنا معاون و مددگار سمجھیں اور نادار مالداروں کو اپنا ہمدرد و خیر خواہ تصور کریں۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے قرآن نے کسی ایک طریقہ پر انحصار نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے لیے تقسیم دولت کا ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں کچھ تو لازم و واجب چیزیں ہیں اور کچھ میں نصیحت و موعظت سے کام لیا ہے۔ یعنی انھیں اختیار کرنے کی صرف ترغیب و تحسین کی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے اعمال جو تقسیم کے نظام کو نقصان پہنچانے والے تھے اور مطلوبہ اغراض و مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو سکتے تھے، انھیں ممنوع قرار دیا ہے۔ ذیل میں ہم ان تینوں طرح کی تدابیر کو اختصار کے ساتھ الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

تقسیم دولت کے لازمی احکام

۱- زکاۃ:

تقسیم دولت کے سلسلہ میں قرآن کریم میں بیان کردہ احکام میں زکاۃ کا نظام سب سے اہم اور مؤثر ہے۔ یہ عبادت بھی ہے اور ایک مالی فریضہ بھی۔ یہ قرآن میں متعدد جگہوں پر صلاۃ کے ساتھ اور کہیں کہیں الگ سے بھی مذکور ہے۔ یہ فریضہ اعادۂ تقسیمِ دولت کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے، کیونکہ اس کے سلسلہ میں فرمان رسول (ﷺ) ہے کہ **تؤخذ من اغنیائهم و ترد علی فقرائهم**۔ ۳ (یہ ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں پر تقسیم ہوگی)۔ ٹیکسوں کے برخلاف اس کے کسی حصہ سے خود زکاۃ دینے والا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ۴ پوری کی پوری رقم دوسرے مستحقین کو منتقل ہوگی۔ یہ بات کہ زکاۃ کن اموال پر واجب ہوگی اور اس کی کیا شرح ہوگی، اس کی تفصیل احادیث میں ہے۔ ۵ لیکن تقسیم کا معاملہ قرآن کی نظر میں اتنا اہم ہے کہ اس کو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر بیان کر دیا ہے جو آٹھ طرح کے لوگ ہیں۔ ۶ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے زکاۃ میں حصہ مانگا تو آپؐ نے صاف فرما دیا کہ اس کی تقسیم کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے، اگر تم ان مستحقین میں آتے ہو گے تبھی تمھیں اس سے ملے گا۔ ۷ عصر حاضر میں اسلامی معاشیات کے چرچا کے ساتھ زکاۃ پر ادبیات میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور اب اس کے مختلف پہلوؤں پر کافی لٹریچر دستیاب ہے۔ ۸

۲- تقسیم وراثت:

زکاۃ کے بعد تقسیم دولت کے سلسلہ میں دوسرا اہم حکم ترکہ کی تقسیم سے متعلق ہے۔ سورۃ النساء میں قرآن نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے تو اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہو۔ ۹ اسلام نے غالباً پہلی مرتبہ عورتوں کو بھی مرنے والے کی دولت میں کم ہو یا زیادہ۔ حصہ دار ٹھہرایا ہے۔ البتہ ان کی مالی ذمہ داریاں کم ہوتی ہیں یا نہیں ہوتی ہیں، اس لیے بعض حالات میں مردوں کو ان کے دو حصے کے برابر دیا گیا ہے جو عدل کے عین

مطابق ہے۔ وراثت کے سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ سب سے پہلے میت کا قرض ادا کیا جائے گا اگر اس پر کسی کا قرض ہو تو۔ پھر اگر اس نے اپنے مال میں کسی کے لیے کوئی وصیت کی ہو تو اس کا نفاذ ہوگا۔ البتہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہیں ہوسکتی۔ دو تہائی تو بہرحال وارثوں کو ملے گا۔ نیز کسی ایسے شخص کے لیے وصیت نہیں ہوسکتی جو خود وارث ہو۔[۱۰] اس وقت اسلامی نظام وراثت پر بھی کافی لٹریچر موجود ہے۔ تفصیلات کے لیے ان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ اموال فیٔ وغنائم

اسلام کے دور اول میں فیٔ اور غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی دولت کی بڑی بہتات رہی ہے۔ اس کی تقسیم سے متعلق احکام بھی قرآن میں قدرے تفصیل سے آئے ہیں۔ فیٔ سے مراد دشمنوں سے حاصل ہونے والا وہ مال ہے جو بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے حاصل ہوا ہو۔ اس کا حکم سورۃ الحشر میں بیان ہوا ہے۔[۱۱] وہیں پر تقسیم دولت سے متعلق عظیم آیت ''كَیۡ لَا یَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡكُمۡ '' بھی آئی ہے۔ فیٔ کے سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری دولت اللہ، اس کے رسول، اس کے اقرباء، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، فقراء ومحتاجوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی مملکت کا سربراہ شوریٰ سے طے کرے گا کہ ان مدات میں کتنا اور کن کن پر خرچ کرے۔ البتہ مال غنیمت جو کہ لڑائی کے بعد حاصل ہوتا ہے، اس میں سے پانچواں حصہ حکومت کو ملے گا اور بقیہ شرکاء جنگ کے درمیان تقسیم ہوجائے گا۔ سورۂ انفال میں اس کا حکم آیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے کتب فقہ اور اسلامی پبلک فائنانس سے متعلق کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۴۔ مالی کفارات

بعض شرعی احکام کی خلاف ورزیوں پر قرآن نے مالی کفارات طے کیے ہیں۔ ان سے بھی تقسیم دولت کا عمل انجام پاتا ہے۔ مثلاً پکی قسم کھانے کے بعد توڑ دینے پر دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دینا (سورۃ المائدۃ/۸۹)۔ اپنی بیوی کو ماں کی طرح حرام قرار دینے

پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا (سورۃ المجادلہ/۳-۴)، حج میں بعض غلطیوں کے ارتکاب کا فدیہ (سورۃ البقرہ/۱۹۶ وسورۃ المائدہ/۹۵) وغیرہ۔ مالی کفارات سے فقراء ومساکین فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۵- روزہ کا فدیہ اور صدقۂ فطر

صدقۂ فطر یا زکاۃ الفطر جو ماہ رمضان کے خاتمہ پر روزہ دار اپنی طرف سے اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے ادا کرتے ہیں، اس کا حکم تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔[۱۲] البتہ سورہ بقرۃ آیت ۱۸۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں تو وہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیتے رہیں۔

۶- دیگر نفقاتِ واجبہ

تقسیم دولت سے متعلق مذکورہ بالا صریح لازمی احکام کے علاوہ کچھ اور بھی مالی ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں جو قرآن سے براہ راست یا استنباطاً ماخوذ ہیں۔ مثلاً والدین اور غریب رشتہ داروں پر خرچ، نذروں کو پورا کرنا، مہر کی ادائیگی، مطلقہ کا نان ونفقہ وغیرہ۔ یہ احکام بھی تقسیم دولت میں مدو معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تقسیم دولت کے سلسلہ میں ترغیب وتشجیع اور نصیحت وموعظت کا رول:

معاملات کی درستگی کے سلسلہ میں قرآن ہمیشہ امر وتحکم سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس کے ساتھ ترغیب وتلقین اور نصیحت وموعظمت کا طریقہ بھی اپناتا ہے۔ مذکورہ بالا لازمی احکام کے علاوہ قرآن نے کچھ اور طریقوں کی تلقین کی ہے جو تقسیم دولت کے اسلامی اغراض و مقاصد کے حصول میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں ان کی حیثیت الزامی نہیں ہے بلکہ انھیں برضا ورغبت اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔ نیچے ہم اس طرح کے بعض امور کا ذکر کرتے ہیں:

۱- وقف

اوقاف کا ادارہ اسلام کے اہم معاشی اداروں میں سے ایک ہے۔ اس کے ذریعہ عام طور پر کمزور طبقات کی حاجت براری، تعلیم وتربیت، علاج وغذا، پوشش ورہائش

اور نہ جانے کتنی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا رہا ہے۔[۱۳] اس کے ذریعہ اہلِ ثروت اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ دوسروں کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ وقف کا براہ راست کوئی حکم نہیں آیا ہے لیکن اکثر علماء نے قرآنی آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ" (آل عمران/۹۲) سے وقف کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ کچھ صحابہ نے بھی اس آیت کو سننے کے بعد اپنے بعض اہم اثاثوں کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔ زکاۃ کی طرح اوقاف کی معاشی اہمیت پر اس وقت کافی لٹریچر آچکا ہے۔ دور جدید میں اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔[۱۴]

۲- وصیت کا عمل

قانون وراثت سے متعلق آیات نازل ہونے سے قبل اہل ایمان پر فرض کیا گیا تھا کہ وفات سے قبل والدین اور اقرباء سے متعلق اپنے مال میں وصیت کر جائیں۔ "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْراً الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُتَّقِينَ" (البقرہ/۱۸۰)۔ بعد میں کچھ اعزہ و اقرباء سے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود وصیت فرمادی۔ "يُوصِيكُمُ اللّهُ فِي أَوْلاَدِكُمْ الخ" (سورۃ النساء/۷) البتہ جیسا کہ اوپر آچکا ہے غیر وارثین کے حق میں اب بھی وصیت کی گنجائش رکھی گئی ہے، وصیت بھی تقسیم دولت کا ایک ذریعہ ہے جسے مستحسن سمجھا گیا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان اپنے لیے صدقۂ جاریہ کی راہ پیدا کر سکتا ہے۔ "یوم لا ینفع مال و لا بنون" جب کہ مرنے کے بعد اس کی کوئی چیز اس کے کام نہیں آسکتی۔

۳- صدقات نافلہ اور ضرورت سے فاضل مال کو خرچ کرنے کی ترغیب

سورہ البقرہ میں نبی کریم ﷺ سے مومنین کے پوچھنے پر کہ کیا خرچ کریں ارشاد ہوا، کہہ دو کہ 'عفو' (خرچ کریں)۔ عفو کی تفسیر میں بہت سے اقوال آئے ہیں، لیکن صحابہ کے عمل کو دیکھتے ہوئے اس کے معنی بنتے ہیں ضرورت سے فاضل یا جو بھی آسانی سے خرچ کر سکیں۔ صدقات نافلہ میں اتنا خرچ نہ کردے کہ خود اور اپنے اہل وعیال کو تنگی میں ڈال

دے۔ فَتَقْعُدَ مَلُوْماً مَّحْسُوْرًا (سورۃ الاسراء/۲۹)۔لیکن گنجائش کی حد تک یتیموں، اسیروں، پڑوسیوں، بیواؤں، بھوکوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرنے کی جگہ جگہ تاکید فرمائی ہے۔اس کے لیے درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں: (سورۃ البقرہ/۲۲۰؛ سورۃ النساء/۲،۳۶؛ سورۃ الدہر/۸-۹؛ سورۃ البلد/۱۴-۱۶)

تقسیم دولت پر منفی اثرات رکھنے والے اعمال پر پابندی:

قرآنی نظامِ تقسیم دولت میں عدل و مواسات کے حصول کے لیے جہاں کچھ لازمی احکام اور مرغوب و مستحب اعمال بتائے گئے ہیں، وہیں کچھ ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے جن کا اثر عادلانہ تقسیم کے برعکس ہو اور جو مال دار و نادار کے درمیان فرق کو کم کرنے کے بجائے اس کو اور بڑھانے والے ہوں۔اس طرح کی بعض منہیات ذیل میں مذکور ہیں۔

۱- سود کی ممانعت

قرآن کی نظر میں سود ایک ظالمانہ نظام ہے، اس لیے اس نے اس پر پابندی لگادی ہے۔''لاَ تَظْلِمُونَ وَلاَ تُظْلَمُونَ'' (سورۃ البقرہ/۲۷۹)۔سود بظاہر مال میں اضافہ کے لیے دیا جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ کوئی لائق اعتبار اضافہ نہیں ہے۔''وَمَآ اٰتَيْتُم مِّن رِّباً لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِندَ اللَّهِ'' (سورۃ الروم/۳۹)۔بقول علامہ اقبال ؎

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجاۃ

آج ہندوستان میں جو آئے دن کسانوں کی خودکشی کے واقعات پیش آرہے ہیں، وہ اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔[۱۵] سورہ روم کی مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کے اثرات زکاۃ کے بالکل برعکس ہیں۔زکاۃ سے ناداروں کی مدد کی جاتی ہے، جب کہ سود سے ان کا استحصال ہوتا ہے۔اسی لیے قرآن میں ارشاد ہے:''يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ'' (سورۃ البقرہ/۲۷۶) (اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو بڑھا دیتا ہے)۔اگر قرآن حکیم کی تعلیم''وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى

مَیۡسَرَةٍ ‘‘(سورۃ البقرہ/۲۸۰) کے مطابق تنگ دست و عاجز، مقروض کو موقع دیا جائے اور پیداواری معاملات کو شرکت کی بنیاد پر کیا جائے تو کئی طرح کے معاشی بحرانوں اور استحصال کے طریقوں سے بچا جا سکتا ہے۔

۲- جوئے پر پابندی

اسی طرح قرآن نے جوئے اور لاٹری پر بھی پابندی لگا دی ہے۔’’یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡآ اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَیۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ‘‘(سورۃ المائدہ/۹۰) قمار کا تقسیم دولت پر منفی اثر پڑتا ہے۔اس میں ایک شخص کی رقم دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے ہارنے والے کے بغیر کسی فائدہ کے۔ اسی طرح لاٹری میں ہزاروں کی رقم ایک شخص کی جیب میں چلی جاتی ہے۔اس سے نہ صرف یہ کہ دولت کی تقسیم میں تفاوت بڑھتا ہے بلکہ بغض و حسد اور عداوت و خصومت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔جس کے نتیجہ میں مزید برائیاں سماج میں جنم لیتی ہیں۔

۳- باطل طریقوں سے دوسروں کا مال کھانا

ربا اور قمار کی ممانعت کے علاوہ قرآن کریم نے ایسے بہت سے طریقوں سے دولت کے حصول کو روک دیا ہے جو عدل و انصاف اور اخلاق و آداب کے خلاف ہیں اور جن کا اثر تقسیم دولت پر منفی ہوتا ہے۔ان سب طریقوں کے لیے قرآن نے ایک جامع اصطلاح ’’اکل المال بالباطل‘‘ کی استعمال کی ہے۔ارشاد ہے:’’یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡآ اَمۡوَالَكُمۡ بَیۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ... الآیة‘‘(سورۃ النساء/۲۹)(اے ایمان والو! اپنے درمیان اپنے مالوں کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ)۔اکل المال بالباطل کے بہت سے طریقے ہیں اور اس آیت کے اندر سبھی شامل ہیں، مثلاً رشوت، خیانت، چوری، رہزنی، ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:’’وَلَا تَاۡكُلُوۡآ اَمۡوَالَكُمۡ بَیۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَآ اِلَی الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ‘‘(اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور اس کو

حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسرے کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کرسکو۔ درآنحالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)۔ اسی طرح امانتوں میں خیانت سے منع کیا ہے۔''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ''(سورۃ الانفال/۲۷) (اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت، جانتے بوجھتے نہ کرو)۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا:''فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ... الآية''(سورۃ البقرہ/۲۸۳) (پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے جو اس کا رب ہے، ڈرے)۔

چوری پر قرآن نے قطع ید کی سزا تجویز کی ہے:''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا......الآیۃ''(سورۃ المائدہ/۳۸) (اور چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔ اسی طرح رہزنی کو قرآن نے اللہ اور رسول سے جنگ کے مترادف قرار دیا ہے اور اس کی بڑی سخت سزائیں دینے کا اختیار اسلامی حکومت کو تفویض کیا ہے۔''إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ......الآیۃ''(سورۃ المائدہ/۳۳) (ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذابِ عظیم ہے)۔

قرآن نے ناپ تول کی کمی کی مذمت سورۃ المطففین آیات ۱-۳ میں فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:''برا ہو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا، جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں''۔ شعیبؑ کی قوم میں خاص طور پر یہ بیماری تھی چنانچہ انھوں نے اس کے انجام بد سے ڈرایا۔''وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ......الآیۃ''(ھود/۸۵) (...اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول

کو پورا رکھو پورے عدل کے ساتھ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو۔ اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ ابھرو)۔

یتیموں اور کمزوروں کا مال ہڑپ کرنے سے منع فرمایا ''إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا ......الآیۃ'' (النساء/۱۵) (بے شک جو لوگ ظلم وناانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے)۔

قرآن کے مطابق بخالت کرنے اور مال گن گن کر رکھنے سے قیامت کے دن ذلت ورسوائی اور حسرت وعذاب کے سوا کچھ نہ حاصل ہوگا۔ ''وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ ......الآیۃ'' (آل عمران/۱۸۰) (اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہتر برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے)۔ اسی طرح سورہ ھمزہ میں بھی اس طرح کے لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی۔ اس کے برخلاف جود وسخا اور انفاق پر دنیا وآخرت دونوں میں انعام واکرام اور برکت وسعادت کا وعدہ فرمایا۔ ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ ......الآیۃ'' (بقرہ/۲۶۱) (ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے)۔

خاتمہ کلام

گذشتہ صفحات میں قرآنی نظامِ تقسیم دولت کا بس ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جس کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں۔ مختصر یہ کہ تقسیم دولت کا مسئلہ انسان کی معاشی تاریخ میں شروع سے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دنیا میں جو مختلف معاشی نظام پائے جا رہے ہیں،

ان کے درمیان اختلاف کی ایک بڑی وجہ تقسیم دولت سے متعلق ان کے موقف کا اختلاف رہا ہے۔ اس مسئلہ پر عموماً ان نظامہائے معاش میں افراط وتفریط پائی گئی ہے، قرآن نے ایک معتدل ومتوازن تقسیم کا نظام پیش کیا ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے افراد، جماعتوں اور حکومت سبھی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، تقسیم دولت میں سبھی حصہ دار ہیں اور اپنے حصے کے مطابق سبھی جواب دہ ہیں۔

تقسیم دولت کے سلسلہ میں قرآن نے کوئی ایک طریقہ نہیں اپنایا ہے۔ کچھ چیزیں تو اس نے لازمی قرار دی ہیں تو کچھ کو کرنے کی سفارش کی ہے اور اسی کے لیے آخرت میں بے پناہ اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اس طرح اس نے دنیوی دارو گیر اور آخرت کے ثواب واحتساب کے ذریعہ خود انسان کے ضمیر سے اپیل کی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ان معاملات پر پابندی لگادی ہے جو تقسیم کے نظام کو سبوتاژ کرنے والے ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظامِ تقسیمِ دولت کی تصویر ایک موثر جامع حل کے طور پر ابھرتی ہے۔

دور حاضر میں پیداوار کے وسائل اور تکنیک میں ترقی کے ساتھ افزائش دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے کہیں بڑھ کر غریبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ امیر وغریب کے درمیان خلیج وسیع تر ہوگئی ہے۔ دونوں کے وسائل اور معیار زندگی میں کوئی نسبت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اناج گوداموں میں غلہ جات کا سڑ جانا، بھکمری سے اموات کا ہونا، سودی قرضوں میں جکڑے کسانوں کی خودکشی کے واقعات، نکسل وادیوں سے تصادم اور جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار، یہ سب تقسیم دولت میں خلل کے مظاہر ہیں۔ ایسے میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قرآن کے پیش کردہ نظام تقسیم دولت کو اپنایا جائے۔ حکومتی، جماعتی اور انفرادی سبھی سطح پر کم از کم امت مسلمہ جس کو قرآن نے امت وسط کہا ہے اور شہادت علی الناس جس کا مشن قرار دیا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے عہد برا نہیں ہوسکتی اگر اس نے قرآن کے اس معتدل ومتوازن نظام تقسیم دولت کو علم وعمل دونوں میدانوں میں عام کرکے کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کیا۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

حواشی و مراجع

(۱) Simons, H.C. (1984) Economic Policy for a Free Society, Chicago, University of Chicago Press p.5

(۲) Ricardo, David (1951), Works and Correspondance of David Ricardo, edited by P. Saraffa, Cambridge, Cambridge University Press, Vol-1, p.5

(۳) البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل (۱۹۸۷) الجامع الصحیح، القاہرہ، دار الشعب، المجلد الثانی ص ۱۳۰، حدیث نمبر ۱۳۹۵

(۴) ٹیکس کی ادائیگی کے حق میں یہی دلیل دی جاتی ہے کہ ٹیکس دینے والا اس سے بالواسطہ یا براہ راست فائدہ اٹھاتا ہے۔

(۵) اس کے لیے کسی بھی مجموعۂ حدیث یا فقہ کی کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(۶) ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ، آیت ۶۰

(۷) ابوداؤد (بدون تاریخ)، سنن ابی داؤد، بیروت: دار الکتاب العربی، ج ۲، ص ۳۵، حدیث نمبر ۱۶۳۲

(۸) مثلاً دو ضخیم جلدوں میں مشہور عالم دین یوسف القرضاوی نے فقہ الزکاۃ کے عنوان سے کتاب رقم کی ہے جس میں زکاۃ کے سبھی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ مطبوعہ بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، مجلدین بدون تاریخ۔

(۹) ملاحظہ ہو سورۃ النساء، آیات ۷ تا ۱۴ اور اسی سورہ کی آخری آیت

(۱۰) یہ تفصیلات احادیث سے معلوم ہوتی ہیں، ملاحظہ ہو ابوداؤد، سنن مرجع سابق، ج ۳، ص ۷۳، باب ما جاء بالوصیۃ للوارث

(۱۱) ملاحظہ ہو سورۃ الحشر، آیات ۶-۱۰

(۱۲) الاصبحی، مالک بن انس (بدون تاریخ) موطا الامام مالک، مصر، دار احیاء التراث العربی، ج ۱، ص ۲۸۴، باب مکیلۃ صدقۃ الفطر، حدیث نمبر ۶۲۶

(۱۳) Islahi, Abdul Azim (1996) "Institution of waqf and Human Resource Development". Islamabad: Institute of policy studies and Tehran: Institute for political and International Studies.

(۱۴) وقف کے موضوع پر ادبیات کی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو:

Islahi, Abdul Azim (2003) Waqf - A Bibliography. Jeddah: Scientific Publishing Center

(۱۵) اس طرح کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو:

Roy, Arundhati (n.d) "Capitalism: A Ghost Story http://en.wikipedia.org/wiki/arundhati_roy

قرآن مجید سے احکام ومسائل کا استنباط
اور عصر حاضر کے تقاضے

محمد فہیم اختر ندوی

'فقہ اسلامی' انسانی زندگی کے لئے ایک جامع دستور العمل ہے، اسی کی روشنی میں ایک مسلمان کی زندگی الٰہی ہدایت کی ڈگر پر گامزن رہتی ہے۔ فقہ اسلامی کا بنیادی سرچشمہ کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید ہے۔ عہد نبوی سے لے کر آج تک اسی کتاب الٰہی کے نصوص سے عملی زندگی کے لئے احکام ومسائل کا استنباط کیا جاتا رہا ہے، اور بہتا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

دراصل اسلامی شریعت اللہ کا وہ آخری قانون ہے جس کی پوری تابعداری کرنے کا اس نے حکم دیا ہے، اور اسلامی شریعت کی پاسداری میں کسی چوں وچرا کو بھی ایمان کے منافی قرار دیا ہے۔ قرآن میں اللہ کا فرمان صاف ہے کہ:

''ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلَی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ''۔ (سورہ جاثیہ:۱۸)

(اس کے بعد اب اے نبی ﷺ ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے)

اور ''فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتَّی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً''۔ (سورہ نساء:۶۵)

(اے محمد ﷺ تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسر تسلیم کریں۔)

اور ''وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّه ''(سورہ مائدہ:۴۹)۔

(اے نبی ﷺ تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو)

اسلامی شریعت کے مسائل واحکام کا مجموعہ'فقہ اسلامی' ہے، کیونکہ عملی زندگی کے مسائل ومعاملات کی تفصیلات اور جزئیات کی ایسی تعیین' کہ عامۃ الناس بآسانی ان پر عمل پیرا ہوسکیں، فقہ اسلامی کے ذریعہ ہی انجام پاتی ہے۔فقہ اسلامی کا سماج کے ساتھ دوطرفہ تعلق رہتا ہے۔ایک جانب فقہاء ومجتہدین ہیں جو تفقہ فی الدین اور استنباط مسائل کے فرض منصبی کو بہ کمال دیانت انجام دے کراس حکم الٰہی کو بجالاتے ہیں کہ:

'' فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ''(سورۃ التوبہ:۱۲۲)۔

(مگرایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اوردین کی سمجھ پیدا کرتے اورواپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کوخبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے)

اوردوسری طرف وہ عامۃ المسلمین ہوتے ہیں جواپنے مسائل روز وشب میں ان علماء وفقہاء کی جانب رجوع کرکے اس فرمان الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں کہ:

'' فَاسْأَلُواْ أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ''(سورہ نحل:۴۳)۔

(اہل ذکر سے پوچھ لواگرتم لوگ خودنہیں جانتے)

یہ استفتاء اورافتاءعہدرسالت مآب ﷺ سے وارثین نبوت اورعلماء امت کے ذریعہ امت کے اندر جاری ہے۔

عہدرسالت میں نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس تمام تر قانون سازیوں کا سرچشمہ تھی۔آپ ہی کے قلب اطہر پر قرآنی آیات کا نزول ہورہا تھا:

'' نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ''(سورۃ الشعراء:۱۹۳،تا۱۹۵)۔

(اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے کہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں صاف صاف عربی زبان میں)۔

آپ تلاوت آیات کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے اور تزکیہ وتربیت بھی انجام دیتے تھے:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِي ضَلالٍ مُّبِيْنٍ" (سورۃ آل عمران:۱۶۴)۔

(درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے)۔

آپ ﷺ کی یہ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ وتربیت' سنت رسول کا قالب اختیار کرتی گئی۔ اور لوگوں کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات اور مسائل میں اللہ اور اس کے رسول اور اولو الامر کی اطاعت کریں ، اور جہاں کہیں کوئی تنازعہ یا استفسار کی نوبت آئے تو اس معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کے دربار عالی میں پیش کر کے حکم الٰہی معلوم کریں:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّٰهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً" (سورۃ النساء:۵۹)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی ، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں ، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)۔

چنانچہ عہد نبوت میں مسائل واحکام کے سلسلہ میں رہنمائی کے لئے ذات نبوت کی جانب رجوع ہر حال میں لازمی تھا۔صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ سے قرآنی آیات سیکھتے اوران احکام کو اپنی زندگی میں نافذ کرتے۔اگرانھیں خودکوئی سوال درپیش ہوتا تو رسول کریم ﷺ کے پاس آکر دریافت کرتے،اور آپ ﷺ ان کی رہنمائی فرماتے۔یہ رہنمائی کبھی نازل ہونے والی وحی الٰہی یعنی آیات قرآنی کے ذریعہ ہوتی،اورکبھی آپ اپنے الفاظ میں الٰہی رہنمائی سے آگاہ کرتے،اوربیشتر ایسا بھی ہوتا کہ وہ آپ ﷺ کو عمل کرتے ہوئے دیکھ کر سیکھتے اوراسی طرح عمل کرلیتے۔کیونکہ یہ بھی اللہ کا حکم تھا:

''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا''(سورۃ الحشر:۷)۔

(جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لےلواور جس چیز سے وہ روک دے اس سے رک جاؤ)

اور'' قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ''(سورۃ آل عمران:۳۱)۔

(اے نبی ﷺ!لوگوں سے کہہ دو اگرتم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہوتو میری پیروی اختیار کرو،اللہ تم سے محبت کرے گا اورتمہاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا،وہ بڑا معاف کرنے والا اوررحیم ہے)

تئیس سالہ دورنزول قرآن میں رسول کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو ایسی قرآنی تربیت سے گذارا گیا کہ وہ قرآنی رنگ میں رنگ کراس کے مزاج و مذاق آشنا بن گئے۔ صحابہؓ کی اس قدسی جماعت نے صاحب قرآن ﷺ کی صحبت بافیض میں رہ کران سے قرآن کا نطق وقراءت بھی سیکھا اوراس کی تفسیر وتشریح بھی۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے خلق نبوت کے بارے میں سوال کرنے والے کو یہی جواب دیا تھا کہ:

'' کان خلقه القرآن''(۱)۔ (آپ ﷺ کا خلق سراپا قرآن تھا)

صحابہ کی اس قرآنی اورنبوی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ قرآن مقدس کو اپنے تمام تر معاملات اور مسائل میں فیصل قرار دیتے تھے،اس کی ہدایات کے سامنے سرتسلیم خم کرتے، اس کے اوامر بجالاتے،اس کی نواہی سے گریزاں رہتے اوراس کی مقرر کردہ حدود سے سر

موتجاوز کرنے کا خیال بھی نہ لاتے تھے:

''وَمَن يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَاراً خَالِداً فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ'' سورۃ النساء:۱۴)۔

(اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن سزا ہے)۔

اس تربیت قرآنی کی جھلک دیکھئے کہ جب رسول کریم ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کے علاقہ کا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا تو ان سے دریافت فرمایا کہ اگر ان کے سامنے لوگوں کے معاملات پیش ہوں تو ان میں کس طرح فیصلہ کریں گے:

'' كيف تقضي اذا عرض لك قضاء ؟ قال : اقضي بكتاب الله ''۔ (۲)

انھوں نے برملا جواب دیا کہ: اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔

یہی روش ان تمام صحابہ کرام کی تھی جو احکام ومسائل کے استنباط کے عمل سے کسی نہ کسی حیثیت میں جڑے ہوئے تھے۔ سب کے پیش نظر سب سے پہلے کتاب الٰہی کی آیات ہوتیں، اور ان ہی کی روشنی میں وہ مسائل کے احکام معلوم کرتے، اور درپیش معاملات کے لئے حکم شرعی کا استنباط کرتے۔ چنانچہ جب صحابہ کرامؓ ذات نبوت ﷺ سے دور ہوتے اور انھیں فوری موقع مہیا نہ ہوتا کہ پیش آمدہ معاملہ میں حضور اکرم ﷺ سے استفسار کر سکیں تو وہ قرآنی آیات کو سامنے رکھ کر خود سے اجتہاد کرتے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ غزوہ ذات السلاسل کی ایک سرد رات میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو جنابت کی وجہ سے غسل کی ضرورت پیش آگئی۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ کڑکڑاتی سرد صبح کا غسل باعث ہلاکت نہ بن جائے۔ چنانچہ انھوں نے تیمّم کیا اور لوگوں کو فجر کی نماز پڑھائی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو ان سے پوچھا کہ تم نے جنبی ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے سردی کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہوا، میں نے قرآن میں دیکھا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''ولا تقتلوا انفسكم ان الله كان بكم رحيما''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جواب سنا تو ہنس پڑے اور کچھ نہیں کہا۔ (۳)۔

عہد نبوت کے بعد یہ صورت بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی، اب چونکہ رسول کریم ﷺ کی ذات مقدسہ موجود نہیں تھی، جن کا ہر جواب بذات خود شریعت تھی، اب ان کے سامنے مسائل تھے اور انھیں خود ہی ان میں شرعی احکام دریافت کرنی تھی۔ سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس غرض کے لئے جو منہج اور طریقہ اختیار فرمایا، ابن القیم نے حضرت ابوبکرؓ کے اس منہج کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”کان ابو بکر الصدیق اذا ورد علیه حکم نظر فی کتاب الله تعالی، فان وجد فیه ما یقضی به قضی به، وان لم یجد فی کتاب الله نظر فی سنة رسول الله ﷺ، فان وجد فیه ما یقضی به قضی به، فان اعیاه ذلک سال الناس هل علمتم ان رسول الله ﷺ قضی فیه بقضاء، فربما قام الیه القوم فیقولون: قضی فیه بکذا وکذا، فان لم یجد سنة سنها النبی ﷺ جمع رؤساء الناس فاستشارهم فاذا اجتمع رایهم علی شیء قضی به“(۴)۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو آپ اللہ کی کتاب میں دیکھتے، اگر اس میں جواب مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کردیتے۔ اگر اللہ کی کتاب میں نہیں ملتا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت میں دیکھتے، اگر اس میں جواب ملتا تو اس کے مطابق فیصلہ کردیتے۔ اگر وہاں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے پوچھتے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ کبھی لوگ بتاتے کہ اس معاملہ میں آپ ﷺ نے ایسا ایسا فیصلہ فرمایا ہے۔ اگر نبی ﷺ کی کوئی سنت نہیں ملتی تو سربرآوردہ لوگوں کو جمع کرکے ان سے مشورہ کرتے، اگر وہ کسی رائے پر متفق ہوجاتے تو آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے)

یعنی احکام ومسائل کے استنباط کا منہج صدیقی یہ تھا کہ سب سے پہلے کتاب اللہ میں مسئلہ کا حکم تلاش کیا جاتا، اگر اس میں حکم مل جاتا تو فیصلہ اس کے مطابق کیا جاتا تھا۔ مانعین زکاۃ سے قتال کیا جائے گا یا نہیں، اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے قرآن سے استدلال کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اللہ نے نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے کا حکم ایک ساتھ دیا ہے، اس میں فرق کرنے والے غلط ہیں، اور میں ان میں فرق کرنے والوں سے جہاد کروں گا۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق اعظمؓ بھی اسی روش پر گامزن رہے؟ابن القیم لکھتے ہیں:

"وکان عمر یفعل ذلک فان اعیاہ ان یجد فی الکتاب والسنة سال هل کان ابوبکر قضی فیه بقضاء فان کان لابی بکر قضاء قضی به والا جمع علماء الناس واستشارهم فاذا اجتمع رایهم علی شیء قضی به"(۵)۔

(حضرت عمرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے، اگر انھیں کتاب وسنت میں جواب نہیں ملتا تو پوچھتے کہ کیا اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کوئی فیصلہ کیا ہے؟ اگر حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ ہوتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے، ورنہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے، اگر وہ کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو وہی فیصلہ کر دیتے)

یہی طریقہ معلم کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تھا، انھوں نے فرمایا: "من عرض له منکم قضاء فلیقض بما فی کتاب الله"(۶)۔ (اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آجائے تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو)

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس بھی اسی راہ پر گامزن رہے:

"عن عبید الله بن ابی یزید قال سمعت ابن عباس اذا سئل عن شیء فان کان فی کتاب الله قال به، وان لم یکن فی کتاب الله وکان عن رسول الله ﷺ قال به"(۷)۔

(عبیداللہ بن ابو یزید کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کو سنا کہ جب ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تو اگر اس کا جواب اللہ کی کتاب میں ہوتا تو وہی جواب دیتے، اور اگر اللہ کی کتاب میں جواب نہیں ہوتا اور اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث میں جواب ملتا تو وہی جواب دیتے)

غرض یہ مقررہ روش تھی جس پر تمام صحابہ کرام گامزن رہے، کہ جب بھی کوئی سوال یا مسئلہ درپیش ہوتو اس کا حکم قرآن مجید کے اندر تلاش کیا جائے، اور قرآن مجید سے ہی اول اول احکام ومسائل کے استنباط کا کام لیا جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے قاضی حضرت شریحؒ کو اسی مضمون کا خط لکھا تھا:

''اذا وجدت شيئا في كتاب الله فاقض به ولا تلتفت الى غيره''(۸)۔
(اگر تمہیں اللہ کی کتاب میں جواب مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو، اور اس کے غیر کی طرف توجہ نہ کرو)

صحابہ کرام کے اس منہج پر ان کے شاگرد تابعین اور مجتہدین کار بند رہے، اور انہی اصولوں پر انھوں نے استنباط واجتہاد کے عظیم کارنامے انجام دیئے۔ امام ابوحنیفہ جو فقہی مسالک میں سب سے اول مسلک یعنی 'فقہ حنفی' کے مؤسس ہیں، اور جن کے بارے میں امام شافعی جیسے محدث وفقیہ کی شہادت ہے کہ:'' الناس في الفقه عيال على ابي حنيفه''،(لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں)، انھوں نے اپنا منہج استنباط ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''اگر قرآن میں مل جائے تو اس کا حکم لیتا ہوں، قرآن میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ ﷺ کو لیتا ہوں، اور کتاب وسنت میں کسی بات کا حکم نہیں پاتا تو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے جس کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں''(۹)

قرآن کے حوالے سے یہی منہج استنباط تمام فقہاء عظام اور مجتہدین کرام کا رہا ہے۔

قرآن مجید سے احکام ومسائل کے استنباط میں فقہاء کرام یہاں تک اہتمام فرماتے تھے کہ انھوں نے قرآن کریم سے اخذ معانی کے لئے صرف اس کے ظاہری الفاظ تک خود کو محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے اشارات اور اقتضاءات سے بھی احکام مستنبط کئے، چنانچہ قرآن مجید سے اخذ معانی کے لئے انھوں نے چار طریقے بیان کئے: ایک 'عبارة النص' یعنی وہ حکم جو نص قرآنی کے الفاظ سے ہی واضح ہو جاتا ہو۔ دوسرے 'دلالة النص' یعنی وہ حکم نص قرآنی کے لفظ سے تو ثابت نہ ہو، البتہ وہ اس کی واضح مراد ہو، جیسے والدین کو اف نہ کہنے کے حکم سے جسمانی اذیت کی ممانعت کا ثبوت۔ تیسرے 'اشارة النص' یعنی وہ حکم جو آیت قرآنی کے ذکر کا مقصود تو نہ ہو، لیکن وہ مفہوم نص کے الفاظ سے ہی سمجھ میں آجاتا ہو، جیسے حکم قرآنی ''وعلى المولود له رزقهن ''(اور بچہ کے باپ پر ان کی ماؤں کا خرچہ ہے) سے باپ کی طرف بچہ کے نسب کی نسبت کا ثبوت۔ چوتھے 'اقتضاء النص' یعنی وہ مفہوم نص کے معنی کا لازمی تقاضا ہو، جیسے حکم قرآنی '' حرمت عليكم الميتة ''(تم پر مردار کو

حرام کر دیا گیا) سے مردار کے گوشت کی حرمت کا حکم۔ اسی طرح جمہور فقہاء نے نص قرآنی کے مفہوم مخالف سے بھی استنباط حکم کیا ہے۔

سابقہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ احکام ومسائل کے استنباط میں قرآن مجید کو بنیادی اور اولین حیثیت حاصل رہی ہے۔اسی لئے اصول فقہ میں' جو استنباط احکام کے طرق ومناہج پر مشتمل فن ہے، قرآن مجید کو 'مصدر اول' قرار دیا جاتا ہے۔ اور اجتہاد کی بنیادی شرط یہ قرار پاتی ہے کہ قرآن کی ان آیات پر گہری نظر ہو' جو احکام سے تعلق رکھتی ہیں۔قرآن کریم میں آیات احکام کی تعداد دوڈھائی سو سے لے کر پانچ سو تک بیان کی گئی ہے،اور متعدد فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ قرآن کی آیات احکام کی تفسیر وتوضیح کے لئے کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ، جن میں احکام القرآن از جصاص رازی ، احکام القرآن از الکیاہراسی ، اور احکام القرآن از ابن العربی کے علاوہ ملاجیون کی 'تفسیرات احمدیہ' اور مولانا ظفر احمد عثمانی وغیرہ کی 'احکام القرآن' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔فقہی مسالک کی تشکیل میں قرآن مجید اولین سرچشمہ رہا ہے،اور فقہی اجتہاد کا پورا سفر اسی راہ پر جاری رہا ہے۔

انسانی زندگی تغیر پذیر ہے اور تغیر مسائل ومعاملات کی نئی نئی صورتیں سامنے لاتا رہتا ہے۔تاریخ میں جب عہد خلفائے راشدین ،عہد بنوامیہ اور ابتداء عہد بنوعباس کے اندر، یا دوسرے الفاظ میں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اندر اسلامی فتوحات کی کثرت ہوئی ، دوسری اقوام کے ساتھ میل جول بڑھا، نئے افکار وتمدن سے واسطہ پڑا ، اور نئی نئی چیزیں سامنے آئیں ،تو بے شمار نئے مسائل پیدا ہوئے ، اور نئے سوالات نے جنم لیا۔ایسے موقع پر مجتہدین وفقہاء نے پوری سعی وامانت کے ساتھ ان نو پیش مسائل کے شرعی احکام دریافت کئے اور امت مسلمہ کو کسی ایسی راہ پر نہ چھوڑا جہاں وہ اپنے مسائل ومعاملات کے بارے میں شرعی رہنمائی سے محروم رہ سکے۔درمیان کی طویل صدیوں میں یہ سفر دھیمی رفتار سے جاری رہا، لیکن انیسویں اور بیسویں صدی میں پھر ایک بار صنعتی انقلاب ،نئی تحقیقات وایجادات اور تمدنی ترقی کے نتیجہ میں زندگی کے بیشتر میدانوں میں بے شمار نئے مسائل پیدا ہوئے اور علماء امت نے ان کے شرعی جوابات فراہم کئے ۔اور تبدیلی وترقی کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔

تاریخ کے ان دونوں مواقع پر یہ سوال پوری قوت سے اٹھا کہ کیا ان نوع بہ نوع مسائل کے حل کے لئے شریعت کے مصادر کافی ہیں؟ اور کیا ان بدلے حالات میں اسلامی شریعت قابل عمل رہ سکتی ہے؟ لیکن دونوں مواقع پر فقہاء ومجتہدین کی اجتہادی خدمات اور استنباط احکام کی عملی کاوشوں نے ثابت کر دیا کہ شریعت اسلامی دائمی اور ابدی شریعت ہے، اور قرآن وسنت کے سرچشموں سے ہر دور کے نئے مسائل حل کئے جاتے رہیں گے۔

دراصل اللہ نے قرآن کریم کے اندر چند مسائل کے اندر تو جزوی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، جن میں حالات کی تبدیلی کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے۔ جیسے میراث کے حصے، محرمات نکاح کی تعیین اور حدود وقصاص کے کچھ احکام وغیرہ۔ لیکن عام مسائل میں صرف اصولی ہدایات دینے پر اکتفا کیا گیا ہے، خود صاحب قرآن جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جزوی مسائل کی تعیین کرنے کے بجائے صحابہؓ کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ قرآن وسنت کے دائرہ میں رہ کر نئے مسائل میں استنباط واجتہاد کا عمل انجام دیتے رہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله و سنة نبیه" (۱۰)۔

(میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، تم جب تک ان دونوں کو تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت)

پھر ان اصولی ہدایات سے کس طرح جزوی احکام کا استنباط کیا جائے، اس کی تربیت بھی آپ ﷺ نے دی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے سابق الذکر واقعہ میں جب رسول کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اگر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں درپیش مسئلہ کا حکم نہ ملے تو کس طرح فیصلہ کرو گے، اور انھوں نے جواب دیا کہ: "اجتهد برایي و لا آلــو"، یعنی تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا، تو رسول خدا ﷺ نے اس جواب پر اپنی بے پناہ خوشی اور رضامندی کا اظہار فرمایا۔ اسی طرح جب ایک خاتون نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی، لیکن ان کا انتقال ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں،

حج کرلو، اگر تمہاری ماں پر کسی انسان کا قرض باقی ہوتا تو تم اسے ادا نہیں کرتی؟ اللہ کا قرض زیادہ مستحق ہے کہ اسے ادا کیا جائے (۱۱)۔ ایسے ہی آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: جب ایسا مسئلہ پیش آئے جس کا حکم قرآن اور سنت میں نہ ملے تو امت کے اہل علم کو جمع کر کے ان کے مشورہ سے فیصلہ کرو (۱۲)۔ آپ علیہ السلام کی اول الذکر ہدایت میں اجتہاد کی، ثانی الذکر میں قیاس کی اور ثالث الذکر میں اجماع کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ ایسی اور بھی نبوی ہدایات موجود ہیں۔ آپ علیہ السلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں جن مسائل کا واضح حکم قرآن وحدیث میں نہیں پایا، ان میں مشورہ اور اتفاق سے فیصلہ کیا۔ نیز انھوں نے بے شمار نئے مسائل کو قرآن وسنت میں موجود مسائل پر اشتراک علت کی بنیاد پر قیاس کیا۔ چنانچہ خود صدیق اکبرؓ کی خلافت پر بیعت کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ نے قیاس سے کام لیتے ہوئے کہا کہ:

''رضیه رسول الله ﷺ لديننا او لا نرضاه لدنيانا'' (۱۲)۔

(رسول اللہ ﷺ نے ان کو ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا ہے تو کیا ہم اپنی دنیا کے لئے انھیں پسند نہ کریں؟)

اسی طرح صحابہ کرامؓ نے قرآن کی جمع وتدوین کا فیصلہ باہمی اتفاق سے کیا۔ یوں نئے مسائل کو حل کرنے کے لئے قرآن وسنت کے ساتھ قیاس اور اجماع سے کام لیا گیا ، اور فقہی احکام کے استنباط کے لئے اولین ادلہ شرعیہ: قرآن وسنت، اور اجماع وقیاس قرار پائے۔ ان چار ادلہ شرعیہ کے علاوہ کچھ ثانوی یا ضمنی ادلہ شرعیہ بھی قرار پائے، جیسے استحسان جو قیاس ہی کی اقوی شکل ہے، استصلاح، استصحاب اور سد ذرائع وغیرہ، جو محض ضمنی اور تبعی دلائل ہیں، اور اصل میں ادلہ اربعہ سے ہی مستفاد و مستند ہیں۔

جہاں تک ادلہ شرعیہ اربعہ کا تعلق ہے تو قرآن کی متعدد آیات سے ان کی تائید ہوتی ہے، گویا ان ادلہ کی روشنی میں استنباط دراصل قرآن ہی سے استنباط ہے، دیکھئے قرآن کی آیت ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ'' (سورۃ النساء:۵۹)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو)

اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم قرآن اور سنت کی پیروی کا حکم ہے۔ اولوالامر (صاحب امر) سے اولوالامر التشریعی یعنی علماء امت مراد ہیں، اور ان کی اتباع کے حکم میں ان کے اتفاق یعنی اجماع کی پیروی کا حکم ہے۔ اور متنازع واقعات کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹانے کا حکم دراصل جب قرآن وسنت کا واضح حکم نہ ہو تو اس وقت قیاس کرنے کا حکم ہے، کیونکہ قیاس میں کسی نئے مسئلہ کو قرآن وسنت کے کسی حکم کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ (۱۳)

پس حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید سے احکام ومسائل کا استنباط تو قرآن سے استنباط ہے ہی، سنت رسول ﷺ سے استنباط بھی قرآن ہی کے حکم کی تعمیل ہے، اور اسی طرح اجماع اور قیاس سے استنباط بھی بالآخر قرآن اور سنت ہی کے حکم کی تعمیل ہونے کی وجہ سے بالواسطہ قرآن سے استنباط میں داخل ہے۔

عصر حاضر کے تقاضے

سابقہ سطور میں فقہ اسلامی کے اس اصولی موقف کی توضیح کی گئی جس کی رو سے احکام ومسائل کے استنباط میں قرآن مجید کو اولین سرچشمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ ابتدائی دور سے عملی روایت کا سفر اسی نہج پر جاری رہا ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ موجودہ دور جو نئے مسائل کی کثرت، تنوع اور پیچیدگی کے حوالے سے امتیاز رکھتا ہے، ساتھ ہی علمی زوال روز افزوں ہے، اس دور میں احکام ومسائل کے استنباط میں قرآن مجید سے استفادہ کی کیا نوعیت ہے اور اس باب میں کیا امور غور وفکر کے قابل ہیں۔

دور حاضر میں نئے مسائل کی کثرت کی وجہ سے مختلف سطحوں پر فقہی غور وخوض اور اجتماعی اجتہاد کا کام جاری ہوا ہے۔ عالمی سطح پر 'مجمع البحوث الاسلامیہ' قاہرہ (قیام ۱۹۶۱ء)،

'مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ' (قیام ۱۹۸۴)، 'رابطہ عالم اسلامی کی المجمع الفقہی الاسلامی' (قیام ۱۹۷۸)اور 'یوروپین افتاء کونسل' (آئرلینڈ، قیام ۱۹۹۷) کے انتہائی اہم متعدد فقہی اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں، جن میں دور حاضر کے سینکڑوں مالی، طبی، معاشرتی اور دیگر مسائل پر حکم شرعی کے استنباط کا کام انجام پایا ہے۔ خود ہمارے ملک کے اندر 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' (قیام ۱۹۸۹) نے تقریبا دو درجن فقہی سیمیناروں کے ذریعہ سو سے زائد نئے مسائل پر شرعی رہنمائی فراہم کی ہے۔ 'ادارہ مباحث فقہیہ' (قیام ۱۹۷۰) 'مجلس تحقیقات شرعیہ' (قیام ۱۹۶۳)، 'مجلس فقہی' (قیام ۱۹۹۲) اوراسی طرح کے دیگر اداروں کی فقہی خدمات بھی نا قابل فراموش ہیں۔

یہ بات تو سرے سے قابل قبول ہی نہیں ہوسکتی کہ موجودہ دور کے اندر انفرادی یا اجتماعی سطح پر شرعی احکام کے استنباط میں قرآن مجید بنیادی مصدر شریعت کے طور پر پیش نظر نہ رہے۔ کیونکہ ایسا کوئی بھی اجتہاد اور استنباط حکم درست ہی نہیں ہوسکتا جس میں قرآن اولین سرچشمہ نہ ہو۔ البتہ اس ضمن میں چند باتیں ضرور قابل توجہ ہیں:

۱- پہلی بات یہ کہ شریعت کے احکام اپنے کچھ مقاصد رکھتے ہیں، اوران احکام کی غرض صرف ظاہری رسوم کی بجا آوری نہیں بلکہ ان سے وابستہ مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس لئے بسا اوقات بالخصوص اجتہادی مسائل میں اگر کسی حکم سے اس کا مطلوبہ مقصد پورا نہیں ہورہا ہوتو حکم میں تبدیلی لائی جاتی ہے۔ استنباط احکام کے عمل میں اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء ومجتہدین نے قیاس کے ذریعہ استنباط احکام کرتے ہوئے جب یہ محسوس کیا کہ اس کا تکنیکی استعمال بعض جگہوں پر مقصود شرع سے دور لے جاتا ہے تو اس میں جزوی استثناء یا عدول کا منہج اپناتے ہوئے اس کا نام 'استحسان' رکھا، تا کہ مستنبط شدہ حکم مقصود شرع سے ہم آہنگ ہو جائے۔ موجودہ دور میں احکام ومسائل کے استنباط اور فتاوی کے اختیار میں بعض حلقوں کے اندر بسا اوقات یہ پہلو نظر انداز ہورہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جیسے دستوری ملک میں بعض لوگوں کی طرف سے ربوا کے جواز کی رائے،

جس پر اللہ نے جنگ کا اعلان کیا ہے، محض اس مزعومہ تکنیکی بنیاد پر دے دی جاتی ہے کہ ہندوستان دار الاسلام نہیں بلکہ دار الحرب ہے۔ جب کہ خود یہ اصطلاحات قرآن وسنت میں وارد نہیں ہیں، چہ جائیکہ موجودہ ہندوستان پر ان کا انطباق درست ہو، اوراس کے نتیجہ میں ربوا جیسے محرم قطعی کے جواز کی رائے اپنائی جائے۔

۲- قیاس کا عمل قرآن وسنت کے منصوص حکم پر مبنی ہوتا ہے، خود قیاس سے ثابت کسی حکم پر مزید کسی نئے مسئلہ کو قیاس نہیں کیا جاتا ہے، موجودہ دور میں نئے مسائل و احکام کا استنباط کرتے ہوئے بسا اوقات کسی قدیم فقہی جزئیہ کی تلاش' اس غرض سے کہ وہ نئے استنباط کے لئے مستدل بن سکے' براہ راست نصوص قرآن وسنت اوران کے مقصود پرغور کی بہ نسبت زیادہ کی جانے لگتی ہے۔ جب کہ نہ تو کسی قیاسی یا اجتہادی رائے کو مستدل بنایا جاسکتا ہے، اور نہ ہی یہ منہج قابل اطمینان ہے کہ نصوص کی بجائے اجتہادی جزئیات کی تلاش پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اس سلسلہ میں نصاب زکاۃ کے اندر سونے اور چاندی کے درمیان قیمتوں کے زبردست فرق کا مسئلہ غربت اورغناء کے حوالے سے ہمارے غور وفکر کا محتاج ہے۔

۳- قرآن وسنت کے نصوص اورفقہاء کے مستنبط کردہ اجتہادی احکام میں ایک واضح فرق ہے۔ نصوص دائمی اور ناقابل تبدیل ہیں، جبکہ اجتہاد کا عمل حالات زمانہ کی رعایت اور موجودہ لوگوں کے عرف ورواج کو سامنے رکھ کر انجام پاتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: ''من لم یعرف اھل زمانه فھو جاھل'' (جو اپنے زمانہ کے لوگوں کو نہ جانے وہ جاہل ہے)۔ اور ''لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان'' (یعنی زمانہ کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی قابل نکیر نہیں ہے)۔ پس ہر زمانہ کے اجتہادی احکام پر متعلقہ زمانہ کے احوال اور رائج عرف کے اثرات ہوتے ہیں۔ بدلے زمانہ میں اور نئے عرف میں ضروری نہیں کہ سابقہ اجتہادی احکام کے ہو بہو نفاذ پر اصرار کیا جائے۔ بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ بدلے حالات میں نصوص قرآن وسنت کے مقصود کی کہاں تک تکمیل ہو رہی

ہے۔اور اس کے مطابق تبدیلی احکام یا استنباط جدید کی ضرورت ہوگی ۔اس پہلو سے بھی موجودہ روش قابل غور ہے، جہاں بسا اوقات قدیم رائے پر اصرار کے نتیجہ میں فکر و نظر کی سطح پر انتشار اور عمل کی سطح پر دشواری اور غیر محمود نتائج سامنے آنے لگتے ہیں۔طلاق سے جڑے کئی مسائل میں آج یہ صورت حال دیکھی جاسکتی ہے۔

حوالے جات

(۱) احمد بن حنبل، مسند احمد حدیث نمبر ۲۵۶۸۹، جلد ۱۸ صفحہ ۶۰، تحقیق حمزہ احمد الزین، طبع اول، دار الحدیث قاہرہ ۱۹۹۵ء۔

(۲) ابوداؤد، سنن ابوداؤد، کتاب الاقضیہ

(۳) ابوداؤد، سنن ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب اذا خاف الجنب البرد ایتیمم ؟

(۴) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۴۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۵) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۵۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۶) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۵۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۷) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۵۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۸) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۴۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۹) محمد خضری، اردو ترجمہ، عبدالسلام ندوی، تاریخ فقہ اسلامی، صفحہ ۳۰۴، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۸ء

(۱۰) موطا امام مالک، کتاب القدر، باب النہی عن القول بالقدر

(۱۱) محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الحج والنذ ورعن المیت، حدیث نمبر ۱۸۵۲۔

(۱) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۵۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۱۲) ابن القیم، اعلام الموقعین ۱/۱۶۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء

(۱۳) عبدالوہاب خلاف، علم اصول الفقہ، صفحہ ۲۱، مکتبۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، شباب الازھر۔

رجوع الی القرآن کی ایک اہم صورت
دور جدید کی رہنمائی کے تناظر میں

محی الدین غازی

رجوع الی القرآن کی عوامی سطح کی تحریک، جس کے مخاطب عوام ہوتے ہیں اور جس میں قرآن مجید کو ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔اس تحریک کے اب تک کیا نتائج حاصل ہوئے، اور اس کو مزید موثر کس طرح بنایا جائے، اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

تاہم زیرنظر تحریر کا تعلق اس سے ہے کہ علمی سطح پر اور خاص طور سے دور جدید کے تناظر میں رجوع الی القرآن کے ابعاد کیا ہو سکتے ہیں، اور اہل علم کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔

دور جدید کی رہنمائی قرآن مجید کے دائرہ ہدایت میں یقینی طور سے شامل ہے، اور یہ اس گروہ کی ذمہ داری ہے جو خود کو قرآن مجید کا حامل اور امین سمجھتا ہے۔

اب تک دور جدید کے سامنے اسلام کی جو ترجمانی کی گئی، خواہ اس کا تعلق عمل سے ہو یا نظریہ سے ہو، وہ محض قرآن مجید سے ماخوذ نہیں تھی بلکہ اس میں روایات اور فقہی اجتہادات بھی شامل تھے، اسلام سے متعلق جو اشکالات اور اعتراضات دور جدید کی جانب سے کئے گئے، ان میں بھی اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ اعتراضات کا محل قرآن مجید کی ہدایت ہے یا روایات اور فقہی اجتہادات سے برآمد ہونے والا کوئی نتیجہ ہے۔

اعتراضات کا جواب دینے کے سلسلے میں دور جدید کے متکلمین اسلام کا عام طور سے موقف یہ رہا ہے کہ انہوں نے ہر اعتراض کا جواب پورے اخلاص اور بھرپور قوت سے دینے کی کوشش کی اور چونکہ دور جدید کا مطالبہ تھا کہ عقل ومنطق کی زبان میں گفتگو کی جائے، اس لئے دور جدید کے علمائے اسلام نے عقلی دلائل سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب

دینے کی کوشش کی۔اس سلسلے میں دور جدید کے علمائے اسلام کی کوششیں یقیناً قابل قدر ہیں۔

تاہم عقل و منطق کے حوالے سے جدید ذہن کو مطمئن کرنے کی کوششیں کہیں کامیاب نظر آتی ہیں، لیکن کہیں ایسا نظر نہیں آتا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے، کہ جب بھی کسی موقف پر اعتراضات یا سوالات وارد ہوئے تو اس موقف کو قطعی اور کسی بھی قسم کی غلطی سے محفوظ مان کر اس کی وکالت اور بدافعت کی گئی، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پہلے اپنے موقف پر قرآن مجید کی روشنی میں نظر ثانی کی جاتی، اور وہاں سے تائید ملنے کی صورت میں پوری قوت کے ساتھ مدافعت کی جاتی اور اگر خود قرآن مجید سے تائید نہیں ہوتی تو اس موقف سے رجوع کر کے وہ موقف اختیار کیا جاتا جو قران مجید سے ثابت ہو رہا ہو۔ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ہم اپنی بعض ان رایوں کی بھی مدافعت میں جمے رہے جن کی تائید نہ تو عقل سے ہوتی تھی اور نہ ہی قرآن مجید سے اور جو نہ جدید دور کے غیر مسلم ذہن کو مطمئن کر سکتے تھے اور نہ ہی قرآن مجید سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو۔

اس کی ایک مثال غلامی کا مسئلہ ہے۔جو بیک وقت غلامی کے مسئلہ سے بھی متعلق ہے اور جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے مسئلہ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

اسلام کے عہد اول میں غلامی کو جس طرح گوارا کیا گیا اور لونڈیوں اور غلاموں سے متعلق جو احکام دیئے گئے، اہل علم نے اس کی عقلی توجیہ پیش کی اور وہ ذہنوں کو اپیل بھی کرتی ہے اور سماجیاتی طریق استدلال سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

تاہم اسی مسئلۂ غلامی سے متعلق فقہاء کا یہ موقف کہ جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنا کر عام مسلمانوں کی ملکیت میں دیا جا سکتا ہے، کسی طور سے انسانی ذہن کو مطمئن نہیں کر پاتا۔

اس موقف سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اگر پوری دنیا سے غلامی کا خاتمہ ہو جائے اور غلام بنانے کے سارے راستوں کو دنیا غیر قانونی اور غیر اخلاقی قرار دے دے، اس کے باوجود اسلام وہ مذہب ہے جو نہ صرف آزاد انسانوں کو غلام بنانا جائز سمجھتا ہے، اور اسلام کے راستے سے دوبارہ دنیا میں غلاموں کا دور واپس آ سکتا ہے۔

مزید یہ کہ جنگی قیدیوں کے بحیثیت انسان حق آزادی کو اگر پوری دنیا تسلیم کر لے تو بھی اسلام اسے تسلیم نہیں کرتا۔

فقہاء کے مذکورہ موقف کی وکالت و مدافعت میں جو توجیہات پیش کی جاتی ہیں گو کسی بھی دور کے ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتی تھیں، تاہم جدید ذہن چونکہ غلامی کے تصور سے عام طور سے اور پورے طور پر متنفر ہو چکا ہے، اس لئے اب تو ان توجیہات میں ذہن کو اپیل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی دیگر علمائے اسلام کے علاوہ مولانا مودودی نے بھی فقہاء کے اس موقف کی عقلی توجیہ پیش کر کے جدید ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کوشش بالکل کامیاب نظر نہیں آتی۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"قیدیوں کے معاملے میں یہ شکل اسلام نے سرے سے اپنے ہاں رکھی ہی نہیں ہے کہ ان کو ہمیشہ قید رکھا جائے اور حکومت ان سے جبری محنت لیتی رہے اگر ان کے ساتھ یا ان کی قوم کے ساتھ تبادلۂ اسیران جنگ یا فدیے کا کوئی معاملہ طے نہ ہو سکے تو ان کے معاملے میں احسان کا طریقہ یہ رکھا گیا ہے کہ انہیں غلام بنا کر افراد کی ملکیت میں دے دیا جائے، اور ان کے مالکوں کو ہدایت کر دی جائے، کہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس طریقے پر عمل کیا گیا ہے، صحابہ کرام کے عہد میں بھی یہ جاری رہا ہے، اور فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ جو شخص قید میں آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو اور پھر کسی طرح گرفتار ہو جائے وہ تو آزاد کر دیا جائے گا، مگر جو شخص قید ہونے کے بعد اسلام قبول کرے، یا کسی شخص کی ملکیت میں دے دئے جانے کے بعد مسلمان ہو تو یہ اسلام اس کے لئے آزادی کا سبب نہیں بن سکتا۔ ۔ ۔ اور یہ بات سراسر معقول بھی ہے، اگر ہمارا قانون یہ ہوتا کہ جو شخص بھی گرفتار ہونے کے بعد اسلام قبول کر لے گا وہ آزاد کر دیا جائے گا تو آخر وہ کون سا نادان قیدی ہوتا جو کلمہ پڑھ کر رہائی نہ حاصل کر لیتا"۔ [تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۴]

ایک اور مسئلہ تبدیلی مذہب کا ہے، تبدیلی مذہب کی سزا موت تو ہر زمانے میں

باطل ادیان کا قانون رہا ہے، انہوں نے کبھی نبیوں کو مذہب کی تبلیغ کی اجازت دی اور نہ کسی کو ان کی دعوت سے متاثر ہو کر اپنا مذہب تبدیل کرنے کی اجازت دی۔ قرآن مجید نے اس پابندی کے خاتمہ کا اعلان کیا، کہ اب ہر انسان کو تبلیغ کی بھی آزادی ہوگی اور تبدیلی مذہب کی بھی آزادی ہوگی۔ جو غلط بات کی تبلیغ کرے گا وہ بھی روز قیامت اپنا انجام دیکھے گا، اور جو غلط مذہب قبول کرے گا وہ بھی اپنے کیئے کی سزا پائے گا۔ تاہم دنیا میں ایسے کسی فرد کو سزا اور وہ بھی سزائے موت سے دوچار نہیں کیا جائے گا۔

تبدیلی مذہب کے سلسلے میں اسلام کا جو موقف پیش کیا جاتا رہا ہے، وہ قرآن مجید سے ماخوذ نہ تھا بلکہ اس کی صراحتوں کے خلاف بھی تھا، دور قدیم میں چونکہ عام انسان اس مسئلہ کے سلسلے میں باشعور نہیں تھا، اور ایسی پابندیاں دنیا میں ہر طرف قائم تھیں، اور ان پابندیوں سے عام آدمی مانوس بھی تھا، غالبا اسی لئے اس مسئلہ پر بھرپور گفتگو کی ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوئی، تاہم جدید دور میں عام انسانوں نے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، مذہب کو اختیار کرنے کی آزادی کو ہر انسان کا بنیادی حق تسلیم کر لیا ہے، اور اگر کسی اسٹیٹ میں تبدیلی مذہب پر پابندی کا قانون بنتا ہے، تو دنیا کے تمام مہذب انسانوں کے ساتھ خود مسلمانوں کو ایسا قانون سراسر غلط اور مبنی بر ظلم نظر آتا ہے، اس لئے دور جدید کے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے بھی اس مسئلے میں رجوع الی القرآن کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

جاری گفتگو سے قطعا یہ مطلب نکالنا درست نہ ہوگا، کہ اس میں محض جدید ذہن کو مطمئن کرنے کی خاطر اسلام کے مختلف احکام پر نظر ثانی کی دعوت دی جارہی ہے، بلکہ اصل دعوت تو اس بات کی ہے کہ قدیم ورثہ اور جدید دور کے دباؤ میں آئے بنا پورے اخلاص اور اعتماد کے ساتھ قرآن کی طرف رجوع کیا جائے، اور جو غلطیاں ماضی میں ہو چکی ہیں، اور اتنی مشہور ومقبول ہوگئی ہیں، کہ اب ان کے غلط ہونے کا خیال بھی خطرناک تصور کیا جاتا ہے، ان کی تصحیح قرآن مجید کی روشنی میں کی جائے، علمی سطح پر یہ رجوع الی القرآن کی سب سے اہم صورت ہے۔

چونکہ یہ غلطیاں دور جدید پر اسلام کی اثر انگیزی کی راہ مین رکاوٹ بھی بن رہی ہیں، اس لئے خاص اس پس منظر میں یہ اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ان غلطیوں کی تصحیح کا

کام کیا جائے اور فوری طور پر اس کام کا آغاز کر دیا جائے۔

یہ امر بہرحال غور طلب ہے کہ اسلام سے متعلق جن احکامات پر دور جدید میں زیادہ طاقتور تنقیدیں کی گئی ہیں، وہ احکام قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتے ہیں، اور جو احکام قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں خود دور جدید انہیں تسلیم کر چکا ہے، یا ایسا لگتا ہے کہ مستقبل میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا۔

رجوع الی القرآن کے پس منظر میں، ایک بڑے تحقیقی پروجیکٹ کے طور پر اس موضوع پر کام کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ انسانوں کے وہ بنیادی حقوق جن پر ساری دنیا کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی عملاً متفق ہیں، ان کے سلسلے میں صرف قرآن مجید کا موقف کیا ہے، صرف قرآن مجید کا موقف معلوم کرنا اس لئے ضروری ہے، کہ اب تک کے سرسری جائزہ سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ اسلام کے غیر قرآنی لٹریچر میں خواہ وہ روایات ہوں تاریخی واقعات ہوں یا فقہاء کے اجتہادات ہوں، بنیادی حقوق کے سلسلے میں بعض تصورات صرف قرآن کے تصور سے مختلف لگ رہے ہیں، دوسری طرف ایسا بھی لگتا ہے کہ صرف قرآن مجید مذکورہ بنیادی حقوق کو جس طرح تسلیم کرتا ہے، غیر قرآنی لٹریچر میں ان کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جاتا۔

غور طلب امر یہ بھی ہے کہ دور جدید میں جن لوگوں نے محض قرآن مجید کی طرف رجوع کر کے اسلام کے مختلف احکام پر نظر ثانی کی اور وہ رائے اختیار کی جس کی تائید قرآن مجید کی دلیلوں سے ہوتی تھی، ان پر جدیدیت سے متاثر ہونے اور دور جدید کے دباؤ کو قبول کرنے کا الزام لگا، اس الزام کو تقویت اس سے پہونچتی رہی کہ جن باتوں کو انہوں نے غلط قرار دیا دور جدید کو ان باتوں پر اعتراض تھا، اور جن باتوں کو انہوں نے اختیار کیا دور جدید کا موقف ان سے کسی قدر ہم آہنگ تھا۔

لیکن اگر ان کے طریق تنقید اور طریق استدلال کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے دور جدید کا دباؤ نہیں قبول کیا تھا بلکہ قرآن مجید کی طرف پورے تجرد کے ساتھ رجوع کیا تھا، اور انہوں نے پورے اخلاص کے ساتھ وہی رائے اختیار کی جو رجوع الی القرآن کے

نتیجہ میں ان کو اختیار کرنا چاہئے تھی، یہ الگ بات ہے کہ رجوع الی القرآن کے نتیجہ میں ان کو امت میں رائج بعض آراء سے اختلاف بھی کرنا پڑا اور جو آراء اختیار کیں وہ دور جدید کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ نظر آئیں۔

جہاں تک فہم واجتہاد اور تشریح وتعبیر پر کسی دور کے دباؤ یا اثر انگیزی کا مسئلہ ہے، یہ کہا جا سکتا ہے اور اس کے واضح دلائل موجود ہیں کہ قدیم دور کے اجتہاد وتعبیر پر زمانہ اثر انداز ہوا، اور بہت سارے احکام پر جاری زمانے کے اثرات واقع ہوئے اور ان سے بالاتر ہو کر فیصلے نہیں کئے گئے۔ اور اسی لئے بعض فیصلے قرآن مجید اور دین کی روح سے متصادم نظر آتے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ایک طرف تو قرآن مجید صاف صاف کہتا ہے کہ یا تو انہیں یونہی چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، مولانا مودودیؒ کے مطابق فقہاء کے یہاں یہ دونوں طریقے پسند نہیں کئے گئے۔ اس کے برعکس وہ طریقے تجویز کئے گئے جو زمانے میں رائج تھے، لیکن آج کا زمانہ خود دباؤ ڈال رہا ہے کہ اسلام کے ماننے والے قرآن کی طرف رجوع کریں۔

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، اللہ کی کتاب میں کوئی ایسا موقف پیش کیا جائے، جو اس کے ماننے والوں کو کمزور پوزیشن میں کھڑا کر دے، یہ بعید از قیاس ہے، ہاں موقف میں اس وقت کمزوری آسکتی ہے جب اللہ کی کتاب کے علاوہ ان دیگر مآخذ کو بھی قرآن کا درجہ دے دیا جائے جو غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں، اور قرآن مجید میں اور ان مآخذ میں جو فرق ہے اس کو نظر انداز کر کے اور سب کو مساویانہ حیثیت دے کر ایسا موقف اختیار کیا جائے جہاں قرآن مجید کی آواز اپنی شان کے مطابق بلند ہونے کے بجائے روایات واجتہادات کے سامنے دب جائے۔

رجوع الی القرآن کے نتیجہ میں جب بعض ان افکار وخیالات کو غلط قرار دینے کی نوبت آتی ہے، جن کو جمہور امت کے یہاں قبول واعتبار حاصل رہا ہے، تو کچھ سوالات یا اندیشے سر ابھارتے ہیں، ان میں سرفہرست یہ ہے، کہ اگر اس طرح امت کے درمیان مسلم خیالات کو غلط قرار دیا جاتا رہا تو اس کا اندیشہ ہے کہ ایک اینٹ کے غلط ثابت ہونے سے

ساری اینٹوں پر سے اعتبار اٹھ جائے، اور دین کی پوری عمارت غیر معتبر قرار دی جانے لگے۔

مولانا مودودی نے مرتد کی سزا کے تعلق سے یہ اندیشہ پیش کیا ہے، ان کے مطابق امت کے اجماعی مسائل کو چھیڑنے سے خواہ وہ دلیل کے حوالے سے کیوں نہ ہو، امت کے پورے دین پر ایمان کو نقصان پہونچنے کا ڈر ہے۔اس کے برعکس مولانا عنایت اللہ سبحانی کا خیال ہے کہ جب ہم قرآن کی روشنی میں کسی مزعومہ اجماعی موقف کے خلاف کوئی مختلف رائے اختیار کرتے ہیں، تو ہمارے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

اس مسئلے کو گہرائی میں جا کر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا مودودیؒ کا اندیشہ اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس کا حوالہ دے کر رجوع الی القرآن سے روکا نہیں جا سکتا، البتہ امت کے افراد کی ایسی ذہن سازی ضروری ہے کہ باشعور ہو جائیں اور فرق کر سکیں ایسے اختلاف میں جہاں محرک کچھ اور ہے، اور ایسے اختلاف میں جہاں رجوع الی القرآن کے نتیجہ میں جمہور امت کی رائے سے اختلاف کرنا ناگزیر ہوا غرض یہ کہ امت کے افراد کو یہ یقین حاصل ہو کہ ان کے پاس قرآن مجید جیسی بہت مضبوط پناہ گاہ ہے، اور جب بھی کسی قسم کے شکوک وشبہات یا امت کے کسی معروف موقف سے اختلاف ان کے اعتماد کو متزلزل کرے، وہ قرآن مجید کے زیر سایہ پناہ لے کر اپنے اعتماد کو قوت پہونچا سکتے ہیں اور ایمان ویقین کی کیفیت کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ رجوع الی القرآن کی یہ صورت آسان نہیں ہے، اس کے لئے اہل علم کی تیاری اور عوام کی ذہن سازی ناگزیر ہے۔

قرآن کریم پر ہندو انتہا پسندوں کے اعتراضات کا جائزہ

محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن کریم پر اعتراضات کا سلسلہ اس کے زمانۂ نزول ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مشرکینِ مکہ نے، جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے، اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے۔ کبھی اسے گھڑی ہوئی کہانیاں (اساطیر) قرار دیا تو کبھی شعر، کہانت یا جادو کہا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد یہود کی جانب سے بھی برملا اسلام دشمنی کا اظہار ہونے لگا اور وہ بھی قرآن پر مختلف اعتراضات کرنے لگے۔ قرآن نے ان تمام اعتراضات کا مدلّل جواب دیا اور ان سے اپنی براءت کا اعلان کیا۔ بعد کے زمانوں میں بھی قرآن کریم پر اعتراضات و الزامات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہر دور میں اعدائے اسلام نے قرآن کو نشانہ بنایا اور اس کی تعلیمات پر تنقید و ملامت کے تیر برسائے۔ اس سلسلے میں خصوصیت سے مستشرقین (Orientalists) کا نام لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے قرآنیات کے میدان میں اہم علمی کام انجام دیے ہیں، لیکن ان کے پس پردہ ان کی اسلام دشمنی کارفرما رہی ہے اور انھوں نے قرآن کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے اور اس کی جانب بے بنیاد باتیں منسوب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے[1]۔

ہندوستان میں بھی اسلام کے مخالفین کی جانب سے قرآن پر اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عیسائی مشنریاں پیش پیش رہی ہیں اور ہندو انتہا پسندوں نے بھی کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ آئندہ سطور میں قرآن پر ہندو انتہا پسندوں کے اعتراضات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

ہندو معترضین میں ایک نمایاں نام سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴-۱۸۸۳ء) کا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں جہاں دیگر مذاہب: یہودیت اور عیسائیت پر اعتراضات کیے ہیں وہیں ایک باب اسلام پر اعتراضات کرنے کے لیے بھی خاص کیا

ہے۔انھوں نے بہ کثرت قرآنی آیات نقل کرکے ان کے من مانے معانی و مفاہیم بتائے ہیں اور اسلام کو ایک جارحیت پسند اور غیر عقلی مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔[۲]

اسلام اور قرآن پر بہت سے اعتراضات شدت پسند ہندو تنظیموں کی جانب سے بھی کیے جاتے رہے ہیں۔مثال کے طور پر اکھل بھارت ہندو مہا سبھا نے ''دیش میں دنگے کیوں ہوتے ہیں؟'' کے عنوان سے ایک فولڈر شائع کیا تھا، جس میں قرآن کی چوبیس (۲۴) آیتوں یا ان کے اجزاء کو نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ قرآن مسلمانوں کو دوسرے دھرموں کے لوگوں سے جھگڑا کرنے کا حکم دیتا ہے۔اور کہا گیا تھا کہ جب تک ان آیتوں کو قرآن سے نکالا نہیں جاتا دیش کے دنگوں کو روکا نہیں جاسکتا''۔[۳]

انہی الزامات کے تحت کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور قرآن پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر فاضل ججوں نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خارج کردیا۔

عموماً ہندو شدّت پسندوں کی جانب سے قرآن کریم کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں، آئندہ سطور میں ان کا تذکرہ کرکے ان کا جائزہ لینے اور صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱- لفظ 'کافر' کا مفہوم؟

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے لفظ 'کافر' استعمال کیا ہے۔ان میں ہندو بھی شامل ہیں۔اس لفظ میں بغض، نفرت اور حقارت کا مفہوم شامل ہے۔کافروں کے بارے میں قرآن میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے دنیا میں جس طرح کا معاملہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور مرنے کے بعد دوسری دنیا میں ان کے ساتھ جیسا معاملہ کیے جانے کی خبر دی گئی ہے، انھیں پڑھ کر مسلمانوں کے دلوں میں ان سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور ان سے دور رہنے اور ہر طرح کا تعلق منقطع رکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لفظ 'کافر' کا یہی مفہوم ہے؟

عربی زبان میں لفظ کفر کے اصل معنیٰ چھپانے اور ڈھانکنے کے ہیں۔عربوں کے کلام میں اس مادہ سے جتنے الفاظ آئے ہیں سب میں یہ معنیٰ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا ہے۔ ماہر لغت ابن درید الازدی نے لکھا ہے:

اصل الکفر التغطیة علی الشیءِ[۴]

(کفر کی اصل ہے کسی چیز کو ڈھانک لینا)

اسی لیے اہل عرب لفظ کافر کا اطلاق ان چیزوں پر کرتے ہیں جو کسی چیز کو ڈھانپ لیں۔مثلاً ان کے کلام میں درج ذیل چیزوں کے لیے اس لفظ کا استعمال ملتا ہے:

رات: کہ وہ اپنی تاریکی سے تمام چیزوں کو ڈھانپ لیتی اور لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ کر دیتی ہے۔

سمندر: کہ وہ بڑی سے بڑی چیز کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔

بڑی وادی: کہ اس میں پہنچ کر لوگ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔

دریا: کہ وہ اپنے اندر چھوٹی بڑی چیزوں کو چھپا لیتا ہے۔

گہرا بادل: کہ وہ ستاروں، چاند اور سورج کو چھپا لیتا ہے۔

کسان: کہ وہ زمین میں بیج ڈال کر اسے چھپا دیتا ہے۔

زِرَہ: کہ وہ فوجی کے جسم کو چھپا لیتی ہے۔

دور دراز کا علاقہ جہاں کسی کا گزر نہ ہو: کہ وہاں رہنے والے عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔[۵]

اسی طرح عربی زبان میں 'کفر' ناشکری کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔اس میں بھی اس کے اصلی معنیٰ پائے جاتے ہیں۔اس لیے کہ جو شخص کسی کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا اپنے محسن کے احسان کو چھپا دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔جمھرة اللغة میں ہے:

وکفر فلان النعمة اذا لم یشکرھا۔[۶]

(فلاں نے نعمت کا کفر کیا،یعنی اس پر شکریہ ادا نہیں کیا)

البتہ عربی زبان میں لفظ 'کفر' کا غالب استعمال، اسلام و ایمان کے بالمقابل ایک

اصطلاح کے طور پر ہوتا ہے، ماہرین لغت نے اس کی صراحت کی ہے۔ ازدی نے لکھا ہے:
الکفر ضد الاسلام[۷] جوہری اور فیروز آبادی کہتے ہیں: الکفر ضد الایمان۔[۸]

قرآن کریم میں لفظ 'کفر' کا استعمال مختلف لغوی معانی کے لیے بھی ہوا ہے اور ایمان کے بالمقابل اصطلاح کے طور پر بھی۔ ایک مقام پر وہ اصل لغوی معنیٰ (چھپانے) میں آیا ہے۔ دنیاوی زندگی کو لہو ولعب قرار دیتے ہوئے اس کی یہ مثال بیان کی گئی ہے:

كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ۔ (الحدید/۲۰)

(اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے......)

اس آیت میں کسانوں کے لفظ 'کفار' لایا گیا ہے۔ کسان کو 'کافر' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کھیتی کے دوران بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔

بعض مقامات پر اس کا استعمال شکر کے بالمقابل ناشکری کے معنیٰ میں ہوا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ۔ (البقرۃ/۱۵۲)

(لہٰذا مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کرو)

إِنَّا هَدَيْنَهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً۔ (الدھر/۳)

(ہم نے اسے راستہ دکھایا، اب خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)

اور چوں کہ ناشکری نعمت کے انکار کو مستلزم ہے، اس لیے بعض مقامات پر یہ انکار اور براءت کے معنیٰ میں آیا ہے:

إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَاناً مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضاً۔ (العنکبوت/۲۵)

(تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے۔ مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے)

قرآن کریم میں کفر کا استعمال ایمان کے بالمقابل ایک اصلاح کے طور پر بھی آیا ہے۔

اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ یہاں بہ طور مثال دو آیتیں درج کی جاتی ہیں:

وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔(البقرۃ/۱۰۸)

(جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا)

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔(البقرۃ/۸۵)

(کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟)

مفسرین اور ماہرینِ لغت نے صراحت کی ہے کہ لفظ 'کافر' میں وہ تمام معانی پائے جاتے ہیں جن کے لیے اس کا عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ ابن الجوزیؒ نے لکھا ہے:

''لغت میں کفر کے معنیٰ چھپانے کے ہیں۔ کافر کو کافر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حق پر پردہ ڈال دیتا ہے''۔9

جوہری فرماتے ہیں:

''کافر کو کافر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے احسانات کا انکار کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کو چھپالیتا ہے''۔10

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ''ایسے ہر شخص کو جو اسلام کی اساسیات پر ایمان نہ رکھتا ہو، کافر نہیں کہا جاسکتا، یہ لفظ 'غیر مسلم' کے مترادف نہیں ہے۔ کافر اسی شخص کو کہا جاسکتا ہے جس تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے اور اس پر اتمام حجت کردی جائے، اس کے باوجود وہ اسلام قبول نہ کرے۔ اتمام حجت کے بعد بھی متعین طور پر کسی کو کافر نہیں کہا جاسکتا''۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ لفظ کافر کا استعمال ایمان اور اسلام کے بالمقابل ہوا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کے دین کو نہ مانے اور اسلامی عقائد کو تسلیم نہ کرے وہ کافر ہے۔ قرآن کریم

کی بہت سی آیات میں لفظ کفر کی نسبت یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طرف کی گئی ہے۔[11]

اسلام اصولی طور پر دین حق کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان فرق کرتا ہے، تاکہ اس کے احکام کے نفاذ کے معاملے میں دونوں کے ساتھ الگ الگ برتاؤ کیا جا سکے۔ دین حق کے ماننے والوں کو ان احکام کا پابند بنایا جا سکے اور نہ ماننے والوں کو ان کی پابندی سے مستثنیٰ رکھا جا سکے۔ اس لفظ کے ذریعے نہ غیر مسلموں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے اور نہ اس میں لغوی طور پر بغض و نفرت، حقارت اور ذلّت کے معانی پائے جاتے ہیں۔

۲- کافروں کے بارے میں عذابِ جہنم کے بیان سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ قرآن میں جہنم کے عذاب کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول نہیں کریں گے انھیں وہ عذاب دیا جائے گا، مثال کے طور پر وہ ان جیسی آیات کا حوالہ دیتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيزاً حَكِيماً۔ (النساء/۵۶)

(جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے)

فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَاباً شَدِيداً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ. ذٰلِكَ جَزَآءُ أَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ۔ (حم السجدة/۲۷-۲۸)

(ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزہ چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے)

وہ کہتے ہیں کہ ان آیات کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں غیر مسلموں کے بارے میں نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

کافروں کو آخرت میں دی جانے والی جو سزائیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل وانصاف کے عین مطابق ہیں۔ یہ سزائیں اہل ایمان کے دلوں میں کافروں سے نفرت وحقارت نہیں، بلکہ ہم دردی پیدا کرتی ہیں اور انھیں آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے ان بھائیوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی جدّ وجہد کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں پیدا کیا اور انھیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ ان کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام بجالائیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ حقیقت میں بڑے ناشکرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ۔ (النحل/۷۲)

(پھر کیا یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں)

جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں، جو حقیقت میں نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، وہ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا رویّہ بغاوت کے مترادف ہے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اس کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی نگاہ میں مجرم ہیں۔ اس نے ان کے لیے آخرت میں ایسی ہی سزائیں تجویز کر رکھی ہیں جن کے وہ مستحق ہیں:

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللّٰهِ كَذِباً أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ۔ (یونس/۱۷)

(پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا، جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے، یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے)

یہ دنیا دارالامتحان ہے اور آخرت دارالجزاء۔ یہاں انسان جیسے کام کرے گا اس کا بدلہ آخرت میں پائے گا۔ جو لوگ دنیا میں اللہ کے باغی اور مجرم بن کر رہیں اور اس کے

احکام کی خلاف ورزی کریں انھیں آخرت میں سخت سزائیں دی جائیں گی۔ فرماں بردار اور نافرمان، اطاعت گزار اور سرکش، نیک اور مجرم دونوں کے انجام میں فرق کرنا عین تقاضائے انصاف ہے، لیکن یہ فرق آخرت میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کرے گا۔ اس سے دنیا میں غیر مسلموں کے انسانی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس سے اہل ایمان کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ مشرکین نجس ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو قرآن میں ناپاک اور گندا کہا گیا ہے۔ اس تعبیر سے ان کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔ معترضین کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا۔ (التوبۃ/۲۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مشرکین نجس ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نجاست سے مراد جسمانی اور مادّی گندگی نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی خرابی اور شرک کی آلودگی ہے۔ اس پر تمام مفسّرین اور علماء کا اتفاق ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مشرکین نجس ہیں۔ اس سے مراد عقیدے کی نجاست اور گندگی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے اعضاء پیشاب پاخانہ جیسی چیزوں کی طرح نجس ہیں''۔[۱۲]

اسلام عقیدے کے معاملے میں کوئی مداہنت اور رو رعایت نہیں کرتا۔ وہ توحید کا علم بردار اور شرک کے سخت خلاف ہے۔ اس کے نزدیک شرک ایک گندگی ہے، جس سے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے والے کا ذہن آلودہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس گندگی کو ناپسند کرتا اور انسانوں کو اس سے پاک صاف رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ

السلام توحید کے علم بردار تھے۔ انھوں نے اللہ واحد کی عبادت کے لیے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگے تھے۔ خانۂ کعبہ کی دیواروں میں انھوں نے مورتیاں نصب کر رکھی تھیں اور اس کے اندر اور مسجد حرام میں تین سو ساٹھ بت رکھ چھوڑے تھے۔ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد جب وہاں کا اقتدار توحید پرستوں کے ہاتھ میں آیا تو یہ امر فطری تھا کہ وہ توحید کے مرکز کو مظاہر شرک سے پاک کر دیں، چنانچہ فتح مکہ کے اگلے سال حج کے موقع پر اعلانِ عام کر دیا گیا کہ خانۂ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور مسجد حرام کو مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے شرک کی آلودگیوں میں مبتلا لوگوں کو آئندہ یہاں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

جہاں تک کافروں اور مشرکوں کے ظاہر کا تعلق ہے اگر انہوں نے صفائی ستھرائی کا خیال رکھا ہو تو خواہ مخواہ اسلام نہ تو انھیں گندا قرار دیتا ہے اور نہ ان سے الگ تھلگ یا دُور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب کفار و مشرکین کے درمیان رہتے تھے، ان سے آپ کا ملنا جلنا رہتا تھا، وہ مسجد میں آتے تھے، آپؐ اور آپؐ کے اصحاب ان کے برتنوں سے پینے اور وضو کرنے کے لیے پانی لیتے تھے، ان کا بنایا ہوا کھانا کھاتے تھے اور ان کے تیار کیے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، لیکن کبھی ایسا نہیں کہ جن چیزوں پر ان کا ہاتھ لگتا ہو یا جو چیزیں ان کے بدن کے کسی حصے سے مَس ہوتی ہوں انھیں دھوئے جانے کا آپؐ نے حکم دیا ہو۔

حضرت حسنؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلۂ ثقیف کا وفد آیا تو اسے مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول یہ لوگ تو مشرک ہیں'' (شاید ان کی مراد یہ تھی کہ ان کی وجہ سے مسجد ناپاک ہو جائے گی) آپؐ نے فرمایا:

إن الارض لا ینجّسھا شیٔ [۱۳]

(زمین اس جیسی کسی چیز سے ناپاک نہیں ہوتی)

حضرت عمران بن حصینؓ نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر کا حال بیان کرتے ہیں کہ

راستے میں ایک پڑاؤ پر پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کچھ صحابہ تلاش کے لیے نکلے۔ ایک غیر مسلم عورت پانی کے دو مشکیزوں کے ساتھ ملی۔ وہ اسے آں حضرت ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپؐ نے اور تمام صحابہ نے اس سے پانی لے کر اپنی پیاس بجھائی۔[۱۴]

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ غیر مسلموں کے کھانے پینے کے جو برتن ہمارے ہاتھ لگتے تھے انھیں ہم استعمال کرتے تھے۔ اس پر آپ ہماری کچھ نکیر نہیں کرتے تھے۔[۱۵]

حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ نے ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ سے غیر مسلموں کے ان برتنوں کے بارے میں دریافت کیا، جن کے متعلق امکان ہو کہ ان میں وہ خنزیر کا گوشت پکاتے اور شراب پیتے رہے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر دوسرے برتن موجود ہوں تو ان مشتبہ برتنوں کو نہ استعمال کرو، موجود نہ ہوں تو انہی کو اچھی طرح دھو کر استعمال کر سکتے ہو۔[۱۶]

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مشرکین کی نجاست سے مراد عقیدہ کی خرابی ہے، نہ کہ ظاہری گندگی۔ جہاں تک انسانی تعلقات اور زندگی کے عام معاملات کا سوال ہے ان میں مشرکین کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا گیا ہے اور کسی حال میں ایسا رویہ نہیں اختیار کیا گیا ہے، جس سے ان کے سلسلے میں نفرت اور حقارت کا اظہار ہو۔

۴- • کافروں سے دوستی کی ممانعت

ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے اور انھیں دشمن کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں کے بارے میں بغض و نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور انھیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اس اعتراض پر بہ طور دلیل اس طرح کی آیات پیش کی جاتی ہیں:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۔

(النساء/۱۴۴)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ)

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِٱلْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلْحَقِّ۔ (الممتحنۃ/۱)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالاں کہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں)

ان آیات پر ان کے صحیح تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو 'اولیاء' نہ بنائیں۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ اس کا مادہ 'ول ی' اور مصدر 'ولاء' ہے۔ ولاء کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یکجا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ان سے مغایر ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ قربت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ خواہ یہ قربت جگہ کی ہو، یا تعلق کی، یا مذہب کی، یا دوستی، مدد اور عقیدہ کی۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو اس کے لیے 'ولی' کا لفظ مستعمل ہے۔[۱۷]

مذکورہ بالا آیتوں اور ان جیسی دیگر آیتوں میں لفظ 'اولیاء' انتہائی قربت کے معنیٰ میں آیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

أولياء أى خاصتكم وبطانتكم منهم۔[۱۸]

(کافروں کو اپنا ولی یعنی بہت قریبی اور راز دار نہ بناؤ)

علامہ زمخشری اس کا یہ مفہوم بتاتے ہیں:

لاتتّخذوهم اولياء تنصرونهم وتستنصرونهم وتؤاخونهم و تصافونهم وتعاشرونهم معاشرة المؤمنين۔[۱۹]

(کافروں کو اولیاء نہ بناؤ، یعنی ان سے تمھارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص و محبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو جس طرح اہل ایمان باہم رہتے ہیں)

ان آیات کو سمجھنے کے لیے اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جن میں وہ نازل ہوئی تھیں۔ مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف ان کے دشمنوں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود و نصاریٰ کا رویہ بھی کھلی دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انھوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انھیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد تھے۔ ایسے حالات میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا ان کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے 'ولایت' کا تعلق نہ رکھیں۔ کفّار کے بارے میں کہا:

يَـٰٓأَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَاء مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (النسا: ۱۴۴)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ)

یہود و نصاریٰ سے تعلقات کے بارے میں بھی یہی حکم دیا:

يَـٰٓأَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى أَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ۔ (المائدۃ: ۵۱)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے)

منافقین کے بارے میں فرمایا:

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآء فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ

أَوْلِيَآء ۔(النساء/۸۹)

(وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں، لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ)

اس معاملہ میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے، جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مبادا ان کے واسطے سے ان کے اسرار کفار تک نہ پہنچ جائیں:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ آبَآءكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَآء إَنِ اسْتَحَبُّواْ الْكُفْرَ عَلَى الإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَـٰئِكَ هُمُ الظَّـٰلِمُونَ۔ (التوبۃ/۲۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے)

قرآن کریم کی بعض آیات میں ان اسباب کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِينَ اتَّخَذُواْ دِينَكُمْ هُزُواً وَلَعِباً مِّنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَـٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ۔ (المائدۃ/۵۷)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ)

سورۂ ممتحنہ میں ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاء ۔ (آیت/۱)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ)

اسی سورت میں آگے ہے:

إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۔ (آیت/۹)

(وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں)

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کو وہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ تمھارے دشمن ہیں اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کر رہے ہیں، تمھیں تمھارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں مذکور ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالاً وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ۔ (آل عمران/۱۱۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے)

اس آیت میں لفظ 'بطانة' کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ بطانة کپڑے کے اندرونی حصے کو کہتے ہیں، جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بہ طور استعارہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے آدمی اپنا گہرا دوست اور ہم دم و ہم راز بنا لے۔[۲۰]

اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو۔ اس لیے کہ وہ لوگ تمھارے بہی خواہ نہیں ہیں، تمھیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویّے سے عیاں ہے۔

قریبی تعلق سے ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو عام غیر مسلموں کے ساتھ انسانی تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے، بلکہ ممانعت صرف ایسا تعلق رکھنے کی ہے جس سے اسلامی ریاست کے سیاسی و عسکری راز دشمنوں پر افشا ہوجائیں اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوجائے۔ یہ ممانعت صرف ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسر جنگ ہوں یا ان کے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہوں۔ رہے وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ مصروفِ جنگ نہ ہوں اور نہ ان کا طرزِ عمل عداوت اور ظلم و ستم پر مبنی ہو، ان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے، اچھے تعلقات رکھنے اور بھلا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنۃ ۸)

(اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

غیر مسلموں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم ہے۔ اس میں دو الفاظ آئے ہیں: 'أَنْ تَبَرُّوْهُمْ' اور 'تُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ'۔ برّ سے مراد ہے حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا[۲۱] اس میں زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے (البرّ: التوسّع في الاحسان اليه)[۲۲] تُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ کے معنیٰ بعض مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو، جب کہ بعض دیگر مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انھیں دو (ان تعطوهم قسطاً من

اموالکم علی وجه الصلة)۲۳۔

بعض مفسرین اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے (وقال اکثر اهل التاویل هی محکمة)۲۴۔

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:

هذه الآیة رخصة من الله تعالیٰ فی صلة الذین لم یعادوا المؤمنین ولم یقاتلوهم۔۲۵

(اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی)

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

قال اهل التأویل: هذه الآیة تدلّ علی جواز البرّ بین المشرکین و المسلمین، وان کانت الموالاة منقطعة۔۲۶

(مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان نیکی اور حسن سلوک کا معاملہ جائز ہے، اگرچہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے۔)

اس سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں سے ہر طرح کے تعلق سے منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ممانعت صرف 'ولایت' یعنی مخصوص قسم کے قریبی تعلق کی ہے۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

الاحسان والهبة مستثناة من الولایة۔۲۷

(غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انھیں کچھ دینا 'ولایت' میں شامل نہیں ہے)

امام رازیؒ نے لکھا ہے:

۵- مخالفوں سے لڑنے اور انھیں قتل کرنے کے احکام

ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے قرآن پر ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض اس کے تصور جہاد پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ

وہ کافروں اور مشرکوں سے جنگ کریں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کے لیے گھات لگائیں اور انھیں جہاں پائیں قتل کریں۔ بہ طور دلیل یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً۔ (التوبۃ/۱۲۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان کافروں سے جو تمھارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں)

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔ (التوبۃ/۵)

(...تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو)

يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (التحریم/۹)

(اے نبی، کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ۔ (التوبۃ/۱۴)

(ان سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمھاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا)

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ۔ (التوبۃ/۲۹)

(جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور

دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)

اس طرح کی آیات پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ آیات ہیں اس وقت تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں۔

یہ غلط فہمی در حقیقت جنگ کے بارے میں قرآن کے احکام و تعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے اور متعلقہ آیات کو ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) اسلام جبر و اکراہ کا مخالف ہے۔ قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے حق واضح کر دیا ہے، ساتھ ہی انھیں ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کر کے دائرۂ اسلام میں آجائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں:

إِنَّا هَدَيْنَهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً ۔ (الدھر/۳)

(ہم نے اسے راستہ دکھادیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِنُ وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (الکہف/۲۹)

(صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے)

(ب) جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا تب انھیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا جواب دے سکتے ہیں:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ. الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُولُوا رَبُّنَا اللهُ۔ (الحج/۳۹-۴۰)

(اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق

نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: ہمارا رب اللہ ہے)

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ جنگ ان پر تھوپی گئی تھی۔ دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کم زور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں اور شمعِ اسلام کو اپنی پھونکوں سے گُل کر دیں۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن اس وقت بھی انھیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (البقرۃ/۱۹۰)

(اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

(ج) قرآن کریم میں مذکور آیاتِ قتال کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دورانِ جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جب کسی گروہ سے جنگ برپا ہو تو میدانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رُو رعایت نہیں برتتا، بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کر دے۔ اس موقع پر کسی کم زوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

(د) جنگ ایک ناپسندیدہ لیکن ناگزیر صورت حال ہے۔ اسی لیے مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی ان کے پیرووں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام و قوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے، بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صورت حال کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ذیل

میں ہندومت کی مذہبی کتابوں کے چند حوالے دیے جاتے ہیں:

''اے اِندر، ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے۔ تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں۔ اے بہادر، ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ''۔[28]

''اے اگنی، ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگا دے۔ اے اجیت، دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت و شوکت نصیب کر''۔[29]

''اے مینو، طاقت ور سے زیادہ طاقت ور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے، دشمنوں اور ورتیروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے۔ تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا''۔[30]

بھاگوت گیتا کا تو موضوع ہی جنگ ہے۔ یہ دراصل کرشن جی کے اس طویل اپدیش پر مشتمل ہے جو انھوں نے پانڈوؤں کے سردار ارجن کو، جنگ پر ابھارنے اور لڑنے کی ترغیب دینے کے لیے دیا تھا۔

(ہ) ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان آیات کا خطاب اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں غیر مسلموں کو قتل کر دیں، بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہِ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا ہے:

امر الجهاد موكول الى الامام واجتهاده ويلزم الرعيّة طاعته فيما يراه من ذلك۔[31]

(جہاد کا معاملہ سربراہِ ریاست کے ذمّے ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے

فیصلے کو تسلیم کرنا لازم ہے)

اسی طرح جس قوم سے جنگ ہو رہی ہو اس کے صرف ان افراد کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو جنگ میں عملاً حصہ لے رہے ہوں، یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غیر متعلق لوگوں سے تعرض کرنے اور انھیں نشانہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ولا تقتلوا شيخاً فانياً ولا طفلاً ولا صغيراً ولا امراة۔[۳۲]

(اور نہ قتل کرو کسی بوڑھے کھوسٹ کو، کسی بچے کو، کسی کم سن کو اور کسی عورت کو)

قرآن کریم پر ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے کیے جانے والے جملہ اعتراضات جذباتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات بھڑکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کے مختلف مقامات سے کچھ آیتیں منتخب کر لی جاتی ہیں اور انھیں سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے من مانے مفہوم بیان کیے جاتے ہیں۔ اگر ان آیات کا مطالعہ صحیح تناظر میں کیا جائے اور ان حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں وہ نازل ہوئی تھیں تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا، بلکہ پڑھنے والے پر ان کی معقولیت آشکارا ہوگی۔

حواشی و مراجع

۱۔ قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم کا مقالہ بہ عنوان: ''قرآن کریم پر مستشرقین کے اعتراضات'' شائع شدہ ''روزنامہ راشٹریہ سہارا، قرآن عظیم نمبر، ۱۴/۱۱ اکتوبر ۲۰۰۶ء

۲۔ سوامی دیانند سرسوتی اور ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے بارے میں ملاحظہ کیجیے: مولانا محمد فاروق خاں، ہندو دھرم کی جدید شخصیتیں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق ستیارتھ پرکاش میں اسلام کا باب الحاقی ہے، وہ سوامی دیانند کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

۳۔ ملاحظہ کیجیے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع شدہ کتابچہ بہ عنوان: قرآن مجید کی چوبیس آیات پر بے جا اعتراضات، طبع چہارم،۱۹۹۳ء، ص ۳

۴۔ ازدی، ابوبکر محمد بن الحسن بن درید، جمہرۃ اللغۃ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۳۴۵ھ، ۲/۴۰۱

۵۔ فیروزآبادی، مجدالدین محمد، القاموس، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱/۵۴

۶۔ جمہرۃ اللغۃ، ۲/۴۰۱

۷۔ حوالہ سابق

۸۔ جوہری، ابونصر اسماعیل بن حماد، تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ، طبع مصر، ۱۲۸۲ھ، ۱/۳۹۴، القاموس، ۱/۵۴

۹۔ ابن الجوزی، ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمٰن بن علی البغدادی، زادالمسیر فی علم التفسیر، المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ، ۱/ ۲۷

۱۰۔ تاج اللغۃ، ۱/۳۹۵

۱۱۔ ملاحظہ کیجیے البقرۃ: ۸۹، المائدۃ: ۷۲،۷۳، ۷۸، البینۃ: ٦

۱۲۔ نووی، یحییٰ بن شرف، شرح مسلم، باب الدلیل علی ان المسلم لا ینجس

۱۳۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب المشرک یدخل المسجد

۱۴۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الفائت

۱۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، باب الاکل فی آنیۃ اہل الکتاب

۱٦۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب آنیۃ المجوس، صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الصید بالکلاب المعلّمۃ

۱۷۔ راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ۱۳۲۴ھ، ص ۵۵۵

۱۸۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر القرطبی) الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب مصر، ۱۹۸۷ء، ۵/۴۲۵

۱۹ زمخشری، ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی وأولادہ مصر،۱۹۷۳ء،۱/ ۶۱۹

۲۰ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر الطبری) دارالمعارف مصر،۱۹۶۹ء،۷/ ۱۳۸، کشاف،۱/ ۴۵۸، تفسیر قرطبی،۴/ ۱۷۸

۲۱ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر،۱۳۵۶ھ،۴/ ۳۴۹، لسان العرب،۴/ ۵۴، مادہ 'بر'

۲۲ المفردات فی غریب القرآن، ص۹۳

۲۳ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ المالکی الإشبیلی، احکام القرآن، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۳۱ھ، ۲/ ۲۴۹، الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری، النکت والعیون (تفسیر الماوردی)، مطابع المقہوی الکویت، ۱۴۰۲ھ، ۴/ ۲۲۳، تفسیر قرطبی، ۱۸/ ۵۹، تفسیر کبیر، ۸/ ۱۳۴

۲۴ تفسیر قرطبی، ۱۸/ ۵۹

۲۵ حوالہ سابق

۲۶ رازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المطبعۃ العامرۃ مصر، ۱۳۰۸ھ، ۸/ ۱۳۴

۲۷ تفسیر قرطبی، ۸/ ۹۴

۲۸ رگ وید، ۶:۱:۸-۱۳

۲۰ یجروید، ۹:۳۷

۳۰ اتھروید، ۴:۳۲:۱-۳

۳۱ ابن قدامۃ، ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد المقدسی، المغنی علی مختصر الخرقی، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ ریاض، ۱۹۸۱ء، ۸/ ۳۵۲

۳۲ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین۔

غیر مسلم قرآن کی نظر میں

سعید احمد بن عبداللہ عمری

فکر و عمل کی آزادی انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ دین اسلام صرف اس کا قائل ہی نہیں اس پر کاربند بھی ہے کیوں کہ اسی آزادی کے صحیح اور غلط استعمال پر اس نے انسان کی کامرانی اور ناکامی کی بنیاد رکھی ہے چنانچہ قرآن کا یہ اعلان: لا اکراہ فی الدین (سورۃ البقرہ:۲۵۲) ترجمہ: ''دین میں کوئی جبراً نہیں'' اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ غیر مسلم کو فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اسے نیکی اور بدی میں حق اختیار ملا ہے پس یہ دنیا دارالامتحان ہے، الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (سورۃ الملک:۲) ترجمہ: ''اسی نے موت و حیات کی تخلیق فرمائی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔ اگر فکر و عمل کی آزادی انسان کو میسر نہ ہو تو پھر تخلیق انسانی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآن مجید میں کفار و مشرکین کے سلسلے میں بار بار انبیاء کرام کی ذمہ داری دین کی صرف فہمائش اور تبلیغ بتائی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ o لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (سورۃ الغاشیۃ:۲۱،۲۲) ترجمہ: ''آپ صرف تذکیر کرنے والے ہیں آپ ان پر داروغہ نہیں، ارشاد ہے: وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (سورۃ العنکبوت:۱۸) ترجمہ: ''بلکہ حق دعوت ادا ہونے اور اتمام حجت کے بعد مزید کسی کوشش کو جبر و اکراہ سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی ممانعت فرما دی، ارشاد ہے: أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (سورۃ یونس:۹۹) ترجمہ: ''تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اسی فکر و عمل کی آزادی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانی آبادی کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے ایک اہل ایمان دوسرا اہل کفر۔ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (سورۃ التغابن:۲) ترجمہ: ''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پس تم میں سے کوئی کافر ہے اور تم میں سے کوئی مومن، اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے''۔

یہ تقسیم کسی تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی انسانوں میں اختلاف وتفریق کو ہوا دینے کی خاطر ہے بلکہ یہ ایک فطری اور منطقی تقسیم ہے جو کسی بھی نظریہ اور نظام کے سلسلے میں لازماً رونما ہوگی، اگر اس کے حاملین آزادئ فکر وعمل کے حامی ہوں چنانچہ قرآن مجید جس نظریہ وعقیدہ کا علمبردار اور جس شریعت ونظام کا داعی ہے اس کے سلسلے میں بھی یہی دو طبقے وقوع پذیر ہوسکتے ہیں ایک وہ طبقہ جو اس کے پیش کردہ نظریہ وصداقت سے واقف ہوکر اسے تسلیم کرے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے اس طبقہ کا نام اس کی نظر میں مومن اور مسلم یعنی ماننے اور اطاعت کرنے والا ہے دوسرا وہ طبقہ جو اس کے عقیدے وشریعت کو سچا نہ مانے بلکہ اسے رد کردے اس کا نام کافر اور منکر یعنی رد کرنے والا اور انکار کرنے والا ہے اصلاً یہی دو طبقات ہیں لیکن قرآن مجید میں ایک اور طبقہ بھی منافقین کے نام سے نظر آتا ہے یہ وہ طبقہ ہے جو بظاہر دین اسلام کو قبول کرتا ہے اور اس کے احکام بجالاتا ہے مگر ان کے دل اس کی صداقت پر گواہی نہیں دیتے، شخصی وگروہی مفادات کے تحت یہ طبقہ پروان چڑھتا ہے، حقیقت کے اعتبار سے اسلام نے اس طبقہ کا شمار دوسرے طبقہ یعنی طبقہ کافرہ میں رکھا ہے کیوں کہ اسلام میں وہی عمل معتبر ہے جو قلبی ایمان کی بنیاد پر رضا ورغبت کے ساتھ ہو نیز اسی دوسرے طبقے میں اس نے تمام گروہوں کو بھی شمار کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے کسی بھی نام سے موسوم رہے ہوں مگر آخری دین کے آنے کے بعد انہوں نے اسے قبول کرنے اور اپنانے سے انکار کردیا ہو، عرف میں بھی اسی دوسرے طبقے کو غیر مسلم کا نام دیا جاتا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید میں ان دو طبقات کے ساتھ کیا سلوک اور معاملہ روا رکھا ہے چنانچہ پہلے طبقہ کو وہ اس نظام کی تفصیلات اور تقاضے بتاتا ہے جسے اس نے قبول کیا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس سانچہ میں ڈھال سکے جو مطلوب ہے مگر دوسرے طبقے کو وہ بار بار مختلف پہلوؤں اور متنوع اسالیب سے دعوت غور وفکر دیتا ہے ان کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرتا ہے ان کی غفلت کے دبیز پردوں کو چاک کرتا ہے، ان کی فطرت، عقل اور جذبات سے پرزور اپیل کرتا ہے اس طرح وہ انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کرتا کیوں کہ وہ اس کے بندے ہیں، اگرچہ اس کی بندگی کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، وہ اپنے خالق سے دور ہوچکے ہیں حالاں کہ وہ اسی کی مخلوق ہیں، وہ ابلیس اور اس کی ذریت کے دست وبازو بنے ہوئے ہیں جب کہ وہ آدم علیہ السلام کی ذریت سے وابستہ ہیں۔

الغرض قرآن مجید نے غیر مسلم کو جو حقوق دیے ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں البتہ اس مختصر مضمون میں صرف قرآن مجید کے اسلوب خطاب کو بنیاد بنا کر چند تصورات وحقائق پیش کیے گئے ہیں جن سے واقفیت غیر مسلمین کے سلسلے میں ہمارے تصورات اور تعلقات کو استوار کرنے کے لیے ضروری ہے چنانچہ قرآن مجید کے مطالعے سے ہمیں صرف دو مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں منکرین حق کو ان کے اسی وصف سے ساتھ پکارا گیا ایک سورۃ الکافرون ہے جس میں ایمان وکفر کے درمیان حد فاصل کی نشاندہی کی گئی اوران کے مابین کسی بھی اشتباہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ دوسری جگہ سورۃ التحریم کی یہ آیت ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ.... (سورۃ التحریم:۷) ترجمہ: ''اے وہ لوگو! جنھوں نے کفر کیا تم آج معذرت مت کرو تم کو اسی چیز کا بدلہ مل رہا ہے جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے''۔ اس آیت کا خطاب درحقیقت آخرت سے متعلق ہے یہاں دعوت ایمان کی کوئی گنجائش نہیں جو دار العمل اور دار الابتلاء نہیں بلکہ دار الجزاء ہے، ان دو مقامات کے علاوہ قرآن مجید میں کہیں بھی اس طرح کا خطاب نہیں حالاں کہ اس طرز خطاب میں عقلی اور منطقی طور پر کوئی قباحت بھی نہیں۔

پس قرآن مجید میں غیر مسلمین سے زیادہ تر خطاب ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ'' (۲۰ مقامات پر) کے لفظ سے ہوا ہے کیوں کہ غیر مسلم بھی انسان ہے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان انسانیت ایک بڑی قدر مشترک ہے نیز انسان جب اپنے مقام انسانیت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اسے مقصد زندگی سے واقف ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ اشرف المخلوقات ہے خلیفہ فی الارض ہے دوسری مخلوق سے ممتاز ہے وہ ایک نرا معاشی اور سماجی حیوان نہیں کہ صرف لذت کام ودھن میں گھر کر رہ جائے اس کی فطرت میں حیوانی تقاضوں کے ساتھ روحانی داعیات بھی ودیعت کیے گئے ہیں اس کی حیوانیت اگر اسے زمین کی طرح کھینچتی ہے تو اس کی روحانیت اسے آسمان کی طرف اٹھاتی ہے چنانچہ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے قرآن مجید میں سب سے پہلا خطاب اسی انسانیت کے واسطے سے کیا گیا ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (سورۃ البقرہ:۲۱) ترجمہ: ''اے انسانو! تم اپنے اس پروردگار کی بندگی کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم جہنم

کے عذاب سے بچو" اس آیت کریمہ میں انسانوں کو انسانیت کے ناطے سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے تخلیق کے مقصد کو جانیں اور پورا کریں، جس کا ذکر دوسری آیت میں یوں ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ‎o (سورۃ الذاریات:۵۶) ترجمہ: "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں"۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں اسلام کے بنیادی اصول وتعلیمات کے ماننے اور تسلیم کرنے کی دعوت بھی اسی انسانیت کے دلنواز خطاب سے دی گئی: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (سورۃ فاطر:۳) ترجمہ: "اے انسانو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کیا اللہ کے علاوہ کوئی ایسا خلاق ہے جو تمہیں آسمان وزمین سے روزی دیتا ہو، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ پس تم کہاں پھیرے جاتے ہو"۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (سورۃ النساء:۱) ترجمہ "اے انسانو! اپنے اس پروردگار کی نافرمانی سے بچو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلائے پس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مدد کا سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے بچو، یقیناً اللہ تم پر نگراں ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ (سورۃ النساء: ۱۷۰) ترجمہ "اے انسان! تحقیق کہ تمہارے پاس اللہ کے رسول تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آ چکے پس ایمان لے آؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا"۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (سورۃ یونس:۱۰۸) ترجمہ: "اے انسانو! تحقیق کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق آ گئی، پس جس نے ہدایت اختیار کی تو بس اس نے اپنی ذات کے لیے ہدایت کی اور جس نے گمراہی اختیار کی تو بس

اس نے ذات کے لیے گمراہی اختیار کی،اس حال میں کہ تم پر دارغہ نہیں ہوں''۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (سورۃ الاعراف:۱۵۸) ترجمہ: ''آپ کہہ دیجیے اے انسانو! یقیناً میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم ایمان لے آؤ اللہ پر اس کے رسول اور نبی امی پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ''۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْماً لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئاً إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ... (سورۃ لقمان:۳۳) ترجمہ: ''اے انسانو! اپنے پروردگار کے عذاب سے بچو اور ڈرو ایسے دن سے جس میں کوئی باپ اپنے بچے کے کام نہ آئے گا اور نہ کوئی بچہ اپنے باپ کے کچھ کام آئے گا، یقیناً اللہ کا وعدہ اٹل ہے، پس تمہیں دنیوی زندگی ہرگز مغالطہ میں نہ ڈالے اور نہ تمہیں اللہ کے بارے میں بڑا دھوکے باز مغالطہ میں ڈالے''۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِي الأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (سورۃ البقرہ:۱۶۸) ترجمہ: ''اے انسانو! زمین میں موجود حلال اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی مت کرو، یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (سورۃ الحجرات:۱۳)

ترجمہ: ''اے انسانو! یقیناً ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم کو قبیلوں اور نسلوں میں بنا دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے''۔

الغرض انسان اگر اپنے آپ کو پہچان لے اپنے مقام و مرتبہ سے آشنا ہو جائے

اپنی قدرت ومحدودیت سے آگاہ ہوجائے اپنی مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس کرلے تو اس کے اور اسلامی تعلیمات اور ہدایت کے مابین کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔

پھر دوسرا خطاب ''بنی آدم'' کے نام سے بھی (۵ مقامات پر) ملتا ہے غیر مسلم خواہ وہ اپنے آپ کو مختلف نسلی ملکی مذہبی اور لسانی گروہ بندیوں میں جکڑے اور ابلیس کے نقش قدم پر چلے مگر وہ درحقیقت حضرت آدم وحواء کی اولاد ہے، دنیا کی پوری انسانی آبادی اسی اصل سے نکلی ہے اس طرح بنی آدم کے مبنی برحقیقت خطاب سے قرآن مجید میں غیر مسلم کے شعور کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ وہ اس آدم کی نسل سے ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا مزید برآں اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس نے تاویل کی اور اپنی سبکی کا انتقام لینے کی اس نے قسم کھائی، پھر آدم وحواء کو شجرہ ممنوعہ کے قریب جانے اور اس سے کھانے پر آمادہ کیا، اب آدم زاد کے لیے دو ہی راہیں ہیں یا تو وہ اپنی غیرت اور منصب کا پاس ولحاظ رکھے اور اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے رسولوں کی پیروی کرے اور ان پر نازل شدہ کتابوں کا اتباع کرے یا ابلیس اور اس کے ذریت کے طریقے کی پیروی کرکے اپنے آپ کو جنت سے باہر کرلے۔

يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِيْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِيْشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَىَ ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ (سورۃ الاعراف:۲۶) ترجمہ: ''اے آدم کے بیٹو! ہم نے تم پر ایسا لباس اتارا ہے جو تمہارے ستر کو ڈھانکے زیب وزینت کے ساتھ اور تقویٰ کا لباس بہتر ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں''۔

يَا بَنِيْ آدَمَ لاَ يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَاتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لاَ تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِيْنَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ (سورۃ الاعراف:۲۷) ترجمہ: ''اے آدم کے بیٹو! تمہیں شیطان ہرگز فتنہ میں نہ ڈالے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے باہر نکالا ان سے جنت کا لباس اترواتے ہوئے بے شک وہ اور اس کی جماعت تمہیں اس جگہ سے دیکھ لیتی ہے جہاں سے تم انہیں دیکھ نہیں سکتے، بے شک ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا سرپرست بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے''۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ الاعراف:۳۵) ترجمہ: ''اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں تم پر ہماری آیتیں بیان کرتے ہوئے پس جس نے پرہیزگاری اختیار کی اور اصلاح کر لی ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

پھر ایک تیسرا ایسا دلنواز خطاب ''یا عبادی'' کے لفظ کے ساتھ بھی ملتا ہے کہ اس خطاب میں مشتمل مضمون کی وجہ سے اس آیت کو قرآن کی سب سے زیادہ امید افزا آیت کہا گیا۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ (سورۃ الزمر:۵۳تا۵۵) ترجمہ: '' آپ کہہ دیجئے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمائے گا، اور تم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کی اطاعت کرو قبل اس کے کہ تم پر عذاب آئے پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی اور تم اس بہترین کتاب کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے نازل کی گئی ہے قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تمہیں اس کا احساس نہ ہو''۔ یہ خطاب اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ غیر مسلم نے اگرچہ ارادی طور پر اللہ کی بندگی قبول نہیں کی ہے مگر وہ تکوینی طور پر اللہ ہی کا بندہ ہے۔

یہ تینوں خطاب ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے وہ ہماری طرح انسان ہیں حضرت آدم وحواء کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں ایک ہی نسل کے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ اس مودت ومحبت کے حق دار ہیں جو ایک کنبے کے افراد میں پائی جاتی ہیں تکوینی طور پر وہ ایک ازلی حقیقت بندگی میں شریک ہیں جو باہمی یگانگت کا تقاضہ کرتی ہے نیز وہ انسان ہونے کے ناطے اس تکریم کے بھی مستحق ہیں جو ایک مسلم کو حاصل ہے لہٰذا ایک مسلمان غیر مسلم کے ساتھ تعلقات رکھنے

کے لیے ان اصولوں کو مدنظر رکھے جن کی بنا وہ سماجی انصاف اور حسن و معاشرت کے برابر حق دار ہیں ارشاد ہے۔

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (سورۃ الممتحنہ:۸)

ترجمہ:"اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

نیز انسانی معاشرے میں جو تعلقات پیدائشی طور پر قائم ہو جاتے ہیں۔ ان میں غیر مسلمین کے حقوق برابر باقی رہتے ہیں چنانچہ مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی حسن سلوک کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَى أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (سورہ لقمان:۱۵) ترجمہ:"اور اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں پس تم ان کا کہنا نہ مانو اور ان کے ساتھ دنیوی معاملات میں معروف کے مطابق تعلق رکھو"۔

البتہ اختیاری تعلقات ہیں جیسے کسی مسلم کا غیر مسلم کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق وغیرہ۔

﴿وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾ (سورۃ البقرہ:۲۲۱) ترجمہ: "اور تم آزاد مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں البتہ مومن باندی آزاد مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند آئے اور تم مشرک آزاد مردوں سے اپنی (مسلم) بیٹیوں کا نکاح نہ کرو البتہ مومن غلام مشرک آزاد مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند

آئے وہ سب جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف اپنے اذن سے دعوت دیتا ہے اس طرح وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے شاید کہ وہ سمجھ سکے''۔

کیوں کہ اسلام صرف حق کا نظریاتی پرچار نہیں کرتا بلکہ وہ حق کی اساس پر ایک معاشرے کی تشکیل بھی چاہتا ہے، اس لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ معاشرے کی بنیادی اینٹ جو ایک مرد اور ایک عورت کے ازدواجی رشتے کے خمیر پر اٹھائی جائے معاشرے کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کے لیے اسے صحیح اساس پر مستحکم کرنا ضروری ہے۔اسی طرح وراثتی قانون میں بھی دین کا اختلاف مانع بنتا ہے کیوں کہ معاشی نظام کے اندر وراثت کا معاملہ بنیادی رول ادا کرتا ہے، سیاسی طور پر بھی کلیدی مناصب جو اسلام کے بنیادی مقاصد کے ترجمان اور نگہبان ہوتے ہیں، ان کے حصول کے لیے بھی ایمان واسلام شرط ہے۔ کیوں کہ اگر اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے تو دین وسیاست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دین سیاست کو صحیح رخ دیتا ہے تو سیاست نظام دین میں تقویت واستحکام پیدا کرتی ہے۔

یہ تمام حقائق اور احکام ایسے ہیں کہ طرفین کی طرف سے ان کی رعایت ہی ان کی بقاء کی ضامن ہے، لیکن اگر فریق ثانی غیر مسلم، ان کا پاس ولحاظ نہ رکھے اور وہ تخلیق انسان کے مقصد کے خلاف انسان کی آزادی فکر وعمل کو سلب کرنا چاہے تو اس سے اسلام باقاعدہ اعلان جنگ کرتا ہے اور ان سے برأت کا حکم دیتا ہے۔ارشاد ہے

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ......... (سورۃ البقرہ:۱۹۳) ترجمہ:'' اوران کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فتنہ یا مذہبی جبر نہ رہے''۔ نیز ایسے لوگوں سے تعلقات کی ممانعت ہے ارشاد ہے: إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (سورۃ الممتحنہ: ۹) ترجمہ: ''صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تم کو منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہو اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا بھی نہ ہو لیکن) تمہارے نکالنے والوں کی) مدد کی ہو اور جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے سو وہ ظالم ہوں گے''۔

الغرض اسلامی جنگ محض کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ ''صد عن سبیل اللہ'' کی وجہ سے اور ازالۂ فتنہ کے لیے ہے جس طرح اسلام نے مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ فکر وعمل سے اختلاف کرنے والوں کو برداشت کرے، اسی طرح غیر مسلم کو بھی چاہیے کہ اس فکری وعملی اختلاف کو برداشت کرے لیکن قرآن مجید میں مشرکین سے قتال کا جو حکم ملتا ہے جیسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ .... (سورۃ التوبہ:۵) (اور مشرکین کو تم جہاں پاؤ وہاں قتل کرو) اس کا ایک خاص پس منظر بھی ہے، جو شروع سے چلا آ رہا ہے کہ کسی رسول کی بعثت اگر کسی قوم میں براہ راست ہوتی ہے تو اتمام حجت کے بعد تکذیب کی صورت میں وہ قوم عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا ...... (سورۃ الاسراء:۱۵) ترجمہ: ''اور ہم عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ کسی رسول کو بھیج دیں۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا (سورۃ الطلاق:۸) ترجمہ: ''کتنی ہی ایسی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی پس ہم نے ان کا سخت حساب لیا اور ہم نے ان کو نادیدہ سزائیں دیں'' ۔مگر بعد کے ادوار میں جب اہل ایمان کی معتد بہ تعداد ہونے لگی تو انہیں مکذبین کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا اور اس قتال کو عذاب الٰہی قرار دیا۔

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ............ (سورۃ التوبہ:۱۴) ترجمہ: ''ان سے لڑائی کرو اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سزا دے گا''، الغرض یہ ان مشرکین کا حکم ہے جن کے اندر براہ راست کسی نبی کی بعثت ہوتی ہے اب رہے وہ مشرکین جن کے اندر نبی کی بعثت بالواسطہ ہوتی ہے ان کا حکم دوسرا ہے۔

مطبوعات ادارہ علوم القرآن

اسمائے کتب	صفحات	قیمت
حقیقت نماز - مولانا امین احسن اصلاحی (تخریج وتحقیق: مولانا سلطان احمد اصلاحی)	۶۰	۱۰
کتابیات فراہی - ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۸۰	۱۰
مولانا امین احسن اصلاحی نمبر (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۶۰۰	۲۰۰
قرآنی علوم بیسویں صدی میں (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۵۳۲	۲۰۰
عصر حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۳۷۶	۲۰۰
خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی	۳۹۲	۲۵۰
قرآنی افکار وتعلیمات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۱۶۰	۱۰۰
اشاریہ ششماہی علوم القرآن	۵۶	۲۰
معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار) مرتبہ ڈاکٹر وصاف احمد، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۲۵۶	۱۶۰
Economic Problems and the Teaching of the Quran By Dr. Abdul Azeem Islahi & Dr. Ausaf Ahmad	۱۶۰	۱۵۰
اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ	۲۵۰	۱۵۰
قرآنی مقالات مرتبہ روفیسر اشتیاق احمد ظلی	۳۳۶	۲۵۰

Idarah Ulum Al-Qur'an
P.O. Box-99, Shibli Bagh, Aligarh-202002 (U.P.)